شانِ سند

سرور تونسوی

Poly
ABS/
P.V.C
Elast
Pho

Kind Attention

Importers, Actual Users Export Houses

We are the indenting agents for
the following Raw Materials

Polythene Moulding Powder Low density High density
ABS/Nylon Moulding Powder M.M. V.P.Monomer
P.V.C. Resins Fine Chemical
Elastic Cloth Self Adhesive Tape &
Insulating Tape

Ferrous Non Ferrous Metals

Please Contact :

NARANG ENTERPRISES

L-4, Connaught Circus, New Delhi-110001

Phone 311976 Telex 031-3980 SAHI IN Cable QUICKSERV

HEARTY GREETINGS

AND

BEST WISHES

ON THE AUSPICIOUS OCCASION

OF A

REPUBLIC DAY

FROM

MOHAN GOLD WATER

Dolly Ganj, Luknow (U.P.)

APEEJAY

SERVING THE NATION IN DIVERSE FIELDS

Manufacturers	STEEL STHUCTURALS & PIPES INGOTS, BILLETS ETC
Shipping	CARRY MERCHANDISE ALL OVER THE WORLD
Tea	SEVERAL GARDEN PRODUCE QUALITY TEA FOR FOREIGN AND DOMESTIC MARKETS
Imports/Agencies	STEEL, DRUGS, CHEMICALS, PHARMACEUTICALS, ROLLING STOCK, NEWSPRINT, EDIBLE OILS ETC
Exports	STEEL, STEEL PIPES GARMENTS, LEATHER GOODS ENGINEERING ITEMS
Hotels	FIVE STAR PARK HOTELS AT CALCUTTA VIZAG, AND NEW DELHI (Under Construction)

APEEJAY PVT. LTD.

17 Park Street, Calcutta

PHONE 246881-32-83

TELEX 021 7309 APEEJAY

BOMBAY NEW DELHI VIZAG

BRANCHES

CLOTH BOUND

CAN BE HAD FROM Rs 72/-

THE SHAN-E-HIND MONTHLY

FLAT 8, ANSARI MARKET, DARYA GANJ

NEW DELHI-110002

ہریانہ ۔ خوشحال مستقبل کی طرف گامزن

سنہ ۱۹۵۰ء میں ہمارا آئین نافذ ہوا۔ اس کے بنیادی اصول ہیں انصاف، آزادی، مساوات و اخوت۔ یہی اصول مختلف ترقیاتی پروگراموں میں ہماری رہنمائی کرتے رہے ہیں۔ ان اخلاقی اصولوں کی رہنمائی میں ہم غریبی، ناخواندگی اور بے روزگاری جیسے مسائل کا سامنا کرتے ہوئے ترقی کی راہ پر گامزن رہے ہیں۔ زراعت، صنعت، مواصلاتی نظام، سائنس اور ٹکنالوجی جیسے مختلف شعبوں میں ہماری کامیابیاں تو بے مثال ہیں ہی پر سماج کے مفلس اور دبے ہوئے طبقوں کی طرف بھی ہم نے خاص توجہ دی ہے۔ نتیجہ کے طور پر آج یہ طبقات بھی قوم کی تعمیر نو میں بھرپور تعاون دے رہے ہیں۔ شریمتی اندرا گاندھی کی پرجوش قیادت میں ہریانہ نے ترقی کی کئی منزلیں طے کی ہیں۔ ساتھ ہی مستحکم اور چوکس انتظامیہ نے امن و امان اور ترقی کے لئے ساز گار فضا بنائی۔ وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کو حاصل عوامی انتخابی فتوے ۲۱ویں صدی میں ہماری قوم کے ایک عالمی رہنما کے طور پر ابھرنے کی غمازی کرتا ہے۔ ہریانہ اپنی چوکسی کے باعث چند برسوں میں ترقی کی ایک مثال بن گیا ہے۔ امید واثق ہے کہ ہم ترقی کی راہ پر مسلسل گامزن رہیں گے۔

- ہریانہ نے ۷۰ لاکھ ٹن اجناس کی پیداوار کی ہے جب کہ سنہ ۱۹۶۶ء میں یہ صرف ۲۶ لاکھ ٹن تھی۔
- آبپاشی سہولیات سنہ ۱۹۶۶ء میں ۱۳ لاکھ ۹۳ ہزار ہیکٹر کی نسبت اب بڑھ کر ۲۷ لاکھ ہیکٹر میں میسر ہو گئی ہے۔
- سبھی ہریجن بستیوں میں بجلی لگا دی گئی ہے اور ۶۰۴۳۴ ہریجن گھروں میں رعایتی شرح پر ایک پوائنٹ کے کنکشن دئے جا چکے ہیں۔ ۴۱۰۰ گاؤں کی گلیوں کو بجلی کی روشنی سے منور کر دیا گیا ہے۔
- چھوٹی صنعتوں کی تعداد سنہ ۱۹۶۶ء میں ۴۵ کے مقابلہ اب ۵۰۰۰ ہو گئی ہے۔ ۱۸۲۴ دیہی اکائیوں میں ۵۴۳۷ افراد کام کرتے ہیں جن میں سے ۵۰ فی صد کا تعلق کمزور طبقوں سے ہے۔
- صنعتوں میں تیزی سے اضافے سے سالانہ صنعتی برآمدات سنہ ۱۹۶۶ء کے ساڑھے چار کروڑ روپے کی نسبت اب ۲۰۰ کروڑ روپے تک ہو گئی ہے۔
- ریاست میں طبی سہولیات ۵ کلو میٹر کے دائرے میں دستیاب ہیں۔ اب طبی سہولیات پر فی کس ۴۳ روپے ۴۵ پیسے صرف کئے جاتے ہیں جب کہ سنہ ۱۹۶۶ء میں اس مد پر صرف ایک روپیہ ۲۳ پیسے

خرچ کئے جاتے تھے۔

- ہریانہ نے خاندانی منصوبہ بندی میں اعلیٰ کارگزاری کے لئے متواتر سنہ ۱۹۸۲-۸۳ء اور سنہ ۱۹۸۳-۸۴ء میں اعزازات حاصل کئے ہیں۔
- ۶۹۰۴ دقت والے گاؤں میں سے ۴۱۰۰ گاؤں کو صاف پینے کا پانی مہیا کرایا جا چکا ہے۔ سنہ ۱۹۸۶ء تک پینے کے پانی کی کمی والے سبھی گاؤں کو یہ سہولت میسر کرا دی جائے گی۔
- ریاست میں پرائمری، مڈل، ہائر اور کالج درجہ تک کی تعلیمی سہولیات بالترتیب ایک کلو میٹر، ۲۰۳۷ کلو میٹر، ۲۰۹۵ کلو میٹر اور ۴۵۰۱۰ کلو میٹر کے دائرے میں دستیاب ہیں۔
- ریاست میں چار لاکھ ۳۰ ہزار کنبوں کو غریبی کی سطح سے اوپر اٹھانے کے لئے اقتصادی مدد دی گئی ہے۔ اقتصادی طور پر کمزور طبقوں کے ۱۰۱۰۴۱ افراد میں ایک لاکھ ۳۵ ہزار ایکڑ فاضل اراضی تقسیم کی جا چکی ہے۔ تین لاکھ بے گھر لوگوں کو مفت رہائشی پلاٹ دئے گئے ہیں۔
- سنہ ۱۹۶۶ء میں سڑکوں کی لمبائی ۵۱۰۰ کلو میٹر کے مقابلے اب ۲۰ ہزار کلو میٹر ہو گئی ہے۔
- ہریانہ روڈ ویز کی ۲۹۰۰ آرام دہ بسیں روزانہ ۶ لاکھ کلو میٹر کی مسافت طے کرتی ہیں جن میں ۱۱/۱۲ لاکھ مسافر سفر کرتے ہیں۔
- گزشتہ سال دس کروڑ شجر لگائے گئے تھے۔ سال رواں میں اتنے ہی اور شجر لگانے کا عمل جاری ہے۔

میری سرکار امن و اخوت کے ماحول میں صاف ستھرے اور مستعد انتظامیہ کے ذریعہ ترقی کی رفتار میں بڑی رفتاری لانے کا عزم کرتی ہے۔ ہم اپنی روایتی قدروں کو برقرار رکھ کر ایک جدید دور کا آغاز کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ ہماری منزل ہے درخشاں مستقبل۔ آیئے! آج ہم سب اس مبارک موقع پر وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کی جرأت مندانہ اور پرجوش قیادت میں دیش کی سالمیت اور یکجہتی کو قائم رکھنے کے لئے متحد ہو کر کام کرنے کا عزم کریں۔

بھجن لال وزیر اعلیٰ ہریانہ

ABDULRAB

ریانہ۔ خوشحال مستقبل کی طرف گامزن

۱ء میں ہمارا آئین نافذ ہوا۔ اس کے بنیادی اصول ہیں انصاف، آزادی، مساوات و اخوت۔ یہی اصول مختلف ترقیاتی پروگراموں میں ہماری رہنمائی کرتے رہے ہیں۔ ان اخلاقی
میں ہم غریبی، ناخواندگی اور بے روزگاری جیسے مسائل کا سامنا کرتے ہوئے ترقی کی راہ پر گامزن رہے ہیں۔ زراعت، صنعت، مواصلاتی نظام، سائنس اور ٹکنالوجی جیسے مختلف
کامیابیاں تو بے مثال ہیں ہی پر سماج کے مفلس اور دبے ہوئے طبقوں کی طرف بھی ہم نے خاص توجہ دی ہے۔ نتیجہ کے طور پر آج یہ طبقات بھی قوم کی تعمیر نو میں بھرپور تعاون
یتی اندرا گاندھی کی پرجوش قیادت میں ہریانہ نے ترقی کی کئی منزلیں طے کی ہیں ساتھ ہی مستحکم اور چوکس انتظامیہ نے امن و امان اور ترقی کے لئے ساز گار فضا بنائے رکھی ہے
ظم شری راجیو گاندھی کو حاصل عوامی انتخابی فتح ۲۱ ویں صدی میں ہماری قوم کے ایک عالمی رہنما کے طور پر ابھرنے کی غمازی کرتا ہے۔ ہریانہ اپنی ہمہ گیر ترقی کے نتیجہ کے
یں ترقی کی ایک مثال بن گیا ہے۔ امید واثق ہے کہ ہم ترقی کی راہ پر مسلسل گامزن رہیں گے۔

لاکھ ٹن اجناس کی پیداوار کی ہے جب کہ سنہ ۱۹۶۶ء میں یہ صرف ۲۶ لاکھ ٹن تھی۔
سنہ ۱۹۶۶ء میں ۱۳ لاکھ ۹۲ ہزار ہیکٹر کی نسبت اب بڑھ کر ۲۷ لاکھ ہیکٹر میں میسر ہو گئی ہے

● سبھی ہریجن بستیوں میں بجلی لگا دی گئی ہے اور ۶۰۴۴۳ ہریجن گھروں میں رعایتی شرح پر ایک پوائنٹ کے کنکشن دیئے جا چکے ہیں۔ ۱۰۰ گاؤں کی گلیوں کو بجلی کی روشنی سے منور کر دیا گیا ہے۔

● چھوٹے صنعتوں کی تعداد سنہ ۱۹۶۶ء میں ۴۵۰۰ کے مقابلے اب ۵۰۵۰۰ ہو گئی ہے۔ ۴۰۱۸۲ ادیبی اکائیوں میں ۵۴۳۴۷ افراد کام کرتے ہیں جن میں سے ۵۰ فی صد کا تعلق کمزور طبقوں سے ہے۔

ری سے اضافے سے سالانہ صنعتی برآمدات سنہ ۱۹۶۶ء کے ساڑھے چار کروڑ روپے
روڑ روپے تک ہو گئی ہے۔

سہولیات ۵ کلو میٹر کے دائرے میں دستیاب ہیں۔ اب طبی سہولیات پر فی کس
یہ خرچ کئے جاتے ہیں جب کہ سنہ ۱۹۶۶ء میں اس مد پر صرف ایک روپیہ ۳۳ پیسے
خرچ کئے جاتے تھے۔

● ہریانہ نے خاندانی منصوبہ بندی میں اعلیٰ کارکردگی کے لئے متواتر سنہ ۸۳-۱۹۸۲ء اور سنہ ۸۴-۱۹۸۳ء میں اعزازات حاصل کئے ہیں

● ۴۹۰۶ دقت والے گاؤں میں سے ۴۱۰۰ گاؤں کو صاف پینے کا پانی مہیا کرایا جا چکا ہے سنہ ۱۹۸۶ء تک پینے کے پانی کی کمی والے سبھی گاؤں کو یہ سہولت میسر کرا دی جائے گی۔

● ریاست میں پرائمری، مڈل، ہائر اور کالج درجہ تک کی تعلیمی سہولیات بالترتیب ایک کلو میٹر، ۲۰۳۷ کلو میٹر، ۲۰۹۵ کلو میٹر اور ۴۵،۱۰ کلو میٹر کے دائرے میں دستیاب ہیں۔

● ریاست میں چار لاکھ ۳۰ ہزار کنبوں کو غریبی کی سطح سے اوپر اٹھانے کے لئے اقتصادی مدد دی گئی ہے۔ اقتصادی طور پر کمزور طبقوں کے ۱۰۱،۴۱ افراد میں ایک لاکھ ۲۵ ہزار ایکڑ فاضل اراضی تقسیم کی جا چکی ہے تین لاکھ بے گھر لوگوں کو مفت رہائشی پلاٹ دیئے گئے ہیں۔

● سنہ ۱۹۶۶ء میں سڑکوں کی لمبائی ۵۱۰۰ کلو میٹر کے مقابلے اب ۲۰ ہزار کلو میٹر ہو گئی ہے۔

● ہریانہ روڈویز کی ۲۰۹۰ آرام دہ بسیں روزانہ ۶ لاکھ کلو میٹر کی مسافت طے کرتی ہیں جن میں ۱۱،۱۳ لاکھ مسافر سفر کرتے ہیں۔

● گزشتہ سال دس کروڑ شجر لگائے گئے تھے سال رواں میں اتنے ہی اور شجر لگانے کا عمل جاری ہے۔

میری سرکار امن و اخوت کے ماحول میں صاف ستھرے اور مستعد انتظامیہ کے ذریعہ ترقی کی رفتار میں برق رفتاری لانے کا عزم کرتی ہے۔ ہم اپنی روایتی قدروں کو برقرار رکھ کر ایک جدید دور کا آغاز کرنے کا عزم رکھتے ہیں ہماری منزل ہے درخشاں مستقبل۔ آیئے! آج ہم سب اس مبارک موقع پر وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کی جرأت مندانہ اور پرجوش قیادت میں دیش کی سالمیت اور یکجہتی کو قائم رکھنے کے لئے متحد ہو کر کام کرنے کا عزم کریں۔

بھجن لال وزیر اعلیٰ ہریانہ

HAYAT HASHMI

PINARA ABDULRAB
NISHTAR
DEIRA-DUBAI

MOHD. MOBIN
ZAKHMI
SURAT

اشاعتِ خصوصی جشنِ جمہوریت

ٹیلیفون نمبر ۲۵۶۔۔۔

رجسٹرڈ نمبر (DN) ۲۵۷ D

رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۵/۴۴۲۔۔۔

Accession Number. 86098
Date 21.12.87

قیمت سالانہ
چوبیس روپے
فی پرچہ
ڈھائی روپے
اس شمارے کی قیمت
تین روپے

ماہنامہ شانِ ہند نئی دلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

جلد نمبر ۲۶ | جنوری ۱۹۸۵ء | شمارہ نمبر ۱

نیا یومِ جمہوریت اور شانِ ہند

تھا کل بھی، مگر آج ہے رنگِ چمن اور
جمہور کی قدروں سے بڑھی شانِ وطن اور!

گلشن ہے یہ سینۂ وادی ہر چند کا گلشن
طوفاں سے نکھرتا ہے صداقت کا چلن اور!

کچھ بڑھ سی گئی عشق کی پاکیزہ نگاہی
کچھ آ ہی گیا حسن میں بے ساختہ پن اور!

دامن کا الجھنا بھی دل آویز ہے یارو
پھولوں کا چلن اور، نہ کانٹوں کا چلن اور!

پانی میں کبھی ایسی روانی تو نہیں تھی!
آزاد ہیں، دلشاد ہیں کچھ گنگ و جمن اور!

چمکی ہوئی سردی میں ہے چمکی ہوئی قسمت
پھولوں کی مہک اور ہے کلیوں کی پھبن اور!

ہر گوشۂ گلزار میں بارات سجے گی
پردے میں کہیں چھپ کے نہ بیٹھے گی دلہن اور!

گلشن کی فضاؤں کو قرار آگیا آخر
ہر روز نہ بدلے گا اب آئینۂ چمن اور!

فیاض بہ ہر گام ہیں میرے لئے کھلے
آئینۂ جاں بن گئے ذرات وطن اور!

پبلشر و پرنٹر سرور تونسوی نے لیتھو کے صفحات خواجہ پرنٹنگ پریس چتلی قبر، نزد جامع مسجد دہلی، اور بلاک کے صفحات پائلٹ پرنٹرس، دہلی میں چھپوا کر دفتر شانِ ہند، فلیٹ نمبر انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

اتحاد اور مضبوطی کے ساتھ

davp 84/272

بُلبُل چہ گُفت؟ گُل چہ شُنید؟ و صَبا چہ کرد

اُتر پردیش اُردو اکیڈمی ——— اونٹ رے اونٹ تیری کون کل سیدھی

ہندوستان میں اُردو اکیڈمیوں کی بسم اللہ اُتر پردیش اُردو اکیڈمی سے ہوئی تھی جو ۱۹۷۲ء میں قائم کی گئی۔ دوسری ریاستوں میں اُردو اکیڈمیاں بعد میں وجود میں آئیں اُن کے آئین، اور قواعد وضوابط اور طریقِ عمل بھی اُتر پردیش ہی کی اکیڈمی کے مرر یا عکس ہیں۔ بادی النظر میں یہ اکیڈمیاں اُردو زبان کی نشوونما، پرورش اور فروغ کے لیے معرضِ وجود میں آئی ہیں لیکن درحقیقت اُردو زبان ان کے متعلق بجا طور پر صرف یہی کہہ سکتی ہے کہ ع

کھلونا دے کے بہلائی گئی ہوں

اُتر پردیش اُردو اکیڈمی (اور اسی طرح سے مُلک بھر کی اُردو اکیڈمیاں) اپنی بنیادی تشکیل ہی سے ع

مری تعمیر میں مُضمر ہے اک صورت خرابی کی

کے مصداق ہیں نہ صرف پوری جنرل کونسل بلکہ اگزیکیوٹو کمیٹی تک ریاستی حکومت نامزد کرتی ہے۔ اور اس پر بھی بس نہیں پریذیڈنٹ، چیرمین اور وائس چیرمین بھی وہی نامزد کرتی ہے سیکریٹری بھی وہ اپنے سیکریٹریٹ سے بھیجتی ہے۔ اگزیکیوٹو کمیٹی میں علاوہ تر یونیورسٹیوں کے پروفیسر، ریڈر اور صدر شعبہ جات اور حکمران پارٹی کے حمایتی بھر دیے جاتے ہیں۔ ان جگہوں کی دست جو بیشتر سیاسی مصالح سے کی جاتی ہیں، یہ اکیڈمی ایک ادبی تنظیم کے بجائے سرکار کے دفاتر [illegible] کی ایک تفریح گاہ بن گئی ہے جہاں ماہر جنرل کونسل، مجلسِ انتظامیہ اور بے شمار سب کمیٹیوں کی میٹنگ میں شرکت کے لیے ممبروں کو آمد ورفت کے فرسٹ کلاس کے کرایے، بھتے کے علاوہ چائے، کافی، پان، سگرٹ اور دیگر تکلف پہنچتے ہیں اور کبھی کبھی تحائف بھی۔

اس ضمن میں یہ پُر لطف واقعہ بھی سن لیجیے کہ عرصہ ہوا اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کے ایک ذمہ دار رکن نے علی گڑھ سے لکھنؤ تک کے سفر خرچ میں گومتی ایکسپریس کا فرسٹ کلاس کرایہ درج فرمایا جب سفر خرچ کا یہ بل اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں گیا تو اکاؤنٹنٹ صاحب نے اس ذمہ دار رکن کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کے کان میں کہا کہ حضور گومتی ایکسپریس کا اسٹاپ علی گڑھ میں ہے ہی نہیں تو آپ نے گومتی ایکسپریس سے سفر کیسے کیا؟ (اُن دنوں گومتی علی گڑھ میں نہیں رکتی تھی) اور اس انکشاف پر ممبر مذکور نے دوسرا بل بنا کر پیش کیا۔

جنرل کونسل کا تازہ ترین اجلاس جو ۱۲ دسمبر ۱۹۸۴ء کو صرف آدھ گھنٹے کے لیے ہوا تھا اور جس میں صرف چند لاتعلق قرار دادیں ہی پاس ہو سکی تھیں، اس پر تیس (۳۰) ہزار روپے سے بھی زیادہ صرف ہوا۔ لنچ کے دوران ایک ممبر نے مرغ، مچھلی، اسکواش اور بریانی کھاتے ہوئے بڑے پُر لطف انداز میں فرمایا "اُردو کے مرنے کا تو افسوس ہے لیکن اس کے نام کا کھانا واقعی بڑا مزیدار ہوتا ہے" تمام تر حکومت کی نامزدگی ہوئی اس جماعت سے یہ توقع کرنا کہ وہ اُردو زبان کے جائز حقوق دلانے کے لیے حکومت سے کوئی مورچہ لے گی یا کسی قسم کی جدوجہد کرے گی کسی بے وقوف کا خواب ہی ہو سکتا ہے۔ اس کونسل [illegible] کے باوجود اگر کبھی کوئی باضمیر ممبر [illegible] اُردو سے متعلق قول و فعل میں کھُلے ہوئے تضاد سے متعلق کوئی بات کہہ اُٹھتا ہے تو اس کی بات کی نقار خانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ اہمیت نہیں [illegible]

سے زیادہ خریدار نہیں ہیں۔ جبکہ اکیڈمی ان دونوں رسالوں کی اشاعت پر کم سے کم ستر پچھتر ہزار روپیہ سالانہ خسارہ برداشت کرتی ہے۔ اس کے باوجود مجلسِ انتظامیہ کے پچھلے اجلاس میں مفتی صاحب نے یہ فرمائش کی تھی کہ ان رسالوں سے کام کے متعلق اکیڈمی کے ایک کارکن کو دو سو روپیہ ماہوار مزید الاؤنس اور بونس دیا جائے۔ جوش سمینار اور مشاعرے کے لیے منظور کیا گیا تھا پچیس ہزار لیکن اس پر خرچ کیا گیا پچاسی۸۵ ہزار کیا ایسی عدیم المثال بدعنوانی کے بعد سوائے اتر پردیش اردو اکیڈمی کے کسی دوسرے ادارے کا سربراہ منہ دکھلانے کے قابل رہ سکتا تھا؟

اکیڈمی میں پچیس۲۵ ہزار روپے ایک نئے کارکن نصرت حسین رضوی نے کرخوار ہو گئے۔ اُن کے ضامن اکیڈمی ہی کے دو ممبر صاحبان پروفیسر شبیہ الحسن اور ڈاکٹر نیر مسعود تھے۔ غبن کی تحقیقات کے سلسلے میں جو کمیٹی تشکیل دی گئی تھی اُس نے متفقہ فیصلہ دیا کہ مذکورہ کارکن کے ساتھ ہی غبن میں اکیڈمی کے سابق سکریٹری غلام حسین زیدی بھی ملوث ہیں۔ اکیڈمی نے ازراہ غربانوازی و اعزانوازی غبن شدہ روپے کی بازیابی کی کوئی عملی کوششیں نہیں کی۔ ضامنوں سے کسی قسم کی بازپرس مناسب نہیں سمجھی۔ بلکہ غلام حسین زیدی کی تنخواہ کی بقایا جو غبن کی تحقیقات کے سلسلے میں رُکی ہوئی تھی [illegible] چیرمین صاحب کی سفارش پر آنہ پائی سے بے باق کر دی گئی حالانکہ غبن کا [illegible] [illegible] ہوا چاہئے تھا اور [illegible] ضامنوں سے روپیہ وصول [illegible] چاہئے تھا بلکہ شبیہ الحسن صاحب ایسے [illegible] [illegible] دینے والے [illegible] چاہیے تھے کہ اپنے [illegible] کو ادا [illegible] مزید [illegible] عمل [illegible] ۔

[illegible] [illegible] نے [illegible] کے لیے ایک قاعدہ موسومہ آسان اردو لکھا تھا۔ اکیڈمی [illegible] کمیٹی نے ممبر کی رائے لینے کے بعد شروع اپریل [illegible] میں یہ فیصلہ کیا کہ [illegible] کے بجائے اکیڈمی خود [illegible] کرائے۔ اگست ۱۹۷۸ء میں جب [illegible] برسر اقتدار [illegible] چھپنے کے اُس ۴۸ صفحے کے قاعدے پر بے دریغ روپیہ [illegible] جانے اور تصویر سازی پر خرچ کیا جانے لگا حتیٰ کہ رفتہ رفتہ [illegible] ہزار روپے اکیڈمی کی تحویل سے نکل گئے۔ اس کے بعد اس کی طباعت کے لیے

مفتی صاحب بہ نفسِ نفیس خود دہلی جا کر وہاں آفسٹ پریسوں کے تخمینے ٹنڈر لائے جو ۲۵ ہزار اور ۲۴ ہزار روپے کے تھے اور لطف کی بات یہ ہے کہ جن پریسوں سے یہ ٹنڈر دیئے گئے اُن کے یہاں کوئی آفسٹ پرنٹنگ مشین ہے ہی نہیں۔ جبکہ دہلی میں کم و بیش دو ہزار آفسٹ پریس ہوں گے اور یہ ٹنڈر بذریعہ ڈاک یا اشتہار طلب کیے جا سکتے تھے جو یقیناً اس سے ایک چوتھائی رقم کے ہوتے جب یہ ٹنڈر [illegible] انتظامیہ کے سامنے پیش ہوئے اور ممبروں کو پہلی دفعہ یہ بتایا گیا کہ [illegible] ایک قاعدے کی صرف پانچ ہزار جلدوں پر ایک لاکھ روپیہ [illegible] ہوگا تو انھوں نے بڑا واویلا مچادیا اور محسوس کیا کہ اس قاعدے کو ٹٹی کی آڑ بنا کر اکیڈمی کے روپوں کا استحصال کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اخراجات کی جانچ پڑتال کے لیے ایک ہنگامی کمیٹی تشکیل کی گئی۔ بدقسمتی سے اکیڈمی کی روایت یہ ہے کہ ہر کمیٹی کا بھی چیرمین اکیڈمی کا چیرمین ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا اس سب کمیٹی کے بھی سربراہ مفتی صاحب تھے انھوں نے جب دیکھا کہ بعض مالی بے ضابطگیوں کے اعتراضات براہ راست اُن پر وارد ہو رہے ہیں مثلاً بلا کسی بجٹ کے ایک چھوٹے سے قاعدے کے متعلق کتابت اور طباعت پر اتنی کثیر رقم کیسے خرچ ہوگئی، لکھنؤ کے بجائے دہلی کے آفسٹ پریسوں سے کیوں رجوع کیا گیا اور وہ بھی سینکڑوں آفسٹ پریسوں میں سے صرف [illegible] ایسے پریسوں سے جن کے پاس آفسٹ پرنٹنگ مشین [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] نے [illegible] [illegible] نیا پیدا [illegible] ہنگامی سب کمیٹی سے [illegible] نے یہ تجویز منظور کرا لی کہ بصورتِ موجودہ قاعدہ چھپنے کے لائق ہی نہیں ہے مصنف نظرِ ثانی کر کے اسے پھر پیش کرے اور اُس وقت اُس کی اشاعت پر از سر نو غور کیا جائے گا۔

مجلسِ انتظامیہ میں اس تجویز کے پیش ہونے پر [illegible] ممبروں نے پوچھا کہ قاعدہ جب چھپنے کے لائق ہی نہ تھا تو اس پر اب تک اتنی کثیر رقم کیوں صرف کی گئی؟ یہ تو سابقہ غبن سے بھی کہیں زیادہ افسوسناک معاملہ ہے کیونکہ یہ نا گزیر نہ تھا اور بہت بڑی دیدہ دلیری سے آنکھوں میں دھول

چھوڑی جا رہی تھی۔

اکیڈمی کے اربابِ بست و کشاد اس حقیقت سے بے بہرہ تھیں کہ اردو زبان کی بقا کے لیے سب سے زیادہ ضروری امر یہ ہے کہ نئی نسل کو اردو کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس کے لیے کتابیں، رسالے، چارٹ وغیرہ شائع کرائے جائیں لیکن اس سلسلے میں اتر پردیش اردو اکاڈمی کی کارکردگی بالکل صفر ہے۔ جہاں زندہ شعراء کے غزلیات کے مجموعے اور مرحوم شعراء کے کلام کے انتخابات نیز نکات الشعراء، منتخب العروض، گلشنِ بے خار وغیرہ جیسی کتابیں شائع کی جا رہی ہیں وہاں یہ کوششیں بھی کی جانی چاہیئے کہ ایسی کتابوں کو پڑھنے والے بھی تیار کیے جائیں موجودہ نسل میں جو انگلیوں پر گنے جانے والے حضرات اور کتب سے مستفید ہو سکتے ہیں اُن کے بعد ان کتابوں کو کون پڑھے گا۔

بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اشاعتِ کتب کے ماتحت اکیڈمی کا روپیہ کافی حد تک خرد برد کیا جا رہا ہے جو کتاب کوئی ناشر پانچ ہزار روپے میں چھاپ سکتا ہے وہ اکیڈمی میں پندرہ ہزار روپیوں میں چھپتی ہے۔

قریب قریب یہی کیفیت لائبریریوں کی امداد کی ہے بعض ایسی لائبریریوں کو مالی امداد دی جاتی ہے جن کا کوئی وجود ہی نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو معشوق کی کمر کی طرح موہوم یعنی صرف کاغذی۔ ایک مرتبہ اکیڈمی کے کوئی رکن لائبریریوں کا جائزہ لینے کے واسطے دورے پر بھیجے گئے تھے۔ اُن کی رپورٹ سے پیشتر ہی اکیڈمی میں کئی جگہوں سے یہ شکایتیں پہنچیں کہ وہ صاحب لائبریریوں کے منتظمین سے اس دھمکی کے ساتھ رشوت طلب کر رہے تھے کہ مجھے کچھ دو ورنہ تمہاری لائبریری کی پول کھول دوں گا اور گرانٹ بند ہو جائے گی۔

میر سپاہ ناسزا لشکریاں شکستہ صف
آہ وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف

آج [illegible] کا دور دورہ ہے ... میں بھی ... ہو جائے گا۔ اتر پردیش کی تمام ریاست نے پریشان ہند ایسی منظم تحریک شروع کرے کا جس سے اتر پردیش کی حکومت مجبور ہو جائے گی کہ وہ اردو اکاڈمی اتر پردیش کی ان بے ضابطگیوں کے بارے میں کسی کمیٹی کے ذریعہ تحقیقات کرائے تاکہ اتر پردیش کے اردو دوستوں کو اصل صورتِ حال کا علم ہو سکے۔ کیونکہ اب کسی بھی ریاستی چیف منسٹر کو یہ جسارت کرنے کی ہمت نہ ہو سکے گی کہ وہ وزیرِ اعظم جناب راجیو گاندھی کے نقشِ قدم پر چلنے سے انکار کرتے ہوئے بھرشٹاچار کے خلاف عملی قدم نہ اٹھائے شانِ ہند کی آئندہ اشاعتوں میں نہ صرف اتر پردیش اردو اکاڈمی کے سلسلے میں مزید انکشافات کیے جائیں گے بلکہ دیگر ریاستوں کی اردو اکیڈمیوں کی کارگزاریوں سے بھی آپ کو روشناس کرایا جائے گا۔

سرِ مغفرت

ایک ہزار روپیہ انعام

شریمد بھگوت گیتا کا منظوم اردو ترجمہ جس کے متعلق دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں آج تک ایسا سلیس اور عام فہم منظوم ترجمہ شائع نہیں ہوا۔ اگر کوئی صاحب اس دعوے کو جھٹلا سکیں تو انہیں ایک ہزار روپیہ نقد انعام دیا جائے گا سرِ مغفرت کے شروع میں شریمد گیتا سے متعلق جو معلومات دی گئی ہیں آج تک کم سے کم اردو میں ان کا وجود نہیں تھا۔ مؤلف ابو الفصاحت پنڈت بلارام رتن پنڈوری نے گیتا سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے سرِ مغفرت میں جو واقفیت بہم پہنچائی ہے اس سے گیتا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ قیمت صرف بائیس روپیہ علاوہ محصول ڈاک

دفتر ماہنامہ شانِ ہند، [illegible] مارکیٹ
[illegible]

اردو اکادمی دہلی

ایک نظر میں

- ★ اردو کے مشہور ادیبوں، شاعروں، صحافیوں کو ادبی خدمات کے اعتراف میں پانچ پانچ ہزار روپے، اکادمی کے نشانِ امتیاز، شالیں اور اسناد ایوارڈ کے طور پر دی جاتی ہیں۔
- ★ اردو ناشرین کی حوصلہ افزائی کی خاطر اچھی مطبوعات پر دو دو ہزار روپے کے انعامات بھی دیے جاتے ہیں۔
- ★ سال میں ایک بہترین مطبوعات پر دہلی کے مصنفین کو دو دو ہزار روپے کے انعامات دیے جاتے ہیں۔
- ★ مستحق اور ضعیف اہلِ قلم حضرات کو پس مرگ ان کے وارثوں کو تین سو روپے ماہوار کی مالی امداد فراہم کی جاتی ہے۔
- ★ مستحق اہلِ قلم حضرات کی تحقیقات کی طباعت پر مالی امداد دی جاتی ہے۔
- ★ مشاہیر شعرا، ادبا اور اہلِ قلم حضرات کے اعزاز میں اور ایسے ہی مہمانوں کے لیے اعزازی تقاریب منعقد کی جاتی ہیں۔
- ★ اکادمی کی مرکزی لائبریری کے لیے اردو کی جدید اعلیٰ اور معیاری کتب کو خرید کر عوام الناس کے فائدے کے لیے محفوظ کیا جاتا ہے اور اداروں اور درسگاہوں کو ایسی کتابیں مفت دستیاب کرائی جاتی ہیں۔
- ★ دہلی کی تہذیبی، ثقافتی اور سماجی زندگی پر مذاکرات، سیمینار، نشستیں منعقد کی جاتی ہیں اور ان میں پیش کی جانے والی تقاریر، مقالوں اور رپورٹوں کو شائع کرایا جاتا ہے۔
- ★ اردو ادب کی مختلف اصناف میں مجلسوں اور نشستوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ پیش کیے جانے والے کلام اور رشحات کو شائع کیا جاتا ہے۔
- ★ اردو کی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے چھٹی، آٹھویں اور دسویں جماعتوں کے ہونہار اور امتیازی نمبر حاصل کرنے والے طلبا کو وظائف دیے جاتے ہیں۔
- ★ اردو اسکولوں میں طلبا کے تقریری، مضمون نویسی، خوش خطی، غزل اور نظم خوانی وغیرہ کے مقابلے منعقد کیے جاتے ہیں۔
- ★ اردو خوش نویسی کے فن کو فروغ دینے کے لیے اکادمی کی طرف سے اردو کتابت کا ایک دو سالہ کورس چلایا جا رہا ہے۔
- ★ بورڈ امتحانات میں اردو میں اوّل پوزیشن حاصل کرنے والے طلبا کو نقد رقم، سرٹیفکیٹ اور میڈل بطور انعام دیا جاتا ہے۔
- ★ زیرِ غور اداروں [illegible] کے لیے [illegible] کی تعلیم [illegible] کا [illegible] جاتا ہے۔
- ★ اردو زبان و ادب سے متعلق انجمنوں کو پروگرام کے انعقاد کے لیے مالی امداد دی جاتی ہے۔

اور اپنا طرحی سلام حسبِ معمول ترنم میں سُنا رہا ہے۔ شائقین
حضرات واہ واہ کے ذریعہ ان کے حوصلے بڑھا رہے ہیں۔ دو شعر آپ کی
نذر کر رہا ہوں ؎

ایذا ہائے بیت سے ثابت یہ ہو گیا
حق والے ہر مقام پہ ہوتے ہیں کامیاب
اے مقتلِ حسین تری زندگی دراز
برپا ہے تیرے دم سے زمانے میں انقلاب

اب بیرونی شاعر تنویر دہلوی کو ان کے مختصر سے تعارف
کے بعد آواز دی گئی۔ تنویر دہلوی پہلی بار کامٹی تشریف لائے
ہیں۔ اور لوگ سنبھل کر بیٹھ گئے ہیں۔ تنویر صاحب نے پہلے
ایک قطعہ سنایا۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

رسول اللہ کا دلبر اگر ضد پر اتر آتا
فلک کیا شے ہے عرشِ خالقِ اکبر بھی تھراتا
حسین ابن علی کا قتل بے اعجاز ممکن نہ
زمینِ کربلا پہ چشمۂ کوثر اتر آتا

واہ واہ کا شور و غل ہے کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہا ہے پورا پنڈال واہ واہ
اور سبحان اللہ کے نعروں سے گونج رہا ہے اور پھول نواز ترنم نے
قطعہ کو اور دلکش بنا دیا ہے۔ واہ کا شور کم ہوا تو تنویر صاحب اپنا طرحی کلام
سُنا رہے ہیں ؎

شبیر جیسے دین صداقت کا آفتاب
شبیر باغِ دیں کا مہکتا ہوا گلاب

سلسلہ ابتدا ہی سے عروج پر ہے۔ پنڈال سامعین سے بھرا پڑا ہے
بہت سے سامعین جگہ نہ ملنے کی وجہ سے باہر ہی سے کھڑے کھڑے
لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ تنویر دہلوی بہت کامیاب ہیں۔ ان کا
یہ شعر سننے والوں نے بہت پسند کیا ہے ؎

ظاہر کی تیرا اقربہ بالیقیں ترا نورِ صورت کیا لاجواب ہے سیرت کیا جواب

تنویر دہلوی کلام ختم کر کے نہایت کامیاب مائیک سے رخصت
ہو رہے ہیں۔ اب ناگپور کے عزیز منطق مائیک پہ آتے ہیں۔ گو کہ
کافی اثر نہیں چھوڑ رہے ہیں تاہم ان کا یہ شعر اچھا لگا ؎

تمام کوششیں ناکام تھیں لعینوں کی
حسین ابن علی کو مٹا سکا نہ کوئی

اب کامٹی کے نوجوان اور مترنم شاعر اشفاق انجم مائیک پر ہیں
اور اپنے کلام سے محظوظ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور کسی حد تک کامیاب
ہیں۔ ان کے دو شعر آپ بھی سنئے ؎

غمِ حسین میں پلکوں پہ آنسوؤں کے چراغ
ہم اہلِ درد کی صورت جلا سکا نہ کوئی
کچھ اپنے وقت کے معصوم بھی بنے لیکن
بس اک حسین ہی بن کر دکھا سکا نہ کوئی

اب ناگپور کے نوجوان شاعر حمید انصاری تشریف لا کر تحت میں
بڑی عمدگی سے اپنا کلام سنا رہے ہیں اور داد وصول کر رہے ہیں ؎

ستم کی دھوپ میں زینب کے ماسوا کوئی
ردائے صبر کے خیمے لگا سکا نہ کوئی
خدا کی راہ میں سر تو کٹے ہیں لیکن
مقامِ حضرتِ شبیر پا سکا نہ کوئی

اب مہمان لیکن جانے پہچانے شاعر حسن فتح پوری کو زحمت
دی جا رہی ہے حسن فتح پوری جواں سال شاعر ہیں اور بھوپال
میں مقیم ہیں۔ جتنے اچھے شاعر ہیں اتنے ہی اچھے انسان بھی ہیں
مائیک پر آ کر پہلے قطعات سے نواز رہے ہیں ؎

ہر فکر کی تشکیل کا بانی ہے حسین ہر دانشِ تخیل کی روانی ہے حسین
ہاں معرکۂ اولیٰ کو محمد کہیے ہے اسلام ترا معرکۂ ثانی ہے حسین

داد و تحسین کا شور کم ہوا تو دوسرا قطعہ عنایت کر رہے ہیں ؎

اسلام کی عظمت کا نشاں خونِ حسین
قرآن کی خاموش زباں خونِ حسین
دنیا نہ مٹا پائے گی تا حشر اسے
ہے دین کی رگ رگ میں رواں خونِ حسین

داد و تحسین کا سلسلہ جاری ہے اور حسن فتح پوری بڑے احترام
ادب کے ساتھ وصول کر رہے ہیں۔ حسن فتح پوری کا
بڑا پیارا ہے۔ سامعین نے حوصلہ بڑھایا تو ایک اور قطعہ
پیش ہے ؎

کربلا تو کسی بیوہ کی کہانی مانگے
اس کا بچپن تو کبھی اس کی
ہاں مگر ایک نئی بات جھلک کر رات

ایسا دیا ہے جو عباس سے پانی مانگے

فدایانِ حسین بھی شاعر کی حوصلہ افزائی فرما رہے ہیں۔
قطعہ کو دہرانے کے بعد حسن فتح پوری اپنے مخصوص انداز میں
بلا طرحی کلام سنا رہے ہیں ے

اوصاف کیا بیان کروں آپ کے جناب
بحرِ گراں ہیں آپ تو میں ہوں فقط حباب

حسن مطلع میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ مصرعۂ طرح کو ضم
کیا گیا ہے۔ آپ بھی دیکھئے ے

ہوں سینکڑوں یزید ہزاروں میں انقلاب
"روشن رہے گا عزمِ حسینی کا آفتاب"

ایک تو کلام کی پاکیزگی اور سونے پہ سہاگا پڑھنے کا خوبصورت
انداز۔ گویا ہر طرح سے حسن فتح پوری کامیاب ہیں۔ آگے فرماتے
ہیں ے

یہ جیت تو یزید کے مقصد کی ہار ہے
شبیر اپنے سر کو کٹا کر ہیں کامیاب
اکبر حبیب قاسم و عباس شیر خوار
اک کربلا کے واسطے کیا کیا ہیں انتخاب
ذلت کی زیست سے بھلی عزت کی موت ہے
کربل کی سر زمیں سے اٹھا پہلا انقلاب

حسن فتح پوری اپنا کلام ختم کر کے نہایت کامیاب لوٹ
رہے ہیں۔ اور مسلسل نہایت کامیابی کے ساتھ اپنی منزل کی
جانب بڑھ رہا ہے۔ اب ایک اور مہمان شاعر ناشر حیدری رائے
پوری کو زحمت دی جا رہی ہے۔ ناشر حیدری مجمع کو زیادہ متاثر
کیا ہے۔ ان کے دو شعر آپ بھی دیکھئے ے

نبی کی بولتی تصویر صرف اکبر تھے
پھر ایسی شان کا جلوہ دکھا سکا نہ کوئی
طرف تمہارا انتہائے علی اصغر
کہ گاہوارے سے مقتل تک آ سکا نہ کوئی

محفلوں کی محفلیں ہوں یا مسالموں کی مجلسیں سامعین
بالخصوص برابر ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی فرمائشیں باقاعدہ
کی جاتی ہیں تو کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی پرچیوں کے

دے دیئے۔ یہاں آوازیں تو نہیں لگائی گئیں مگر کچھ پرچیاں میرے پاس
ضرور آئی ہیں۔ پرچیوں میں زیادہ تر بیرونی شعرائے کرام کو سننے
کی فرمائشیں درج ہیں لیکن چونکہ ابھی کچھ کامٹی اور ناگپور کے
شعرائے کرام باقی ہیں اور انہیں موقع محل دیکھ کر بلایا جا رہا ہے
اس لئے فرمائشوں پر زیادہ دھیان دینا ضروری نہ تھا۔ مقامی
شعرائے کرام میں خلش قادری کا نام نہایت نمایاں ہے میں
انہیں زحمت دے رہا ہوں۔ خلش قادری علاقۂ ودربھ کے
معتبر شاعر ہیں مگر کچھ دنوں سے اپنی ناسازیٔ طبیعت کے باعث
مشاعروں اور مسالموں سے دور ہو گئے ہیں۔ خلش قادری
ترنم میں پڑھیں چاہے تحت میں سامعین ان کے کلام کو پسند
فرماتے ہیں۔ آج اپنا کلام تحت میں سنا رہے ہیں اور داد
وصول کر رہے ہیں۔ چند شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ کیا
خوب کہتے ہیں ے

پوچھو جو صبح و شامِ غریباں کا ہے حساب
شمس و قمر کے چہرے پہ پڑ جائیں گے نقاب
موجیں سمٹ کے سینۂ ساحل میں رہ گئیں
دیکھا گیا نہ تشنہ دہانوں کا اضطراب
دامانِ قتل گاہ میں چھینٹیں لہو کی ہیں
یا منتشر ہے ریت پہ اللہ کی کتاب

خلش قادری کامیاب ہو کر مائیک سے لوٹ رہے ہیں اور
اب ایک اور مہمان شاعر ضیاء القمر رائے پوری مائیک پہ تشریف
فرما ہیں۔ ترنم میں اپنا کلام سنا رہے ہیں۔ دو شعر آپ کی نذر ہیں

شجاعت اور اطاعت کا نام ہے عباس
یہ وہ لقب ہے جس کو نبھا سکا نہ کوئی
رسولِ پاک کی عظمت تو دور کی شے ہے
حسین ہی کے مقابل میں آ سکا نہ کوئی

قمر رائے پوری نے کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑا ہے۔ اب
ناگپور کے رمضان طالب کو دعوت دی جا رہی ہے۔ طالب
صاحب تحت میں کلام سنا رہے ہیں اور کامیاب ہیں۔ دو شعر
پسند کئے گئے یہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ے

قدرت کی ادا میں سب کچھ لٹا کے بھی خوش ہیں

اک ادھر ہی میں سب کچھ لٹا سکا نہ کوئی

لعل کے پیاسوں نے پانی پلا دیا سب کو
نبی کے پیاروں کو پانی پلا سکا نہ کوئی

اب نہایت ادب و احترام کے ساتھ حضرت پیام اعظمی
کو زحمت دی جا رہی ہے جو اعظم گڑھ سے تشریف لائے ہیں۔
حضرت پیام اعظمی محتاج تعارف نہیں۔ مسدس پہ قدرت
رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے علماء آپ کے ارشادات کو سند آ
پیش کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ حضرت پیام اعظمی کی کیا
توصیف کی جا سکتی ہے کہ اہل علم و فضل انہیں "انیس عصر"
کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ حضرت پیام اعظمی مائیک پر آ کر
ماحول کا جائزہ لے رہے ہیں۔ سامعین میں ہلچل سی مچی ہوئی
ہے۔ حضرت پیام اعظمی طرحی سلام سے پہلے چند قطعات سنا کر
محظوظ فرما رہے ہیں۔ ایک قطعہ خاص طور سے بہت پسند کیا گیا
جو آپ کی ضیافت طبع کے لئے حاضر ہے ۔۔

مالک نمازِ علوی کی خاطر
خورشید سر شام پلٹ آیا تھا
لیکن تیرے اک سجدے کی خاطر کشش
جاتا ہوا اسلام پلٹ آیا تھا

حضرت پیام اعظمی سے سامعین بڑے متاثر ہو رہے ہیں۔
واہ واہ و تحسین کی صداؤں سے پنڈال گونج رہا ہے۔ طرحی کلام
کے چند شعر بھی ملاحظہ فرمائیں۔ واہ کیا انداز بیان ہے ۔۔

عمل کی اتنی بلندی پہ جا سکا نہ کوئی
نبی کے دوش سے کاندھا ملا سکا نہ کوئی
جواب اصغر بے شیر لا سکا نہ کوئی
گلے پہ تیر سے تو مسکرا سکا نہ کوئی
[illegible] میں لے گئے تھے نیزے پر
کہ کاٹ کر بھی یہ تیرا سر جھکا سکا نہ کوئی

حضرت پیام اعظمی بہت کامیاب رہے۔ کچھ شعر تو ان
سے بار بار پڑھائے گئے۔ اور اب کامٹی کے جواں فکر شاعر ڈاکٹر
یونس افسر کو زحمت سخن دی جا رہی ہے۔ یونس افسر
عنایت کامٹی اچھے اور جانے پہچانے شاعر ہیں۔ جس کا قول

عمت میں اپنا طرحی کلام سنا رہے ہیں ۔۔
صداقت حق تھی کہ جس کو دبا سکا نہ کوئی
حسینیت کو جہاں سے مٹا سکا نہ کوئی
یہ اور بات کہ سب جنگ پہ تھے آمادہ
نگاہ سبطِ نبی سے ملا سکا نہ کوئی
رہ فرات پہ پہرہ تو سخت ہے لیکن
رخِ حسین پہ پہرہ لگا سکا نہ کوئی
چراغ شام تو کتنے ہی بجھ گئے جل کر
چراغ سبطِ نبی کو بجھا سکا نہ کوئی

یونس افسر بہت کامیاب ہیں۔ سامعین انہیں برابر داد دئے
چلے جا رہے ہیں۔ اور جب وہ اس شعر پہ پہنچے ۔۔

حسین جب بھی لکھو تو حسین لگتا ہے
تمہارے نام کی خوبی کو پا سکا نہ کوئی

تو پورا مجمع "واہ واہ" اور "سبحان اللہ" کے شور میں ڈوب گیا۔ کئی بار
اس شعر کو یونس صاحب سے پڑھوایا گیا۔ ڈاکٹر یونس افسر
کے بعد ناگپور کے پروفیسر یونس صاحب کو زحمت دی گئی۔
پروفیسر یونس گزشتہ چند سالوں سے بلا ناغہ اس مسالمہ میں
شرکت فرما رہے ہیں۔ بڑے مخلص اور قدر شناس آدمی ہیں
شاعری میں جدید و قدیم روایت کے حامل و قائل ہیں۔ فکر میں
شگفتگی اور اسلوب بیان میں دلکشی ہے۔ مگر افسوس کہ
میں ان کے طرحی کلام کے منتخب اشعار نوٹ نہیں کر سکا
تاہم طرحی کلام سے پہلے انھوں نے چند شعر سنائے تھے جن
میں سے یہ شعر آپ کی خدمت میں پیش ہے ۔۔

قریب جاؤ تو سانسوں کی آنچ آتی ہے
درونِ دشت نہ جانے مزار کس کا ہے!

مشاعروں کی دنیا میں آج چند نام بڑے معتبر ہیں۔ جو
صرف مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت تصور کئے جاتے ہیں
مشاعروں کی عزت سمجھے جاتے ہیں۔ انہیں میں سے ایک
نام جوگا سنگھ انور کا بھی ہے۔ جوگا سنگھ انور گزشتہ
بھی مسالمہ میں تشریف لائے تھے اور بڑی کامیابی حاصل
جب بھی ان کا نام زبان پر آتا ہے تو ان کا یہ شعر بھی یاد آ

رہے ہیں ۔ لوگ بڑے ذوق و شوق سے انہیں سن رہے ہیں ۔ مرحلہ خوب داد سے نوازے رہے ہیں ۔ آن کے کلام سے میں خود اتنا محظوظ ہو رہا تھا کہ کوئی شعر نوٹ نہیں کر سکا یہ سوچ کر کہ مسالمہ کے اختتام پر آن کا کلام حاصل کر لوں گا مگر یہ بھی ممکن نہ ہو سکا ۔ بہر حال : آن کا یہ شعر یاد رہ گیا ہے

اسمِ حسین کو شہرِ فردوس آگیا ،
اسمِ حسین پیاس کا پیمانہ شباب

اس طرح مسالمہ کا یہ پہلا دور ختم ہوا ۔ سامعین کے پُر زور اصرار پر مسالمہ کا غیر طرحی دور شروع کیا گیا ۔ جس میں صرف بیرونی شعرائے کرام کو موقع دیا گیا ۔ دوسرا دور بھی خوب کامیاب رہا ۔ اس طرح یہ طرحی مسالمہ رات کے تین بجے ختم ہوا اور بہت کامیاب رہا ۔ مسالمہ کی کامیابی کے لئے محترم قبلہ خاطر حکیمی ، صوفی حبیب الرحمن ، صوفی حفیظ الرحمن ، صوفی غلام رسول اور صوفی غلام رحمان مبارکباد کے بہت بہت مستحق ہیں جن کی انتھک کوششوں اور دوڑ دھوپ سے کامیابی کا یہ مسالمہ یادگار ثابت ہوا ۔

آئینۂ حقیقت

(تضمین بر اشعار اقبال رح)

بھول کر اپنی حقیقت ، صید لاچاری ہے تو
سروری ہے تیرا ورثہ ، اہلِ سرداری ہے تو
تو نہیں بے مایہ قطرہ ، قلزمِ جاری ہے تو
"کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے"

خامی تدبیر تھی یہ ، تھی نہ قسمت کی خطا
بحر در آغوش ہو کے ، بھی تو تشنہ لب رہا
موسمِ گل آیا ، گلشن تو لٹا کر چل دیا
تو ہی ناداں ، چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

محمدین لعل محمد دھر
بھی والہ منڈی (ضلع فرید کوٹ)
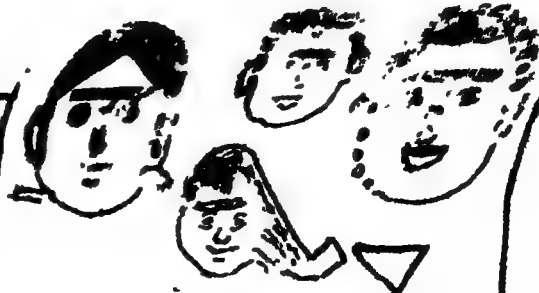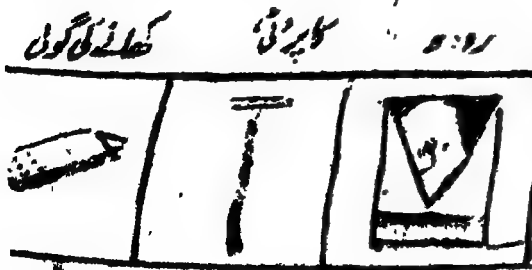
جشنِ جمہوریت کے مبارک موقع پر
ہر ہندوستانی کے لئے دل کی
گہرائیوں سے
نیک خواہشات
ہوٹل راج دوت
نئی دہلی

مشاعرہ نمائش مظفرنگر

(ایس ان حسانی حسن پور لوہاری)

مظفرنگر کی نمائش میں ہر سال ایک مشاعرہ بھی ہوتا ہے
اس مشاعرہ کا انتظار بڑی شدت سے کیا جاتا ہے۔ اس کا
اعتراف شعرائے کرام بھی کرتے ہیں کہ ہم پورے سال مشاعرے
پڑھتے ہیں لیکن یہ مشاعرہ سب سے نرالا اور اچھوتا ہوتا ہے
یہاں کے سامعین پوری رات فرش پر بیٹھ کر مشاعرہ سنتے ہیں
مشاعرہ کمیٹی کے ممبران بھی بڑی دلچسپی اور سرگرمی سے حصہ لیتے
ہیں۔ وہ اچھے سے اچھے شعراء کو یہاں بلانے کی کوشش کرتے
ہیں۔ ان کی طرف سے کسی قسم کی کوئی کمی نہیں رہتی اب رہے
مشاعرہ کی کامیابی یہ عوام کے مذاق پر منحصر ہے۔ یہاں کے ذرہ ذرہ
کا کہنا ہے کہ سامعین تک سبھی سخن فہم اور ادب نواز ہیں۔

اب میں آپ کو نمائش کے اس پنڈال میں لئے چلتا ہوں
جہاں کوئی سمیلن اور ہر سال یہ مشاعرہ و دیگر تقریبات ہوتی ہیں

پنڈال کے دروازہ پر بے پناہ ہجوم ہے آج دروازہ سے اندر جانا
کار دارد۔ والا دو ہاتھ لنگر آتا ہے تو ایک چھڑیئے آیئے! اس گیٹ سے
چلئے آپ کو اسٹیج تک لے جائے گا۔ تو یہاں بھی پاس کی ضرورت
ہے لیکن شعراء کے ہمراہ نکل چلئے۔!

اب اسٹیج سے صرف ایک نظر سامنے ڈالئے پنڈال میں
سروں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے کہیں بھی تل دھرنے کو جگہ
نہیں ہے ادھر گیٹ پر وہی شور و غل ہے اگر یہ مزید حضرات اندر
آتے ہیں تو کہاں اور کیسے سمائیں گے۔ یہ سوال پریشان کن ہے
دس بج کر ۴۵ منٹ ہو چکے ہیں جو حضرات
مشاعرہ کو سننے کے لئے گھنٹوں پہلے سے جمے بیٹھے ہیں وہ اب
تالیوں پر اتر آئے ہیں اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ بس
اب حد ہو چکی مشاعرہ شروع کرایا جائے۔ لیجئے انتظار کی گھڑیاں
ختم اور صدارت کے لئے ضلع کے ہر دل [illegible] اور مشہور رہبر
جناب سید مرتضےٰ صاحب کا اسم گرامی پیش کیا جا رہا ہے۔

اور ساتھ ہی ڈی۔ ایم صاحب مظفرنگر سے بھی اسٹیج پر ہی
تشریف لانے کی درخواست کی جا رہی ہے۔ ڈی۔ ایم صاحب
آ رہے ہیں اور تالیوں سے صدر صاحب اور ڈی۔ ایم صاحب کا
خیر مقدم ہو رہا ہے ادھر وسیم بریلوی نے مائیک سنبھال کر مظفرنگر
کے ایک مترنم شاعر راغب عالم کو یاد کیا ہے عالم آ گئے ہیں لیکن گیٹ
پر ایک شور و غل ہے ہر کوئی اندر آنے کے لئے زور آزمائی کر رہا ہے
پولیس نے یہ ہنگامہ فرو کرا دیا ہے اور عالم صاحب یوں نغمگی کا مظاہرہ
کر رہے ہیں ۔۔۔

وہ خدا کو بھی شرمندۂ احسان کیا ہے
اک محبت نے ہمیں آج مسلمان کیا ہے

سیدھے دو دیتے وقت کے کچھ تھوڑا رہے ہیں اور عالم صاحب لہک
رہے ہیں ۔۔

معصوم سے چہرے پہ یہ مخمور سی آنکھیں
کیا کیا نہ مرے قتل کا سامان کیا ہے

چہرہ وار کا ایک دھماکہ ہوا ہے اور آپ کو سنا بھی جا رہا
کیوں مائیک سے کھسک آئے ہیں۔ پھر وسیم صاحب
دوسرے مشہور شاعر سلیم گنگوہی کو دعوتِ غزل دے رہے
اس اعلان پر سنسنا کر رہ گئے ہیں اور آتے ہی ایک خوبصورت
غزل بے دلی سے شروع کی ہے ۔۔

ہزار پردوں میں حسنِ فطرت چھپا ہے لیکن چھپا نہیں
نگاہ سے ماورا ہیں وہ تصور سے ماورا نہیں ہیں

ہماری آہ و فغاں نے آتشِ جگر پہ ہی بھی غزل ترانہ ما
ہم اپنی قسمت کو رو رہے ہیں کسی سے شکوہ گلا نہیں

سلیم صاحب کا موڈ خراب ہے لہٰذا وہ مائیک سے
ساتھ جدا ہو رہے ہیں اور اب اسی جمود کو توڑنے
کے نوعمر شاعر عبدالحق سحر آ رہے ہیں غزل سرا

بھنور میں زندگی کے اتارے گئے ہیں ہم
کتنے حسیں فریب سے مارے گئے ہیں ہم
ہر حادثہ چمن کا ہمیں پہ ہوا تمام
شامت کسی کی آئی تو مارے گئے ہیں ہم
پہلے تو غم دئے ہمیں پھر دیں تسلیاں
یعنی ڈبو ڈبو کے ابھارے گئے ہیں ہم

صاحب سحاری کرکے داد لیتے اپنی جگہ آ رہے ہیں دیکھا
یک تو عمر لطافت کو چھوتی ہوئی پیکرِ غزل حنا تیموری اگر
ں اپنے فنِ موسیقی کا مظاہرہ کر رہی ہیں ؎

ہے مرا عشق بھی بہتے ہوئے دریا کی طرح
چند لمحوں میں سمندر سے ملا جاتا ہے
میرے ہونٹوں پہ مچلتے ہوئے لفظوں کی قسم
بات کرتی ہوں تو افسانہ ہوا جاتا ہے

دینے والے زیادہ اچھل کود کر رہے ہیں حالانکہ سمجھ میں کچھ نہیں
ہے اگر اختر آوا یاری میرے قریب بیٹھے ہوئے نہ ہوتے تو
یں ایک مصرع بھی نہ سمجھ پاتا (حنا صاحبہ ہی) بالکل ہی سے
کو لوٹنے کی ٹھان رہی ہیں ؎

ان اندھیروں کو اجالوں کی ضرورت ہی نہیں
یہ دیا کون یہاں روز جلایا جاتا ہے

تالیوں پہ اتر آئے ہیں اور اسی عالم میں آپ
مائک سے جدا ہو رہی ہیں اور دیوبند کے
نواز آکر غزل سرا ہیں ؎

مری حسرتیں نہ لوٹ بے پناہ ہو گئے
راہ میں نہ قافلے تباہ ہو گئے
سفید ہو گیا نہ سب کے دل سیاہ ہو گئے

داد و تحسین کے ڈھول کے پلٹ رہے ہیں ادھر
علاوہ کو غباب پڑے جانے کے لئے

ہے قفس تو میں توڑ دوں لیکن
ہے کہ چمن میں بہار ہے کہ نہیں
ہنگامہ کا گماں ہو رہا ہے کتنی بار [illegible]

ہوا ہے ؎

یہ قتل و خون۔ یہ غارت گری۔ یہ ظلم و ستم
میں سوچتا ہوں کہ پروردگار ہے کہ نہیں

پھر داد کا عالم نہ پوچھئے اور آپ اسی رنج و غم سے محفل کو چھوڑ رہے
ہیں ؎

جب رگ دل میں غم دوست سما جاتا ہے
تب کہیں جاکے دعاؤں میں اثر ہوتا ہے
تم نہیں وہ بھی نہیں وہ بھی نہیں وہ بھی نہیں
کون ہے جو غریبوں پہ ستم ڈھاتا ہے

اب داد دینے والے بھی بے حال سے ہو چلے ہیں اور آنجناب محفل میں
محفل کو گرما رہے ہیں ؎

دھوپ ہی ٹھیک ہے اس چھاؤں سے جو گم کر دے
کم سے کم دھوپ میں سایہ تو نظر آتا ہے

لیجئے اب تالیاں بھی جاگ اٹھی ہیں ایک اور ایک اور کے شور
میں غزل سرا ہیں ؎

خود اپنے آپ سے چھپنے کی آرزو کی ہے
تمہاری یاد سے جب جب بھی گفتگو کی ہے
کلی کلی ہے پریشاں پھول پھول اداس
یہ کس ذلیل نے توہینِ رنگ و بو کی ہے
فقیہ شہر سے کچھ کم نہیں ہیں ہم اختر
کہ ہم نے بادہ پرستی بھی باوضو کی ہے

پھر داد نے ہنگامہ کا روپ دھار لیا ہے اور تالیوں کے بے ہنگم شور میں
کامران بلاشہ رہے ہیں اصحاب تھا ندر کی الاپ رہے ہیں ؎

بے زباں طور کی نور کی بات ہے
نور کا ذکر ہے طور کی بات ہے
میرے آنگن میں جگنو بھی آتے نہیں
چاندنی رات تو دور کی بات ہے
کہئے کم ایک دیا ہی جلا دیجئے
بات کہنے کو یہ دور کی بات ہے

صاحب اس شعلہ [illegible]
یہاں سن لیا جاتا ہے یہ الگ بات [illegible]

…علی لسانی کر ہنگے اور زور آزمائی کر کے چلتے بنے وہ دیکھئے غزالاں
…راناں نعیم غزل انیتا نکہت بہری سندری سفید بلاؤز والی ٹی بیسٹن
…ے مائیک پہ آکے بچے ترنم یعنی سمجھ میں نہ آنے والے ترنم سے غزل
…یز رہی ہیں ؎

پہلے دیدار کا مشتاق بنا دیتے ہیں
پھر نگاہوں کو ترسنا بھی سکھا دیتے ہیں
دل کے زخموں پہ چھڑکتے ہیں نمک تغافل کا
پاس رہ کر بھی جدائی کی سزا دیتے ہیں
شام ڈھلتے ہی جلا دیتے ہیں دل کی شمعیں
پھر اسی شمع کو اشکوں سے بجھا دیتے ہیں

شمس احمد کی صحت کا عالم وہ مدراس ہی کیوں نہ ہو اس پُرجوش
گونج اور حسین غزل پر نکہت صاحبہ کو ہر شعر پر داد کیسے نہ دی جاتی
ایسے چھوڑ دیتے کہ ہر شعر کے سمجھنے میں ایک پوری قوت سماعت برباد کرنا پڑی
جب جا کے کوئی شعر سمجھ میں آیا ہو گا بس ترنم کو کس نام سے پکارا
جائے گا۔ آئیے پھر ایک شگفتہ غزل حق کانپوری سے سنئے گا ؎

کہاں میرے مقدر پہ آپ ہاتھ ملتے ہیں
کچھ چراغ ایسے ہیں بجھتے ہیں نہ جلتے ہیں
اشک میری آنکھوں میں بے سبب چھلکتے ہیں
یہ عجب مسافر ہیں رکتے ہیں نہ چلتے ہیں
جانے کیسے بے پردہ گھر سے وہ نکلتے ہیں
ہاتھ ملنے والے تو اب بھی ہاتھ ملتے ہیں

پنڈال بھی انگڑائیاں سی لے رہا ہے اور حق صاحب حق گوئی ادا
کر رہے ہیں ؎

اب تو دل کے گوشوں سے یوں دھواں سا اٹھتا ہے
جیسے بند کمرے میں خط کسی کے جلتے ہیں

پھر نوجوان تالیوں پر اتر آئے ہیں اور حق صاحب محفل کو
گرما کر تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں جا رہے ہیں۔ اب اس رنگ
کو بدلنے کے لئے ناظم انصاری ناگپوری اگر یوں بحث میں
اضافہ کر رہے ہیں ؎

میں بجلیوں میں ترے باپ کو بٹھا لوں گا
میرے دماغ میں ایسا ابال باقی ہے

تمہیں تو یاد نہ ہو گا کہ مارا تھا پتھر
ہمارے ماتھے پہ اب تک نشان باقی ہے
ابھی سے کیا اجڑتے ہو کس لیے ناظم
ابھی تو آپ کا آدھا مکان باقی ہے

پنڈال میں ایک فلک شگاف اور ہوٹ بازی ہے لیجئے اب ترنم سے
واثق آ رہے ہیں ؎

مقام عشق ہے میں اب غلط گیا تو نہیں
ہنسیوں کی طرح سب کو گھورتا تو نہیں
نظر جھکائے جو بیٹھا ہے مہ جبینوں میں
کہیں وہ مولوی صاحب کا چھوکرا تو نہیں
تمہارے گھر کے سبھی لوگ مجھ پہ مرتے ہیں
مجھے فقیر بنانے کی سوچنا تو نہیں

پنڈال میں پھر ایک ہنگامہ سا چھا گیا اور شور و غل ہے اور
آپ فرما رہے ہیں ؎

ابھی سے چوڑیاں توڑو نہ منے کی اماں
میں کر رہا ہوں ریہرسل ابھی مرا تو نہیں

پھر سے تالیاں جاگ اٹھی ہیں ایک اور ایک اور کے شور
ناظم صاحب فاتح محفل بنے ہوا لوٹ رہے ہیں دیکھا تو
مظفر رزمی یوں بانکپن سے غزل سرا ہیں ؎

ہر ایک شخص تری چاہ کے گمان میں تھا
نہ جانے کون سا جادو تری زبان میں تھا
سوال تجھ سے ہے اے بادلو جواب تو دو
کہاں گیا وہ پرندہ جو آسمان میں تھا
بلند و پست ہماری نظر میں کچھ بھی نہیں
زمین پہ بھی وہی ہے جو آسمان میں تھا

رزمی صاحب بھی داد و تحسین لے کر اپنی جگہ آ رہے ہیں۔
افتخار امام آگرہ عطا کر رہے ہیں ؎

پہرے کہ تمام شہر پناہوں کے ساتھ ہیں
جیتے بھی تو اک زندگی سیاہ کے ساتھ ہیں

دوسرے مصرع پہ داد کا عالم نہ پوچھئے کئی بار دہرا
ہو رہا ہے ؎

منزل کی دھوپ بن کے سمٹنے لگے ہو تم
ہم گردِ راہ ہو کے بھی راہوں کے ساتھ ہیں
نیکی ہمیں قبول مگر ہو سکیں نہیں
وہ ساری لذتیں جو گناہوں کے ساتھ ہیں
واقف ہیں اپنے عشق کے ہر فیصلے سے ہم
قاتل ہمارے خود ہی گواہوں کے ساتھ ہیں

اب داد پر ہنگامہ کا گماں ہو رہا ہے افتخار امام صاحب یہاں کے لئے نئے شاعر ہیں اس لئے سامعین ان کے مزاج کو سمجھ نہ پائے کچھ انہوں نے بھی غلطی کی کہ کبھی تحت سے پڑھتے ہیں کبھی ترنم سے۔ اس طرح یار لوگ بھی مذاق کے موڈ میں ہیں، امام صاحب کو وہ داد نہ دی گئی جو ان کو ہر مشاعرہ میں ملتا رہا ہے۔ آیئے اب اس مشاعرے کے ہیرو راحت اندوری سے یہ لاجواب اشعار سنیئے ؏

سانحہ تو کسی دن گذرنے والا تھا
میں بچ بھی جاتا تو اک روز مرنے والا تھا
مرا نصیب مرے ہاتھ کٹ گئے ورنہ
میں تیری مانگ میں سیندور بھرنے والا تھا

اک شور غل تو ارکم ہوا تو گرج رہے ہیں ؏

روایتوں کی صفیں توڑ کر بڑھو ورنہ
جو ہم سے آگے ہیں وہ راستہ نہیں دیں گے
شراب پی کے بڑے تجربے ہوئے ہیں ہمیں
شریف لوگوں کو ہم مشورہ نہیں دیں گے

صاحب محفل کو گرما کر اور رنگ جما کر مائیک سے جدا ہوئے اور ہلال سیوہاروی فرما رہے ہیں ؏

کوئی سمجھا ہی نہیں اس خوبصورت طنز کو
کتنا کو تو ایگزر، شرما کا بیاں اچھا لگا
ان سے جب پوچھا گیا کیسا لگا ہندوستاں؟
کہا۔ دور سے ہندوستاں اچھا لگا

اب ہلال صاحب ایک مولانا سے مخاطب ہیں ارشاد ہے ؏

بیروت کی قبروں نے تری جس کو جتایا
اللہ رکھے جذبۂ اسلام چلا جا
لیکن یہ منظر تو وطن میں بھی بہت ہیں
بیروت بہت دور ہے آسام چلا جا

اسی غل غپاڑہ میں ہلال صاحب چلتے بنے آج فرمائشوں کو بھی نظر انداز کر گئے آیئے جناب وسیم بریلوی سے بھی ایک غزل سن لیجئے ؏

بے حسی کا موسم سارا منظر پیاسا پیاسا تھا
تم نے ہی آواز نہ دی تو، تو اک سناٹا تھا
ہم وہ نفس اک پیاس کے مارے خالی خالی بیٹھے تھے
اور ہماری رگ رگ میں اک پاگل دریا بہتا تھا
وہ تو کچے بیروں کی اک ٹھیری لے کے نکلی تھی
اس کو کیا معلوم کہ بازار میں کیا کیا بکتا تھا

وسیم صاحب ایک گیت اور سنا کر مائیک سے جدا ہو رہے ہیں اور نیر رضوی نے اس طرح نمبر لئے اور عجیب ترنم سے غزل چھیڑی ہے کہ جس پر کچھ تالیاں بجنے لگی ہیں ؏

وہ دور بھی تھا اپنا جب شوق ہمیں بھی تھا
غالب کی کتابوں پر رکی کا پتا لکھنا
غالب کے غلاموں میں تہذیب نہیں باقی
آداب بڑوں کو چھوٹوں کو دعا لکھنا

پھر آپ نے ایک گیت شروع کیا ہے یا، لوگوں اور من چلوں نے پسند نہیں کیا آپ چپ چاپ مائیک سے کھسک آتے ہیں اور آتی سی اننت لے یہ مشاعرہ کمیٹی کی نذر ـــــ؟ بھی بیداری ہوئی لو یا یہ گم ضائع اور بربادی کر دی اچھی آیئے اب عالم فتح پوری سے بھی سن لیجئے گا ؏

جو راستہ تمہیں رہبر بتا رہا ہے میاں
یہی تو ہے کہ جو مقتل کو جا رہا ہے میاں
یہ اک چھوٹی سی چھتو اراس سے کیا ہو گا
بہت ہی تند یہ طوفان آ رہا ہے میاں
یہی سے دیکھنا اک روز خون برسے گا
یہ گھبرا گھبرا سا بادل جو چھا رہا ہے میاں

جب حالم ایسے مشہور شاعر اپنی روایتی شاعری چھوڑ کر اس قسم کے کلام سنانے لگیں گے تو تمام توقعات اور اُمیدیں ڈھیر ہو کر رہ جاتی ہیں جب شعراء کی بے دلی کا یہ حال ہو تو پھر مشاعرہ کیسے اٹھے گا۔ ابھی بے دلی سے یار لوگ بھی شکر ادا کر رہے تھے یا آ رہے ہیں آپ نے دو چار اور شعر بھی سناتے ہیں گویا بادل نخواستہ کوئی فرض چکایا ہو مشیر صاحب عطا کر رہے ہیں ؎

ممکن ہے کل زبان و قلم پر ہوں بندشیں
آنکھوں کو گفتگو کا سلیقہ سکھائیے

مانگا ہوا لباس پہننے سے پیشتر
اپنا مزاج اُس کے مطابق بنائیے

داد کا شور کم ہوا تو ارشاد ہوا ہے ؎

زخم در پردہ ہمارے جسم پر آئے بہت
زندگی میں پھول بن کر سنگ برسائے بہت
اب مرے گھر سے کوئی دیوار ملتی ہی نہیں
تھے اسی بستی میں کل تک میرے ہمسائے بہت

مشیر صاحب بھی داد و تحسین دھول کے مائیک سے جدا ہو رہے ہیں اور اب ہنگامہ ہو رہا عالم رویا ہیں کیف بھوپالی آ گئے ہیں زبانوں کا ایک طور سا شور ہے کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے پہلے کیف شعر کہنے لگے اور پاؤں اٹھنے لگے ہیں تم ابی غزل الاپ رہے ہیں ؎

حکم موسم کا نہ ٹالا جائے گا
آج روزہ توڑ ڈالا جائے گا

ایسے ہی کہتے ہیں مادرِ گلشن بھونے آنکھ گویا موسم کا تقاضا یہ ہے کہ آج پی جائے لیکن روزہ سے اُس کا کیا تعلق۔؟ سنا ہے کیف صاحب قرآن پاک کا منظوم [illegible] فرما رہے ہیں اور اُسی قرآن پاک کا یہ مذاق ۔۔۔ آپ اسی طرح جھوم رہے ہیں ؎

روزِ محشر جب بھی زندہ ہاتھ دا
ہاتھ میں لے کر پیالا جائے گا

یار لوگ بھی سنائی غزل کو سُن لکھ رہے اور تفریح کے موڈ میں زیادہ ہیں یوں خود آزمائی کر رہے ہیں ؎

جب جبیں مسجد جاتا پڑا
راہ میں ایک میخانہ پڑا
فرج نہ ہو تو دیکھتے چلئے
راہ میں ایک دیوانہ پڑا

کیف صاحب کے ساتھ ہی پہلا دور ساڑھے ۲ بجے ختم ہو رہا ہے دوسرے دور کے لئے یار لوگ حسبِ دستور بیٹھے ہیں اس دور میں کئی شعراء کو خوب خوب سنا گیا اور چار بجے تک یہ دور چلا۔

دو سال سے اس مشاعرہ کو ٹھیکے کبھی ادارہ یا کارپوریشن کے سپرد کر دیا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ غیر ادبی اور غیر شاعرانہ ماحول ہاتھوں میں یہ مشاعرہ چلا جاتا ہے لہٰذا اس کا حشر معلوم۔ یہ مشاعرہ صرف کاروباری ہو کر رہ جاتا ہے دیکھیں شعراء کو خوب بھاری رقم دی جاتی ہے آنے والے شعراء کچھ حاضری دے تو دیتے ہیں لیکن جیسا کہ یہاں کی روایت رہی ہے وہ حق ادا نہیں کر رہے جو اُن پر فرض عائد ہوتا ہے مثلاً بے

کچھ لوگ کہتے ہیں مشاعرہ جما نہیں
کچھ یہ نعرہ بلند کرتے ہیں کہ مشاعرہ کامیاب نہیں ہوا

چند لوگوں کی یہ رائے ہے کہ شعراء نے تازہ کلام نہیں سنایا غزلیں منہ آتی باتیں اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے جب مشاعرہ تھا اور کامیاب نہیں ہوا تو چار بجے تک کیسے جاری رہا۔ اور اس کو اتنی دیر تک کس نے سنا۔؟ اب دیکھئے میں نے تمام مشاعرہ کیسے نوٹ کر لیا۔ ظاہر ہے مشاعرہ حسبِ روایت سنا گیا اور سامعین بھی جمے رہے صرف شعراء نے بے دلی کا ثبوت دیا ورنہ مشاعرہ کمیٹی نے تو مشہور اور مقبول شعراء کو مدعو کیا ہے جو ہر سال یہاں آتے رہے ہیں اور مشاعرہ کو چار چاند بھی لگاتے رہتے ہیں۔ سامعین کا ہجوم بھی ہر سال کی طرح وہی تھا پھر یہ آوازیں کیوں ۔۔۔؟ یہ اُن شعراء سے پوچھا جائے جو حق ادا نہیں کرتے اور اپنی ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتے۔ کمیٹی تو داد کی مستحق ہے کہ اُس نے ایک اچھے اور معیاری انتظام کیا اور عوام کے سامنے پیش کر دیا اب مجھے بھی اجازت دیجئے خدا حافظ پھر ملاقات ہوگی ۔ والسلام

"میرے وطن سے اچھی کوئی زمیں نہیں ہے"

محمد نقی خاں اثر اندوری
باوڑی والی مسجد،
جھابوہ ایم۰ پی

میرے وطن سے اچھی کوئی زمیں نہیں ہے
سارے جہاں میں ایسی دھرتی کہیں نہیں ہے

بادِ نسیم اس کے آنگن میں گھومتی ہے
بوئے شمیم اس کے دامن کو چومتی ہے
ہر ہر روش پہ اس کے سبزے لہک رہے ہیں
غنچے چٹک رہے ہیں اور گل مہک رہے ہیں
سرتاپا سیکدا ہے ہر ایک اس کا منظر
جامِ جہاں نما ہے ہر ایک اس کا منظر
میرے وطن سے اچھی کوئی زمیں نہیں ہے

باغوں کو اس کے گنگا شاداب کر رہی ہے
کھیتوں کو اس کے جمنا سیراب کر رہی ہے
عزم و عمل کے ہر سو چشمے ابل رہے ہیں
صنعت گری کے شعبے سونا اگل رہے ہیں
رشکِ جناں ہیں اس کی گل آفریں بہاریں
حسنِ ازل ہیں اس کی سرکردہ یادگاریں
میرے وطن سے اچھی کوئی زمیں نہیں ہے

مرغانِ خوشنوا کا رس گھولتا ترانا
بلبل کا چہچہانا بھنوروں کا گنگنانا
پیغام دے رہا ہے خوشحال زندگی کا
انسان سے محبت کا اور دوستی کا
یہ سرزمیں کہ جس پہ ہم لوگ بس رہے ہیں
ہر سمت نور پرور جلوے برس رہے ہیں
میرے وطن سے اچھی کوئی زمیں نہیں ہے

مل جل کے کام کرنا دستور ہے ہمارا
آپس میں پیار کرنا منشور ہے ہمارا

ہے تین رنگ والا پرچم ہماری عظمت
بھارت میں بسنے والی ہر قوم کی ضمانت
ہم جس کے زیر سایہ آرام پا رہے ہیں
اور اپنی محنتوں کا انعام پا رہے ہیں

میرے وطن سے اچھی کوئی زمیں نہیں ہے

چشتی کی سرزمیں ہے نانک کا یہ چمن ہے
گوتم کا دیش ہے یہ گاندھی کا یہ وطن ہے
اک در بے بہا ہے کشمیر اس زمیں پر
جنت کی خوشنما ہے تصویر اس زمیں پر
تاج و قطب اجنتا ہیں شان اس زمیں کی
گنگ و جمن سے دریا ہیں جان اس زمیں کی

میرے وطن سے اچھی کوئی زمیں نہیں ہے

اس خاک سے بنے ہیں پرتاپ اور ٹیپو
آزاد و شاستری اور گاندھی پٹیل نہرو
امیر و نظیر و حالی پیدا یہیں ہوئے ہیں
ٹیگور اور تلسی پیدا یہیں ہوئے ہیں
دنیا سے کچھ عجب ہے میرے وطن کی مٹی
لاکھوں میں منتخب ہے میرے وطن کی مٹی

میرے وطن سے اچھی کوئی زمیں نہیں ہے

اے دوستو ہم اس کی آغوش میں پلے ہیں
ہم کیا ہیں سورما ہیں غازی ہیں تن چلے ہیں
رکشا کریں گے بل سے ہم مادرِ وطن کی
اپنے لہو سے سینچیں گے ہم زمیں چمن کی
دشمن اٹھائے گا سر تو سر کو توڑ دیں گے
اور آنکھ اگر دکھائی تو آنکھ پھوڑ دیں گے

میرے وطن سے اچھی کوئی زمیں نہیں ہے

بقیہ صفحہ ۵ کا: قومی یک جہتی کے نقطۂ نظر سے ایسے پر مغز مضامین لکھنے کی ضرورت ہے، اشد ضرورت ہے جیسا کہ اعلیٰ حضرت جناب ہرن صاحب گورنر ہریانہ نے اپنے ایک انگریزی لیکچر میں فاضلانہ و عالمانہ طور پہ شعر اقبال پہ ڈاکٹر یوسف ڈالی اور جس کا اردو ترجمہ ہریانہ ساہتیہ اکادمی نے شائع کیا ہے۔ اردو زبان قومی یکجہتی کا سمبل رہی ہے۔ اور اس کے اسی رول کو فروغ دینے کی ضرورت ہے

کالیداس گپتا رضا کی

تا حال مطبوعہ تصانیف

"شعلۂ خاموشش" مجموعۂ کلام قیمت ۵۰ روپے	"ہندوستان مشرقی افریقہ میں" (تاریخ) قیمت ۱۹ روپے ۵۰ روپے	"انتخاب آبشار و تجلیات" چکبست قیمت ۴۰ روپے
"شورِ سخنِ پنہاں" مجموعۂ کلام قیمت ۲۰ روپے	"مکتوباتِ جوش ملسیانی" بنام رضا (مخطوط) قیمت ۱۹ روپے ۵۰ پیسے	"چکبست اور باقیاتِ چکبست" قیمت ۴۴ روپے
"شارعِ حق" مجموعۂ کلام قیمت ۱۵ روپے	"منثوراتِ جوش ملسیانی" قیمت ۲۰ روپے	"کلیاتِ چکبست" (نظم) قیمت ۶۰ روپے
"اُجالے" نعت اور سلام قیمت ۱۰ روپے	"متعلقاتِ غالب" قیمت ۲۰ روپے	"سبُو و سراغ" مجموعۂ مضامین قیمت ۲۵ روپے
"شعورِ غم" سلام وغیرہ قیمت ۳ روپے		
"شارعِ جاوید" مجموعۂ کلام رباعیات قیمت ۲۰ روپے	"دعائے صباح" غالب کی ایک مثنوی قیمت ۱۵ روپے	"مقالاتِ چکبست" قیمت ۷۵ روپے
"دی سائلینٹ فلیم" THE SILENT FLAME ENGLISH Rs. 10/-	"غالبیات چند عنوانات" قیمت ۵۰ روپے	غیر مطبوعہ تصانیف کا اعلان طبع ہونے پر کیا جائے گا

وِمل پبلیکیشنز

۲۰۵ چرچ گیٹ چیمبرز نیو میرین لائنز
چرچ گیٹ بمبئی ۴۰۰۰۲۰

غالی اقبالیوں سے گزارش

ڈاکٹر جگدیش چرن رستوگی

جب کبھی اقبال پر تحقیقی مضامین شائع ہوتے ہیں تو غالی اقبالیوں کے جذبات بگڑ جاتے ہیں۔ لہٰذا اُن ہی سے میرا خطاب ہے۔

میرے نزدیک اُردو محض زبان و ادب ہی نہیں ہے، کلچر بھی ہے اور میں حالانکہ پیشہ وران اُردو سے صرف میرے دوستانہ مراسم ہی رہے ہیں اُردو کو اپنا دین و ایمان بھی سمجھتا آیا ہوں مگر میرا یہ ایمان کمزور نہ ہونے کے باوجود کبھی کبھی متزلزل ضرور ہونے لگتا ہے بالخصوص اس وقت یا ایسے حالات درپیش ہو جانے پر جب تنقید، تحقیق، ادبیات بلکہ علم و دانش جو متعدد تنظیموں پر محیط ہوتا ہے سے متعلق امور پر بحث و تمحیص سے لوگ کتراکر پر اُتر آتے ہیں۔ ضرورت افہام و تفہیم کی ہوتی ہے۔ چلّم نمائی و ڈھنگ زنی سے رعب جمانے کی کوشش کرنا، حفظ مراتب سے روگردانی کرتے ہوئے ذرفر و حرّ حرّ پر اُتر آنے سے ہم اپنی کم ظرفی ہی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ملک بھر انگریزی درس و تدریس، انگریزی ادبیات، نیز تقابلی ادبیات پر ریسرچ سکالرز کی نگرانی، علمی استعداد جیسے چار مضامین میں ایم۔ اے۔ انگریزی میں ڈاکٹر ولیم پیس منظر کا مجھ جیسا خاکسار اپنی لُغت و دیوانہ باور کرو یہ شد ہتھیا نہیں ہو سکتا۔ اقبال، اقبالیات پر اعلیٰ سطح کا کام علی سردار جعفری، جگن ناتھ آزاد، قمر رئیس، بشیر احمد ڈار، کلیم الدین احمد اور راقم الحروف ہی نے کیا ہے۔ خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہونے والوں کی کب کمی رہی ہے۔

ریسرچ کے معیار پر پورے اُترنے والے درج ذیل تین مضامین کے شائع ہوتے ہی سورج سوا نیزے پر اُتر آیا "مجاہدین"، "رجال الاقبال" یعنی غالی اقبالیے میدان میں اُتر آئے۔

۱۔ علامہ اقبال کا وصیت نامہ از محمد عظیم فیروز آبادی ہماری زبان یکم اکتوبر ۸۴ء

۲۔ اقبال کے والد شیخ نتھو (حصہ اول) از محمد عظیم فیروز آبادی، ہماری زبان ۲۲ اکتوبر ۸۴ء

۳۔ اقبال کے والد شیخ نتھو (حصہ دوم) از محمد عظیم فیروز آبادی، ہماری زبان ۱۵ نومبر ۸۴ء

تینوں مضامین اعلیٰ معیار کے ہیں۔ اتفاق و اختلاف، افہام و تفہیم کے دروازے کبھی بند نہیں رہتے۔ ان سے متعلق ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب ہماری زبان (۱۵ دسمبر ۸۴ء) میں یوں رقمطراز ہوتے ہیں۔

"محمد عظیم فیروز آبادی کا مضمون شائع ہوا ہے۔ ایسے غیر معقول اور سوقیانہ مضمون کے مصنف نے صرف چند سطروں کی تحریر کو افسانہ بنانے کی کوشش کی ہے جس کا مقصد کوئی تحقیق نہیں، ایک محترم شخصیت پر کیچڑ اچھالنا ہے یہ محض ایک جدت پسندی ہے تاکہ ایک شوشہ چھوڑ کر لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کی جائے۔ یہ وہی حرکت ہے جو کچھ عرصہ پیشتر جگدیش چرن رستوگی صاحب کرتے رہے تھے لہٰذا اس میں کوئی نیا پن نہیں ہے........"

کیوں صاحب کیا لفظ "حرکت" سوقیانہ نہیں ہے؟ مغنی صاحب کا مضمون اُن کی علمیت کا آئینہ دار ہے۔ کلیم الدین احمد کے بارے میں جو کچھ اُنہوں نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے وہ استدلال پر مبنی نہ ہو کر جذباتی ہر کو دکا کریہہ منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں بتا سکے ہیں کہ "عالمی ادب" کس کو کہتے ہیں۔ دراصل عالمی ادب ایک گمراہ کن ادبی اصطلاح ہے جس پر میں نے دو مضامین موقر جریدہ کو دیئے ہیں۔

غالباً مغنی صاحب کے "محراب و منبر" کرنے سے خوف زدہ ہو کر ہماری زبان کی ادارت نے ۲۲ دسمبر ۸۴ء کے شمارے میں "اقبال کے بارے میں [illegible]" کے تحت لکھا ہے

"ہماری زبان" کے شمارے مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۸۴ء میں
ظیم فیروز آبادی صاحب کا مقالہ "اقبال کا وصیت نامہ" شائع
ہوا تھا۔ اُس میں جو غیر شائستہ زبان استعمال کی گئی ہے اُس
کے لئے ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں......"
یعنی مُغنی صاحب کو سارٹیفکیٹ دے دیا گیا یا اُن کی بات
ں تصدیق کر دی گئی۔ یہ عجیب و غریب ادبی صحافت ہے کہ
یر شائستہ زبان والے مضامین کو شائع کر دے اور بعد کو غیر شائستگی
ل نشان دہی کئے بغیر معافی مانگنے پر اُتر آئے۔ معذرت کی چنداں
ضرورت نہ تھی کیونکہ عظیم صاحب ہر اعتبار سے معیاری گفتار و
کردار کے شخص ہیں۔
ہماری زبان کے شمارے مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۹۸۴ء میں محمد عظیم
صاحب کے مضامین سے متعلق دو مراسلے شائع ہوئے ہیں۔
پہلا مراسلہ بیگم صالحہ عابد حسین صاحبہ کا ہے "بہت اچھا مُراسلہ ہے
کاش، وہ یہ مشورہ بھی دے دیتیں کہ لوگ اقبال کو برہمن زاد
(؟) وغیرہ بتانا بند کر دیں" چونکہ غلط بیانی ہی سے اُس کا ازالہ
کرنے کی ضرورت پیدا ہو جاتی ہے۔
دوسرا مراسلہ جناب ڈاکٹر احسن اختر صاحب کا ہے۔
ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ عظیم صاحب "سچے محقق ہیں اور
علامہ کے بارے میں تحقیق کر رہے ہیں۔" اس کے بعد ڈاکٹر
صاحب نے دو شہروں کی فہرست وغیرہ سے کوائف پیش کرتے
ہوئے بالواسطہ اقبال کی ذات کو "شیخ سپرو" بتایا ہے۔ یہ شیخ سپرو
کیا بلا ہے مگر اس سلسلے میں مزید کچھ کہنے کے پہلے قدرے پس منظر
کی جانب رجوع کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ معذرت کے
ساتھ تفصیلات کا خاکہ پیش کرتا ہوں۔
نہ جانے کیوں کچھ اُردو حلقوں میں بالخصوص اُن نام نہاد اشخاص
پر مشتمل حلقوں میں جو اقبال کے صاف شفاف چہرے پر داڑھی
لگا دینا چاہتے ہیں اور جو یہ نہیں جانتے کہ ریسرچ کے معنی و مفہوم
رقبہ حدود اربعہ کیا ہیں تین چار اشخاص گردن زدنی سمجھے جاتے ہیں
کلیم الدین احمد مرحوم، فراق گورکھپوری، عظیم فیروز آبادی، ڈاکٹر
حیدری کشمیری، اور خاکسار رستوگی۔ اگر ان لوگوں کا بس چلے تو
کلیم صاحب کو جوار رحمت سے گھسیٹ لائیں اور فی النار کر دیں۔
کیونکہ مرحوم نے یہ کہا تھا کہ اقبال کو حالی اور بھی کوئی مقام
نہیں دیا جا سکتا۔ فراق صاحب اب ایس جہانی نہیں رہے مگر
چونکہ انہوں نے کہا تھا کہ اقبال کی شاعری ملنے کل سے پتا اسد
سے نا آشنا سے محض ہے اور جارحانہ تمائلات و رجحانات کو
جنم دیتی معلوم ہوتی ہے۔ ہندو ہیں ہم وطن ہیں / مسلم ہیں ہم
وطن ہیں / ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا، کیا بات ہوئی۔
ایسے دعوے شدید تر یا ردِ عمل پیدا کر سکتے ہیں۔ جناب حیدری
کشمیری نے بھرپور ثبوت پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کر دیا کہ حاجی
نول، اقبال کے جدِ امجد نہیں تھے، لوٹ تھے اور اُنہوں نے کبھی
شادی ہی نہیں کی۔ بغایت فاضلانہ طور پر عظیم فیروز آبادی نے
بہت پہلے یعنی کئی سال پہلے ہماری زبان کو ایک مضمون دیا تھا
بہ عنوان "کیا اقبال کشمیری پنڈت تھے" یہ مضمون نا یہ امیں میں
وضاحت و تشریح کے ساتھ اقبال سے متعلق اس غلط بیانی
کو کہ وہ کشمیری برہمن "زاد" (نژاد) تھے فوکس میں لا کر متعدد
ثبوت پیش کئے تھے کہ دعویٰ قابلِ ترک ہے۔
ان سب اشخاص سے پہلے میں نے دو مضمون "ہماری
زبان" نئی دہلی کو دیئے تھے۔
۱۔ اقبال سے متعلق چار فیصلہ طلب امور
۲۔ چہ گفتمت، چہ شنیدی، چہ در گماں آمد
پہلے مضمون میں شبہات مع دلائل پیش کئے تھے۔ (۱) اقبال
برہمن زاد (ویسے زاد کہنے سے ذم کا پہلو نکلتا ہے، نژاد کہنا چاہیے
کیونکہ زاد کے ایک معنی لڑکا بھی ہوتا ہے) نہیں تھے۔ سپرو کوئی
گوتر (گوت) نہیں ہوتی۔ گوتر کو گوت نا خواندہ و متوسط
طور پر تربیت یافتہ ہی کہتے ہیں، لفظ غلط ہے۔ (۲) اقبال نے
مسجد قرطبہ میں نماز نہیں پڑھی، مسجد قرطبہ (جو اب دراصل
Cathedral یعنی بڑا گرجا ہے) میں اقبال کو جائے نماز مسجد (؟)
کے اندر ہے وہی سیڑھیوں پر بچھا دکھایا گیا ہے۔ (۳)
اقبال کی برگساں سے ملاقات محض افسانہ نگاری پر مشتمل
شاہکار ہے۔ (۴) تاریخ ولادت سے متعلق تھا۔
عرض کرتا چلوں، پہلے مضمون کے محرک میرے بھائی (شہباز
عظیم آبادی) تھے۔ میں نے اپنے شبہات ان کے سامنے پیش کئے

تھے۔ بھائی جان نے مجھے کہا کہ شایستہ زبان میں مضمون کی شکل دے کر لکھ ڈالو۔ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے میں نے مضمون لکھ کر بھائی جان کو دے دیا۔ سُہیل بھائی نے اس کا کشمیری زبان میں ترجمہ "شیرازہ" (ریاست جموں کشمیر) میں بھی لکھوایا۔ کہیں سے بھی یہ آواز نہیں آئی کہ "ہم اقبال کے خاندان سے وابستہ ہندو شاخ کے لوگ ہیں۔"

چند سال قبل منتظری متعدد مضامین میں چھوا پہ پیرجو تھی جن کا واشگاف و باستدلال جواب میں نے اپنے دوسرے مضمون "بہ لفتند بہ شنیدی، چہ و گماں آمد" میں دے دیا۔ جس پر جناب صفدر سیتاپوری (ہومیوپیتھک کے ڈاکٹر، اور مذہب سے غالب وابستہ ہو گئے تھے) نے ایک مضمون لکھ مارا جو زیر بحث نکات سے کوئی واسطہ ہی نہ رکھتا تھا ؂

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

میں نے دندان شکن جواب لکھ کر جاری زبان کو پیش کر دیا تھا۔

اقبال ہو، اقبال جو کوئی کرے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہند و پاک کے ادیبوں اور ناقدوں میں اقبالیات کو سب سے زیادہ موضوعات میں نے ہی فراہم کئے ہیں مثلاً :-

اقبال اور گایتری منتر، اقبال کے نظریات انتقادِ سے متعلق کلام اقبال کا احتجاجی آہنگ، اور

(Papers): Iqbal & Religions other than Islam

" . Iqbal's works : A Sociological Perspective

" : Iqbal & Tagore Perspective

مزید براں،

Iqbal's works : A Psycho-sociological Perspective

غالباً یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ "اثر" سے متعلق کچھ سب سے پہلے میں نے ہی وضع کیا جو میرے اس تحقیقی مقالے (Western Influence on Iqbal) جس پر مجھے انگریزی ادبیات میں ڈاکٹریٹ بھی ملنا ہے، اور جس کو میں اردو میں شائع ہونے والے اپنے متعدد مضامین میں بھی بتا چکا ہوں۔

تھا اقبال اتنا بڑا شاعر تھا، عظیم شاعر تھا۔ وید، اپنشد، گیتا وغیرہ بھی اس کے زیرِ مطالعہ آئے مگر جیسا کہ گایتری کے ترجمے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو بھی مطالعہ تھا وہ میکس مولر پر زیادہ محیط تھا۔ گایتری منتر میں صرف ۱۶ حروف ہیں، میکس مولر کی گایتری منتر کی تفسیر کو اقبال نے نظم کیا ہے اور بہترین ترجمہ کیا ہے۔ مخزن میں جب یہ ترجمہ شائع ہوا تھا تو اس کے ساتھ ہی شذرات میں اقبال نے سوریہ نرائین اپنشد کا ذکر کیا ہے۔ صرف سوریہ اپنشد ہی کہنا چاہیے تھا۔ سوریہ نرائین اپنشد کوئی نہیں ہے مگر میکس مولر نے چونکہ یہی نام لکھا تھا لہذا اقبال نے بھی لے لیا۔ بہرکیف ترجمہ بہت خوب ہے۔ اس موضوع پر میرا مضمون گفتگو بمبئی کے کسی شمارے میں شائع ہوا تھا۔

بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ جب میں نے ثابت کر دیا کہ اقبال برہمن نژاد نہیں تھے تو سُہیل بھائی نے مجھ سے پوچھا کہ اب یہ بتاؤ کہ اقبال نے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا ؂

برہمن زادۂ رازآشنائے رُوم و تبریز است

ہوا تا، میں نے عرض کیا کہ ایک اعتبار سے اقبال کی بات کو درست قرار دیا جا سکتا ہے۔ اقبال نے گایتری کا ترجمہ کیا تھا لہذا گایتری منتر کے خالق رشی وشوامتر (Vishvamitra) سے وہ ناواقف نہ تھے۔ رشی وشوامتر کو "جہاں دوست" کے نام سے اقبال نے جاوید نامہ میں پیش کیا ہے۔

ایک دلچسپ بات، وشوامتر تپسیا کرتے تھے تو اُن کے پیروں طرف برف جم جاتی تھی گرداگرد مارِ سفید سے حلقہ زن۔ مزید براں اقبال کو یہ بھی معلوم تھا کہ ویدک آریہ دھرم میں دو پیدائشیں مانی جاتی ہیں، جسمانی اور روحانی۔ ایک عمر پر پہنچ جانے پر بالخصوص بالغ ہو جانے سے کچھ بیشتر "گایتری منتر دیا جاتا ہے (یہ ہندو روزمرہ ہے) اور گایتری لینے والا برہمہ میں پرویش (؟) یعنی اُس کا رمز آشنا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا گایتری منتر لینے والے کو برا (؟) کہا جا سکتا ہے۔ یہ نظریہ آریہ سماج کا ہے اور اقب

اِس سے واقف ہونگے۔ اُن کا مطالعہ بھی تھا اور سوامی رام تیرتھ سے دوستانہ مراسم بھی تھے۔ اگر اِس استدلالی کھینچ تان سے کام لیا جائے تبھی اقبال کو برہمن نژاد کہا جاسکتا ہے۔ (زاد اور نژاد میں فرق ہے)۔

اقبال نے ایشیا کے استحصال اور مغربی استعماریت کے خلاف سب سے پہلے آوازاُٹھائی جو قابلِ ستائش ہے۔

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چُن چُن کر بنائے مسکرات

شکوہ، جوابِ شکوہ، طلوعِ اسلام وغیرہ نظمیں بہترین سماجیات و تاریخی پس منظر بھی رکھتی ہیں، اور دعوت و عزیمت بھی دیتی ہیں۔ اقبال نے جمال الدین افغانی کے پیغام پر خاطر توجہ صرف کی تھی مشرق اور مغرب کو بطور قاطیغوریاس (Category) اور اصطلاح استعمال کرنے والا پہلا شخص افغانی ہی تھا۔ مغربی طاقتوں کی استعماریت اور دوسری اقوام بالخصوص مشرق کی اقوام کا استحصال کرنے والی مغربی طاقتوں کے خلاف نعرہ بلند کرنے والا پہلا شخص افغانی تھا اور دوسرا اقبال۔ ساتھ ہی اقبال پر سر سید کی تحریک کے اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ افغانی مغرب کی سائنس اور علوم کا دلدادہ بھی تھا اور وہ مسلمانوں سے مغربی علوم و فنون کا بائیکاٹ کرنے کی تلقین نہیں کرتا تھا، وہ مسلمانوں کو ہر طرح آراستہ و اسلحہ بند دیکھنا چاہتا تھا۔ اقبال کی بھی یہی خواہش تھی لیکن افغانی کی طرح اقبال گفتار و کردار کے غازی نہ تھے۔ افغانی زبردست مقرر تھا مگر اقبال کی تقاریر میں افغانیت نہیں، اُن کی شاعری میں "افغانیت" ہے اور "انسانیت" ہے۔ مردِ جا آدم اُن کے پیشِ نظر تھا ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

ان کا ایک اور شعر، فارسی شعر جو اُن کے کلیات میں شامل نہیں ہے، بیان قابلِ توجہ ہے ؎

... سوئے افلاک تو اش ہم نہ یافت
از غبارِ مہ و ماہ اندیشہ گرد آلود بود

... من ہیں، اُن کا یہ شعر بھی قابلِ داد ہے، حالانکہ سباق و سیاق کے نقطۂ نظر سے اُس کو پیش کرنا غیر ضروری سا معلوم ہوتا ہے ؎

من درونِ سینہ خود سومنا تے ساختم
آستانِ کعبہ را دیدم جبیں فرسودہ بود

غرضیکہ اقبال بہ حیثیت شاعر خاصی وقیع عظمت کا حامل ہے۔ شعرِ اقبال سے آگے پڑھنے والوں کو بیگم صالحہ عابد حسین صاحبہ کا مراسلہ بہ غور پڑھنا چاہیئے اور کچھ کہتے وقت یا لکھتے وقت احتیاط برتنا چاہیئے۔ ورنہ درج ذیل سوالات و شبہات سامنے آنے لگتے ہیں، جو ریسرچ کے اعتبار سے ناگزیر بھی ہیں اور بغایت اہم بھی ہیں

۱۔ اقبال قطعاً برہمن زاد یا نژاد نہ تھے۔

۲۔ اقبال نے اپنے والد ماجد کا نام تبدیل کیا تھا۔ شیخ نتھو سے شیخ میر محمد اور پھر شیخ نور محمد۔

۳۔ آفتاب اقبال، جو پہلی بیوی سے محمد اقبال کے بڑے صاحبزادے تھے۔

اُن کو گھر سے نکال دیا اور عاق کر دیا۔ کیوں؟ یہ ثبوت میرے پاس تھا یعنی آفتاب اقبال کا خط میرے خط کے جواب میں۔ خط ہذا کی فوٹو سٹیٹ کاپی سہیل عظیم آبادی نے کروائی تھی اور وہ یقیناً مرحوم کے کاغذات میں ہوگی۔ میرے پاس جو مراسلہ تھا وہ ملبہ زدہ ہو گیا۔ لینڈ سلائیڈ میں گھر کے چار افراد زندہ دفن ہوگئے تھے۔ اور میری چار ہزار کتب پر مشتمل لائبریری تباہ و برباد ہو گئی صرف ۱۲۰۰ سو کتب اور مسودات صاف کیے جاسکے۔

بہر کیف مراسلہ ہذا کا ایک پھٹا ہوا حصہ ہنوز میرے پاس ہے میں اِس سلسلے میں مزید کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ بہر کیف ایک بات عرض کردوں۔ اقبال کے ایک دوست کنہیا لال گابا ہوا کرتے تھے جو اپنے دوست کی طرح دل پھینک تھے۔ مسلمان ہو جانے پر اُن کا نام اقبال کی تجویز پر خالد لطیف گابا ہو گیا اور اس طرح Gaba K. L. ہمارے سامنے رہے۔ انہوں نے اپنی سوانح حیات (Friends & Foes) میں اقبال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اقبال کی ازدواجی زندگی خوش گوار نہ تھی۔ وہ اقبال کو پاکستان کا باشکوہ مقبرہ کہا کرتے تھے۔

ڈاکٹر اُودے سرن ارمان (بلاری) نے ہندی افسانہ نگاری میں اپنا ایک مقام بنانے کے بعد اپنے اُردو افسانوں کا مجموعہ

مان سرووَر

شائع کر کے اُردو ادب میں جو مقام پایا ہے وہ درجنوں افسانوی مجموعوں کے خالق افسانہ نگاروں کو بھی حاصل نہیں ہو پایا۔

چنانچہ

"مان سرووَر" اُردو افسانوں کا مجموعہ ہندی اور انگریزی میں اشاعت پذیر ہو کر دُنیائے ہندی کے ساتھ ساتھ مان سرووَر کے انگریزی ایڈیشن نے انگلینڈ تک شہرت پائی ہے۔ مان سرووَر انگریزی ایڈیشن پر انگلینڈ کے تین انگریزی ادب کے ماہرین نے دیباچہ۔ تقریظ اور گرامی قدر رائے سے نوازا ہے۔

انگریزی ایڈیشن	ہندی ایڈیشن	اُردو ایڈیشن
۲۵ روپے	۱۵ روپے	۲۱ روپے

ندا اب ڈاکٹر اُودے سرن ارمان کے تازہ ترین بہترین افسانوں کا مجموعہ

ہر بار کہا دل نے

طباعت کی منازل طے کر رہا ہے۔ تفصیلات کے لئے لکھیے
دفتر ماہنامہ شانِ ہند فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۲

مہری چند اختر

ایک باغ و بہار شخصیت

رام لال نابھوی

یکم جنوری ۱۹۰۰ء کو ساہا گاؤں ضلع
مہری چند اختر ہوشیارپور ریاست پنجاب میں ایک دیہاتی اور قدیم رسم و رواج کے پابند براہمنوں کے گھر میں پیدا ہوئے، جن کا ذریعۂ معاش کاشتکاری تھا۔ خاندان بھر میں کوئی پڑھا لکھا نہ تھا۔

جالندھر کے گورنمنٹ اسکول میں زیرِ تعلیم تھے کہ حفیظ جالندھری سے ملاقات ہوئی۔ گرامی مرحوم کی صحبت مل گئی، شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ ہائی اسکول سے فراغت پا کر فارمن کرسچن کالج میں داخل ہو گئے۔ بی اے پاس کیا اور ایک اخبار میں نوکری کر لی۔ شروع میں شررؔ تخلص کرتے تھے پھر اختر کہلانے لگے۔ دوزخی تخلص سے بھی شعر کہتے رہے۔

سال ۱۹۳۹ء سے سال ۱۹۴۷ء تک لاہور میں مقیم رہے۔ لاہور ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا، یہ بھی شامل ہو گئے۔ طبیعت میں ظرافت کا رنگ غالب تھا۔ بے حد ذہین و زود طبع تھے۔ چھیڑ خانی کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ مشاعرے فتح ہوتے۔ نظم و نثر دونوں میں عبور حاصل تھا۔ کہیں [illegible] کہیں اظہار کا مزاحیہ کالم لکھا جا رہا ہے۔ کہیں مشاعرے کے لئے نظم مرتب ہو رہی ہے۔

جالندھر میں حفیظ جالندھری اور گرامی مرحوم کی صحبتوں نے فکر و فن کو جلا بخشی۔ مولانا تاجور نجیب آبادی نے جب لاہور میں انجمن اربابِ علم کی بنیاد رکھی تو اختر اور ان کے ساتھیوں نے مولانا سے اختلافِ رائے ہونے کی وجہ سے بزمِ ادب قائم کی۔ مولانا تاجور جیسے عالم کے مقابلے میں کسی انجمن کے قائم کرنے کا خیال ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ وہ بڑے سے بڑے شاعر اور ادیب سے ٹکرا جاتے تھے۔ بات سے بات نکالنا اور نکتہ سے نکتہ پیدا کر لینا اور پھر حسبِ موقع استعمال کرنا ان کا کمال تھا۔ فی البدیہہ شعر کہنا ان کی طبیعت کا خاصا تھا۔ ان کے ہاتھ سے نہ ظفر علی خان جیسا صحافی بچا۔ نہ منشی راج نرائن ارمان کی مونچھیں، نہ تاجور نجیب آبادی کی توند، یا خواجہ حسن نظامی کی تبلیغ، ان کی زد میں آنے سے نہیں بچیں۔ غرضیکہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

لاہور کی ادبی سرگرمیوں میں تاثیر، سالک، صوفی تبسم، حفیظ جالندھری، بخاری پطرس، علامہ گرامی، علامہ اقبال، محمد عبداللہ [illegible]، نریندر ناتھ، تاجور، وابستہ، پیرشادی فدا، ظفر علی خاں، کرشن چندر، کنہیا لال کپور، کنور سین، یاس یگانہ، دواریکا داس شعلہ، موہن سنگھ دیوانہ، محمود شیرانی، کرم چند، کنور سین، ملک فیروز خاں نون، گوپال متل، غلام محمد، جیسے سخن شناس، سخن ور، سخن گو، حصہ لیتے تھے۔ زبان اور فن پر بحث ہوتی تھی۔ ادھر ایک نے چھیڑا، ادھر جواب حاضر۔ پھر کسی نے نکتہ نکالا، کسی نے پھبتی کسی، ادھر سے جواب ملا۔ میدان میں سب ڈٹے رہتے۔ صف آرائیاں ہوتیں، چوٹیں ہوتیں، [illegible] فکر کے جوہر کھلتے۔ بذلہ سنجی پروان چڑھتی، ہاؤ ہو ہوتی، لطیفے پیدا ہوتے۔ یہی وہ محفلیں تھیں جہاں اختر کے طنز و مزاح کو جولانی اور وہ باغ و بہار شخصیت بن گئے۔

کس کی ہمت تھی کہ ظفر علی خاں سے ٹکرا جاتا۔ بڑے بڑے شاعر ان کے نام سے کانپتے تھے، حکومتیں ان سے خوف کھاتی تھیں۔ اختر سے کہیں نوک جھونک چل رہی تھی۔ کہیں ان کے شعر میں تعقید نظر آئی۔ فوراً تعقیدِ لفظی کے ستم پر آمادہ ہو گئے اور آخری فعل کو الگ کر کے یعنی "کون بولے گا" کی جگہ "بولے کون گا" کی زمین میں ظفر علی خاں کی ہو بہو ڈھنگ کا قطعہ مرتب کر دیا۔ رنگ ملاحظہ ہو:

پھر ظفر کے بعد گائے ایسے ڈھولے کون گا

پھر سُنائے ٹھمریاں، پیتے، جو بولے کون گا
آمنت مرحوم کہ جیسیں شوخ بولے کون گا
بھرے جاتے یوں ہی چھڑکے جوڑے کون گا
نبض تک خاموش رہ جاتی ہے رعبِ حُسن سے
حالِ دل پوچھا اگر اس نے تو بولے کون گا
تو جو مجھ پر کر رہا ہے بے خبر مشقِ کرخ
جُن کے تیرے واسطے لائے غلولے کون گا
ہے شبِ وعدہ ادھر مجھ پر ہے غلبہ نیند کا
وہ اگر آئے تو پھر دروازہ کھولے کون گا
دوزخی صاحب بھی ساحل سے جھٹ بیٹھ اگر
عشق کے طوفان میں کھاتے جھکولے کون گا

تر کی بذلہ سنجی، رنگینی و شوخی، خوش طبعی و خوش گفتاری،
ڈنگ، پرکاری اور بر جستگی اور سب سے بڑھ کر شیریں بیان
نیں مشاعروں کا کھینچ لاتی تھی۔ وہ ایک گوشے میں بیٹھ جاتے،
ے مداح ان کے اردگرد، سب کی نظریں کھنچ ہو جاتیں
شاعروں کی نظریں اختر پر۔ ادھر کسی نے مصرعہ کہا اور پنڈت
ی گرہ جڑ کی اور اس سے پہلے کہ شاعر دوسرا مصرعہ کہتا،
ت جی شعر پورا کر دیتے اور اس طرح کی ساری محفل زعفران
رہو جاتی، شاعر سٹپٹا جاتا۔ پنڈت جی کی کبھی نیت ایسی
ں ہوتی تھی کہ کوئی شاعر اکھڑ جائے لیکن وہ اپنی فطری
ت سے مجبور تھے۔ ان کی بات کا کوئی برا نہیں مانتا تھا۔
نکہ سب جانتے تھے کہ وہ الماس کی طرح شفاف، آئینے
طرح آبدار، پھول کی طرح خوش رنگ اور طوطی کی طرح
ش نوا تھے، وہاں نہ بغض و عناد تھا نہ رشک و حسد، نہ غرور و
نت، نہ خود نمائی اور خود ستائی۔ ایک پھلجھڑی چھوڑ دیتے اور
ست الست۔ بیٹھے لطف لیتے۔ مشاعرہ میں وہ رنگ بھر
تے تھے کہ ان کی حاضری مشاعرہ کی کامیابی کا ضامن ہوتی
ی کچھ نہیں بیٹھتے تھے۔ اگر وہ کسی شعر پر بہت زیادہ داد دیتے
ے تو سامعین سمجھ لیتے تھے کہ یا تو اس شعر میں کوئی سقم ہے یا
ر درحقیقت تعریف کے قابل ہے۔ ایک مشاعرے میں ایک
شیدہ شاعر اپنی غزل پڑھ رہے تھے۔ غزل کی زمین تھی

"رات کٹتی نظر آتی نہیں" شعر کا پہلا مصرعہ تھا، "یہ دل ہے
جگر ہے یہ کلیجہ" پنڈت جی کب چوکنے والے تھے بلند آواز سے
دوسرا مصرعہ کہا "قصائی لایا ہے سوغات کتنی" محفل لالہ زار ہو گئی۔
یہ واقعہ اتنا مشہور ہوا کہ آج بھی اس شعر کو لوگ بڑے مزے
لے لے کے پڑھتے ہیں۔

بقول مرزا جعفر حسین۔ جوش ملیح آبادی کا کہنا ہے کہ بڑی
چند اختر بے حد زود گو تھے، انہوں نے بے شمار غزلیں نظمیں کہی
تھیں جو بہت بڑی تعداد میں تلف ہو گئیں۔ جو کچھ فراہم ہو سکا وہ
ایک مختصر مجموعہ کی صورت میں "کفوایاں" کے نام سے شائع
ہوا ہے۔ اب دیکھئے کہ اختر جوش ملیح آبادی کو بھی نہیں بخشتے تھے۔
اور انہیں ملیح آباد کا ہیبتناک کہا کرتے تھے۔

اختر کی طبیعت میں بلا کی جدت، لطافت اور ان کے
احساسات میں غضب کی تازگی اور انفرادیت تھی۔ ایک مشاعرے
میں شمولیت کے لئے کچھ شاعر جموں جا رہے تھے۔ راستے میں
پنڈت ولسنہ پرشاد فدا نے اختر سے کہا کہ ایک غزل ہوئی ہے
مقطع نہیں ہو رہا ہے۔ زمین تھی "خدا ہو کر، فدا ہو کر" اختر صاحب
نے فی البدیہہ یہ فرمایا "مزا جینے کا آخر دل لگانے پر ہی ملتا ہے
فدا صاحب کسی پہ دیکھ لینا تھا فدا ہو کر" اللہ اللہ، شعرا حضرات
لوٹ پوٹ ہو رہے تھے اور اختر صاحب یوں بیٹھے تھے جیسے
کچھ ہوا ہی نہیں۔ شعر کی بندش میں ایک تڑپ تھی، ایک چمک تھی،
ایک شعلہ تھا جو جنوں تک اپنی لو دیتا چلا گیا۔

شملہ کا ایک واقعہ سنئے گیتی تھیٹر میں ایک ڈرامہ بعنوان تمنا
شام کو ہونے والا تھا۔ ہیروئن نہ آئی اور ڈرامہ نہ ہو سکا۔ پنڈت جی
بھلا کب چپ رہتے، بولے ایک شعر ہو گیا ہے

تھی جس پر کامیابی منحصر چل دی وہی لڑکی
تمنا کی جگہ خونِ تمنا دیکھتے جاؤ

ادھر بات تھی ادھر ذہن سے کونپل پھوٹی، فکر کی ندرت
خیال کی جدت، وزن و آہنگ سے مناسبت اور شعر کے لوچ
لچک جانچنے کی فنی صلاحیت پنڈت جی میں خداداد تھی۔

پنڈت جی نہ شراب پیتے تھے نہ گوشت کھاتے تھے، بعض سگریٹ
پیتے تھے جو بعد میں انہوں نے چھوڑ دی تھی۔ یار لوگ ایک بار

2102
Accession Number
86097
Date 21.12.87

ضمیر کی آواز

ڈاکٹر اودے سرن ارمان ( )

سات ہزار روپے میرے سامنے رکھتے ہوئے بابو گیان چند نے کہا " ستو لوری سیمنٹ اور چاہیے امید ہے کہ مجھے نا امید نہ ہونا پڑے گا" میں نے نوٹوں کی گڈی اٹھاتے ہوئے کہا آپ کا کام تو کرنا ہی ہوگا۔ ابھی چاہیے یا چھ سات دن بعد"

ٹھیکیدار صاحب اگر فوری ضرورت نہ ہوتی تو اس قدر تیز دھوپ میں آپ کو تکلیف دینے حاضر نہ ہوتا ۔ میں نے فارم سے کمپا کو لانے کو کہا اور بابو گیان چند کو یقین دلایا کہ وہ اُس پل تک پہنچے جہاں کام چل رہا ہے میں بھی تھوڑی دیر میں وہاں پہنچتا ہوں اور ان کا کام وہیں کر دیا جائے گا۔ بابو گیان چند کپا کولا کی بوتل دو تین گھونٹوں میں ہی ختم کرتے ہوئے فوری طور پر نہر پل کی جانب چل پڑے۔

بیوی کی گڑگڑاتی آواز نے مجھے چونکا دیا جو خفگی کے لہجے میں کہہ رہی تھیں کہ اس جھلسا دینے والی دھوپ میں پرندے تک اپنے گھونسلوں میں دبکے بیٹھے ہیں اور ایک آپ ہیں جو نہ معلوم کس کنسٹرکشن میں لگے ہوتے ہیں۔ بیوی نے نوٹوں کی گڈی اٹھاتے ہوئے کہا اب کبھی کبھی آپ کیوں اپنے دو بیوی بچوں کو بھی سب کچھ بھولے ہوئے ہیں۔ یہ چیز ہی ایسی ہے کہ اس کے لئے آدمی اپنوں تک کو بھول جاتا ہے۔ مجھے کتاب کی طرح خاموش پا کر بیوی نے نسوانی حربہ استعمال کرتے ہوئے مصنوعی حسن مسکراہٹ کے ساتھ کہا اتنے نوٹ دیکھ کر تو مردہ بھی کروٹ لے لے گا آپ ہیں کہ خوشی کی گھڑیوں میں بھی اداس ہیں۔ میں نے بیوی کو اپنے قریب بٹھاتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں اسے بتایا کہ ڈاک گیشن منسٹر کی بیٹی کی شادی ہے جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے محکمے کے افسران سے تین لاکھ روپیہ فراہم کر دینے کو کہا ہے جس کی وجہ سے مجھ پر بھی مخصوص انداز میں اوپر سے دباؤ پڑ رہا ہے کیونکہ بہت جلد یہ رقم اکٹھا ہو کر جانی ہے جبکہ

تو اوپر والوں نے اپنی پرسینٹیج ویسے ہی بڑھا دی ہے جس سے مارجن اتنا کم رہ گیا ہے کہ گھر کا خرچ تک چلنا دشوار ہو رہا ہے جبکہ اس پر مزید یہ مطالبہ ہے۔ لہٰذا مجبوراً بابو گیان چند کا کام کرنا ہی ہوگا۔

میری ان باتوں کو سنتے سنتے بیوی کی ہشاش بشاش صورت پر کسی قدر گمبھیر سوچ کی لکیریں ابھر آئی تھیں مگر اصرار پر کہنے لگیں۔

دیکھو جی اس طرح پل کمزور رہے گا اور اگر بارش میں یہ بیٹھ گیا تو کتنی جانوں کا نقصان ہوگا اور یہ سب پاپ ہمارے سر پر ہوگا۔

میں نے حوصلہ مندانہ آواز میں کہا محض میرے اور تمہارے سوچنے سے پل تھوڑے ہی اچھا بن جائے گا پل کمزور بنتے ہیں تو نیچے سے اوپر تک ان گنت لوگ ذمہ دار ہیں تم تو ویسے ہی گھبرا اٹھتی ہو ٹھوڑی پر ہاتھ رکھتے ہوئے قدرے اطمینان سے کہنے لگیں تو پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟ بس بتوں کا انتظار کر رہا ہوں وہ آ جائے تو میں پل پر جاؤں کیونکہ بابو گیان چند وہاں میرا انتظار کرے گا۔

مگر بتوں تو تین بجے سے پہلے آنے کا نہیں۔ کیونکہ جب سے اس نے تنخواہ بڑھانے کو کہا ہے اور آپ نے اس کی مانگ پر دھیان نہیں دیا تب سے وہ تین بجے کے بعد ہی آنے لگا ہے۔ کہتا ہے کہ اس کی بیٹی کی شادی ہے۔ مگر میں سمجھتی ہوں کہ تنخواہ بڑھوانے کے لئے اس نے بہانہ بنا رکھا ہے۔ آج کل لیبر کلاس کا دماغ ساتویں آسمان پر ہے اس لئے خود جا کر آنے گاڑی سے لے آئیے۔ کیونکہ بابو گیان چند کو سیمنٹ کے کٹے دینے کے لئے بتوں کی فوری ضرورت تھی لہٰذا میں نے گیراج سے کار نکالی اور بتوں کے گھر کی جانب چل دیا۔ راستے بھر میں سوچتا رہا آج کل کے ملازموں کی بے مروتی کا خیال آتا رہا کہ ان لوگوں کے ساتھ چاہے کتنا ہی اچھا سلوک کیا جائے مگر جب انہیں دوسری جگہ سے کچھ

زیادہ ملتا ہے وہیں کام کرنے لگتے ہیں اور اطلاع تک دیئے بغیر کام چھوڑ جاتے ہیں۔ جوتوں کا گاؤں اچھا تھا مگر میں اس کا مکان نہیں جانتا تھا۔ جامن کے پیڑ کے نیچے تین بچے پیڑ سے از خود گری ہوئی جامنوں کو چن رہے تھے۔ میں نے کار روکی اور نیچے اتر کر جامن کے پیڑ کے قریب جا کر بچوں سے جوتوں کے گھر کا پتہ دریافت کیا۔ بچے مجھے اور کار کو دیکھ کر کچھ سہم گئے کہ میں نے ان کی گھبراہٹ کو دور کرنے کے لئے بڑے پیار سے کہا کیا مجھے جامن نہیں کھلاؤ گے۔ یہ سنتے ہی تینوں کے چہرے پھول کی طرح کھل اٹھے اور اپنی اپنی اکٹھی کی ہوئی جامنوں میں سے اچھی اچھی جامنیں نکال کر مجھے دینے لگے سب سے چھوٹے بچے نے توتلی زبان سے کہا میاں جامن بڑی اچھی ہے کچی لیشا (ریشا) ہے لوکا (کھا) لو۔ بچے کے میلے کچیلے ہاتھوں سے مجھے کراہیت تو ہوئی مگر اس کی توتلی زبان سے نکلے ہوئے پرخلوص الفاظ اس کا معصوم چہرہ اور والہانہ انداز میں جامن کا پیش کرنا مجھے اس قدر بھایا کہ میں نے بلا تکلف جامن لے لی کہ دوسرا لڑکا بے ساختہ کہنے لگا بابو جی یہ بھنگی کا لڑکا ہے اس کے ہاتھ کی جامن نہ کھانا تو میری جامن کھالو۔ اس پر چھوٹا معصوم بچہ قدرے سہم کے پیچھے ہٹ گیا۔ سب سے بڑا لڑکا کہنے لگا بابو جی یہ دھوبی کا لڑکا ہے اور بہت گندہ ہے اس کی جامن نہ کھانا یہ لو میری جامن کھالو میں دھیمر ہوں۔ میں نے تینوں بچوں کی جامنیں لے لیں اور انہیں بڑے پیار سے سمجھایا کہ بھنگی تو ہم سب کی گندگی صاف کر کے ہمیں صاف ہوا میں سانس لینے کی آسانیاں مہیا کرتا ہے۔ ہم اپنے گندے میلے کچیلے کپڑے دھوبی کو دیتے ہیں جنہیں وہ دھو کر ہمیں صاف ستھرا رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ دھیمر ہمارے گھروں کے برتنوں کی صفائی کرتے ہیں اور ہمیں صاف ستھری زندگی بسر کرنے کی راحت پہنچاتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں تو ان سب کا احسان مند ہونا چاہیئے نا کہ ان سے نفرت کریں اور ذات برادری کے چھوٹے بڑے ہونے کی بات کریں۔ ہم سب بھائی بھائی ہیں۔ میں نے یہ کہتے ہوئے تینوں بچوں کی دی ہوئی جامنیں کھالیں جس پر تینوں بچوں کی باچھیں کھل گئیں اور انہوں نے اپنی اپنی ساری جامنیں مجھے دینے کی کوشش کی۔

میں نے بڑے پیار سے بچوں سے کہا کہ یہ سب جامنیں تم سب کھالو اور جیب سے تین روپے نکال کر ایک ایک روپیہ ہر بچے کو دینے کو ہاتھ بڑھایا تو تینوں نے ایک ایک روپیہ لینے سے انکار کر دیا۔ میں نے اصرار کیا تو بھنگی کا لڑکا کہنے لگا بابو جی میں نہیں لوں گا میری ماں مارے گی ایک بار کسی کے آنگن میں اٹھنی پڑی ملی تھی تو میری ماں نے وہی مجھ سے لے کر اسی آنگن میں ہی پھینک دی۔ اور کہا تھا کہ کسی کی چیز نہیں اٹھاتے حرام کی کمائی بری ہوتی ہے۔

دھوبی کے لڑکے نے بھی بتایا بابو جی میری ماں بھی مارے گی میں نہیں لوں گا۔ ایک بار کپڑے دھوتے ہوئے کسی پینٹ میں سے سات سو روپیہ کے نوٹ نکل آئے تھے تو کپڑے کا نمبر دیکھ کر میرے ابا کے ہاتھ پینٹ کے مالک کے گھر بھجوا دیئے تھے۔ میرے ابا نے کہا بھی کہ رکھ لو ہم کون سے کسی کے گھر چرانے گئے تھے۔ کوئی پوچھے گا بھی تو کہہ دیں گے کہ ہم نے نہیں دیکھے۔ مگر میری ماں نے منہ بگاڑتے ہوئے میرے ابا کو ڈانٹ دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ خدا تو دیکھ رہا ہے۔ تب ٹھیک رکھو ایمان کو سنبھالو ابھی دل سے تو پورا ہی رہے گا۔ یہ سنتے ہی میرے ابا ڈر گئے اور روپے واپس کر آئے۔ دھیمر کے لڑکے نے بھی ویسے ہی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا کہ میری بھی ماں مارے گی۔ ایک بار میری ماں کو ایک ساہوکار کے گھر میں پونچھا لگاتے وقت نوٹوں سے بھرا بٹوہ ملا تھا اور اس نے [illegible] کے حوالے کر دیا جب میرے بابا جی کو پتہ چلا تو میری ماں پر خفا ہوئے اور کہا کہ تم نے بے کار بٹوہ واپس کیا۔ [illegible] کام آتا۔ اس پر میری ماں نے بگڑ کر کہا [illegible] ایسے حرام کے روپے نکالتے ہوئے شرم نہ آئی [illegible] بے ایمان بن کر جینے سے تو بھوکے مر جانا بہتر ہے۔ ہم غریبوں کے پاس صرف عزت اور ایمان ہی تو ہوتا ہے اگر یہ بھی چلا گیا تو پھر کیا رہ جائے گا۔

تینوں بچوں نے میرے کٹر ضمیر پر اس زور سے تازیانہ لگایا کہ میں اپنے آپ سے نفرت کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ بچپن میں میری ماں نے بھی مجھے ایسی ہی اچھی باتیں بتائی تھیں۔ عورتیں مردوں کی

بہت زیادہ رحم دل اور مذہبی جذبہ کی مالک ہوتی ہیں اگر امریکہ میں کوئی عورت ہے یہ ذہنیت ہوتی تو ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم نہیں گرائے جاتے۔ میں انہیں خیالات میں گم تھا کہ جگو نے مجھے چپ چاپ دیکھ کر بے زبان ہو کر کہا، بابو جی آپ ناراض ہو گئے ہیں میں نے روپے جیب میں رکھتے ہوئے کہا نہیں میں یہ سوچ رہا تھا کہ گاؤں کے لوگ اپنے گھر آنگن میں جامن۔ آم۔ پپیتا۔ آڑو۔ کٹھل۔ امرود اور کیلے وغیرہ کے پیڑ لگاتے ہیں جن سے پھل بھی ملتے ہیں اور سایہ بھی اور امیروں کے پاس کوٹھیوں میں، یہ وکیریا۔ یوکلپٹس، املتاس۔ رائل پام بسرو اور اشوک کے پیڑ لگائے جاتے ہیں جن سے نہ پھل ملتے ہیں اور نہ ہی بہتر سایہ۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے سے ٹوٹ جاتے ہیں زمین پر آ رہے اور بچے انہیں اٹھانے کے لیے دوڑے۔ اور مجھے جگو کے گھر کا پتہ دریافت کرنے کا دھیان آیا اور میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ وہ اس وقت مکان پر نہیں ہے کیونکہ اس وقت سڑک پر پتھر توڑنے جاتا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ وہ تو میرے یہاں نوکری کرتا ہے اور دوپہر کو کھانا کھانے اور آرام کرنے کے لئے گھر آتا ہے۔ تو وہ پتھر توڑنے کیسے جاتا ہے۔ میری خاموشی کو بھانپتے ہوئے دھنو کا لڑکا بولا بابو جی وہ ہر روز دوپہر کو سڑک پر ایک ڈھیری پتھر توڑ کر ٹھیکیدار سے چار پانچ روپیہ لیتا ہے اور پتھر توڑنے کے بعد نوکری پر چلا جاتا ہے

بچوں سے جگو کی بات یہ سب کچھ سن کر میں نے سمجھ لیا کہ جگو نے لڑکی کی شادی کا بہانا نہیں بنایا بلکہ حقیقت میں وہ ضرورت مند ہے مجھے اس کی تنخواہ بڑھا دینی چاہیے تھی۔ میں نے بچوں کو ہمدردی کی نظروں سے دیکھا اور کار سٹارٹ کر کے گھر کی طرف لوٹا میرا دل بار بار کہہ رہا تھا کہ اگر میں نے جگو کی تنخواہ بڑھا دی ہوتی تو اتنی کڑی دھوپ میں وہ پتھر نہ توڑتا۔ اب میں اس کی تنخواہ اس کی فرمائش سے بھی دوگنی بڑھا دوں گا۔ جب میں سرکاری مال کی چوری کر کے اسے اچھے داموں بیچ کر سرکاری [illegible] سکتا ہوں ان کی پریشانی ادا کرتا ہوں تو جگو کی تنخواہ بڑھانے سے کیا فرق پڑ جائے گا سیمنٹ کے دو کٹے اور نہ سہی۔ سرکاری کی پبلک اس کمائی سے عیش پرستی کرتے ہیں یہ بیچارہ تو ضروری کام میں صرف کرے گا۔ اس طرح ایک غریب کی مدد بھی ہو گی۔ تینوں بچوں کی باتیں اور ان کی ماؤں کی نصیحتیں کار چلنے کے ساتھ ساتھ اسی تیز رفتاری سے میرے دماغ میں گھوم رہی تھیں اور مجھے اپنے پیشے سے نفرت پیدا ہو رہی تھی میرے دل و دماغ میں ہلچل مچی ہوئی تھی سیمنٹ اور لوہا ناجائز طور پر فروخت کر کے ناجائز روپیہ کمانے سے میں دل ہی دل میں توبہ کر رہا تھا مجھے احساس ہو چلا تھا کہ میں غلط کام کر رہا ہوں میری اس حرکت سے قوم اور ملک کا نقصان ہو گا چند روپیوں کا لالچ مجھے خطرناک حالات میں گرفتار کر دے گا۔ میں ایمان فروش ہوں۔ ضمیر فروش ہوں قوم کا دشمن اور ملک کا غدار ہوں۔ یہی سوچتا سوچتا میں گھر پہنچا کار گیراج میں کھڑی کر کے باہر نکلا تو بیوی کہہ رہی تھی کیوں؟ جگو نے آنے سے انکار کر دیا نا؟ مجھے پتہ تھا کہ وہ آپ کے ساتھ نہیں آئے گا کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دے گا تم نے ہی اسے منہ چڑھا رکھا ہے ارے میں کہتی ہوں کوئی دوسرا نوکر... اسی تنخواہ میں مل جاتے تھے بے روزگاری کا زمانہ ہے ایک بلاؤ گے سو آ جائیں گے۔ اسی طرح وہ ہلتے بولتے ہوئے جب ابلتے ہوئے آتش فشاں کی طرح خاموش ہو گئی تو میں نے اسے حقیقت حال سے آگاہ کیا اور اپنی دل کی بات بھی سنائی تو وہ سنجیدگی سے بولی آپ کی تمام باتوں سے میں متفق ہوں۔ دیا دھرم سے ہی آدمی صحیح معنوں میں انسان بنتا ہے۔ مگر آپ کسی سے رشوت لیں یا سرکاری مال ناجائز طور پر فروخت کر کے ناجائز روپیہ نہ کمائیں یہ تو ہو سکتا ہے لیکن کسی کو رشوت نہ دیں یہ نہیں ہو سکتا.........

بیوی نے آخری الفاظ جس زوردار انداز میں کہے تھے وہ اب تک میرے دل و دماغ کو جھنجھوڑ رہے ہیں اور میں ابھی تک اسی تذبذب میں معلق ہوں کہ کیا واقعی رشوت ہمارے معاشرہ میں اتنی گہرائی تک جڑ پکڑ چکی ہے کہ رشوت ہمارا قومی کردار بن چکی ہے؟ [illegible]

ملک و قوم کی شاندار ترقی کے لئے

وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی

کے

جدید بیس نکاتی پروگرام

کی کامیابی اور اُسے عملی جامہ پہنانے میں

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹیو بینک لمیٹڈ

پوری طرح مستعد ہے اور اپنی پوری تمام خدمات وقف کرتا ہے بینک نے موجود
ڈپوزٹ کی رقم پر ۱۰ فیصد سے زائد سرمایہ اسی پروگرام کے تحت پسماندہ طبقوں
کو فراہم کیا ہے

ہیڈ آفس

... محمد علی روڈ بمبئی ...

فون نمبر ۶۵-۳۲۲۳۹۴۱

دہلی برانچ

۵۵۵ نیتا جی سبھاش مارگ دریاگنج دہلی

فون نمبر ۲۹۴۳۴۴ - ۲۶...

غزل

نسیم شاہجہاں پوری

حال پوچھا مرا با دیدۂ تر لوگوں نے
خوب ہنس ہنس کے کہا سب سے مگر لوگوں نے

مئی پہ جشن کئے شام و سحر لوگوں نے
جب سنی میری تباہی کی خبر لوگوں نے

جب کبھی حال مرا رحم کے قابل دیکھا
پھیر لی دیدہ و دانستہ نظر لوگوں نے

کون کم ظرف ہے خود راز یہ کھل جائیگا
کی مری وضع پہ تنقید اگر لوگوں نے

اپنے عیبوں کو چھپانے کے لئے دنیا سے
کتنے الزام لگائے مرے سر لوگوں نے

جس نے خودداری و ایماں کا نہ چھوڑا دامن
اس کو جینے نہ دیا تنگ نظر لوگوں نے

جس کو اک بار بھی دیکھا ہے ترے ساتھ نسیم
اس پہ کیا کیا نہ ڈالے ہیں اثر لوگوں نے

غزل

ہیکش اجمیری

جان دے کر بھی ہوں وعدے کو نبھانے والا
میں نہیں ساتھ ترا چھوڑ کے جانے والا

میں ابھر آیا ہوں چندن کے درختوں کی طرح
خوش ہوا تھا مجھے مٹی میں ملانے والا

کس میرا نہ کبھی دل سے بنا پائے گا
ریت پر نام مرا لکھ کے مٹانے والا

میں محبت کو بنا رکھا ہے
حسن کا کوئی تو ہو ناز اٹھانے والا

میری ایجاد ہے ناپختہ ذہن کی آمد
تو ہے انسانی کھلونوں کو بنانے والا

اور بھی قلب کو مایوس کئے دیتا ہے
مجھ کو بربادی کا احساس دلانے والا

ساری دشواریاں ہو جاتی ہیں آساں ہیکش
شرط بس یہ ہے کہ ہو جان لٹانے والا

غزل

ساجدہ مسعود ایم اے

یہ موڑی دل اُن کو بلایا نہیں جاتا
جاناں بھی اگر چاہوں تو جایا نہیں جاتا

انساں کو خلافت کا شرف مل تو گیا ہے
یہ بارِ گراں اس سے اٹھایا نہیں جاتا

دوں ساتھ زمانے کا یہ ممکن نہیں مجھ سے
خودداریِ فطرت کو دبایا نہیں جاتا

اک شام تخیل کا فسانہ ہے غمِ دل
ہنس کر اُسے اے دوست سنایا نہیں جاتا

پوشاک بدلنے سے بدلتا نہیں انساں
آئینے میں صورت کو چھپایا نہیں جاتا

توبہ ارے ناصح مری توبہ ارے توبہ
توبہ کا بھی اب بار اٹھایا نہیں جاتا

اک طرفہ تماشا ہے مرا ماضیٔ ہستی
بھولی ہوئی باتوں کو بھلایا نہیں جاتا

وہ دیکھ رہے ہیں مجھے میں سوچ رہا ہوں
پھر ساجدہ کیوں اُن کو بلایا نہیں جاتا

غزل

ایم۔ آر قریشی سوز

سرمایۂ حیات ہیں میری غزل کے شعر
محتاجِ التفات ہیں میری غزل کے شعر

اک ربطِ خاص ہے جنہیں فکر و نگاہ سے
وہ رُوحِ کائنات ہیں میری غزل کے شعر

یہ تم کو دیں گے دعوتِ نظارۂ جمال
حُسنِ تجلیات ہیں میری غزل کے شعر

تفسیرِ زیست بھی ہیں یہ تخلیقِ زیست بھی
اک شرحِ کائنات ہیں میری غزل کے شعر

یہ پیار کا تمہیں بھی سلیقہ سکھائیں گے
دل کے معاملات ہیں میری غزل کے شعر

سُنیے گا آپ ان میں صدائے شکستِ دل
غم ہائے کائنات ہیں میری غزل کے شعر

اے سوزؔ اہلِ زیست کو معلوم ہی نہیں
گنجینۂ حیات ہیں میری غزل کے شعر

غزل

کوثرؔ ــــــــ قزدونی

عزمِ دار و رسن کو پلنے دو
وقت کے ساتھ ہم کو چلنے دو

چاندنی پیار کی نکلنے دو
دل اگر جل رہا ہے جلنے دو

تم بزرگوں کی وضع مت چھوڑو
شاہراہوں کو آگ اگلنے دو

اپنی منزل کی سمت بڑھتے رہو
وقت کو کروٹیں بدلنے دو

دل کے آئینے کو جِلا بخشو
زلفِ احساس کو مچلنے دو

ڈھالتا ہے اگر کرن خورشید
شمع کو رات بھر پگھلنے دو

اوج پر تم کو دیکھ کر کوثرؔ
ہم نشیں جل رہے ہیں جلنے دو

غزل

غیاث الدین غیاثؔ
(جھابوہ) ایم۔ پی

غم یہیں ہے یہ نہیں کیوں دامنِ گلشن چھوڑا
ہے قلق یہ کہ بہاروں میں نشیمن چھوڑا

اُس کو احساس ہوا ہو گا تباہی کا مری
ورنہ اُس شوخ نے کیوں ہاتھ سے دامن چھوڑا

مُڑ کے دیکھا نہ کبھی شاخِ نشیمن کی طرف
میں نے جس روز سے اے دوست گلشن چھوڑا

چاند پانی میں اُتر آیا ہمیں ایسا لگا
رات دریا میں جب اُس شوخ نے کنگن چھوڑا

کیا ملا ہم کو زمانے میں کہ دُرست کے سوا
جب سے ہم نے تری سرحد کو ملنے چمن چھوڑا

قوم وہ در پئے آزار ہی دُنیا میں رہی
باخدا جس نے بھی اخلاق کا دامن چھوڑا

مہرباں مجھ پہ رہی گردشِ دوراں اے غیاثؔ
عمر بھر اُس نے کبھی میرا نہ آنگن چھوڑا

غزل

...... یس۔ یم۔ عتیق شکوری شموگہ

اک قیامت تھا نکل گیا سورج | آج دوزخ اُگل گیا سورج
شام ہوتے ہی کوہساروں میں | سر چھپا نے نکل گیا سورج
پوچھئے سارے چاند تاروں کو | رفتہ رفتہ نکل گیا سورج
صبح کو شبنمی بدن لے کر | قطرے قطرے میں ڈھل گیا سورج
ابرِ رحمت کے آڑے آتے ہی | لگ رہا ہے سنبھل گیا سورج
چاند تاروں کو روشنی دے کر | ظلمتوں سے بہل گیا
حسنِ عارض بنا بوقتِ غروب | رنگ کیسا بدل گیا

عارضِ سُرخیٔ شفق سے عتیقؔ
آج کھو سے بہل گیا سورج

اندرا گاندھی

جناب عبدالرب نشتر
نیتوری (دیہرہ دون)

پچھلے چار ماہ سے ہسپتال میں ہوں۔ بستر علالت پر ہی اندرا جی کے افسوسناک قتل کی خبر سنی تو فی البدیہہ یہ اشعار آنسوؤں کے ساتھ ساتھ کاغذ پر نقش ہوگئے۔ (نشتر)

تو غریبوں کی نگہباں تھی اندرا گاندھی
دیش والوں پہ مہرباں تھی اندرا گاندھی
ہم کو مالک کی طرف سے یہ ملا تھا تحفہ
ہم پہ آکاش کا احسان تھی اندرا گاندھی
یاد آئے گی زمانے کو محبت تیری
پیار تھی چاہ تھی ارمان تھی اندرا گاندھی
ذات اور پات کے خانوں میں اسے فٹ نہ کرو
صرف انسان تھی انسان تھی اندرا گاندھی
دشمنوں کے لئے نشتر تھی وہ نشتر جیسی
دوستوں کے لئے قربان تھی اندرا گاندھی

قطعات

سلام ساگری

مرحومہ وزیر اعظم اندرا گاندھی کو خراج عقیدت

... وشواس پر لگا ڈالی | بادفا بن کے اُن جفا کردی
... ایک عورت کا | بزدلی کی بھی انتہا کر دی

... کر اے اندرا گاندھی | تو نے کتنا بڑا کیا احسان
... اتحاد کی خاطر | ملک پر اپنے ہو گئی قربان

... پست ہوئے | جن کے سامنے تھے خونخوار
... اندرا گاندھی | حوصلہ تیرا شیر نر کی طرح

زبانی جنیتی منانے سے حاصل | عمل وہ کرو جس میں ہو کچھ حقیقت
کرو اندرا جی کے آدرش پورے | حقیقت میں یہ ہے خراج عقیدت

کرو قومی یکجہتی دامن بڑھا | اگر تم کو ہے اندرا جی کی چاہت
حکومت کو دیں مل کے ہم تم تعاون | تو ہوں ان کے خوابوں کا تعمیر بھارت

بعد مردن ہو گئی ہے تو اگر اتہاس میں | یعنی اب ہے زندگی دائم تری خاتون ہند
دیش پہ قربان ہو ہر کسی کو کب نصیب | انفرادیت ہوئی قائم تری خاتون ہند

غزل

محمد یٰسین نغمہ کہام گاوں
(سورت)

کون یہ دل میں بس گیا لوگو | جال میں اپنے کس گیا لوگو
کشت دل میں نہ آئی سرسبزی | ابر آ کے برس گیا لوگو
یہ بھی جینے میں کوئی جینا ہے | دل ہنسی کو ترس گیا لوگو
زہر تنہائیوں کا مار گیا | ناگ راتوں کو ڈس گیا لوگو
یہ جو بے وفائی عام ہوئی | جیسے ہاتھوں کا ... گیا لوگو
آنکھ صیاد سے لڑی جب سے | دل سے خوف قفس گیا لوگو
دل نغمہ پہ چھائی غم کی گھٹا | جب کوئی ہم نفس گیا لوگو

غزل

گوہر نام کہنہ گلشن (لندن)

میں اُسے پاتے ہی تنہا ہو گیا | ڈوب کر دریا میں پیاسا ہو گیا
ترک الفت پہ وہ آمادہ ہوئے | رابطہ اُلفت اور گہرا ہو گیا
زندگی کیا اور دے سکتی مجھے | ایک دکھ تھا جو کہ اپنا ہو گیا
ہمسفر تھا تو تو دلکش تھی حیات | ... تیرے میں اک تماشا ہو گیا
جب اُٹھایا ہے مؤرخ نے قلم | ہر ورق میرا ہی چہرہ ہو گیا
جل بجھے حسن رفاقت کے چراغ | پیار کا موسم بھی سپنا ہو گیا
تن بدن میں وحشتوں کا شور ہے | دل کا گلشن ایک صحرا ہو گیا

مجاہدِ افغانستان محافظِ ہندوستان ہے

افغان مجاہدین کی مدد کرنا ہندوستان کی فلاح اور دماغ کے لیے انتہائی ضروری ہے

افغان مجاہدین

کی مدد کے لیے نئے سال ۱۹۸۵ء کا تیرہ ۱۳ شیٹ والا رنگین اور مصوّر کیلنڈر دس روپیہ کا منی آرڈر بھجوا کر منگائیے

محصول ڈاک ہمارے ذمہ ہوگا۔

افغان نیوز بلیٹن

کے مستقل خریداروں کی خدمت میں نئے سال کا یہ تحفہ بالکل مفت پیش کیا جا رہا ہے۔ افغان نیوز بلیٹن کا زرِ سالانہ پچیس روپے بذریعہ منی آرڈر بھجوا کر اس کی مستقل خریداری قبول فرمائیے اور اور یہ تحفہ بالکل حاصل کریں

۳۰۲۰۰۱

انجمن افغان دوستان :- ۱۰۔ سی۔ ایم۔ ایل۔ اے کوارٹرز جے پور راجستھان

SHAN-E-HIND, DELHI

January 198

بھارتی ریلوے آپ کی جائداد ہے۔ بلا ٹکٹ سفر کرنے سے ریلوے کو جو نقصان ہوتا ہے وہ کروڑوں روپے ہے جبکہ اس نقصان کی رقم سے ریلوے آپ کے سفر کی بہترین سہولتیں مہیا کر سکتی ہے تاکہ آپ زیادہ آرام سے سفر کر سکیں۔ بہتر سروس مہیا کی جاسکے جو چیزیں خراب ہو گئی ہیں ان کو بدلا جا سکے۔

اب یہ آپ کا کام ہے کہ آپ اس لعنت کو ختم کرنے میں ہماری مدد کریں۔
.....کیونکہ آخر کار اس سے سبھی کو فائدہ پہنچے گا۔

ناردرن ریلوے

JANUARY 1985 — Phone : 275602 — Regd. No.D-(DN) 370
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 — REGD. No. D-(DN) 353
Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644,57

بالوں کا انداز چاہے کوئی بھی ہو لیکن اگر بالوں کی
یہ گھٹائیں ہمیشہ قائم رکھنا چاہیں، انہیں دراز، ملائم اور کالا دیکھنا چاہیں تو زلفی ہیر
ٹانک ہی استعمال کیجئے۔ یہ گرتے بالوں کو روکتا ہے، خشکی دُور کرتا ہے اور بالوں کی جڑوں کے نیچے تک
پہنچ کر بالوں کی بیماریوں کو ختم کر دیتا ہے۔ زلفی ہیر ٹانک تیل نہیں بالوں کی غذا ہے۔ سر پہ نئے
بال اگانے میں مدد دیتا ہے۔ اپنے بال صابن سے نہ دھویئے۔ یہ بالوں کی جڑوں کو جلا دیتا ہے سر دھونے
کے لئے زلفی پاوڈر استعمال کیجئے جو بالوں کو صاف رکھتا ہے، ان کو ریشم کی طرح ملائم بناتا ہے۔

● شمع [illegible] لیبارٹریز، لال کنواں، دہلی ●

عرب ممالک میں زلفی حاصل کرنے کے لئے رجوع فرمائیں
متحدہ عرب امارات میں
ملک بیوٹی ایجنسی:
● دبئی (فون نمبر: [illegible])
● شارجہ
● ابوظہبی

سعودی عرب میں
ایم ۔ ایم ملیباری

● دیرہ (فون نمبر: [illegible])
دیگر ممالک کے [illegible] کیلئے

شان ہند
دہلی
جلد
شمارہ
سرور نمبر
سرور تونسوی

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۰۶۰
رجسٹرڈ نمبر ۳۵۹۳ (DN) A
رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۶۴۴/۵۷

ایڈیٹر
سردار تونسوی

ماہنامہ

شانِ ہند
نئی دہلی

قیمت سالانہ
بیس روپے
فی پرچہ
ڈھائی روپے

جلد نمبر ۳۴ | فروری ۱۹۸۵ء | شمارہ نمبر ۲

"فغانِ محرومی" تضمین بر اشعارِ اقبال

کندن لال گوہر

کیا بتاؤں تجھ کو کیا گنجِ گراں کھویا ہے
حسن خود آرا گیا، جب ذوقِ نظارا گیا
عقل کی حکمت گئی، اور عشق کا سودا گیا
شوق بے پروا گیا، فکرِ فلک پیما گیا
تیری محفل میں نہ دیوانے نہ فرزانے رہے

* * * * *

اٹھ گئے اہلِ نظر، جلوہ دکھائے گا کسے
تو مسیحا دم سہی، لیکن جلائے گا کسے
جامِ چشمِ مست سے بیخود بنائے گا کسے
غیر تو ساقی سہی، لیکن پلائے گا کسے
اب نہ وہ میکش رہے باقی نہ میخانے رہے

جو دنیا پرکاش سردار تونسوی نے لیتھو کے صفحات خواجہ پریس بیتہ منگو جامع مسجد دہلی، اور بلاک کے صفحات پائینیٹ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر شانِ ہند خلیف ۵۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

بچت کی ایک سرکاری اسکیم جو چھوٹے بچت کاروں کو [illegible] فیصد ٹیکس سے مستثنیٰ سود کے علاوہ 50 روپے تا ایک لاکھ روپے کے کسی بھی انعام کا امکان بھی پیش کرتی ہے۔

ڈاک گھر بچت بنک کے تین لاکھ سے بھی زیادہ کھاتہ دار ایسے انعام حاصل کر چکے ہیں۔
آپ اپنے خاندان کے ہر فرد کے نام کھاتا کھلوا کر اپنے انعام جیتنے کے مواقع میں اضافہ کر سکتے ہیں یا آپ مختلف بنک کھاتے اپنے نام سے جتنے بھی چاہیں کھول سکتے ہیں۔

انعامی اسکیم

ڈاک گھر بچت بنک کھاتے میں کم از کم 200 روپے جمع رکھنے سے آپ پبلک ڈرار کے ذریعے نکالے گئے انعام کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ ڈرار ہر سال جنوری اور جولائی میں نکالے جاتے ہیں۔ ہر ڈرار کے تقریباً 22 ہزار انعاموں کی کل مالیت لگ بھگ 30 لاکھ روپے ہوتی ہے۔

ڈاک گھر بچت بنک میں ۱۰ اپریل تک کھاتہ کھول لیجئے تاکہ آپ جنوری 86ء میں نکالے جانے والے ڈرار میں شامل ہو سکیں۔

بُلبُل چہ گُفت؟ گُل چہ شُنید؟ و صبا چہ کرد

مشاعرہ اندر پرستھ اسٹیڈیم

جشنِ جمہوریت کے سلسلے میں گذشتہ ۳۵ سالوں سے
دو کا مشاعرہ نیز ہندی کوی سمیلن اور پنجابی کوی دربار لال
میں منعقد ہوتے رہے اور جشنِ جمہوریت کی تقاریب
سلسلے میں ہونے والے اس مشاعرہ کا نام ہی لال قلعہ
شاعرہ مشہور ہو گیا اور ویسے بھی تاریخی طور پر اُردو
اعرہ اور لال قلعہ ایک ایسی تثلیث ہے کہ جسے بادشاہان
رنے بھی برقرار رکھا۔ اور جشنِ جمہوریت کے مشاعرہ
بنا سورگیہ پنڈت جواہر لال نہرو کے عہد میں شروع
ئی اور اس مشاعرہ میں کم و بیش ہر سال وہ تشریف
تے رہے۔ اس کے بعد سورگیہ لال بہادر شاستری
لال قلعہ کے مشاعرہ میں تشریف لائے۔ سورگیہ اندرا
ندھی صاحبہ کی مصروفیات اپنے پیش رو وزرائے اعظم
سے کہیں بڑھ گئی تھیں اس لیے غالباً وہ اس مشاعرہ
میں کبھی تشریف نہ لا سکیں اور ویسے بھی اندرا جی کے
عہد میں مشاعرۂ جمہوریت کا معیار منتظمین مشاعرہ کی ذاتی
اغراض کے باعث کم سے کم تر ہوتا گیا مگر اس میں کوئی
شک نہیں کہ لال قلعہ کا مشاعرہ مُلک بھر میں ایک معتبر
اور قومی مشاعرہ کی حیثیت سے اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔

ہمارے بعض قومی رہنما جو قومی یکجہتی اور سیکولرازم
کا نام رٹتے رہتے ہیں ان کے نہاں خانۂ دل میں کہیں
نہیں یہ رمق ضرور رہتی ہے کہ بعض قومی روایات
خصوصاً جن کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق ہو انھیں جیسے
بھی ہو مٹایا جائے۔ لہٰذا کچھ سالوں سے لال قلعہ سے
متعلق اس قومی روایت کو مٹانے کی کھچڑی پک رہی
تھی چنانچہ اس کا اظہار ۱۹۸۲ء میں ایشیاڈ کے
بعد ماف کمل کر کیا جانے لگا اور لال قلعہ مشاعرہ کی
کمیٹی میں یہ تجویز رکھی گئی کہ لال قلعہ کا مشاعرہ جشنِ
جمہوریت اندر پرستھ اسٹیڈیم میں منعقد کیا جائے
مگر بھلا ہو پروفیسر جاوید وششٹ کا اور کچھ ان کے ہم
نواؤں کا کہ یہ تجویز سر سے نہ چڑھ سکی۔

مگر اس سال روزنامہ "قومی آواز" میں یہ خبر شائع
ہوئی کہ جناب گلزار آنند بھارتی نے پریس کانفرنس میں
اعلان فرمایا کہ امسال جشنِ جمہوریت کا مشاعرہ، کوی سمیلن
اور کوی دربار اندر پرستھ اسٹیڈیم میں ہوں گے حیرت ہوئی
کہ اُردو اکاڈمی کی مشاعرہ کمیٹی نے اس سلسلے میں اپنی آواز
کیوں بلند نہ کی۔ ہو سکتا ہے کہ عوام کی آواز اس فیصلہ
کے خلاف بلند ہوتی مگر قومی آواز میں ہڑتال ہو جانے کی
باعث اُردو پرستوں کی آواز بلند نہ ہو سکی۔ دوسرے
کچھ اُردو اخبارات کو کیا پڑی تھی وہ تو خود اس سے
متفق ہیں کہ ایسی قومی روایات جن کے ساتھ مسلمانوں
کا کچھ بھی تعلق ہو وہ نیست و نابود ہو جائیں۔

اس سلسلے میں ایڈیٹر شانِ ہند نے اُردو اکاڈمی
کے سیکریٹری صاحب سے بات کی تو انھوں نے فرمایا
کہ ہمارے گلزار آنند بھارتی جی اور دہلی انتظامیہ یہ چاہتا ہے
کہ اس مشاعرہ میں عوام کا اتنا بڑا مجمع ہو کر دُنیا کے
اُردو کو حیرت ہو

اس میں کوئی شک نہیں کہ امسال جشنِ جمہوریت
کے مشاعرہ میں جمِ غفیر تھا اور یہ جمِ غفیر اکٹھا کرنے کی
وہی ترکیب کی گئی جس طرح عام طور پر ریلیوں میں
عوام کو جمع کر لیا جاتا ہے۔ مگر اس جمِ غفیر نے مشاعرہ

کا مٹی پلید کرنے میں جو اہم کردار ادا کیا اُس سے حکومت دہلی اور شری کلانند بھارتی یقیناً ناواقف نہیں ہیں۔ اور اگر وہ اپنے آپ کو معصوم سمجھتے ہیں تو پھر ہم اُن کی خدمت میں یہ صاف صاف عرض کر دیں کہ مشاعرہ کی ناکامی کے اسباب حسب ذیل تھے۔

۱۔ مشاعرے کو لال قلعہ سے دور رکھنے کے خلاف عوام کا احتجاج۔

۲۔ جناب ڈاکٹر صلاح الدین خاں اور جناب [illegible] کے ذاتی مخالفوں کی رنجش۔

۳۔ مشاعرے کی نظامت تسلی بخش نہیں تھی۔

۴۔ شعراء کی ترتیب قطعاً غلط تھی۔

۵۔ مشاعرے میں داخلے کے پاسوں کو زیادہ تر نا اہلوں کو دیا جانا۔

۶۔ شری کلانند بھارتی کی انتخاب شعراء میں مداخلت

اولین پانچ وجوہات کے بارے میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ رہی چھٹی وجہ تو اس کا کوئی جواب وہ ہے کہ مشاعرہ کمیٹی نے جن شعراء کا انتخاب کیا اُن کے علاوہ [illegible] بھرتی کے شعراء مشاعرہ کمیٹی کی اطلاع کے بغیر کہاں سے آ گئے۔

نور جہاں نور حیدرآبادی جو یقیناً شاعرہ نہیں ہے اُس ... نے خود مدیر شانِ ہند کو بتایا کہ کلانند بھارتی کے ہاں گئیں اور بھارتی جی انھیں دیکھتے ہی کہنے لگے ارے نور جہاں تو حیدرآباد سے کب آئی اور انھوں نے فوراً فون اٹھایا اور اردو اکیڈمی کے سیکریٹری صاحب کہا کہ نور جہاں نور حیدرآبادی کو خود ہی طرف سے دعوت نامہ دیا جائے۔ اور نور جہاں نور کا یہ اپنا بیان ہے کہ انھیں حیدرآباد کا کرایہ وغیرہ دیا گیا۔ جبکہ وہ آگرہ میں رہتی ہیں اور مولانا انور صابری کی بہو بن چکی ہیں اگر نور جہاں نور کا یہ بیان جو اُس نے مدیر شانِ ہند کو دیا غلط ہے ... کی موجودگی میں دیا گیا ہے تو ہم شری [illegible] سے دریافت کرنے کا حق رکھتے ہیں

کہ انھوں نے ایسی حماقت کیوں کی؟ حماقت کا لفظ سے آپ چونکیے نہیں۔ اسی قبیل ہزار داستان جیسے عرفِ عام میں نور جہاں نور کہا جاتا ہے کے بارے میں اگر بھارتی جی نے کسی بھی مقامی شاعر یا کم از کم کنور مہندر سنگھ بیدی سحر سے ہی دریافت کر لیا ہوتا تو وہ یقیناً یہ حماقت نہ کرتے اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے جونہی مشاعرے کی سٹیج پر نور صاحبہ کو دیکھا وہ مشاعرے سے اُٹھ کر چلے گئے۔ بیدی صاحب مشاعرہ کمیٹی کے صدر ہیں انھیں حیرت ہوئی کہ اس ننگِ شاعری کو اس معتبر اور ملک گیر شہرت رکھنے والے مشاعرہ میں کیسے مدعو کر لیا گیا۔

ہمیں مشاعرہ کمیٹی سے بھی مخلصانہ شکوہ ہے کہ شاعروں کا انتخاب کرتے وقت محض نام پڑھے شاعروں کو ہی اولیت دی جاتی ہے ملک کے بہترین شعراء کو محض اس لیے نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اُن کے پاس کوئی ایسا وسیلہ نہیں کہ وہ مشاعرہ کمیٹی کے ارکان یا کلانند بھارتی تک رسائی حاصل کر سکیں۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ایڈیٹر شانِ ہند نے محض ایک شاعر جناب گوہر عثمانی مرادآبادی کے نام نامی کی سفارش کی تھی اور سب نے دیکھ لیا کہ اس کربلائی مشاعرہ میں گوہر عثمانی صاحب پوری غزل سنا سکے اور داد بھی پائی اور نئی دہلی دور درشن نے مشاعرہ کی جو جھلکیاں پیش کیں اُس میں سب سے اولین جگہ گوہر عثمانی صاحب کو دی اور ان کے چھ اشعار پیش کیے گئے جبکہ بڑے بڑے نامور شعراء کا محض ایک ایک یا دو دو اشعار پیش کیے گئے۔ آخر میں ہم اس سال اس مشاعرہ کی بُری طرح ناکامی پر دلی افسوس کرتے ہوئے کلانند بھارتی جی سے کہیں گے کہ وہ اس پرم پرا کو مٹانے کی کوشش نہ کریں جو مشاعرہ لال قلعہ کے ساتھ منسلک رہی ہے اور اگلے سال سے یہ مشاعرہ پھر لال قلعہ میں ہی منعقد کیا جائے۔ ●●

ابوالفصاحت پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی

پدم شری ابوالفصاحت پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی [illegible] فروری [illegible] کو پیدا ہوئے اور ۲۷ جنوری ۱۹۷۶ء کو وفات پائی۔ [illegible] جس طرح داغ دہلوی کے سینکڑوں شاگرد تھے۔ اسی طرح اُن کے آخری شاگرد جناب جوش ملسیانی کے بھی سینکڑوں شاگرد ہیں جن میں حضرت آغا [illegible] ایسے باکمال اور [illegible] پاک میں شہرت یافتہ نام بھی شامل ہیں۔

باقیاتِ جوش، جنون و ہوش، فردوسِ گوش، شرحِ دیوانِ غالب، نغمۂ فردوس اُن کی مشہور تصنیفات ہیں ان کے علاوہ جوش صاحب کے شاگردوں کی غزلوں پر اُن کی اصلاح اور توجیہ کا بہت بڑا ذخیرہ بھی شاہکار اصلاحِ سخن کی حیثیت رکھتی ہے آزاد ہندوستان کے سب سے پہلے ہوم منسٹر پنڈت گووند ولبھ پنت کے ہاتھوں ۱۹۵۷ء میں جوش ملسیانی کو ایک ابھینندن گرنتھ پیش کیا گیا۔

جوش ملسیانی کی وفات کے بعد اُن کے فرزندِ ارجمند جناب عرش ملسیانی نے اُن کے نثری مضامین کا مجموعہ مرتب کر کے کئی سال ہوئے پنجاب گورنمنٹ کو دیا تھا اور اُن کی کلیات بھی ترتیب دے کر بھیجی تھی جن کی اشاعت کی منظوری حکومت پنجاب نے دے دی اور یہ دونوں مسودے پنجاب بھاشا بھاگ پٹیالہ کو چھاپنے کے لیے دے دیئے۔

عرش صاحب کی وفات کے بعد ان کی اہلیہ محترمہ نے پنجاب بھاشا وبھاگ پٹیالہ کو بارہا لکھا کہ جب ان دونوں کتابوں کی اشاعت کے لیے حکومت پنجاب کی منظوری مل چکی ہے تو یہ کتابیں کیوں نہیں شائع کی جا رہی ہیں۔ جناب ساحر ہوشیارپوری خود پٹیالہ اس غرض سے جاتے رہے کہ یہ دونوں یادگار کتابیں پنجاب بھاشا وبھاگ جلد سے جلد شائع کرے۔ مگر معلوم ہوا ہے کہ بھاشا وبھاگ پٹیالہ نے دونوں مسودے حکومت پنجاب کو واپس کر دیئے ہیں کہ اُن کے پاس کتابوں کی اشاعت کا کوئی انتظام نہیں ہے۔

اب جبکہ پنجاب میں راشٹرپتی راج ہے اور ہمارے راشٹرپتی ذاتی طور پر پدم شری ابوالفصاحت پنڈت لبھو رام صاحب جوش ملسیانی سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ اُن کی شرافت و انسانیت اور اعلیٰ شاعری کے معترف رہے ہیں۔ لہٰذا اُن سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ وہ حکومت پنجاب [illegible] کو ہدایت کریں کہ حکومت پنجاب اپنا وعدہ پورا کرے اور حکومت پنجاب اگر دو کتابوں کی اشاعت کا انتظام کرنے سے قاصر ہے تو حکومت پنجاب ماہنامہ شانِ ہند دہلی کو یہ خدمت سونپ سکتی ہے۔ شانِ ہند [illegible] اشاعت سے اس وقت تک کئی بہترین اور قابلِ قدر کتابیں شائع ہو چکی ہیں لہٰذا ہم حکومت پنجاب کی [illegible] کرنے کی ذمہ داری لیتے ہیں۔

۱۳ جنوری کو جناب ساحر ہوشیارپوری نے اپنے دولت کدہ پر پدم شری ابوالفصاحت پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی کے یوم پیدائش کے سلسلے میں ایک نشست کا انتظام کیا جس میں متعدد حضرات نے شرکت فرمائی۔

صفحہ نمبر ۳ کا بقیہ

"مگر باتیں تو معقول کر رہے تھے۔"

"وکالت جو پڑھتا ہے۔"

"اے آپ نے کھانے پر روک کیوں نہیں لیا کبھی گا [illegible] کے بعد گاؤں آیا اور آپ نے اسے کھانے کو پوچھا تک نہیں بارہ بجے تک مجھ کو یہاں بٹھائے رہا۔"

"اچھا تو بات کی اس کی دعوت کر دینا" اور کرشن لال نے ایک مشتبہ نگاہ اپنی ہیرا پر ڈالی باپ کا دل تو ہے قدم قدم پر دھوکا کھاتے تو بہات کرشن لال کے دماغ میں پیدا ہوئے ہوں گے کون کہہ سکتا ہے انہوں نے کہا "اب جاؤ بھی مجھے آرام کرنے دو تھوڑی دیر میں آ کر پھر میرا سر [illegible]"

ہیرا چلی گئی اور کرشن لال ہیرا کی آئندہ زندگی پر غور کرتے ہوئے سو گئے۔

جن جاتا ہے۔ ایک ایسا مُرقع جس میں پاکستان کے مختلف مزاج کے ادیب، شاعر، صحافی، نقاد اور ناشر اپنی اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ اُن کی تصادیر میں تفصیلات نہیں شخصیات ہیں جاننا ممکن بھی نہ تھا اور غالباً وہ ایسے خاکوں کو کتاب میں تبدیل بھی نہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ اس کی محبت ہے کہ اس نے ہر اہلِ قلم کا نام، کام، اور مقام یاد رکھا۔

اس سفرنامے میں رام لعل کی افسانہ نگاری بہت کام آئی ہوگی۔ چنانچہ رام لعل بطور افسانہ نگار افراد اور واقعات کی جزئیات سے جو تاثر آفرینی کرتا ہے اس سے اُس نے یہاں بھی خصوصی کام لیا چنانچہ بعض ادیبوں کے بارے میں اُس نے چند سطروں میں جو تاثرات قلم بند کر دیئے اُن سے اگر اُس کی مفصل تصویر مرتب نہیں ہوتی تو کم از کم اُن کی مکمل فہرست قلم بند کر ڈالی کبھی کبھی تو وہ و شاعری کی صورت تو یقیناً اختیار کر لے جاتے ہیں اور دیکھا جائے تو دن بھر لاتعداد ادیبوں سے ملنا اور پھر اُن سب کی شخصیات کے تاثرات کو محفوظ کرنا آسان کام نہیں یہ رام لعل ہی کا کمال ہے کہ اُس نے اتنا مفصل اور بھرپور سفرنامہ قلم بند کر ڈالا چنانچہ چھوٹی بڑی تفصیلات، اہم اور غیر اہم، معقول اور نامعقول کرتا ہیں ۔۔۔ یہ سب مل کر، ایک ایسی موزیک کی صورت اختیار کرتے ہیں جو پاکستان کے ادبی منظر کی تصویر پیش کرتا ہے ایسی تصویر جو رنگین بھی ہے اور دلکش بھی!

جن دنوں "افکار" میں پاکستان کا سفرنامہ چھپ رہا تھا تو میں نے صبا لکھنوی کو ایک خط (شمارہ اکتوبر ۱۹۸۸ء) میں، جو لکھا اُس پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

" رام لعل چونکہ افسانہ نگار ہیں اس لیے انھوں نے بیشتر جگہ پر ایک افسانہ نگار کی آنکھ سے کام لیتے ہوئے جزئیات نگاری بھی کی ہے۔ اور چھوٹی چھوٹی تفصیلات کو خوبصورتی سے بیان کیا ہے اور ان سب پر مستزاد لاہور سے رام لعل کی ایسی جذباتی وابستگی! جب وہ اس

مکان کو یاد کرتے ہیں، جہاں شادی کے بعد کا پہلا بچہ پیدا ہوئی تو اُن منظروں میں حسرت کی چبھن بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح کتابوں کی دوکان اور قدیم سینما کی عمارات اور اُن میں دکھائی گئیں فلموں کی یادیں بھی جذباتی تلازموں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور اس سے ان کے یہاں رہ جانے کی خواہش کونپل کی طرح پھوٹتی محسوس ہوتی ہے۔

آپ نے بعض اہم تحریریں شائع کی ہیں یہ سفرنامہ بھی انھیں میں شمار ہوگا۔"

یہ تاثر چند قسطوں پر مبنی تھا مگر مکمل سفرنامہ پڑھ لینے کے بعد تو میں اس کی اہمیت کا اور بھی قائل ہو چکا ہوں۔

غزل

● ڈاکٹر محمود دیوآن (لندن)

عقل و خرد کے پاسباں میری بڑی بھلی سمجھ
یہ عشق ہے کھیل آگ کا اس کو نہ دل لگی سمجھ

اہلِ جہاں کی عقل سے بالا ہے بزمِ عشق کی
پروانے ہی نہیں جلے شمع بھی جل اٹھی سمجھ

خودغرضیاں ہیں دہر میں باعثِ رنج جہاں گزیں
اپنی خوشی تو کر چکا میری بھی کچھ خوشی سمجھ

یہ حسن اور عشق تو ہیں کاروبارِ اہلِ دل
میرا شریکِ کار بن۔ خود کو نہ اجنبی سمجھ

جامِ شکستہ کا ملال ہم سے نہ بار بار کر
شیشے سے کم نہیں ہے دل اس کی بھی نازکی سمجھ

کر کے خود کو بے حجاب میرا بھی دل کیا کباب
سُنتے نہیں مگر سب جناب اس کو بھی تو کبھی سمجھ

واعظ ہوں یا کہ شیخ جی دیوآن سے خفا سبھی
اس میں بھی رمز ہے کوئی باتیں نہ بے تکی سمجھ

گوشۂ عقیل صدیقی

دلی اردو اکاڈمی کا مشاعرہ شاعرات

سرور تونسوی

دلی اردو اکاڈمی کی پروگرام کمیٹی کے صدر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اردو کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے اور اس زبان کی اہمیت اور افادیت کا احساس پیدا کرنے کے لیے کئی دلچسپ پروگرام ترتیب دے رہے ہیں لہٰذا اسی سلسلے میں ۲۶ فروری ۸۵ء کو اردو اکاڈمی دلی کے زیر اہتمام ایوانِ غالب میں "خواتین کا مشاعرہ" منعقد ہوا۔

چونکہ ڈاکٹری ہدایات کے مطابق مجھے رات گئے تک جاگنے کی ممانعت ہے اس لیے مشاعرے میرے لیے "شجر ممنوع" کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اردو اکاڈمی کے اسسٹنٹ سیکریٹری جناب عابدی صاحب نے بتایا کہ خواتین کا مشاعرہ ساڑھے پانچ بجے شام شروع ہوگا اور آٹھ بجے تک ختم ہو جائے گا۔ تو میں نے اس خیال سے اس مشاعرے میں شریک ہونے کی دعوت قبول کر لی کہ اندازہ لگایا جا سکے کہ ہماری شاعرات نے پچھلے پندرہ سال میں اردو شاعری کے سلسلے میں کیا ترقی کی ہے۔

کیونکہ گذشتہ پندرہ سال میں میں نے صرف تین یا چار مشاعروں میں ہی شرکت کی جن میں شاعرات کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ دوسری وجہ اس مشاعرہ میں شرکت کی مرتکب یہ ہوئی کہ مدعو شاعرات میں کئی نام ایسے تھے جو میرے لیے بالکل نئے تھے۔ اور تیسری اہم وجہ یہ تھی کہ قارئین شان ہند کا مسلسل مطالبہ رہتا ہے کہ میں حسب سابق کسی نے کسی مشاعرہ کا آنکھوں دیکھا حال لکھتا رہوں کیونکہ "شانِ ہند" کی مقبولیت کی دیگر دو وجوہات " بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر" اور "بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید و صبا چہ کرد" کے علاوہ مشاعروں کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا حال بھی ایک وجہ ہے

لہٰذا اس "مشاعرہ شاعرات" کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا حال لکھنے کی غرض سے "ایوانِ غالب" کی راہ لی۔

سب سے پہلے جناب شریف الحسن نقوی سیکریٹری دلی اردو اکاڈمی سے ایوانِ غالب آڈیٹوریم کی برآمدے میں ملاقات ہوئی۔ نقوی صاحب نے مختلف زاویوں سے اپنی بھرپور مخالفت و مخاصمت کے باوجود اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر دیا ہے کہ کسی اردو اکاڈمی کو کامیابی کی منازل سے ہمکنار کرنا ہو تو کس طرح محنت اور دیانت داری کے ساتھ ساتھ سرکاں مرگ پالیسی اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے کہنے میں کوئی یہ باک نہیں کہ مجھ ایسے آفس زیر پا کو بھی انھوں نے اپنے اخلاق، شرافت و نجابت، حلیمی و انکساری کے ساتھ اپنی کارکردگی کی تفصیل پورے ثبوت کے ساتھ بتا کر قائل کر لیا کہ انھوں نے نہ تو جشن جگن کے لیے اکاڈمی سے روپیہ دیا اور نہ ہی اکاڈمی نے روپیہ کو وہ کسی فضول خرچی میں صرف کرتے ہیں ہر شعبہ کی ایک کمیٹی مقرر ہے وہ کمیٹی جو کچھ منظور کرتی ہے وہ اس پر لفٹننٹ گورنر کی منظوری کے بعد

عمل درآمد کرتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دفتر
شانِ ہند میں کئی شکایات اردو اکاڈمی دہلی کے بارے
میں عام معززین اور سرکاری کارندوں کی طرف سے
برائے اشاعت موصول ہوئیں مگر ایڈیٹر شانِ ہند
نے ان جملہ شکایات پر جب بھی نقوی صاحب سے
بات چیت کی تو انھوں نے پورے ثبوت کے ساتھ
ہر اعتراض کو جھٹلا دیا۔ عوام کو شکایت تھی کہ مجتبے خان
مالک ایجوکیشنل بک ہاؤس کو جو کہ فوٹوگرافی کا بھی کام
کرتے ہیں اکاڈمی کی ہر تقریب کی تصاویر کے لیے بلایا جاتا
ہے۔ اب فدا علی ایسے چابک دست فوٹوگرافر اور دیگر
فوٹوگرافرز ان تقاریب کی تصاویر لیتے ہیں جو تصویر اچھی
ہوتی ہے وہی حاصل کر لی جاتی ہے۔ اور نقوی صاحب
نے یہ بھی یقین دلایا کہ ایجوکیشنل بک ہاؤس سے کتابوں
کی خریداری میں بھی کوئی رعایت نہیں برتی جاتی کی
بلکہ اُسے بھی دوسرے بک سیلرز اور پبلشرز کے مطابق
حصہ رسدی ہی آرڈر ملے گا۔

آڈیٹوریم میں داخل ہوا تو دوسری صف میں جناب
ساقی صاحب کو بیٹھے دیکھا لہٰذا اُن کے قریب ہی نشست
حاصل کر لی مگر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے ہم دونوں
کو صف اوّل میں لا بٹھایا کہتے ہیں کہ جیسے نبی عورت نہیں
ہو سکتی اُسی طرح عورت شاعر نہیں ہو سکتی۔

میں ذاتی طور پر اس قول کا قائل نہیں ہوں۔
مرحوم علامہ عشق آبادی فرمایا کرتے تھے سرور صاحب
میری نظر سے کوئی عورت ایسی نہیں گذری جسے میں
شاعر کہہ سکوں۔ میں نے محترمہ ممتاز مرزا صاحبہ کو ایک
روز اپنے غریب خانہ پر تشریف لانے کی استدعا کی اور
علامہ عشق آبادی کو بھی بلا لیا جب انھوں نے ممتاز مرزا
سے کلام سنا تو فرمانے لگے سرور صاحب ممتاز واقعی شاعر
ہے چونکہ مشاعرہ وقت پر شروع نہ ہو سکا اس لیے مندرجہ
بالا سطور میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے یوں سمجھئے کہ آپ
بھی اسے پڑھ کر ہماری طرح انتظار کا وقت آسانی سے
کاٹ سکیں گے مہمان خصوصی محترمہ سعیدہ خورشید صاحبہ
تشریف نہیں لا سکیں لہٰذا چھ بج کر پانچ منٹ پر جناب
نقوی صاحب مائیک پر کہہ رہے ہیں کہ اس مشاعرہ خواتین
کی صدارت انجمن ترقی اردو ہند دہلی شاخ کی جنرل
سکریٹری محترمہ بیگم حمیدہ سلطان صاحبہ فرمائیں گی سامعین
نے اس اعلان کی طویل تالیوں سے تائید کی ہے اور
بیگم حمیدہ سلطان صاحبہ نے اسٹیج پر مسندِ صدارت
سنبھال لی ہے مدعو شاعرات اور اردو اکاڈمی کی ممبر
خواتین بھی اسٹیج پر تشریف فرما ہو گئی ہیں۔ نقوی صاحب
نے اعلان کیا ہے کہ اس مشاعرہ کی نظامت محترمہ جمیلہ
گپتا فرما رہی ہیں اور مشاعرہ کا افتتاح محترمہ کانتا اگروال
شبنم صاحبہ فرمائیں گی ڈاکٹر رتنا نے صدرِ مشاعرہ کو
اور یاسمین نے محترمہ شبنم صاحبہ کو گلدستہ پیش [illegible]
اردو اکاڈمی [illegible] صدر جناب کنور
مہندر سنگھ [illegible] تشریف لائے۔ اور فرمایا کہ
اردو اکاڈمی اردو [illegible] کے لیے ہم قدم
اٹھا رہی ہے ہم نے اس سلسلے میں کئی دلچسپ پروگراموں
کا خاکہ تیار کر رکھا ہے ایک تمثیلی مشاعرہ بھی کرانے کی
تجویز زیرِ غور ہے۔ [illegible] اگر میں آپ اور
شاعرات کے درمیان [illegible] ابتدائیہ نقوی صاحب اور
دیگر ممبران [illegible] شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے
بھرپور تعاون سے اردو اکاڈمی اچھے پروگرام پیش
کرتی ہے۔ صدارتی خطبہ ارشاد فرمانے کے لیے نقوی صاحب نے
محترمہ بیگم حمیدہ سلطان صاحبہ سے گذارش کی ہے
محترمہ فرما رہی ہیں کہ مجھے تو اس مشاعرہ کی صدارت کیلئے
یونہی پکڑ لیا گیا ہے۔ میں لکھنا ہی جانتی ہوں بولنے کا
شعور نہیں رکھتی۔ میں یہ ضرور جانتی ہوں کہ جیسے خواتین
نے افسانہ نگاری میں اپنا مقام بنا لیا ہے بلکہ مردوں سے
اس زمرہ میں بہت آگے ہیں شاعری کے سلسلے میں بھی
خواتین ایسا ہی نام پیدا کریں۔

اس کے بعد نقوی صاحب نے محترمہ کانتا اگروال شبنم

سے مشاعرہ کا افتتاح کرنے کی درخواست کی ہے شبنم صاحبہ نے مختصر الفاظ میں یہ یقین دلاتے ہوئے کہ ہم خواتین شاعری کے سلسلے میں آگے آنے کی کوشش کر رہی ہیں مشاعرہ کا افتتاح کرتے ہوئے جمیلہ بیگم صاحبہ سے مشاعرہ کی کارروائی شروع کرنے کو کہا ہے۔

محترمہ جمیلہ مناسب الفاظ میں سامعین سے مخاطب ہونے کے بعد مشاعرے کی کارروائی کشمیر سے تشریف لانے والی شاعرہ رُخسانہ جبین صاحبہ سے شروع کر رہی ہیں۔ رُخسانہ جبین ایک قطعہ کے بعد تحت میں غزل ارشاد فرما رہی ہیں یہ

بہت تباہ کیا اب ذرا سنبھال ہوا۔
کہ تیرے قہر سے ہو گئی میں نڈھال ہوا
اسے نے بھی دے تہِ آسمان بستی کے
مجھے نہ سطحِ سمندر پہ یوں اُچھال ہوا
اسے بھی تو نے زمیں بوس کر دیا آخر
یہی تو ایک عمارت تھی بے مثال ہوا

داد ہے کہ سری نگر تک سنائی دے رہی ہوگی۔ سنیئے محترمہ کیا فرما رہی ہیں ؎

وہ ایک لمحہ امانت تھا اب تو لوٹا دے
سپرد تیرے کیا تھا جو پچھلے سال ہوا

اچھا شعر پڑھنے کا انداز شاعرانہ اور اُس پر حسن کشمیر اس شاعرہ نے داد کو شورِ قیامت میں تبدیل کر دیا ہے رُخسانہ جبین غزل کے ایک ایک شعر پر داد پانے کے بعد اپنی جگہ تشریف لے گئیں تو میں نے کنور صاحب سے گذارش کی ایسی شاعرہ کو لال قلعہ کے مشاعرہ میں مدعو کرنا چاہیئے اور انہوں نے اس تجویز کو پسند فرمایا۔

اب اعلان ہوا ہے کہ محترمہ شبانہ نذیر مائیک پر تشریف لا رہی ہیں۔ شبانہ نے ایک مختصر سی نظم "دفا" سنانے اور اس پر بہت اچھی داد پانے کے بعد غزل شروع کی ہے فرما رہی ہیں ؎

چمن کو پھول وطن کو نئی بہار ملے
ہمیں بھی دامنِ صد چاک و تار تار ملے
یہی ہے آمدِ فصلِ بہار کا حاصل
تمام پھول گلستاں میں دل فگار ملے
جنھیں غرور تھا دنیا میں کج کلاہی کا
فرازِ دار پہ ہم کو وہ تاجدار ملے

بیٹی شبانہ اپنے والدِ محترم جناب رفعت سروش سے اچھے شعر کہنے لگی ہے۔ یہ مقطع سنیئے ؎

شبانہ ہم بھی دکھائیں کمالِ شعر اگر
زبان اُردو کو ماحول سازگار ملے

شبانہ نذیر بہت اچھی داد پانے کے بعد مائیک سے الگ ہوئیں۔ تو جمیلہ صاحبہ نے اورنگ آباد کی شاہین شہزاد کو دعوتِ سخن دی ہے۔ شاہین صاحبہ دتی کلاتھ ملز کے مشاعرہ اور اسی ایوانِ غالب کے ایک مشاعرہ میں دھوم مچا چکی ہیں۔ سنیئے لحنِ داؤدی آپ کی قوتِ سامعہ میں اضافہ کر رہی ہے۔ ؎

چند یادوں کے سوا پاس اپنے کیا رہ جائے گا۔
ڈوبتی آہوں کا باقی سلسلہ رہ جائے گا
جانے کیوں رہ رہ کے دل میں گونجتی ہے اک صدا
قافلے چل دیں گے اک دن راستہ رہ جائے گا

داد اس شعر اور ترنم کا حق ہے۔ اور ایوانِ غالب داد سے گونج رہا ہے اکثر نو عمر اور ادھیڑ عمر شاعرات بن سج دھج کر اور اپنے چہروں پہ میک اپ کی تہیں جما کر آتی ہیں کہ جیسے وہ مشاعرے میں نہیں کسی فیشن شو میں شریک ہونے آئی ہیں مگر شاہین سہارا راشٹریہ نسوانی رکھ رکھاؤ اور وقار کی حامل بنی ہوئی ہیں کیا مجال ہے کہ سر سے پلو سرکنے دیں۔ سنیئے نسوانی وقار کی امین شاعرہ کیا آفت ڈھا رہی ہیں نغمہ سرا ہیں ؎

چاہتا ہوں کون ہے لیکن یہ ہوگا ایک دن
عکس کھو جائیں گے سارے آئینہ رہ جائے گا

اچھا شعر [illegible] ترنم لاجواب اور سا[illegible] بہ مشاعرہ [illegible]

دھمال ہوا ہے کہ بس کچھ نہ پوچھیے۔ داد کا شور کم ہوا تو شاہین نے سامعین کو آہ اور واہ کا ورد کرنے کے لیے یوں مجبور کر دیا ؎

رات اپنے ساتھ افسانے کئی لے آئے گی
اور سحر تک کوئی تنہا جاگتا رہ جائے گا

داد پھر اس شعر کا حق ادا کرنے پر مجبور ہو گئی ہے۔ اور میں اپنے پاس تشریف فرما کنور صاحب سے کہہ رہا ہوں کہ لال قلعے کے مشاعرہ میں مدعو کیا جاتا شاہین کا حق ہے شاہین کافی حد تک مشاعرہ لوٹ کر اپنی جگہ تشریف لے گئیں تو جمیلہ صاحبہ نے بڑے رد کے پھیکے انداز میں اعلان کیا کہ اب صبیحہ خان کلام سنائیں گی۔ ایک آواز آئی ہے کہ شاعرہ کا تعارف پورا کرایئے۔ جمیلہ کہنے لگیں آپ گھر کے بھیدی معلوم ہوتے ہیں۔ صبیحہ میری بیٹی ہے اور علیگڑھ یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہونے کے باعث اس میں یہ شعور آیا ہے ماں تو خاک چھانتی رہی مگر بیٹی دنیائے شاعری میں نام کرے گی۔ سنیئے تحت میں صبیحہ قطعہ فرما رہی ہیں ؎

نونہالانِ چمن تم پہ چمن ناز کرے
اپنی خوشبو سے گلستاں کو معطر کر دو
مشعلِ راہ بنو ہر نئی منزل کے لیے
آج ہر راہگزر ہر جادہ کو منور کر دو

ایک قطعہ اور سنانے کے بعد صبیحہ نے ترنم سے غزل شروع کی ہے ؎

اس بستی میں آئے نغمات لیے
باہر نکلیں جانے کیا حالات لیے
شعر کی دنیا عشق و جنوں کی دنیا ہے
ہم بھی آ پہنچے دل میں جذبات لیے
تم آتے تو پھر دل ہلکا کر لیتے
ہم بیٹھے ہیں آنکھوں میں برسات لیے

داد مناسب اور شاعرانہ انداز سے ملی ہے اور صبیحہ فرما رہی ہیں ؎

چھوٹی موٹی چار کتابیں پڑھ کر ہم
آئے ہیں کچھ لفظوں کی سوغات لیے
آ جاؤ تو اس کا مان بھی رہ جائے
رات کھڑی ہے تاروں کی بارات لیے

اس شعر پر داد تو ملی مگر رات کھڑی ہے ذرا کھٹکتا ہے۔ جمیلہ صاحبہ فرما رہی ہیں کہ میرے لیے تو یہ بھی مشکل ہے کہ میں اس کے اچھے شعر پر بھی داد نہیں دے سکتی کنور صاحب فرمانے لگے آخر کسی ماں کی بیٹی ہے"

اب محترمہ ڈاکٹر ذکیہ انجم صاحبہ صدر شعبۂ اردو ماتا سندری کالج نئی دہلی مائیک پر تشریف لائی ہیں اور تحت میں غزل سرا ہیں ؎

دل سے یادوں کی خواہشوں کو مٹائے نہ بنے
یہ وہ قصہ ہے کسی طور بھلائے نہ بنے
سارے ماحول پہ رنجش کا دھواں چھایا ہے
زخم کس کس نے دیئے ہیں یہ بتائے نہ بنے
کھردرے فن کے پسِ پردہ پلے خوش فہمی
اپنے ماحول کے نزدیک تو جائے نہ بنے
لوگ لفظوں کی قبا پہنے ہوئے خوش ہیں مگر
ذہن کا راز چھپائیں تو چھپائے نہ بنے
دل میں شیشوں کی صدائیں ہیں مقید جیسے
نغمہ و ساز سے کچھ ربط بڑھائے نہ بنے
راہِ ہستی ہے بڑی سخت مگر اے انجم
وہ نشاں چھوڑ کہ دنیا سے مٹائے نہ بنے

ڈاکٹر ذکیہ انجم مناسب داد پانے کے بعد اپنی جگہ تشریف لے گئیں تو جمیلہ صاحبہ نے پدم شری محترمہ ممتاز مرزا صاحبہ سے کلام عطا فرمانے کی استدعا کی ہے۔ سنیئے۔ ممتاز صاحبہ ترنم سے غزل عطا فرما رہی ہیں ؎

شامِ فراق بزم سجانے کو آ گئی
پھولوں کی یاد صبح جلانے کو آ گئی
ان کے بغیر پھول کھلا تو کیا نسیم
اکثر چمن میں آگ لگانے کو آ گئی

دشتِ طلب میں دل پہ جو گزری نہ پوچھیے
ٹھنڈی ہوا بھی تیند دوانے کو آگئی
جب بھی کیا ہے جشن چراغاں بہار نے
بادِ خزاں چراغ بجھانے کو آگئی

داد ہے کہ ایوانِ غالب بھی نازاں ہے کہ آج ہماری شاعرات ہند و پاک کے صفِ اوّل کے شعراء کرام سے کسی طرح بھی کم نہیں ہیں۔ خود صدر صاحب کے چہرے سے عیاں ہے کہ شروع میں جو کچھ انھوں نے فرمایا تھا آج کے مشاعرہ کی اکثر شاعرات نے اُسے جھٹلا کر رکھ دیا ہے سنیئے ممتاز صاحبہ کس قدر بہترین شعر عطا فرما رہی ہیں ؎

اُٹھ کر تمھارے در سے بھٹکتے کہاں کہاں
اچھا ہوا کہ موت بُلانے کو آگئی

داد ہے کہ اپنا حق وصول کر رہی ہے اور ممتاز صاحبہ کا مقطع بھی سماعت فرمالیجیے ؎

ممتازؔ بزمِ شعر کہاں اور میں کہاں
اک غم کی داستان سُنانے کو آگئی

ممتازؔ صاحبہ داد و ستائش سے لدی پھندی اپنی جگہ جانے لگیں تو سامعین نے پُر زور مطالبہ کیا ہے کہ ایک غزل اور مرحمت فرمائیں، چنانچہ محترمہ ممتاز صاحبہ نے ایک دوسری غزل کے تین چار بہت اچھے اشعار سنا کر حسبِ سابق داد پاتے ہوئے اجازت چاہی ہے اور اب مائیک پر تشریف لائی ہیں محترمہ ساحرہ قزلباش اور آپ نے راگ پہاڑی میں غزل شروع کی ہے ؎

چاہے اک شب کی ہو دل کشی چراغوں کی
پھر بھی خوبصورت ہے زندگی چراغوں کی
آپ نے تو دیکھا ہے صبح کا حسیں منظر
آپ نے نہیں دیکھی بے بسی چراغوں کی
ہم جلا کے اُٹھیں گے مشعلِ دل و جاں اب
کھو گئی اندھیروں میں روشنی چراغوں کی
بستیوں کی تاریکی اب بھی جگمگاتی ہے
کون بھول سکتا ہے روشنی چراغوں کی

ساحرہ اور اُن کے شوہر نامدار امیر آغا قزلباش دونوں کے لیے داد و دیعت ہو چکی ہے۔ لہٰذا داد ساحرہ نے آج بھی خوب حاصل کی ہے اب اعلان ہوا ہے کہ جناب بسمل سعیدی صاحب ٹونکی مرحوم کی صاحبزادی ڈاکٹر اسماء سعیدی صاحبہ کلام عنایت فرما رہی ہیں سنیے ارشاد ہوا ہے ؎

کب حُسن کی اداؤں میں وہ دلبری رہی
وہ دلبری رہی ہے نہ وہ دل دہی رہی
جس میں خوشی نہ ہو وہ کیا زندگی رہی
روشن نجوم و ماہ رہے روشنی رہی
جب تک ترا خیال رہا چاندنی رہی
ذکرِ زمانہ کیا زمانے میں کیا رہا
انساں میں جب نہ انسیتِ باہمی رہی
بسملؔ سے رہبر تو میسر نہیں رہے
حاصل مگر انھی کی ہمیں رہبری رہی
دل کے اُفق پہ چھائی ہے جب بھی قنوطیت
اُمید کی کرن وہیں کچھ نئی رہی

ڈاکٹر اسماء سعیدی صاحبہ کے کلام میں اپنے والدِ محترم کا رنگ نمایاں ہے مگر جس مشکل زمین میں انھوں نے یہ غزل کہی ہے وہ اس کی نشاندہی کر رہی ہے کہ خواتین شاعری کے میدان میں اب مردوں سے آگے نکلنے کی کوشش میں ہیں۔ اب مائیک پر تشریف لائی ہیں محترمہ مسعودہ حیات صاحبہ ایک قطعہ کے بعد غزل اپنے روایتی ترنم میں شروع کی ہے ؎

ہوتا ہے مہرباں جو ستمگر کبھی کبھی
لگتا ہے اور تیر سا نشتر کبھی کبھی
اک اک ترے خیال سے وہ پھول کھل گئے
[illegible] جو مجھ پہ نیند میں پتھر کبھی کبھی
پاتا ہے منزلوں کو تو تنہا چلے چلو
راہوں میں لوٹ لیتے ہیں رہبر کبھی کبھی

واہ اس شعر پر بہت اچھی داد دی گئی ہے اور سامعین نے

(۳) شعر کو دوبارہ پڑھوایا ہے۔ دیکھیے مسعودہ حیات
صاحبہ کیا عجیب و غریب شعر فرما رہی ہیں ؎

جو مجتہد ہوئے تھے اہنسا کے نام پر
دیکھے ہیں اُن کے ہاتھ میں خنجر کبھی کبھی

داد پھر اپنے نقطۂ عروج پر ہے اور حیات صاحبہ کس قدر
حقیقتِ حال بیان فرما رہی ہیں ؎

گہرے سمندروں کی جو تہہ تک پہنچ گئے
موجوں میں بہہ گئے وہ شناور کبھی کبھی

داد سے کہ حیات صاحبہ کو ملک کی صفِ اوّل شاعرہ
تسلیم کرنے کا اعلان کر رہی ہے اور محترمہ یوں نغمہ
زا ہیں ؎

یک سر بدل چکی ہے محبت کی ہر روش
دیکھو حصارِ غم سے بھی باہر کبھی کبھی
ہم کر سکیں نہ جن کا تصور بھی اے حیات
دیکھے ہیں وہ نگاہ نے منظر کبھی کبھی

حیات صاحبہ داد سے جھولیاں بھر کر اپنی جگہ پر تشریف
لائیں، تو جمیلہ صاحبہ فرمانے لگیں کہ صاحبِ صدر (صدر
صاحبہ کو کہنا چاہیے تھا) کی فرمائش ہے کہ اب میں کلام
سناؤں جبکہ ... اس وقت ... [illegible]
ہیں جبکہ سامعین کی بیشتر تعداد ... میں بھی نہیں
آئی تھی۔ ارشاد ہوا ہے ؎

اک خلش سی ذہن و دل کو ... دے جاتی ہے
راستوں کی بھیڑ میں جب زندگی کھو جائے
لمحہ بے قرار کی ... [illegible]
جب مرا ماضی مجھے اس ... میں یاد آئے ہے
راستوں کی گرد سے منزل کا اندازہ نہ کر
میرا ذوقِ جستجو ہر دم یہی سمجھائے ہے
کس سے سادہ دل لٹا دیتے ہیں ساری کائنات
جب کوئی دزدیدہ نظروں سے کرم فرمائے ہیں

داد تو ... شعر پر ... قدرتی امر ہے ویسے جس
... انداز میں جمیلہ نے یہ شعر پڑھا ہے

وہ ... میں اضافہ کا موجب ہوا ہے۔ جمیلہ صاحبہ
مقطع ارشاد فرما رہی ہیں ؎

تو جمیلہ ایک تدریس ہے ... کتابِ دہر کا
تیرے دم سے داستاں ... [illegible]

اب محترمہ ... صاحبہ شبنم مائک پر تشریف
لائی ہیں۔ وہ قطعات تحت میں سنانے کے بعد
غزل ترنم سے سنا رہی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

جنوں کی جرأت و عظمت کا احترام کرو
کسی کی لغزشِ پا ہو ہمارے نام کرو
بجھا بجھا سا چراغِ حیات ہو کہ ...
یہ ناتمام نشاط ... تمام
خیالِ گردشِ ایام سے ...
ہر ایک لمحے کو ... دورِ جام کرو
دلوں سے ... بیگانگی مٹا ڈالو
اک ایسا ... زنداں کا اہتمام کرو
حرم سے کوئی ... میکدہ چلا آیا
جناب شیخ ہیں بادہ کشو سلام کرو

شبنم صاحبہ ... داد پانے کے بعد جمیلہ صاحبہ
نے ایک رسمی سے تعارف کے بعد محترمہ رفیعہ
شبنم عابدی سے کلام ... [illegible]
... اور ... [illegible]
... رفیعہ شبنم عابدی آئیں تو ... بڑے تیکھے
اور ... ہوئے انداز میں کہنے لگیں، سرزمین دلی
کے ادب نواز ... ذہنوں مسکراتے
... چہروں اور شوخ و شریر آوازوں اور
نگاہوں کو عروس البلاد ... سلام ... من چاہی
شاعرہ کے کلام پر ... کے ساتھ ...
ہوس کا اظہار کافی حد تک بازاری انداز میں کر رہے تھے
رفیعہ شبنم ... سے بالکل خاموش ہو گئی ہیں
اور رفیعہ شبنم نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے ان
نااہلوں اور غیر مہذب لوگوں کو بڑے ہی طنزیہ اور ادبی

شہنائیوں کی گونج میں وہ کھو گیا کہیں
ماتھے پہ میرے اُس کی بندیا بجی رہی
کہنے کو یوں تو ایک اکیلا درخت تھا
کتنی رُتوں سے اُس کی مگر دوستی رہی
آخر مرے خلوص میں تھی کونسی کمی
وہ جاچکا تھا اور میں یہ سوچتی رہی
مجبوریاں، خموشیاں اور نارسائیاں
ان برف کی سلوں میں تمنا دبی رہی
مرچوں کے تیز ہونے پہ وہ چیختا رہا
خود اُس کے بھی مزاج میں تیزی بڑی رہی

رفیعہ شبنم عابدی کے دلوں پر ایک نہ مٹنے والا نقش چھوڑ گئی ہیں اور داد سے لدی پھندی تالیوں کی طویل جھنکار میں اپنی جگہ تشریف لے گئیں تو جمیلہ صاحبہ نے محترمہ بیگم ذکیہ سلطانہ نیّر سے کلام عطا فرمانے کی درخواست کی ہے۔ محترمہ فرما رہی ہیں:

عندلیب خستہ جاں کو نغمہ زن سمجھے تھے ہم
اک خموشی سی تھی جسے سازِ چمن سمجھے تھے ہم
اب کھلا ہم پر کہ دستی دیوانگی بھی مرحلہ
مستقل ہنگامۂ دار و رسن سمجھے تھے ہم
ہمتِ تازہ عطا کی اُس نے سب کو لوٹ کر
راہ بر نکلا وہ جس کو راہزن سمجھے تھے ہم
دل فقط ویرانۂ ماضی ہے اے نیّر جسے
ناصیدہ آرزؤں کا چمن سمجھے تھے ہم

اب ایک ایسی شاعرہ کو مائیک پر تشریف لانے کی تکلیف دی جارہی ہے جس پر شاعری ہمیشہ ناز کرے گی۔ میری مُراد محترمہ ساجدہ زیدی سے ہے۔ آپ نظم کی شاعرہ ہیں اور ان کے نظم کے کئی مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اپنے کسی مطبوعہ مجموعہ سے ایک نظم سنا رہی ہیں۔ کیا زبان ہے کیا اب و لہجہ ہے کہ زبان سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ اُردو کیسے بولی جاتی ہے یہ ساجدہ زیدی سے سیکھیے۔ سامعین کے اصرار پر غزل عطا فرما رہی ہیں۔ ارشاد ہوا ہے ؎

روشِ جنوں کو عالم میں ہمیں دوام کرتے
جو رہ راستوں میں رُکتے دکہیں قیام کرتے
نہ نظر میں آگ جلتی نہ لبوں پہ حرف آتا
نہ نقاب رُخ اٹھاتے نہ صلائے عام کرتے
یہ جراحتوں کا موسم، یہ دفورِ غم کی شبنم
یہی زادِ راہ لے کر سفرِ مدام کرتے
سرِ بزم دوستاں بھی نہ کھلی زبان ہماری
ارے رنجِ نارسائی تجھے کیسے عام کرتے
وہی اک سکوتِ مبہم وہی خامشی پیہم
کوئی ہم زباں ملتا کبھی ہم کلام کرتے

ساجدہ زیدی صاحبہ داد و ستائش کی آوازوں اور طویل تالیوں کی جھنکار میں اپنی جگہ تشریف لے گئیں تو محترمہ سیدہ فرحت علی مخدومی سے جمیلہ صاحبہ نے کلام مرحمت فرمانے کی استدعا کی ہے۔ سنیئے محترمہ فرحت واقعی بے مثال اشعار مرحمت فرما رہی ہیں ؎

صفحۂ دل پر کوئی حرفِ تمنا لکھوں
کچھ بتا اے دلِ مایوس مگر کیا لکھوں
بند خوابوں کے دریچے ہیں ہوا طوفانی
سرد ہے بزمِ تخیل کی فضا کیا لکھوں
میر کی طرح لکھوں قلزمِ ہستی کو سراب
قولِ غالب ہے کہ قطرے کو بھی دریا لکھوں
رگِ احساس میں جب زہر کے نشتر اُتریں
کیسے ممکن ہے کہ قاتل کو مسیحا لکھوں

داد سے کہ سامعین سیدہ فرحت کی پختہ کلام کو تسلیم کر رہے ہیں۔ سیدہ فرما رہی ہیں ؎

اس اندھیرے میں کہاں پاؤں اٹھائے کوئی [illegible]
شبِ تاریک میں کیا صبح کا نغمہ لکھوا[illegible]

سامنے نظروں کے ہے درد کی ماری دُنیا
کیا غم زار کا اس حال میں نوحہ لکھوں
موت کے ساز کی لے تیز سہی سخت سہی
زندگی پھر بھی تری جیت کا نغمہ لکھوں
ہوں جو تنہا میں کبھی خلوت ہستی میں
عظمتِ رُوحِ بشر تیرا قصیدہ لکھوں

بہت اچھی داد پاکر جب سیدہ فرحت صاحبہ اپنی جگہ جانے لگیں تو سامعین نے پُرزور مطالبہ کیا ہے کہ محترمہ ایک غزل اور مرحمت فرمائیں۔ سیدہ محترمہ سیدہ صاحبہ دوسری غزل کا کس قدر بہترین مطلع ارشاد فرما رہی ہیں ؎

محبت میں ہو تش کا رنگ جب شامل نہیں ہوتا
کوئی قاتل نہیں ہوتا کوئی بسمل نہیں ہوتا

اس مطلع اتوار پر خوب خوب داد پانے کے بعد فرحت صاحبہ عطا فرما رہی ہیں ؎

ہمیشہ کھیلتا رہتا ہے جو امواجِ طوفاں سے
سفینہ وہ کبھی شرمندۂ ساحل نہیں ہوتا
نہ جس میں سوز و سازِ زندگی کی لے ابھرتی ہو
دھڑکنے کو دھڑکتا ہے مگر وہ دل نہیں ہوتا

داد کو خوب سے خوب تر سمیٹتی ہوئیں سیدہ صاحبہ فرماتی ہیں ؎

نہ جب تک عشق کی وارفتگی ہو رہبرِ منزل
ہم اہلِ شوق کو لطفِ سفر حاصل نہیں ہوتا

محترمہ فرحت صاحبہ بڑے احترام کے ساتھ مائیک سے اپنی جگہ تشریف لے جا رہی ہیں۔ اور اب اناونسر صاحبہ نے یہ خوشخبری دی ہے کہ صدر صاحبہ بیگم حمیدہ سلطان بھی کلام عنایت فرمائیں گی۔ صدر صاحبہ نے ارشاد فرمایا کہ میں ایک پرانی نظم سنا رہی ہوں جو میں نے ایک تقریب میں استقبالیہ کے طور پر سنائی تھی۔ کچھ اشعار آپ بھی سُن لیجیے ؎

پھر گلوں میں ہے شانِ رعنائی
کہ دُلہن بن کے پھر بہار آئی
پتّا پتّا ہے حسن کی تصویر
بوٹا بوٹا ہے نقشِ زیبائی
گل بداماں ہے ہلکی ہلکی شفق
اُودا اُودا ہے چرخِ مینائی
بھینی بھینی ہے پھر نسیمِ بہار
پھر رہی ہے چمن میں اِترائی
بال کھولے ہیں سنبل تر نے
ہو کے زلفوں کی اُن کی شیدائی
ساریاں سرخ چمپئی اُودی
جامہ زیبی میں شانِ رعنائی
گوندھ کر پھر سمن بروں کے لیے
ہار پھولوں کے ہے صبا لائی
اُڑ کے میکدے سے سوئے چمن
مے ہے ابھی ابھی آئی

اب جمیلہ صاحبہ مشاعرہ کے اختتامی لوازمات انجام دینے ہی والی تھیں کہ انھیں اطلاع دی گئی کہ مُراد آباد سے تسنیم صدیقی صاحبہ آگئی ہیں اس پر جمیلہ صاحبہ نے اعلان کیا کہ تسنیم صدیقی چونکہ سیدھی ہسپتال سے آرہی ہیں اس لیے وہ دیر سے آئی ہیں ایک آواز آئی ہے کہ ہسپتال میں کیا کچھ جننے گئی تھیں اس پر جمیلہ صاحبہ فرما رہی تھیں کہ شعر تو جیسے وہ سناتی ہیں وہی اب بھی سنائیں گی بہرحال اُن کے اشعار کے ساتھ ہسپتال کا کوئی تعلق نہیں ہے [illegible] دے کی اوٹ سے لجاتی۔ شرماتی اندر سے [illegible] لتی ہوئیں تسنیم صدیقی بڑے ناز و ادا سے مائیک پر آ گئی ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ بیٹھ کر پڑھنے کی عادی نہیں اس پر کنور مہندر سنگھ بیدی فرماتے

لگیں کہ اگر آپ کھڑی ہو کر پڑھنا چاہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اس پر تسنیم صاحبہ کہنے لگیں کہ نہیں میں بیٹھ کر پڑھوں گی۔ آپ اُٹھ کر سنیے۔ اس پر کنور صاحب تو خاموش ہو رہے مگر یار لوگ کہاں چوکنے والے تھے لہذا ایک آواز آئی کہ یہ تو آپ کے ساتھ..... کر بھی سن سکتے ہیں۔ مشاعروں میں سامعین یا شعراء یا شاعرات کے درمیان فقرہ بازی اور حاضر جوابی کے نادر نمونے سننے میں آتے رہتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ تسنیم صدیقی ابھی تک حاضر جوابی اور فقرہ بازی میں مہارت نہیں کر سکی ہیں۔ بہر کیف تسنیم صاحبہ نے راگ پہاڑی میں غزل شروع کی ہے غزل پرانی ہے مگر سُن لینے میں کیا برائی ہے دیکھا گیا ہے پیشہ ور شاعرات کے پاس تازہ غزل بہت کم ہوتا ہے۔ اور تازہ کلام تو آج کل مشاعروں میں شاذ و نادر ہی سننے کو ملتا ہے لیجیے تسنیم صدیقی نغمہ سرا ہیں ؎

جھیگا جھیگا موسم ہے وقت بھی سہانا ہے
آ نہ ایسے عالم میں خود کو بھول جانا ہے
گردشِ زمانہ کو آئینہ دکھانا ہے
بجلیوں کے سائے میں آشیاں بنانا ہے
اے غمِ زمانہ تو آج مجھ کو تنہا رہنے دے
آج اُن کی آنکھوں کی جھیل میں نہانا ہے
زہرِ غم کو ہنس ہنس کر اسی لیے پیا ہم نے
آنسوؤں کے سائے میں ہم کو مسکرانا ہے
دیکھیں کس کو ملتی ہے منزلِ وفا تسنیم
اک طرف محبت ہے اک طرف زمانہ ہے

جو مشاعرہ اب تک نہایت ہی اچھے ڈھنگ سے چل رہا تھا اور دراصل یہ مشاعرہ کامیابی سے لحاظ سے آپ اپنی مثال تھا تسنیم صاحبہ کی معقول اندر کسی حد تک غیر سنجیدہ حرکتوں سے ابتذال کی حد تک آ گیا۔ دل پھینک حضرات تسنیم سے دوسری غزل سننے کا اصرار کر رہے ہیں۔ آپ بھی ان کی دوسری غزل کے دو اشعار سن لیجیے ؎

خشک ہونے لگا آنچل میرا
پھر تعاقب کرے بادل میرا
اب کے بچھڑو گی تو کھو جاؤ گی
راستہ روک لے پاگل میرا

یہ شعر تسنیم صاحبہ نے یہ کہہ کر سنایا ہے کہ اپنے مخصوص سننے والوں کی نذر کر رہی ہوں بہر کیف تسنیم صاحبہ نے ایوانِ غالبؔ اچھی خاصی اُدھم مچائی اور صدر صاحبہ کہہ رہی ہیں کہ میں نے ابتدا میں جو کہا تھا وہ کافی حد تک غلط ثابت ہوا۔ یہ مشاعرہ سن کر تو ایسا معلوم ہوا کہ ہماری شاعرات شاعر حضرات سے کسی طور بھی کم نہیں ہیں اور آج کے مشاعرہ میں جو کلام سنایا گیا ہے وہ اُردو دنیا میں قابل تعریف حد تک اپنا مقام رکھتا ہے۔ اس کے بعد محترمہ صالحہ عابد حسین نے سامعین اور شاعرات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا، چٹکیاں میں کہ کچھ شاعرات اپنی شاعری کا حدود اربعہ دل ہی دل میں ناپ رہی ہوں گی۔

میرے لیے آج کی یہ نشست یوں بھی دلچسپ رہی کہ میرے دائیں جانب جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ اور ان کے ساتھ جناب انور دہلوی تشریف فرما تھے اور بائیں جانب جناب ساقی صاحب۔ لہذا اگر شعر پر اور کچھ شاعرات پر جو تبصرے ہوئے وہ مشاعرے کی کارروائی سے تعلق نہیں رکھتا۔ نو بج کر چالیس منٹ پر یہ مشاعرہ ختم ہو گیا ہے۔ ●●

قیس و فرہاد کو دیوانہ بنایا اس نے
شہر بھر کوہ و بیابان میں پھرایا اس نے
خوابِ غفلت ترے عشاق کی بیداری ہے
بیخودی جس کو سمجھتے ہیں وہ ہشیاری ہے
کفر کیا چیز ہے کیا مذہب و دینداری ہے
زہد و تقویٰ ترے میخانہ کی مے خواری ہے
گر ہے مقبول جو تو مجرد نیازِ شیدا
آستاں کا ترے سجدہ ہو نمازِ شیدا

بطور نمونہ مشتے از خروارے، یہی مخولہ بند پیش کیے گئے ہیں۔ اب ملاحظہ کے لیے فریاد نامہ کے چند اشعار پیش ہیں ؎

چارۂ بیچارگاں تجھ سے مری فریاد ہے
جرم بخش عاصیاں تجھ سے مری فریاد ہے
کس کے در پہ جاؤں تیرا آستانہ چھوڑ کر
دے مجھے جائے اماں تجھ سے مری فریاد ہے

ہوں ترا شیدائے قدرت، نام تیرا ہر زباں
ہے مجھے وردِ زباں تجھ سے مری فریاد ہے

"تجھ سے مری فریاد ہے" اس لمبی ردیف نے فریاد نامہ کو اور دل فریب دل ریز و بنا دیا ہے۔

نوائے ضبط کے خالق چودھری رام سروپ ضبط سیتاپوری کو ذوقِ شعر و سخن میراث میں ملا بقول لفظان کے ہم زلف جناب گوپی ناتھ امن لکھنوی نے لکھا استاذی نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی جن کو ان کی مایہ ناز تصنیف بھگوت گیتا کے منظوم ترجمے پر حکومت سرکار سے پدم بھوشن کا خطاب ملا، امن صاحب کے دوست تھے۔ امن صاحب نے اثر مرحوم کی تخلیق سروشِ فطرت پر بھی پیش لفظ لکھا جس کو امن صاحب نے مجھے دے دیا تاکہ میں اثر صاحب کو پہنچا دوں۔ یہ جملہ معترضہ مشکلات ذہنی و قلبی کے تحت مرقوم ہو گیا۔ مزید دیگر اوصاف شعری امن صاحب نے ضبط کے کلام میں درج ذیل خوبیوں کی بھی نشاندہی کی کہ

"ضبط صاحب کو شاعری وراثت میں ملی۔ طبیعت موزوں ۔۔۔ پیدا کیا غزل لکھنے لگے ان کی

شاعری میں غمِ جاناں بھی ہے اور غمِ دوراں بھی۔ نغمۂ شادی بھی نوحۂ غم بھی۔ آپ بیتی بھی، روایتی رنگ بھی ہے اور اُپج بھی۔ متانت بھی ہے اور شوخی بھی دل کی باتیں بھی ہیں اور دماغ کی بھی۔"

امن صاحب نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ عرضِ حال کے تحت ضبط نے اپنے مجموعہ کلام کے چار ادوار بتلائے ہیں۔

دورِ اوّل ۱۹۱۹ء لغایت ۱۹۳۶ء
دوسرا دور ۱۹۵۳ء " ۱۹۵۸ء
تیسرا " ۱۹۵۸ء " ۱۹۶۶ء
چوتھا " ۱۹۶۷ء " ۱۹۷۱ء

شاعری سے متعلق اپنی رائے پیش کرتے ہوئے لکھا کہ "... شاعر کا کلام اس کے دلی جذبات کا آئینہ دار ہوتا ہے جس میں اس کی فطری خصوصیتیں، مزاجی اور فکری کیفیات۔ اس کے گرد و پیش کے حالات، رجحانات، اثر انداز واقعات و حادثات، اس کی مسرتوں، صحبتوں اس کے مشاہدات و تجربات اور اس کے کردار کے نمونے جذب رہتے ہیں ... فن اور ادب نوعِ انسان کا بیش قیمت تجربہ ہے جس سے انسان کی بلندیٔ فکر اور گہرے احساسات ظاہر ہوتے ہیں۔ اس طرح تخلیقِ ادب میں شاعر کی زندگی کا جو حصہ صرف ہوتا ہے اسے اس کی ادبی زندگی کہہ سکتے ہیں (ص ص ۱۰ - ۱۱)

جناب ضبط صاحب کے مجوزہ خیالات درخورِ اعتنا بھی ہے اور خاصے اہم بھی۔ گرد و پیش سے مرتب ہونے والے اثرات جب قالبِ شعری میں ڈھل جاتے ہیں تو شعری کاوشوں میں سوز و گداز، مسرت و بصیرت، خلوص و محبت وغیرہ خصوصیات شگفتگی طور پیدا کر دیتی ہیں۔ نوائے ضبط ۲۵۶ صفحات کو محیط ہے اور غزلیات و نظمیات پر مشتمل ہے۔ چودھری رام سروپ ضبط اپنے والد کی طرح پاکیزگیٔ نفس، حسنِ معاملگی، حب الوطنی، انسان دوستی سے حامل شخص تھے۔ و لہٰذا ۔۔۔ کو بہتر سے بہتر بنانے کا جذبہ ان کے دل ۔۔۔

ملی ہمدردی ہی تک محدود نہ تھا، وہ اپنے جذبات کو عملی جامہ
پہنانا بھی جانتے تھے۔ "دل بہ یار" ہی ہو کر رہ جانا کافی نہیں ہوتا
وہ "دست بکار" بھی رہے۔ ملازمت سے سبک دوش ہو جانے
کے بعد "سروادے" یعنی طلوعِ انسانیت کی تحریک میں جس
ونوبا بھاوے نے شروع کیا تھا شامل ہو گئے۔ وہ زمانے
کو خوش حال دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ گیتا کے مہان اپدیش نشکام
کرم یعنی صلے سے بے نیاز ہو کر عمل پیرا ہونے کی تلقین پر
عمل پیرا ہوئے۔ وہ نظارۂ فلاح و بہبود کو جگہ جگہ بلکہ تمام دنیا
میں دیکھنا چاہتے تھے۔ ملاحظہ ہو یہ شعر ؎

مطمئن ایک نظارے سے اگر دل ہوتا
سینۂ طور فقط نقطۂ منزل ہوتا

"سینۂ طور" کی ترکیب نئی ہے اور بامعنی ہے۔ یہ شعر بیدل
کے درج ذیل سے ملتا جلتا شعر ہے ؎

دل اگر می داشت وسعت بے نشاں بود ایں چمن
رنگ مے بیروں نشست از بسکہ مینا تنگ بود (بیدل)

ملاحظہ ہو درج ذیل اشعار ؎

نہ خدا کی نہ سفینے کی تمنا ہوتی
- قعرِ دریا مری نظروں میں جو ساحل ہوتا

ہر فردِ بشر ہے عیش طلب ہر سانس پہ آسائش کی ہوس
- جب دل سے سکوں ناپید ہوا پھر عیش کا ساماں کیا ہوگا

ہے جذب یہ دل کا کہ ہے یہ کیف نظر کا
- کثرت میں عیاں رنگ ہے وحدت کے اثر کا

ملتا ہے شرف خوبیٔ تقدیر سے ورنہ
- ہر اک کے لیے تختِ سکندر نہیں ہوتا

دل اگر دردآشنا نہ ہوا
اس کا ہونا ہی کیا ہوا نہ ہوا

زندگی خواب سہی یا کوئی افسانہ سہی
سازِ ہستی اسی عنوان میں ڈھلتا دیکھا

ترکِ مے، ترکِ محبت، ترکِ دنیا، ترکِ خود
کر دیا سب ترک لیکن لب پہ تیرا نام تھا

اس شعر میں لفظ ترک کی تکرار سے ایک فارسی
شعر یاد آ گیا تھا

در رہِ عشق نیستم دارم کلاہ چار ترک
ترکِ دنیا، ترکِ عقبیٰ، ترکِ مولیٰ، ترکِ ترک

بس ضبط صاحب نے ترکِ ترک کا ذکر نہیں کیا ہے
ایسی کوئی غزل نہیں ہے جس کے شعر بطور مثال پیش
نہ کیے جا سکیں۔ نظمیں بھی خلوصِ دل نیز وطن پرستی میں
شرابور ہیں۔ "یوم آزادی"، "جہاں گاندھی"، سنت ونوبا
نوجوانانِ وطن سے خطاب، بڑی کامیاب نظمیں ہیں۔ یوم
آزادی شاعر کے نزدیک دورِ انقلاب کا آغاز تھا ؎

پھر زمانے میں دورِ شباب آ گیا
- انقلاب آ گیا انقلاب آ گیا (یوم آزادی)

خدا رسیدہ بڑا باکمال تھا گاندھی
- جہاں میں آپ ہی اپنی مثال تھا گاندھی (جہانِ گاندھی)

پیامِ امن لے کر اک نیا پیغامبر آیا
وہ اک روشن ستارہ تھا جو بھارت میں نکل آیا (سنت ونوبا)

جواہر لال نہرو کے انتقالِ پُرملال پر جو نوحہ ضبط
صاحب نے کہا ہے بہت خوب ہے، پہلا شعر پیش ہے ؎

افسوس ملک و قوم کا رہبر نہیں رہا
دنیا میں آہ ہادیٔ اکبر نہیں رہا

لال بہادر شاستری کے واصل بحق ہو جانے پر
جو نوحہ کہا ہے، مسدس میں ہے اور فنکاری کے لحاظ
سے چکبست اور درگا سہائے سرور کے مسدسوں کی یاد
تازہ ہونے لگتی ہے ؎

رہنمائے قوم اے ہندوستاں کے تاجدار
اے نگہبانِ وطن، اے بیکسوں کے غمگسار
تو وطن پر تھا فدا اہلِ وطن تجھ پہ نثار
تیری ہستی قوم کو تھی باعثِ صد افتخار
ارتقائے قوم کی خاطر ہوا تیرا وجود
ذات سے تیری وطن کی مستقل تھی ہست و بود

مسدس میں کہی ایک اور نظم جو دیانند سرسوتی کے
وحدانیت کے قائل ہو جانے سے متاثر ہو کر کہی
گئی ہے بڑی اچھی نظم ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو

ڈاکٹر شگفتہ کوروکشیتر یونیورسٹی

شش جہت، ارض و سما، زمن و زماں بنتے گئے
حرفِ "کُن" تھا کہ یہ سارے جہاں بنتے گئے
گونج اک راگ میں زمن و زماں بنتے گئے
بڑھ کے اس مکاں میں لامکاں بنتے گئے
میں جو سمٹا ذرّے ذرّے میں سرایت کر گیا
اور جب پھیلا تو بحرِ بیکراں بنتے گئے
زخم تیرا روح کو بس چھیڑنے کی دیر تھی
زخم اپنے آپ اپنی داستاں بنتے گئے
ذہن کے کینوس پہ وہ اک پیکرِ نور تھے
جیسے جیسے سامنے آئے دھواں بنتے گئے
پہلے نظروں کا تصادم، پھر وہ پیہم اختلاط
سلسلے یوں ان کے میرے درمیاں بنتے گئے
جب بھی ڈالی انہوں نے اک بہار آگیں نظر
دل کے ویرانے میں ہر سو گلستاں بنتے گئے
حیرت و عشق، آنسو، آہیں، رنج و حرماں، اضطراب
یوں لق و دق دشت دل میں کارواں بنتے گئے
ہر الم مانی صفت نقاشیاں کرتا رہا
دل کی دیواروں پہ یوں بھی کچھ نشاں بنتے گئے
ابتدا میں ساری فطرت تو وہ بے جان تھی
"شبد" کی ہر گونج پر کون و مکاں بنتے گئے
درحقیقت نا تمامی ہے بنائے کائنات
اور اسی شے سے رموزِ کن فکاں بنتے گئے

بھول کر بھی یاد اُن کی دم بدم آتی رہی
یوں بھی اے شگفتہ نقوشِ جاوداں بنتے گئے

شردھانجلی

(جوزف انور)

بات تیری لکیر لوہے کی
تیرا ہر عزم، عزمِ فولادی
تجھ سے قائم تھی آبروئے وطن
تجھ سے روشن تھی شمعِ آزادی
تیرے سینے میں نرم دل تھا مگر
سخت چٹان ہر ارادہ تھا
درد یوں تو ہزار ہیں لیکن
تجھ میں دردِ وطن زیادہ تھا
پھول بکھرے تھے جتنے گلشن میں
اک لڑی میں پرو دئے تو نے
کھود پھینکیں جڑیں کدورت کی
بیج الفت کے بو دئے تو نے
آگے بڑھتا نہ کیوں بھلا بھارت
تیرے ہاتھوں میں تھی عنانِ وطن
بن گئے مثلِ گردِ راہِ سفر
رہ گئے پیچھے دشمنانِ وطن
سانحہ یہ مگر ہوا کیسا
کس لئے سوگوار ہے عالم
شدتِ غم سے ہو گیا کس کے
سرنگوں آج ہند کا پرچم
حیف صد حیف آج ہم میں نہیں
رہبرِ کاروانِ آزادی
کیسے کہہ دیں کہ ہو گئے قرباں
دیس پہ اپنے صلح کی دیوی
یاد جب جب بھی تیری آئے گی
سوگ ہم یوں ترا منائیں گے
پھول شردھا کے لے کے ہاتھوں میں
یادِ (تیری) پہ سر جھکائیں گے

دو بچوں کے درمیان
تین سال کا وقفہ رکھیے
کھانے کی گولی
کاپرٹی
نرودھ
NIRODH
کوئی بھی طریقہ اپنائیے
davp 84.225
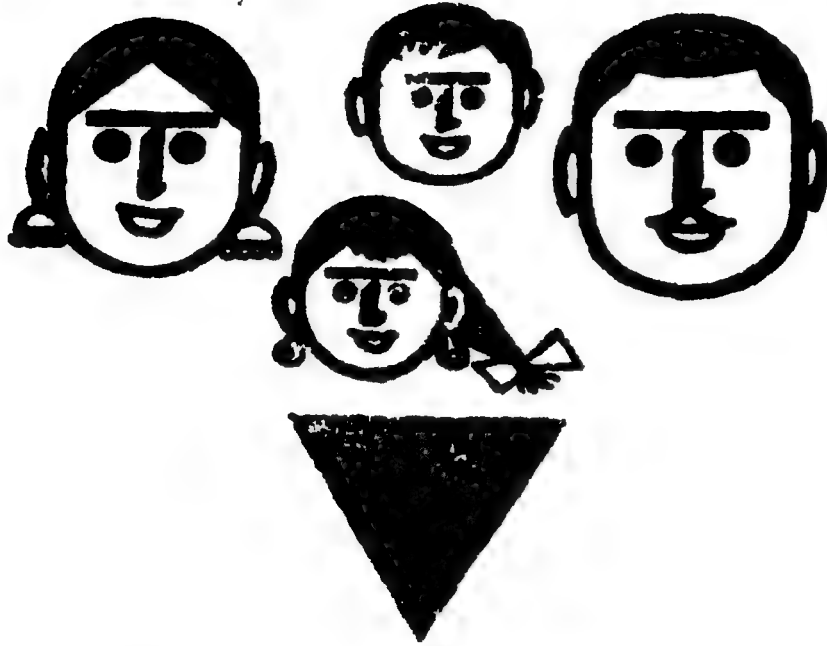
غزلیں

• ڈاکٹر سید المحمود دیوآن (لندن)
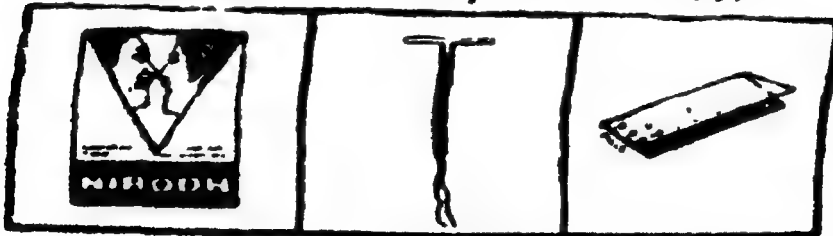
ملتے نہیں ہیں لوگ کسی بدنصیب سے
بچتے ہیں دور دور ہمیشہ غریب سے
جب دیکھا زندگی کو نہایت قریب سے
آنکھوں میں وقت لگتے ہیں کتنے عجیب سے
اب تیرا غم بھی راز بنا کر نہ رکھ سکا
عاجز ہیں اس قدر رہے اپنے نصیب سے
اک تیری بے وفائی سے مجبور ہو گیا
ورنہ کبھی نباہ نہ کرتا رقیب سے
ہمراہ شیخ چلئے بہانہ حسین ہے
ملتی ہے راہ میکدہ کوئے حبیب سے
کچھ اور فاصلے بڑھتے جاتے ہیں دل جگر
نکلے ہیں جب کبھی وہ ہمارے قریب سے
بار گرانِ زیست اٹھانا محال ہے
دیوآن آپ الجھیں نہ اپنے طبیب سے

• محترمہ فاطمہ وثیقہ بانیتی

تسکین قلب کے لیے حسنِ یقین تو ہے
گو سنگ در نہیں ہے ہماری جبیں تو ہے
کیوں آسماں تلاش کریں اپنے واسطے
سجدہ کریں گے خاک پر ممکن زمیں تو ہے
اکثر اسی خیال سے راحت ملی مجھے
اپنا نہیں ہے پر وہ سلامت کہیں تو ہے
جانے یہ کیوں نہ ہم سے اُجڑنے کے بعد بھی
دیکھیں ذرا ہمارا نشیمن یہیں تو ہے
بے وجہ ہاں میں ہاں جو ملاتے تھے کل تلک
اُن کی زباں پہ آج مکمل نہیں تو ہے
ہم جی رہے ہیں اب بھی اسی اعتبار سے
آئے گی صبح نو یہ ہمارا یقیں تو ہے
ہے جس کی یاد اب بھی وثیقہ کا آسرا
وہ دل کے آس پاس ہی پہلو نشیں تو ہے

• شکیلہ جبین قابلؔ

کیا بتائیں تمھیں گزری شب فرقت کیسی
ہم سمجھتے ہیں کہ ہوتی ہے قیامت کیسی
کس کا شکوہ ہے دلِ زار شکایت کیسی
عشق میں جور و ستم کی یہ حکایت کیسی
اب تو ہر اشک ہے آنکھوں میں لہو کا قطرہ
رنگ لائی ہے یہ بربادِ محبت کیسی
جس کو مل جائے تری مست نظر سے صہبا
اس بلانوش کو ہر جام کی حاجت کیسی
ایک آدم کی ہیں اولاد خدا کے بندے
پھر ہے انساں کو یہ انساں سے عداوت کیسی
جب نہ امید رہی کوئی شفا کی قابلؔ
پوچھتے ہیں وہ ہے بیمار کی حالت کیسی

• روپی بھاردواج (گوڑگاؤں)

دل پر لفظ محبت لکھ
رس کی بھری عبارت لکھ
بیگانوں کے من میں بھی
اپنے پن کی عظمت لکھ
پڑھے زمانہ صدیوں تک
ایسی کوئی حکایت لکھ
تو کرموں کی چادر پر
دوزخ لکھ یا جنت لکھ
اپنے سانسوں کے سُر میں
رام نام کی نعمت لکھ
روپی یوگ کی شکتی سے
تو اک نئی شریعت لکھ

بمبئی مرکنٹائل کو آپریٹو بنک لمیٹڈ

رجسٹرڈ آفس ۷۸ محمد علی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

دہلی آفس ۳۶۵۵ نیتاجی سبھاش مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
فون نمبر ۲۶۸۲۶۶ — ۲۶۴۳۷۲

★ ـــ ہمارے یہاں شرح سود تمام نیشنلائزڈ اور شیڈولڈ کمرشیل بنکوں کے مقابلہ ایک فی صد زیادہ ہے۔

★ ہندوستان کا پہلا کو آپریٹو بنک جس کو زرِ مبادلہ میں کاروبار کے لیے لائسنس جاری کیا گیا۔

★ ـــ ہمارے بنک میں اوقاف کی جمع شدہ رقم کی آمد فی دفعہ ۱۳(۵)(الف)(iii) انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔

اس کے علاوہ

★ ہم آپ کے اہم و آسائش کی ضروریات مہیا کرنے کے لیے آسان قسطوں پر قرضہ فراہم کرتے ہیں ایک فیصدی کا فرق بہت بڑا فرق ہے۔ یہ آپ کی رقم میں ہزاروں روپیوں کا اضافہ کرتا ہے آپ بھی اس کا فائدہ اٹھائیں۔

شمیم کاظم
اسسٹنٹ جنرل منیجر شمالی ہند

حسینی۔ ایس۔ ڈاکٹر
(چیئرمین)

زین جی رنگون والا
منیجنگ ڈائرکٹر

یومِ آزادی

حیات ہاشمی
[illegible]۔ایم۔پی

آج تک یاد ہیں وہ غلامی کے دن
بات کرتے تھے غیروں کی آوازیں
صرف دن ہی نہیں سیکڑوں سال تک
کھیت اپنے تھے کھلیان تھے غیر کے
آخر اک دن سرِ آدمیت اٹھا
جس کے سینے میں دل کی جگہ درد تھا
جس نے بے حس جوانوں کو آواز دی
جس نے نبضِ حمیت پہ انگلی رکھی
سرخ ہونے لگی سرزمینِ وطن
ہوش گھٹنے لگا جوش بڑھنے لگا
سلسلہ ٹوٹ پایا نہ منصور کا
رنگ لائیں شہیدوں کی قربانیاں
آج تک یاد ہے وہ مبارک گھڑی
آسماں کی بلندی کو چھونے لگا
گرم زنجیروں کا بازار ہونے لگا
حسنِ الفت سے گاہک جو [illegible]
غربت دور سے دور ہوتی گئی
اب نہ شکوے نہ کوئی شکایت رہی
مل چلے اہمیت [illegible] ہو گئے
زیست کا نغمہ گانے لگی کامنی

دن کو جب رات کہنے پہ مجبور تھے
جی رہے تھے مگر زیست سے دور تھے
قبضۂ غیر میں اپنی قسمت رہی
ہاتھ میں اپنے بس اپنی محنت رہی
جس کے چہرے پہ تیور بغاوت کے تھے
جس کی آنکھوں میں آنسو شرافت کے تھے
جس نے بوڑھوں کو زورِ جوانی دیا
خون کو جس نے حکمِ روانی دیا
اور شہیدوں کی تعداد بڑھنے لگی
باڑھ سی فوجِ آزاد بڑھنے لگی
ٹوٹ کر رہ گئیں خود ہی [illegible]
ہو گیا آخر آزاد اپنا وطن
سیکڑوں سال کی جہد کا ماحصل
وہ ترنگا نشاں وہ نشانِ عمل
رنج و غم کی دکانوں میں تالے پڑے
تو عداوت کی کانوں میں جالے پڑے
پاس سے پاس آتی گئی دوستی
اب نہ تدبیر تقدیر کو کوستی
لہلہانے لگی محنتوں کی فصل
اُس کے کھلیان پر آج اُس کا دخل

یہ حقیقت ہے لیکن حقیقت یہ ہے
مشکلوں سے ملی ہیں یہ آسانیاں
بھول جانا سبھی بھول جانا، مگر
یاد رکھنا شہیدوں کی قربانیاں

اور دھرتی کانپ اٹھی

(تیسری قسط)

احمد حسین شمس ایڈووکیٹ
(کشن گنج)

۔ ہر جگہ کمیونزم کا راج ہوگا۔ کمیونزم وقت کی پکار ہے اسے اب کوئی نہیں روک سکتا۔ نوجوانوں کے خیال میں ایلا مترقی تھا تاہم اس کے منوہر کو محبت تھی وہ چاہتا تھا کہ ابھی اور بحث ہو۔ اور اگرچہ کشن لال اسے ہر بات میں شکست دیتے جا رہے ہیں مگر گفتگو کا سلسلہ جاری رہے اور صرف اس لئے کہ یہ گھر ہیرا کا تھا ہیرا کا نام ہی منوہر کے لیے سکون کا باعث تھا اس نے کہا "اگر آپ کہیں تو میں اشتراکی لٹریچر آپ کو پڑھنے کے لئے دوں"

"نہ! ایسی غلطی ہرگز نہ کرنا اشتراکیت کو کتابوں اور پمفلٹوں ہی میں رہنے دو یہ بلا ہے جو ہندوستان پر نازل ہونا چاہتی ہے۔ جو ازم مذہب کا مذاق اڑائے وہ بھی کوئی ازم ہے ایسے ازم کے سائے سے بھی گریز کرنا چاہیئے۔"

"مذہب انسانیت ہی کا دوسرا نام ہے۔"

"تو کس مذہب نے انسانیت کی مخالفت کی کہ آج کمیونزم اور سوشلزم کی ضرورت آپڑی"

"آپ ذرا طیش میں آ گئے"، منوہر نے ذرا مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم نے ایسی بات ہی کیوں کہی تمہاری باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ چونکہ مذہب نے انسانیت کی خدمت نہیں کی اس لئے اب ان ازموں کی ضرورت آپڑی"۔ کشن لال کی پیشانی پر شکن آ گئی۔

"ابھی چند سال پہلے بنگال، بہار اور پنجاب میں جو اس قدر خونریزیاں ہوئیں بے گناہوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ بوڑھوں اور اپاہجوں کو ریزہ ریزہ کر دیا گیا۔ معصوم بچوں کو نیزہ پر اچھالا گیا۔ عورتوں کی عصمتیں لوٹی گئیں ۔۔۔ یہ سب سوشلزم اور کمیونزم کے نام پر؟ ہندوؤں نے اپنے بھگوان کو پکارا مسلمانوں نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور پھر تلواریں تھیں کہ شب و شب بے گناہوں کے خون سے رنگین ہوتی گئیں مذہب نے ہمیشہ انسانیت کا گلا گھونٹا ہے اسلام صلح آشتی کا دعویٰ کرتا ہے مگر مسلمانوں کی تاریخ کا ہر ورق خونیں داستان سے رنگین ہے عیسائیت اور بدھ ازم محبت اور اہنسا کے داعی ہیں مگر ان کی تاریخیں اس کے خلاف ثبوت دیتی ہیں ہندوؤں اور یہودیوں نے مذہب کے نام پر کیا کم خون بہایا ہے کہ ان کی طرف سے نظریں پھیری جائیں مذہب عبارت ہے نفرت سے دھرم نام ہے تعصب کا خدا اور بھگوان کا فقط بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ انہیں کا ان کا حوالہ دے دے کر ایک دوسرے کی گردن ماری جائے اور آپ کہتے ہیں۔ مذہب نے انسانیت کی خدمت کی ہے"

منوہر اتنی باتیں ایک سانس ہی میں کہہ گیا۔

"مگر افراد کی غلطیاں مذہب اور دھرم کو بدنام نہیں کر سکتیں نہ مسلمانوں کو بدنام کر سکتے ہیں جو اسلام کو نہیں ہندوؤں کو گالیاں دے سکتے ہیں ہندو دھرم کو نہیں دھرم اور مذہب اصول و اعتقادات ہی سے پہچانے جاتے ہیں"

کشن لال ذرا دھیمے پڑے۔

"جی نہیں جو اصول عملی جامہ نہ پہن سکے وہ اصول نہیں مذہب انسانیت کا نام نہیں"

"مگر ڈاکٹر اقبال نے تو تمہارے خلاف فتویٰ دیا ہے مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا"

اور انہوں نے یہ بھی تو کہا ہے۔

آپس میں بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

یہی خدا اور بھگوان مسلمان اور ہندو کو اپنا

میں خلفشار نہیں دیتے اسلام اور ہندو دھرم کو تو چھوڑیئے خود ہندوؤں تک یہاں شودروں کو ناپاک سمجھا جاتا ہے لاکھ کوشش کرنے پر بھی شودروں کو مندروں میں جانے کی اجازت نہیں کیا گارے اور اینٹ کی بنی ہوئی عمارت اتنی مقدس ہے کہ انسان کے داخلے سے وہ ناپاک ہو جائے ایسی عمارتیں کیوں خواہ مخواہ زمین گھیرے کھڑی ہیں ان عمارتوں کو مسمار کر دینا ہی بہتر ہے جو انسان اور انسان میں تفریق کی باعث ہوں ......"

ابھی بات یہیں تک پہونچی تھی کہ ایک شور و غوغہ سنائی دیا ایک ہنگامہ تھا جو کشن لال کی کوٹھی کی طرف بڑھتا ہوا آرہا تھا آگے آگے گائے بیل اور بھینس اس کے پیچھے عدالت کا ایک چپراسی اور اسی سرکل کے چوکیدار وردی پہنے ان کے پیچھے سلیم میاں اپنے بال بچوں کے ساتھ۔ اور ان کے پیچھے بستی کے چند نوجوان ہوٹنگ کرتے ہوئے چلے آرہے ہیں اور سب کے پیچھے میاں حسین بخش کا برق انداز دلاور خاں لٹھ سنبھالے ہوئے۔ سلیم رو رہا تھا برق انداز دلاور خاں اس کی ماں بہن کو گالیاں دے رہا تھا۔

سامنے مویشیوں کو گھیر کر رکھا گیا دلاور خاں لاٹھی ٹیک کر وہیں کھڑا رہ گیا چپراسی برآمدے میں آیا اور آداب بجا کر ایک طرف کھڑا ہو گیا سلیم میاں کی آنکھیں گنگا جمنا بہا رہی تھیں سنوہر اس منظر سے متاثر ہوا مگر کشن لال بدستور مسکرا رہے تھے۔

سلیم نے آگے بڑھ کر روتے ہوئے کہا "......

حضور کچھ فیصلہ کر دیجئے۔"

کشن لال نے چپراسی سے پوچھا "کی ڈگری"

چپراسی نے کہا۔ "ایک سو پچاس روپے کی"

سلیم مونہہ پر سر ٹیک کر کہنے لگے "حضور بالکل غلط میں نے میاں صاحب سے صرف پچاس روپے قرض لئے تھے۔ سو روپے دے چکا ہوں اب ایک سو پچاس روپئے کی ڈگری کیسے ہو گئی؟"

"تم چپ رہو!" کشن لال نے ڈانٹ کر کہا اور سلیم واقعی چپ ہو گیا۔

کشن لال نے چپراسی سے پوچھا "تم روپیہ لوگے یا یہ جائیداد؟"

"سرکار" چپراسی نے کہا "روپے تو سلیم میاں عدالت میں جاکر پیش کریں میں تو ان مویشیوں کو لے جا رہا ہوں"

"سلیم بول اٹھا مگر حضور غضب ہو گیا دودھ دینے والی گائے اور بھینس یہاں لانے کے پہلے ہی دلاور خاں میاں صاحب کے گھر پہونچا آیا ہے"

ابھی اس نے اتنا کہا ہی تھا کہ دلاور خاں اپنی جگہ سے تڑپ کر آیا اور کشن لال کے سامنے سلیم کی گردن پکڑی اور اسے جھنجھوڑ کر اٹھایا اور چند گالیاں دے کر کہا "حرامزادہ سرکار کے سامنے بھی جھوٹ بولتا ہے وہ گھونسے جاؤنگا کہ اٹھ کر پانی بھی نہ پی سکے گا" سلیم کا چھوٹا بچہ چیخ مار کر رو اٹھا اس کے بڑے لڑکے نے آگے بڑھ کر اپنے باپ کو سنبھالا اور دلاور خاں کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس ضعیف انسان پر تمہیں ہاتھ اٹھاتے ہوئے شرم بھی نہیں آتی اور وہ بھی سرکار کے سامنے۔"

"برآمدے پر ایک بھیڑ لگ گئی تھی کشن لال کے گھر کی عورتیں دروازے کی اوٹ میں آکر کھڑی ہو گئیں کشن لال کا پوتا نندن دوڑا دوڑا آیا اور ہکا بکا ایک ایک کا مونہہ تکنے لگا سنوہر پیچ و تاب کھا رہا تھا اسے چپراسی سے زیادہ برق انداز پر غصہ آرہا تھا اس نے مجمع پر نگاہ ڈالی مجمع بالکل شانت تھا مویشی دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر بدستور جگالی کر رہے تھے سامنے پوال کے ڈھیر پر بھینس نے اپنا مونہہ ڈال دیا تھا۔

سلیم نے دلاور خاں سے کہا۔ تم بھی مسلمان ہو میں بھی مسلمان ہوں قرآن پاک کی قسم کھا کر کہو تم چپراسی کے ہاتھ میں روپے دے کر گائے بھینس لے کر چپت نہیں ہو گئے یہ دونوں چوکیدار بھی گواہ میں"

دونوں چوکیداروں نے فوراً کانوں پر ہاتھ دھرے

لاتعلقی میں سر ہلا کر کہا "کیوں سلیم میاں یہ سفید جھوٹ کیوں؟"
سلیم نے کہا "اے بھائی چوکیدار سا چپراسی تو عدالت کا آدمی ہے دلاور خاں حسین بخش کا برق انداز ہے مگر تم تو ہمارے علاقے کے آدمی ہو اب تم لوگوں نے ہمیں جھوٹا بھی ٹھہرا دیا۔"

"تو آپ بچے ہی کب کے ہیں" کشن لال نے ایک معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔

منوہر نے کہا "کشن کاکا! کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ ڈیڑھ سو روپیہ دے کر سلیم کی جائیداد بچا لیں۔"

"تو تم نے سمجھا نہیں" کشن لال نے کہا "یہی تو سب سے پہلے میں نے چپراسی سے پوچھا تھا وہ تو حکم کا بندہ ہے وہ اپنی طرف سے تو کچھ نہیں کر سکتا اور ابھی تمہیں ان باتوں میں دخل دینے کی ضرورت نہیں جب وکیل بن جاؤ گے تو ان باتوں کو خود سمجھنے لگو گے۔" پھر انہوں نے چپراسی سے پوچھا "یوں بھئی تم نے کچھ دانا کھایا ہے؟"

"نہیں حضور صبح سے تو اسی آسامی نے جان کھا رکھی ہے کھانے کی فرصت کہاں؟"

"اچھا تو آرام کرو پہلے آتما تب پرماتما" پھر انہوں نے سلیم سے کہا "سلیم میاں تم بھی مکان جاؤ میں سب انتظام کئے دیتا ہوں ہاں آتے وقت جو میں نے کہا ہے کہ لیتے آنا" اور پھر انہوں نے اپنے نوکر سے کہا "لوگوں سے کہہ دو یہاں سے چلے جائیں وقت بہت زیادہ ہو گیا ہے"

نوکر نے حکم کی تعمیل کی دونوں چوکیدار بھی دو بجے آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

منوہر اٹھا اور اس نے بھی اجازت چاہی۔

کشن لال نے کہا "منوہر! میں نے جس کام کیلئے تمہیں بلایا تھا وہ تو چھڑا ہی نہیں تم نے خواہ مخواہ کی بحث چھیڑ دی ذرا شام کو ٹہلتے ہوئے چلے آنا تم سے باتیں کرنے میں ذرا لطف آتا ہے۔"

منوہر کے چلے جانے کے بعد کشن لال نے چپراسی سے سرگوشیاں شروع کر دیں۔ پروانہ دیکھا ڈیڑھ سو روپیہ کی ڈگری تھی ڈیڑھ سو روپے میں ایک بھینس جو دو تین مہینے کے اندر اندر بچہ دینے والی ہو اور دس بیل ہنکائے گئے نہیں چپراسی کو ڈگری کے روپے سے غرض ہے ان مویشیوں سے اسے کیا مطلب مگر یہ قانونی بات سلیم کے سامنے ہونی چاہئے۔

کشن لال نے دلاور خاں اور چپراسی کے کھانے کا انتظام کر دیا اور خود اندر جا کر کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں لیٹ رہے نوکر حقہ دے گیا اسی سے دل بہلانے لگے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہیرا ان کے کمرے میں آئی ایک دفعہ پھر کشن لال مغموم ہو گئے۔ بیٹی کی جوانی عذاب جان سے کم نہیں لڑکی گھرانے کی عزت ہے جوان لڑکی اور یہ مذموم دنیا! عزت حاصل کرنا آسان کام نہیں بڑی مشکل سے عزت اور شرافت حاصل ہوتی ہے مگر ایک ہلکی سی لغزش بڑے سے بڑے شریف کی پگڑی اتار لیتی ہے اور خصوصاً اس وقت تو انسان منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا جب کسی بے عزتی اور بدنامی کی وجہ خود اس کی اپنی لڑکی ہو۔

ہیرا نے پوچھا "یہ ہنگامہ کیسا تھا دروازے پر"
"سلیم میاں کی جائداد قرق ہو گئی ہے"
"آپ کیوں نہیں چھڑا لیتے؟"
"یہی تو سوچ رہا ہوں ورنہ سلیم تباہ ہو جائے"
"اور منوہر سے کیا باتیں ہو رہی تھیں"
"وہ پاگل ہے کہتا ہے دھرم نے ہمیشہ انسان کو نقصان پہنچایا ہے۔ ہونہہ" اور کشن لال مالش لینے لگے۔
"وہ ناستک ہو گیا ہے کیا؟"
"رام جانے لڑکا برا نہیں مگر کالج جا کر دھرم نشٹ کر دیا ہے شاید۔"

(بقیہ صفحہ ۵ پر)

سرِ معرفت
ایک ہزار روپیہ انعام

شریمد بھاگوت گیتا کا منظوم اردو ترجمہ جس کے متعلق دعوے سے کہا جاسکتا ہے کہ اردو میں آج تک ایسا سلیس اور عام فہم منظوم ترجمہ شائع نہیں ہوا۔ اگر کوئی صاحب اس دعوے کو جھٹلا سکیں تو انہیں ایک ہزار روپیہ نقد انعام دیا جائے گا سرِ معرفت کے شروع میں شریمد گیتا سے متعلق جو معلومات دی گئی ہیں آج تک کم سے کم اردو میں ان کا وجود نہیں تھا مؤلف ابوالفصاحت پنڈت رادلام رتن پنڈوری نے گیتا سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے سرِ معرفت میں جو واقفیت بہم پہنچائی ہے اس سے گیتا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے

قیمت صرف ۱۲ روپے علاوہ محصول ڈاک

(پتہ)

دفتر شانِ ہند فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ دریاگنج دہلی ۲

غزل

• سید ابو محمد قیام افقی (اعظم گڑھ)

نالوں میں اثر ہوگا تو کچھ ہو کے رہیگا
وہ بیج محبت کا کبھی بو کے رہیگا

ہر وقت بھروسہ ہے مجھے ابرِ کرم کا
سب نامۂ اعمال سیہ دھو کے رہیگا

اے غافلو ہوشیار زمانے کی ہوا سے
وہ قافلہ لٹ جائے گا جو سو کے رہیگا

شکوہ نہ کسی کا نہ شکایت ہے کسی کی
قسمت میں جو لکھا ہے وہی ہو کے رہیگا

واقف نہیں آداب محبت سے مرا دل
جو چاہتے ہیں آپ وہی ہو کے رہیگا

باتوں کا پرکھنا انہیں قیام آئے نہ جب تو
وہ فتنۂ دل اپنا کبھی کھو کے رہیگا

شمالی ہند کے مشہور غزل گو
حضرتِ گوہر عثمانی کا

مجموعۂ کلام (قیمت پچیس روپے)

اعتراف :۔ شائع ہوگیا ہے بہترین کلام مشاہیرِ ملک کے گرانقدر مضامین سے مزین۔

تقسیم کار :۔ ماہنامہ شانِ ہند فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۱۱۰۰۰۲

دلی انتظامیہ ترقی کی شاہراہ پر

عوامی خدمات کے دو سال

★ منصوبہ جاتی اخراجات میں تین گنا اضافہ۔ سال ۸۰-۱۹۷۹ء میں ۱۴ء۱۰۷ کروڑ روپے سے بڑھ کر سال ۸۵-۱۹۸۴ء میں تقریباً ۲۹۰ کروڑ روپے۔

★ کمزور ترین طبقے کے لوگوں کی حالت سدھارنے کے لیے بیس نکاتی پروگرام کے تحت چلائی جا رہی اسکیموں کے لیے منصوبہ جاتی اخراجات کا ۳۰ فی صد وقف۔

★ سال ۸۵-۱۹۸۴ء میں صنعتی اکائیوں کی تعداد بڑھ کر ۶۵ ہزار ہو گئی جبکہ سال ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۵۵ ہزار تھی۔ تین مقامات پر ایک کھڑکی سیوا کا شروع۔ جھاڑ کانکنی علاقے میں جدید طریقے سے کھدائی کا کام شروع۔

★ ہزار صنعتی پلاٹوں کے فروغ کا کام آخری مرحلے میں۔

★ عام صارفین کے فائدے کے لیے چلتا پھرتا بازار اور مناسب داموں والی ۲۳۰۰ ہزار سے بھی زیادہ دکانیں موجود۔ کارپوریشن آف انڈیا کے گوداموں سے راشن کی خوردنی اشیاء کی براہ راست فراہمی۔

★ میٹرو پولیٹن کونسل نے صارفین خریدہ (تنازعات) بل پاس کر دیا ہے۔

★ بین صوبائی بس اڈے کے پاس دریائے جمنا پر ۷ء۳ کروڑ روپے کی لاگت سے تعمیر ہونے والے پل کا ۲۰ فی صد کام مکمل وغیرہ اور لونیان والے پلوں کی تعمیر بھی تقریباً مکمل۔

★ سبھی کے لیے ابتدائی تعلیم کے نشانہ کو پورا کرنے میں دلی ملک سب سے آگے۔

★ تکنیکی تعلیم کو بڑھاوا دینے کے لیے فوٹوگرافی انسٹی ٹیوٹ اور دلی ٹیکنالوجی انسٹی ٹیوٹ کا قیام

★ ۵۰۰ بستروں والے دو اسپتالوں اور ۱۰۰ بستروں والے اسپتال کی تعمیر بڑے پیمانے پر جاری دیہی اور دور دراز کے علاقوں میں پالی کلینک اور ڈسپنسریاں کھول گئیں۔

★ خاتون صنعت کاروں کے لیے بننے والے صنعتی کمپلکس میں دس فی صد اور دیگر صنعتی کمپلیکسوں میں تین فی صد پلاٹ مخصوص

★ خواتین کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی روک تھام سے متعلق بل میٹرو پولیٹن کونسل سے پاس۔

★ ریاستی سائنس و ٹکنالوجی کونسل کا قیام توانائی کے بہتر استعمال میں لائے جانے والے طریقوں سے متعلق اسکیموں کا آغاز

★ سبھی کالونیوں میں اور تقریباً ۴۵ ہریجن بستیوں میں پینے کے پانی اور بجلی کے بندوبست۔

★ بڑے پیمانے پر رہائشی اسکیموں پر تیزی سے عمل درآمد شروع۔ بھیڑ بھاڑ والے علاقوں، بازآبادکاری کالونیوں اور تسلیم کی گئی غیر مجاز کالونیوں میں ماحولیاتی سدھار پروگرام پر عمل درآمد شروع ہو گیا ہے۔

محکمۂ اطلاعات و اشاعت، دلی انتظامیہ دلی

FEBRUARY 1985 | Phone : 275602 | Regd· No. D-(CN) 370
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002
Regd with the Registrar of Newspaper at R. No. 644 57

بالوں کا انداز چاہے کوئی بھی ہو لیکن اگر بالوں کی
یہ گھٹائیں ہمیشہ قائم رکھنا چاہیں، انہیں دراز، ملائم اور کالا دیکھنا چاہیں تو زلفی ہیر
ٹانک ہی استعمال کیجئے۔ یہ گرتے بالوں کو روکتا ہے، خشکی دور کرتا ہے اور بالوں کی جڑوں کے نیچے تک
پہنچ کر بالوں کی بیماریوں کو ختم کر دیتا ہے۔ زلفی ہیر ٹانک تیل نہیں بالوں کی غذا ہے۔ سر پر نئے
بال اگانے میں مدد دیتا ہے۔ اپنے بال صابن سے نہ دھویئے۔ یہ بالوں کی جڑوں کو کمزور کر دیتا ہے۔ دھونے
کے لئے زلفی پاوڈر استعمال کیجئے جو بالوں کو صاف رکھتا ہے۔ ان کو ریشم کی طرح ملائم بناتا ہے

شمع لیبارٹریز، لال کنواں، دہلی

عرب ممالک میں زلفی حاصل کرنے کے لئے رجوع فرمائیں
مسقط اور دیگر منطقہ میں
ایم۔ ایم۔ ملیباری
بابت شریف، مکہ وغیرہ

متحدہ عرب امارات میں
منیب بورا ایجنسی
دبئی فون نمبر: ۲۲۳۶۵۲، ۲۲۳۶۹
مسقط فون نمبر: ۲۲۲۴۰۳

دبئی فون نمبر ۲۲۲۴۳۳
سار حبہ
ابوظہبی
دیگر ممالک کیلئے
ایجنسی حاصل کرنے کیلئے لکھئے

شانِ ہند
نئی دہلی
جلد
شمارہ — ۳
مارچ
ایڈیٹر
سرور تونسوی

A leading role

At Shriram, the focus is always on good performance, whether in the factory, field, office—or auditorium. Artistic talent is promoted as systematically as work talent.

Employees of Shriram Fertilisers & Chemicals, at Kota and elsewhere, are given every opportunity to develop their talents—in music, dance, drama—and perform at their best.

Our Shriram Kala Mandir at Kota is equipped with the latest lighting and acoustics technology. And our Shriram Ramlila is a brilliant spectacle which attracts thousands from all over Kota and the neighbouring areas.

Shriram Fertilisers & Chemicals
(Prop. DCM LIMITED)

LATE GOPI NATH AMAN
(16-9-1898 — 7 / 1983)

AMAN SAHIB WITH SH LAL BAHADUR SHASTRI
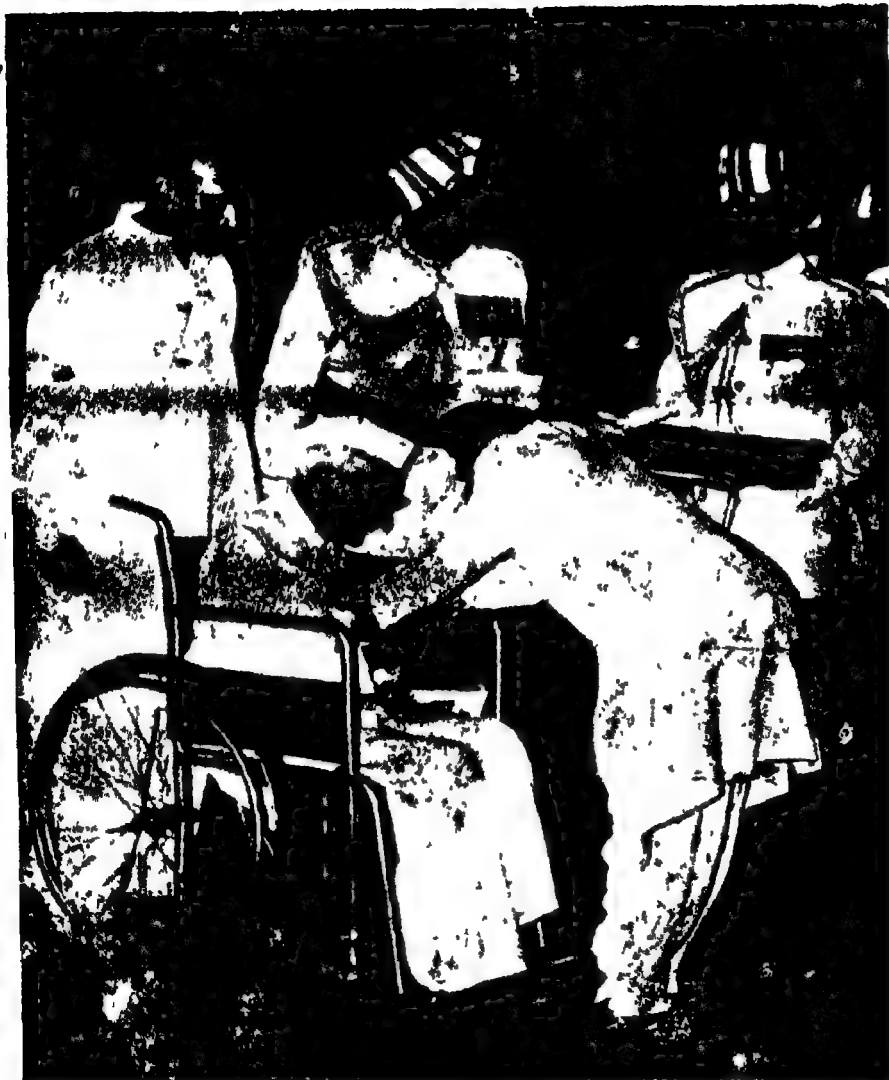
SH B D JATTI (ACG PRESIDENT)
AWARDING PADAM BHUSHAN TO AMAN SAHIB ON 2-4-1977

SH RADHA RAMAN
(C E C DELHI) PRESENTING
TAMRAPATRA TO AMAN SAHIB

SH AMAN ADDRESSING A CONFERENCE
(CHIEF GUEST SH JAWAHARLAL NEHRU
& PRESIDED BY SH JAI SUKHLAL HATHI,
STATE MINISTER HOME)

ٹیلی فون نمبر ۲۷۵۶۰۲ رجسٹرار آف نیوز پیپر فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۵۷/۷۷۴۴ رجسٹرڈ نمبر ڈی ۳۷۰ DN

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
(فیاض گوالیاری)

ماہنامہ
شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

فی پرچہ اڑھائی روپیہ
زر سالانہ ۲۴/- روپے
اس شمارے کی قیمت تین روپے

بیاد جناب گوپی ناتھ امن لکھنوی

جلد نمبر ۱۴	مارچ ۱۹۸۵ء	شمارہ نمبر ۳

معذرت

۱۲ر اکتوبر ۸۴ء کو انجمن یادگار امن لکھنوی کی سالانہ نشست کے سلسلے میں جو مشاعرہ منعقد ہوا اس کا آنکھوں دیکھا حال راقم نے لکھ کر اعظم گڑھ حافظ عبدالستار صاحب خوشنویس کی خدمت میں بھیجا کیونکہ شانِ ہند کی کتابت اعظم گڑھ میں ہوتی ہے۔ مگر بدقسمتی سے یہ روداد راستے میں گم ہو گئی جس کی وجہ سے میں نادم ہوں کہ حسب وعدہ اس مشاعرہ کی روداد شائع نہ ہو سکی تاہم ان شعرائے کرام کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں جنہوں نے اس مشاعرہ میں شرکت فرمائی۔

جناب حسین علی جعفری (صدر مشاعرہ) ذکی طارق صاحب سکریٹری ادبی سنگم غازی آباد۔ جناب اسلم حنفی ڈبائی۔ ڈاکٹر ریاض ساحل غازی آبادی۔ تپش غازی آبادی۔ سرور صاحب (ایڈیٹر شان ہند) نہیں جناب تصور نصرانی۔ عبدالرفیق محسن۔ حضرت ادیب لکھنوی۔ تابش لکھنوی۔ ضمیر صاحب۔ عتیق صاحب۔ علی احمد صاحب۔ رام چندر رشید صاحب۔ سید محمود نقوی۔ جناب ڈاکٹر او کے سرشت اریان بلاروی۔ ناظم صاحب۔ جناب قمر سنبھلی۔ ریاض اختر ادیبی۔ خنداں دہلوی شاگرد سفر امن لکھنوی۔ عشرت کرت پوری۔ جمیل ہاپوڑی۔ ضیا میرٹھی تلمیذ حضرت سیماب اکبر آبادی حضرت اعجاز وارثی۔ شمس غازی آبادی۔ ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ (فرزند ارجمند حضرت امن لکھنوی) جناب شارق میرٹھی۔ نیاز مند سرور تونسوی

ودیا پرکاش سرور تونسوی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے خواجہ پریس چتہ شاہ منگلو جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰ سے شائع کیا۔

القرآن المنظوم

مُرتبہ: کبیر کوثر

- قرآن پاک کا اردو، ہندی، انگریزی میں منظوم ترجمہ
- قرآن مجید کے ترجموں کی تاریخ ساز اولین پیش کش
- قرآن مجید کے متن کے ساتھ ساتھ اردو ہندی میں لفظ بہ لفظ کبیر کوثر کا منظوم ترجمہ
- قرآن حکیم کا متن اور عبداللہ یوسف علی کا انگریزی ترجمہ جسے حکومتِ سعودی عربیہ کی سندِ منظوری حاصل ہے۔
- ہندوستان کے علمائے کرام جناب ابوالحسن، منت اللہ صاحب امیر شریعت بہار و اڑیسہ، قاضی القضات مولانا نظام الدین۔ مفتی عتیق الرحمن عثمانی مرحوم وغیرہ کی اسناد پسندیدگی سے مرصع۔
- فوٹو آفسیٹ پر دو رنگی طباعت۔ رنگین سرورق
- ھدیہ: دس روپیہ فی پارہ علاوہ محصول ڈاک۔ یا حسبِ حیثیت

کبیر کوثر کی دلکش، نظر افروز سہل المفہوم مساعیِ جمیلہ کا

نادر و نایاب تحفہ

پہلا پارہ کرنبیکم جون ۱۹۸۵ء سے دستیاب ہے

تقسیم کار

[illegible]

[illegible]

بُلبُل چہ گفت؟ گُل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

دلّی اردو اکاڈمی

ہندوستان میں سب سے پہلے اتر پردیش
دو اکاڈمی قائم ہوئی۔ اس کے بعد بنگال، بہار،
دھیہ پردیش، مہاراشٹر، کرناٹک، راجستھان،
یہ پردیش وغیرہ پردیشوں میں اردو اکاڈمیاں
جود میں آئیں۔ سب سے آخر میں دلی اردو اکاڈمی قائم
ہوئی۔ ہر نئی اکاڈمی نے اتر پردیش اردو اکاڈمی کے
ین کو پیش نظر رکھ کر اپنا آئین بنایا اور اسی کے
نقش قدم پر چلنے کی کوشش اپنے اپنے ذرائع
کے مطابق کی۔ اس لحاظ سے اتر پردیش اکاڈمی
یک ماں کا درجہ رکھتی ہے اور باقی پردیشوں کی
ردو اکاڈمیاں اس کی بیٹیوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اتر پردیش اردو اکاڈمی کو جو سرکاری امداد
ملتی ہے وہ ہندوستان کی دیگر تمام اردو اکاڈمیوں
کو ملنے والی سرکاری مجموعی امداد کے مقابلے میں
زیادہ ہے۔ اس لئے کسی دوسرے پردیش کی اکاڈمی
کا مقابلہ اتر پردیش اردو اکاڈمی سے نہیں کیا
جانا چاہیئے۔

اتر پردیش اردو اکاڈمی میں جو بے ضابطگیاں
ہو رہی ہیں اور خصوصاً موجودہ چیرمین کے باعث
جو درشتا ہی ٹوٹ پڑی ہے یعنی ایک انتہائی قاعدہ
کی محض کاغذی تیاری میں جو ہزاروں لاکھ
روپیہ ضائع کر دیا گیا اس کی کچھ جھلکیاں آپ نامہ ہند
کی کسی گذشتہ اشاعت میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ لہذا
جب کوئی ماں بدکار ہو تو اس کی بیٹیاں اپنی ماں کے
نقش پا پر چلنے میں کوئی برائی نہیں سمجھتی ہیں بلکہ اکثر
اوقات بیٹیاں ماں سے چار قدم آگے نکل جاتی ہیں۔
یہی حالت ہماری کچھ اردو اکاڈمیوں کی بھی ہے،
جن کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ اس وقت
ذکر دلی اردو اکاڈمی کا ہے جو پاؤں پاؤں چلنے
کی عمر میں آئی ہے مگر اس نے جو کارہائے نمایاں کئے
ہیں ان کی شہرت نہ صرف اپنے ملک میں ہی ہے بلکہ
پاکستان۔ انگلینڈ اور دوسرے ممالک تک جا پہنچی
ہے اور وہاں کے اخبارات میں اس کا ذکر آرہا ہے۔

اسکولوں میں اردو کی تعلیم کے لئے کوشش
کرنا۔ اردو کے قابل طالب علموں کو وظائف دینا،
اردو پڑھانے والے موزوں اساتذہ کی تقرری کے
لئے کوشش کرنا۔ اردو کتابت سیکھنے کے لئے کلاسز
جاری کرنا اور اسی قسم کے کئی ایسے پروگرام ہیں جو
دوسری اردو اکاڈمیوں کی طرح دلی اردو اکاڈمی بھی انجام
دے رہی ہے مگر فرق ہے تو صرف یہ کہ دوسری اکاڈمیوں
کے زیر تحت یہ پروگرام شروع تو ہوتے ہیں مگر ان کی
دیکھ ریکھ کے مناسب انتظامات نہیں ہیں۔ مگر دلی اردو
اکاڈمی کے سکریٹری بذات خود ان پروگراموں کی
نگرانی کرتے ہیں۔ اردو اکاڈمی کے دیگر ممبران کے
تعاون سے ان پروگراموں کی دیکھ ریکھ بہتر انداز
کی جاتی ہے۔ دلی اردو اکاڈمی کو سرکاری مدد ایک
خاص حد تک ہی ملتی ہے مگر جو مفید اور قابل تعریف
پروگرام اردو کی ترقی اور اردو کی بقا و حیات کے

اس نے اس مالی سال میں انجام دئے ہیں ان کی تفصیل اس ایڈیٹوریل میں تو کیا اگر شانِ ہند کا ایک شمارہ بھی وقف کر دیا جائے تو بھی تشنۂ تکمیل رہے گی۔ مگر اس کے دو چار مخصوص پروگراموں کی اگر داد نہ دی جائے گی تو یقیناً ناانصافی ہوگی۔

"شانِ ہند" کی گذشتہ اشاعت میں اردو اکاڈمی دلی کے زیرِ اہتمام مشاعرۂ خواتین کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا حال آپ کی نظروں سے گزرا ہوگا۔ دلی میں اب تک متعدد خواتین کے مشاعرے ہو چکے ہیں مگر جو کامیابی اس مشاعرہ کو حاصل ہوئی اس قسم کے دوسرے مشاعرے اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ پائے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی مشاعرے کی کامیابی یا ناکامی کے بارے میں ایڈیٹر شانِ ہند کی رائے کو کسی طور بھی چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔

مرزا داغؔ دہلوی پر سیمینار اپنی طرز پر ایک ایسا سیمینار تھا کہ مرزا داغؔ کی روح بھی داد دئے بغیر نہ رہ سکی ہوگی اس کے بعد دلی اردو اکاڈمی کی جانب سے اردو افسانہ ورکشاپ / سیمینار منعقد ہوا جس میں ملک بھر کے مشہور افسانہ نگاروں کے علاوہ اردو کے بلند پایہ دانشوروں کو بھی مدعو کیا گیا تھا خوش قسمتی سے ان دنوں پاکستان اور لندن سے کچھ پاکستانی شاعر بھی دلی میں موجود تھے لہٰذا ان شعرائے کرام کا بھی اس سیمینار میں شایانِ شان استقبال کیا گیا۔ جناب علی سردار جعفری کو بھی اس سیمینار میں ان کے اعلیٰ مقام کے مطابق خوش آمدید کہا گیا۔

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اردو افسانہ پر ایسا پُر وقار اور مفید مطلب سیمینار ہندوستان تو کیا دُنیائے اردو میں پہلی بار منعقد ہوا اور اس سیمینار کی کامیابی کا سہرا یقیناً سیمینار کے ڈائریکٹر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے سر جاتا ہے جنہوں نے نہ معلوم کس کس طرح مشکلات پر قابو پا کر ایسی ایسی ادبی ہستیوں کو اس سیمینار میں اکٹھا کر دیا جن کو دیکھنے کے لیے بھی اردو پرست ترستے ہیں۔

مگر بُرا ہو بعض اردو ادیبوں، نقادوں اور شاعروں کی دلی کدورت، منافقت اور ددغلے پن کا کہ انہوں نے اپنے کچھ حواریوں کے ذریعہ "قومی آواز" میں خطوط شائع کرا کے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کی ناکام کوششیں کی۔ سب سے زیادہ مرچیں تو نارنگ صاحب کے مخالفین کو اس بارے میں لگیں کہ جناب صلاح الدین پرویز کو اسٹیج پر کیوں لایا گیا اور ان کی بابت حقیقت افروز باتیں کیوں کہی گئیں۔ قومی آواز میں بکواس کرنے والوں میں کیا یہ سکت ہے کہ وہ سارے ہندوستان میں ایک بھی ایسا مسلمان شاعر پیش کر سکیں جو صلاح الدین پرویز کی طرح ہندو میتھالوجی سے پوری طرح واقفیت حاصل ہو اور وہ اس کو اپنے اشعار میں ڈھال سکے۔ اگر ہم غیر ملکی شعرائے کرام اور اپنے ملک کے سرکردہ شاعر جناب علی سردار جعفری کا استقبال کر سکتے ہیں تو وہ اپنے ہی وطن کے اس ہونہار منفرد شاعر اور قومی یکجہتی کے جیتے جاگتے روشن مینار صلاح الدین پرویز کا استقبال کیوں نہیں کر سکتے جب کہ وہ سالہا سال سے سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ یہ کہنا کہ صلاح الدین پرویز چونکہ مالدار ہیں اس لئے ان کا استقبال کیا گیا ایک ایسی چھوٹی بات ہے کہ جسے کہتے ہوئے بھی ندامت محسوس ہونی چاہئے تھی۔

کہنے والے تو یہ کہتے ہیں کہ واک آؤٹ کرنے والے نام نہاد ادیب یا اردو پرست وہ حضرات تھے جو صلاح الدین پرویز سے مالی فائدہ اٹھانے میں کامیاب نہ ہو سکے یا دوسرے الفاظ میں صلاح الدین پرویز نے ان حضرات سے دھوکا نہ کھایا۔ پاکستان اور لندن کے اردو اخبارات نے اس اردو افسانہ ورکشاپ / سیمینار کی کامیابی کے بارے میں جو نوٹ شائع کئے ہیں اگر انہیں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے یہ مخالفین پڑھ لیں تو شاید بواسیر کے عارضہ میں مبتلا ہو جائیں۔

دلی اردو اکاڈمی کے زیرِ تحت سہ روزہ سیمینار "دلی والے" بھی اپنی نوعیت کا انوکھا اور مفید نیز معلوماتی سیمینار تھا جس میں پچاس کے قریب دلی کی اُن آنجہانی ہستیوں پر خاکے پڑھے گئے جو دلی کی روایات کے آئینہ دار تھے اور جن کا تعلق اردو زبان کی نشو و نما سے رہا۔ اس سیمینار کے ڈائرکٹر ڈاکٹر صلاح الدین

اپنی بساط کے مطابق اس سیمنار کو ہر نوع سے بہتر سے بہتر انداز میں کامیاب بنانے میں جو کوشش کی اس کی تعریف کی جانی چاہیئے۔

دلی اردو اکاڈمی کے سکریٹری جناب شریف احسن نقوی جس مستقل مزاجی سے اُردو اکاڈمی کو فعال ادارہ بنانے میں کوشاں ہیں اس کے بارے میں صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ خدا نقوی صاحب کو نظرِ بد سے بچائے اور انہیں اسی انہماک سے دِلی لگن کے ساتھ اُردو کی خدمت کے لیئے عمر طویل عطا فرمائے۔ دلی اردو اکاڈمی کے اسسٹنٹ سکریٹری مسٹر عابدی اور اسٹاف کے دیگر ممبران نے جس تندہی سے کئی کئی دن اور رات مسلسل کام کر کے اکاڈمی کی تقریبات کو کامیاب بنانے میں محنت کی ہے وہ یقیناً قابل تعریف ہے۔ ناانصافی ہوگی اگر اکاڈمی کے ایڈمنسٹریٹو آفیسر جناب محمد عارفین صاحب کا ذکر خیر نہ کیا جائے۔ عارفین صاحب مختلف سرکاری محکموں میں کئی مشہور زمان افسران کے ساتھ اپنے فرائض منصبی جس خوش اسلوبی۔ دیانت داری اور ایمان داری سے نبھاتے آئے ہیں وہ ہر سرکاری ملازم کے لیئے مشعلِ راہ سے کم نہیں۔ یہ ریکارڈ ہے کہ عارفین صاحب اپنی تمام ملازمت کے عرصہ میں کبھی ایک منٹ بھی دیری سے دفتر نہیں پہنچے، ہاں شام کو خواہ رات کے نو بج جائیں اپنا کام نپٹائے بغیر گھر نہیں جاتے تھے۔ ایک سرکاری اہلکار اچھا افسر اور ایڈمنسٹریٹو آفیسر کو کیسا ہونا چاہیئے، اس کی زندہ مثال عارفین صاحب ہیں۔ دلی کی شرافت اور تہذیب پکار پکار کر کہتی ہے کہ میں عارفین کے وجود میں دیکھی جاسکتی ہوں۔ اور دیانت داری اور ایمانداری زبانِ حال سے پکارتی ہیں کہ اگر ہمیں اپنانا ہو تو عارفین صاحب کے نقشِ قدم پر چلیئے۔

ایڈیٹر شان ہند کو یہ تسلیم کرنے میں دلی مسرت ہے کہ جہاں وہ کئی اُردو اکاڈمیوں کی کارکردگی سے مایوس ہو کر ان اکاڈمیوں کو اردو کے لیئے ایک فالِ بد سمجھنے میں حق بجانب تھا دلی اُردو اکاڈمی کی بہترین اور قابلِ آفرین کارکردگی سے اسے یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ شاید دوسری اُردو اکاڈمیاں بھی دلی اردو اکاڈمی کے نقشِ قدم پر چل کر اپنے فرائض منصبی کو بہتر انداز میں ادا کرنے لگیں۔

●●

فارم ۴ بابت ملکیت وغیرہ رول ۸

۱۔ نام رسالہ شان ہند
۲۔ مقام اشاعت فلیٹ ۸۔ انصاری مارکیٹ
دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
۳۔ میعادِ اشاعت ماہنامہ
۴۔ پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر اور مالک: ودیا پرکاش سرور
۵۔ قومیت ہندوستانی
۶۔ پتہ فلیٹ ۸۔ انصاری مارکیٹ
دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

میں ودیا پرکاش سرور مالک پرنٹر پبلشر ماہنامہ شان ہند اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع کے مطابق درست اور صحیح ہیں۔

ودیا پرکاش سرور
۲۸ر فروری ۱۹۸۵ء

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی
تین نئی کتابیں
۱۔ اقبال کا فن پچاس روپے
۲۔ وضاحتی کتابیات پینتالیس روپے
۳۔ اسلوبیات میر پندرہ روپے
دفتر شان ہند فلیٹ ۸۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲

گورنر اتر پردیش

جناب راجیو گاندھی صاحب وزیر اعظم نے وزارتِ عظمیٰ کا حلف لینے کے بعد فرمایا تھا کہ وہ ملک کو صاف ستھرا ایڈمنسٹریشن دیں گے اور کسی بھی ناپسندیدہ شخصیت کو اپنی وزارت میں نہیں لیں گے اور نہ ہی صوبائی حکومتوں میں آیا رام گیا رام ایسے اشخاص کو گھس پیٹھ کرنے دی جائے گی۔ جناب راجیو گاندھی صاحب نے اپنی کیبنٹ کے اسمائے گرامی کا اعلان فرمایا تو زیادہ تر وہی حضرات نئی کیبنٹ میں تھے جو کہ محترمہ آنجہانی اندرا گاندھی صاحبہ کی وزارت میں تھے۔ مگر ایک نام اس فہرست میں نہ دیکھ کر ملک کے ہر ذی فہم اور انصاف پسند کو اچنبھا ہوا کہ جناب محمد عثمان عارف صاحب کو راجیو گاندھی نے اپنی کیبنٹ میں کیوں نہیں لیا؟ کیوں کہ محمد عثمان عارف صاحب کا سیاسی، اخلاقی، تہذیبی اور سماجی کریکٹر ایسا بے داغ رہا کہ جس پر فرشتے بھی ناز کریں۔ مگر یہ کہہ کر دانشور طبقہ خاموش رہا کہ "رموز سلطنت شاہاں بداند"۔

کچھ حضرات نے جناب محمد عثمان عارف سے دلی زبان میں پوچھا بھی کہ آپ کو راجیو گاندھی صاحب نے نظر انداز کیوں کر دیا؟ مگر عارف صاحب نے مسکرا کر یہی جواب دیا کہ "میں نے کبھی کسی عہدے کے حصول کے لئے کندھا مار کر آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ آنجہانی محترمہ اندرا گاندھی صاحبہ نے مجھے حکم دیا تو جو بھی خدمت انہوں نے مجھے سونپی بسر و چشم انجام دی۔ میری وطن پرستی یا اندرا کانگریس کا ایک ادنیٰ ممبر ہونا یا خدمتِ وطن کے لئے ہر وقت تیار رہنا کسی معاوضہ یا حصولِ عہدہ کا رہینِ منت نہیں ہے بلکہ میں اصولاً اور صدقِ دل سے وطن پرست ہوں اور ملک کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں اور پورے یقین کے ساتھ یہ ایمان رکھتا ہوں کہ ہندوستان میں اندرا کانگریس ہی ایک ایسی پارٹی ہے جو اسے ترقی کی منازل درجہ بدرجہ طے کرا سکتی ہے اور سیکولرازم عقیدے کے مطابق حکومت کو چلا سکتی ہے۔ لہٰذا میں وزیر رہوں یا اندرا کانگریس کا ایک سپاہی مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

مگر چند ماہ بعد ایک ریڈیو اور ٹی وی پر جب یہ خبر سُنی گئی کہ جناب محمد عثمان عارف صاحب کو اتر پردیش کا گورنر مقرر کیا گیا ہے تو ایسا محسوس ہوا کہ یہ اس سال کی وہ خوشگوار خبر ہے جسے اہلِ ملک نے انتہائی دل کی گہرائیوں سے پسند فرمایا ہے۔ ہمارے ملک میں یہ پہلا موقع ہے کہ کسی گورنر کی تقرری پر بازاروں میں عوام کی طرف سے خوشنودی اور مبارکباد کے پوسٹر چسپاں کئے جائیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جس قدر اخبارات و رسائل نے جناب محمد عثمان عارف کے گورنر مقرر کئے جانے پر ادارتی شذرے لکھے ہیں آج تک کسی گورنر کے بارے میں نہیں لکھے گئے۔ اہلِ دلی یا اہلِ بمبئی یا اہلِ راجستھان کا اتر پردیش کے گورنر سے کوئی تعلق نہیں مگر عارف صاحب کے گورنر مقرر ہونے پر بمبئی، دلی، بہار اور دیگر مقامات پر جو مبارکباد اور خوشنودی کے پوسٹر چسپاں ہوئے یا جلسے منعقد ہوئے وہ اس حقیقت کے مظہر ہیں کہ ہندوستانی عوام بلا تخصیص مذہب و ملت ہر اس شخص کے لئے آنکھیں بچھانے کو تیار ہیں جس کا سیاسی اور اخلاقی کیریکٹر بے داغ ہے۔ اور حکومت کے اونچے سے اونچے عہدے پر ایسے صاف باطن، ایماندار، دیانت دار اور سیکولر پسند شخصیت کے تقرر کو عوام اپنے لئے ایک نیک فال سمجھتے ہیں۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ جناب وزیر اعظم راجیو گاندھی نے جس اعتماد اور یقین

یہ ساتھ عارف صاحب کو ہندوستان کے سب سے
ڑے پردیش کا گورنر مقرر فرمایا ہے جناب عارف
ماحب اپنے محبوب وزیر اعظم کی توقعات پر پورا اتریں
گے۔ عارف صاحب نام اور مذہب کے لحاظ سے خدا
ے فضل سے ایک صالح مسلمان ہیں اور مذہبی طور پر
ن سے خلافِ شرع کسی بھی بدعت کی توقع نہیں
جا سکتی مگر ان کے ذمہ جو فرض لگایا گیا ہے وہ
صتاً ایک ہندوستانی کی حیثیت سے انہیں ودیعت
یا گیا ہے۔ لہذا ہم اپنے مسلمان احباب، اخبار
یسوں اور اردو کے سرپرستوں سے مودبانہ
ارش کریں گے کہ وہ اس خیالِ خام کو اپنے
ن سے قطعاً نکال دیں کہ اتر پردیش کا گورنر ایک
سلمان ہے تو وہ اردو کو اتر پردیش کی دوسری
سرکاری زبان قرار دینے میں تمام حدود کو پھلانگ
ے گا۔ ایسا سمجھنا بھی محمد عثمان عارف صاحب کے
ساتھ سراسر زیادتی ہوگی۔ جب ملک کا راشٹرپتی
ی حکومت کو یہ حکم نہیں دے سکتا کہ اردو کو
ن کا جائز مقام دیا جائے اسی طرح کسی صوبے
ہ گورنر بھی اپنی صوبائی حکومت کو یہ حکم نہیں
ے سکتا کہ اردو کو وہاں کی دوسری سرکاری زبان
رار دے دیا جائے یا اس سلسلے میں کوئی آرڈی ننس
ی کیا جائے۔ ایسی سب باتیں صوبائی حکومت کے
ائرہ اختیار میں ہوتی ہیں۔ اس میں کوئی شک
نہیں کہ ہمارے راشٹرپتی اور جناب محمد عثمان
عارف صاحب گورنر یو۔پی۔ دونوں اردو کے
سرپرست ہیں اور دل و جان سے چاہتے ہیں کہ اردو
و اس کا جائز حق ملے مگر یہ دونوں معزز ہستیاں
خود ایسا کوئی حکم نامہ جاری نہیں کر سکتیں۔ اس لئے
سلمان حضرات کو ذرا احتیاط سے کام لینا چاہیے ور
گورنر یو۔پی سے غلط توقعات نہیں رکھنی چاہئیں۔
ایڈیٹر شانِ ہند کے ۳ سالوں سے

جناب عارف صاحب کے ساتھ یقیناً دوستانہ تعلقات ہیں
مگر کیا مجال ہے کہ اس طویل عرصہ میں انہیں کسی
موقع پر بھی انصاف، سچائی یا اخلاقی و تہذیب
کا ساتھ دیتے ہوئے نہ پایا ہو۔ ہاں یہ ہمیشہ رہا
کہ انہوں نے خوشامدیوں سے کبھی واسطہ نہیں رکھا
خواہ کوئی عزیز رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، اس کا
ناجائز کام کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ادیبوں
شاعروں اور اردو پرستوں کے لئے ان کا دروازہ
ہمیشہ کھلا رہا مگر ان کی سفارشوں پر انہوں نے
وہاں تک ضرور دھیان دیا جہاں حق و انصاف
کا خون ہو رہا ہو یا کسی بے گناہ کے ساتھ زیادتی
ہوئی ہو۔ اس لئے یوپی کے اردو دانوں، ادیبوں،
شاعروں اور نام نہاد اردو پرستوں کو دوستانہ
مشورہ ہے کہ وہ یوپی کے راج بھون کو اتر پردیش
اردو اکاڈمی کا دفتر نہ سمجھ لیں بلکہ راج بھون کا
جو احترام ہونا چاہئے اس کا خاطر خواہ خیال
رکھیں۔

ہماری دلی دعا ہے کہ عارف صاحب کو خدا
ہمیشہ اپنی امان میں رکھے اور انہیں عمرِ طویل عطا ہو
کیونکہ ملک اور قوم کی کئی توقعات ان سے
وابستہ ہیں۔ ہم صمیم قلب سے عارف صاحب کو
اس عزت افزائی پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

جوذیس نحیف دہلوی کا تازہ ترین مجموعۂ کلام

آوازِ دل

شائع ہو گیا ہے۔ قیمت پندرہ روپے مجلد
اپنی لائبریری میں اس معقول مجموعۂ کلام کا اضافہ
آپ کے باذوق ہونے کی دلیل ہے۔
دفتر شانِ ہند، فلیٹ ۵، انصاری مارکیٹ
دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اردو اکادمی دہلی

ایک نظر میں

- اردو کے مشہور ادیبوں، شاعروں، صحافیوں کو ادبی خدمات کے اعتراف میں پانچ پانچ ہزار روپے، اکادمی کے نشان، شالیں اور اسناد ایوارڈ کے طور پر دی جاتی ہیں۔
- اردو ناشرین کی حوصلہ افزائی کی خاطر اچھی مطبوعات پر دو دو ہزار روپے کے انعامات دئے جاتے ہیں۔
- سال میں ایک بار بہترین مطبوعات پر دہلی کے مصنفین کو دو دو ہزار روپے انعامات دئے جاتے ہیں۔
- مستحق اور ضعیف اہلِ قلم حضرات کو پس مرگ اُن کے وارثوں کو تین سو روپے ماہوار کی مالی امداد فراہم کی جاتی ہے
- مستحق اہلِ قلم حضرات کی تخلیقات کی طباعت پر مالی امداد دی جاتی ہے۔
- مشاہیر شعراء ادبا اور اہلِ قلم حضرات کے اعزاز میں اور ایسے ہی مہمانوں کے لئے اعزازی تقاریب منعقد کی جاتی ہیں۔
- اکادمی کی مرکزی لائبریری کے لئے اردو کی جدید اعلیٰ اور معیاری کتب کو خرید کر محبانِ اردو کے فائدے کے لئے انہیں محفوظ کیا جاتا ہے اور اردو درسگاہوں کو ایسی کتابیں مفت دستیاب کرائی جاتی ہیں)۔
- دہلی کی تہذیبی، ثقافتی اور سماجی زندگی پر مذاکرات سیمینار اور نشستیں منعقد کی جاتی ہیں اور ان میں پیش کی جانے والی تقاریر، مقالوں اور رپورٹوں کو شائع کرایا جاتا ہے۔
- اردو ادب کی مختلف اصناف میں مجلسوں اور نشستوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ پیش کئے جانے والے کلام اور فن پاروں کو شائع کیا جاتا ہے۔
- اردو کی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے چھٹی آٹھویں اور دسویں جماعتوں کے ہونہار اور امتیازی نمبر حاصل کرنے والے طلباء کو وظائف دئے جاتے ہیں۔
- اردو اسکولوں میں طلباء کے تقریری، مضمون نویسی، خوش خطی، غزل اور نظم خوانی وغیرہ کے مقابلے منعقد کئے جاتے ہیں۔
- اردو خوش نویسی کے فنکاروں کو فروغ دینے کے لئے اکادمی کی طرف سے اردو کتابت کا ایک دو سالہ کورس چلایا جا رہا ہے۔
- بورڈ اور یونیورسٹی کے امتحان میں اردو میں اوّل پوزیشن لانے والے طلباء کو معقول رقم، سرٹیفکیٹ اور میڈل بطورِ انعام دیا جاتا ہے۔
- غیر اردو داں بالغان کے لئے تعلیم کے مراکز قائم کئے جاتے ہیں جہاں شائقین کو اردو زبان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کا ذوق پیدا کرایا جاتا ہے۔
- اردو زبان و ادب سے متعلق انجمنوں کو پروگرام کے انعقاد کے لئے مالی امداد دی جاتی ہے۔

اور ہیں باغ و چمن اب اُسکے نیا شاد و ہے
اب دلِ اہلِ نظر ہیں اور حیرت کا جہاں
حُسن کا انداز طرزِ عاشقانہ اور ہے
بس کے تجھ سے در شتے کو کیا چاہیے
سوزِ غم درد محبت کا فسانہ اور ہے
اڑ گیا تو توڑ کر اپنے قفس کی تیلیاں
اپنی قسمت میں قفس کا آب و دانہ اور ہے
جب بھی تیری محفلوں کے دن ہمیں یاد آئیں گے
یاد سے تیری دلِ ناشاد کو بہلائیں گے

[illegible]

انجمن یادگارِ لکھنؤی کی سالانہ نشست [illegible] میں پیش کی گئی

منظوم عقیدت

دستِ قضا نے چھین لی وہ ذاتِ باصفات
دستِ قضا مشیتِ رب ہے تو کیا کہیں
اشکوں کو روک لیں سرِ مژگاں بجا بجا
یارائے ضبط اس پہ نہ ہو تو کیا کہیں
کیسے کہیں کہ کوئی ہمارا چلا گیا
سارا جہاں کہے کہ ہمارا تو کیا کہیں
اللہ صبر و شکر عطا کر ہمیں کہ ہم
تیری رضا کو واقعی اپنی رضا کہیں
سب لکھنؤ کی راہ اک شمع بجھ گئی
اب کس کو بزمِ شعر و ادب کی ضیا کہیں
یعنی وہ امن جس کا طلب گار ہے جہاں
یعنی وہ امن جس کو صدائے وفا کہیں
تسلیم و صبر و ضبط بڑی چیز ہے مگر
دل اُس کو جب تڑپ کے پکارے تو کیا کہیں
لسانِ عرف آدمی کہیں ذکرِ بلیغ کو
یا قوتِ بشر کی کوئی انتہا کہیں
سینے میں تو کیسا اُسے ماہِ تمام ہے
یا نیرِ متاعِ حقیقت نما کہیں
استاذالاساتذہ [illegible] کی ذات ہے

یا پیکرِ جمال ضیا در ضیا کہیں
یا اُس کو آگہی کے سمندر کا نام دیں
یا آسمانِ علم کی نیلی ردا کہیں
یا صاحبِ جمال کہیں طور کی جگہ
یا بت کدے میں ہند کے قبلہ نما کہیں
پاکیزگی کو نام دیں گنگا کی موج کا
یا سطحِ ذہن کا مذاق آشنا کہیں
گاندھی کا جاں نثار وہ اک مرتبہ شناس
دل چاہتا ہے گر وہ حق نما کہیں
یعنی فدائے علم و ادب گوپی ناتھ امن
جس کو فنا کے بعد بھی جانِ بقا کہیں
واللہ یہ تعلقِ خاطر کی بات ہے
حق اُس کو شفقتوں کا نہ ہو گا ادا کہیں
اے شمس اُس کے رنگِ طبیعت کی داد دو
کچھ اس طرح کہ لوگ تمہارا کہا کہیں
* شمس غلام علی پیامی

انجمن یادگارِ لکھنؤی کے سالانہ نشست میں پیش کیا گیا۔

قطعۂ تاریخ

از حضرت امن

اُٹھ گیا دنیا سے اک جانِ وطن — رو رہی ہے انجمن کی انجمن
آہ وہ دیپک اچانک بجھ گیا — جس سے روشن تھی ابھی بزمِ سخن
اٹھ گیا وہ نغمہ سنجِ [illegible] — جس سے تھی گرمیٔ صحنِ چمن
عظمت و شانِ وطن کا شیفتہ — تھی صبحِ قوم کی دل میں لگن
شمعِ آزادی کا پروانہ تھا وہ — دل میں رکھتا تھا نہاں سوزِ وطن
ہم قدم گاندھی و نہرو کا — تھا نشانِ قوم تن اور اُس کا من
شکوۂ لب وہ اسیری میں نہ تھا — بن گیا تھا [illegible] رنج و محن
دل تھا جب دردِ غلامی کا شکار — تھا زباں پر نغمۂ حبِ وطن
ایک ادیب و شاعرِ علم تھا وہ — نکتہ سنج و آشنائے علم و فن
گوہرِ یکتا تھا اس کا لفظ لفظ — اُس کا ہر اک شعر تھا [illegible]

بزم سے چھینا امن سا مشفق رفیق | اے قضا کے ہاتھ تو نے کیا کیا
مردِ میدانِ صحافت بھی تھا وہ | جنگِ آزادی کا بھی تھا سورما
جیل بھی کاٹی مصائب بھی سہے | اور وزارت کا بھی چکھا ذائقہ
صاحبِ دل صاحبِ فکر و نظر | وہ محبِ قوم بھی شاعر بھی تھا
اُس کا با مقصد تھا پاکیزہ کلام | اُس کا ہر شعر دل کا آئینہ
شعر کی دنیا میں تھا وہ نامور | شاعروں میں بھی تھا اک خوشنوا
اُس کو قدرت نے دیا سونے کا دل | اُس کو فطرت نے دیا ذہنِ رسا
اُس کی فکر و فن پہ تھی گہری نظر | اُس کو حبِّ حُسن کا احساس تھا
اُس نے دیکھا زندگی کا گرم و سرد | اُس نے دیکھا خشک تر سوکھا ہرا
زندگی سادی تھی اور اونچے خیال | اُس نے باپو سے تھی سیکھی یہ ادا
اُس نے جیون کو سمجھ رکھا تھا کھیل | بارہا ہارا وہ جیتا بارہا
ایسے پاؤگے کہاں بالغ نظر | امن جیسے گوہرِ نایاب تھا
اُس پہ ارزاں ہوں ترے لطف و کرم | اُس پہ برسے تیری رحمت کی گھٹا

شانتی دے اُس کی روحِ پاک کو
ہے یہ غالب کی دعا اور التجا

جناب منوہر لال صاحب طالب چکولی

(حالی جناب بخشی اختر آمر لکھنوی)

اشکِ غم

بر وفات منشی گوپی ناتھ صاحب امن لکھنوی بتاریخ [illegible] بعمر [illegible] برس بمقام [illegible]

قطعات

ماتم منا رہے ہیں سبھی امن لکھنوی کا | چھایا ہوا ہے اختر غم امن لکھنوی کا
زارہ تصور اللہ مرحوم چل دیئے تھے | محفل میں تھا غنیمت دم امن لکھنوی کا

فنِ سخن کے نکتے پوچھے گا کس سے جا کر | جائے گا کس کے در پہ کس کو غزل دکھا کر
نا بخشی سے اختر ہر شعر گو ہے گا | بیٹھا تھا ذہن میں کتنا اپنا سر اُٹھا کر

رباعیاتِ غم

اے اختر دل سوختہ اے مہر وفا | کیوں روتا ہے جنت میں گیا وہ ذاتِ صفا
بولیں وفات عیسوی میں ظاہر سیہ یار کرو کچا یہ اعداد صفا
۱۹۸۵

اشکِ غم

وہ شہسوارِ لکھنوی تہذیب چل دیئے
سرمایہ دارِ لکھنوی تہذیب چل دیئے
سونا پڑا ہے مکتبِ تہذیبِ لکھنؤ
آموزگارِ لکھنوی تہذیب چل دیئے
چھائی ادب کے باغ پہ ہے ٹوٹ کر خزاں
جانِ بہارِ لکھنوی تہذیب چل دیئے
تھے پاسدارِ لکھنوی تہذیب جو یہاں
وہ شہریارِ لکھنوی تہذیب چل دیئے
کردارِ لکھنوی جنہیں تھا جان سے عزیز
وہ جاں نثارِ لکھنوی تہذیب چل دیئے
تہذیبِ لکھنوی کا نشاں مٹ مٹا گیا
جو تھے وقارِ لکھنوی تہذیب چل دیئے
تہذیبِ لکھنؤ میں ہے ماتم بپا ہوا
سر دست کارِ لکھنوی تہذیب چل دیئے
تہذیبِ لکھنؤ کو جہاں میں تھا جن پہ فخر
وہ افتخارِ لکھنوی تہذیب چل دیئے
اُف حضرتِ منور و عالی جنابِ امن
آئینہ دارِ لکھنوی تہذیب چل دیئے
اختر خلیقِ غم ہوں نہ کیوں اہلِ لکھنؤ
وہ تاجدارِ لکھنوی تہذیب چل دیئے

ماتمی قطعہ بر وفات علامہ گوپی ناتھ صاحب امن لکھنوی

شعرِ لکھنؤ کا وہ شاعر نہیں رہا | ... وہ اب نہیں رہا
حاصل تھی شعر گوئی پہ فن سخن تمام | وہ امن ... اب نہیں رہا

عالیجناب راولا چودری صاحب

افتتاحیہ تقریر مہمانِ خصوصی عالیجناب ویاس دیو مصرا

سابق چیف جسٹس ہماچل پردیش ہائی کورٹ

صدر محترم بزرگو اور دوستو۔

جب مجھے اِس بزم کے لئے مدعو کیا گیا تو کچھ تعجب بھی ہوا کیونکہ نہ میں شاعر ہوں اور نہ اردو داں ہوں۔ آج کل سیاست والوں، منسٹروں، چیف منسٹر وغیرہ کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے بلانے کا رواج ہے اور وہی ہر موضوع پر تقریر کرتے وہ بھی ایسی کہ تقریر ختم ہونے پر اگر خیال فرمایا جائے کہ کیا کہا گیا تو کچھ سمجھ میں نہ آئے۔ میں نے اِس بزم کے مدعو کرنے والے منتظمین سے بھی سوال کیا مجھے کیوں بلایا جا رہا ہے تو جواب ملا آپ کو اسلئے بلایا گیا ہے کہ آپ اُن صاحب کے ساتھ متعدد مشاعروں اور جلسوں میں شریک ہوتے ساتھ رہے آپ نے اُنہیں نزدیک سے دیکھا ہے۔ میں بھی اسی بزم میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ جناب امن کا میں بھی قدیم مداح رہا اور اُن کے ساتھ مجھے کئی ادب کی خدمت کے مواقع ملے ہیں اس لئے مجھے یہ حق ہے کہ میں امن صاحب کے متعلق کچھ کہہ سکوں۔

سن ۱۹۳۲ء کے لگ بھگ کا ذکر ہوگا۔ جنم اشٹمی کے موقع پر تیج کا ایک خاص نمبر نکلتا تھا۔ ہم سب بھی سال بھر اس انتظار میں رہتا تھا کہ کب یہ نمبر نکلے۔ ہمارا خاندان نئی دلی میں رہتا تھا۔ میرے والد سرکاری ملازم تھے گھر میں انگریزی اخبار سٹیٹسمین آتا تھا۔ اسٹیٹسمین نہیں اس کا فرق اُس زمانے کے لوگ اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ یعنی ہم نیشنل والے تھے بخبر۔ تیج کا اسپیشل نمبر آتا تھا۔ ہم لوگوں کا کام یہ ہوتا تھا کہ مضامین اور نظمیں پڑھی جائیں اور اُس میں جو تصاویر ہیں اُن کو کاٹا جائے البم میں جڑ دیا جائے وہی تصاویر ہمارے گھر میں لگی ہوئی تھیں بعض یاد ہے اُن تصاویر میں ایک پینٹنگ میں مہاتما گاندھی کو گلوب پر بیٹھے ہوئے دکھایا گیا تھا اور امن صاحب کا شعر اُس کے نیچے لکھا ہوا تھا۔ وہ شعر اب تو مجھے یاد نہیں اور نہ ہی اُس زمانے میں شعر و سخن کی بھا اتنی جانکاری تھی کہ سمجھ سکوں اِس کا مطلب کیا تھا۔ مگر یہ ضرور یاد ہے کہ وہ امن صاحب کے لکھے ہوئے تھے کیونکہ اُن کے نیچے امن صاحب کا نام تھا۔ اُس کا ایک مصرع شاید یہ تھا۔

ع۔ کوئی نہ ہو غلام یہ تیرا پیام ہے

یہ اُس وقت کی باتیں ہیں جب لیڈر اور سیاسی کارکن مُلک کی خدمت میں کچھ لیتے نہیں بلکہ دیتے تھے ہیں۔ آج کل ویسا نہیں ہے۔ گدھ کی طرح انتظار کر رہے ہیں کب موقع ملے کھانا شروع کر دیں۔

اسکول کی تعلیم ختم کر کے جب کالج میں آیا تو مشاعروں اور جلسوں میں جانا شروع کیا وہاں امن صاحب کو دیکھا لیکن اُن سے بات چیت آزادی کے بعد ہی شروع ہوئی۔ میں ولایت سے تعلیم حاصل کر کے آیا تھا سن ۱۹۴۸ء کا دور دلی میں بڑی پریشانیاں تھیں۔ دلی میں شیعہ حضرات سوچ رہے تھے محرم اور چہلم کے جلوس اور مجلسیں ہو سکیں گے کہ نہیں۔ اسی سلسلے میں کو خاں حضرات سے واقفیت بڑھی۔ امن صاحب سے بھی جان پہچان ہوئی دوستی بڑھی مشاعروں، جلسوں، مجلسوں میں ساتھ رہے۔ میں امن صاحب کے گھر بھی گیا اُن سے خوب خوب باتیں ہوئیں۔ مذاق بالتعلق بھی لیا۔ ہم لوگ بھی امن صاحب کے ساتھ مذاق کر لیتے تھے اور وہ اُس کا بھی مزہ لیتے تھے۔ اس مذاق کے متعلق جوہری صاحب نے ابھی فرمایا تھا مگر اس کا ایک پہلو انہوں نے چھوڑ دیا تھا۔ میں کسی سبھا سنستھا کے خلاف نہیں کہہ رہا لیکن اکثر دیکھا گیا ہے جب تک شاعر یا مقرر نہ پہنچے منتظمین ہمہ تن انتظار رہتے ہیں لیکن مشاعرہ اور جلسہ ختم ہوا تو وہ پریشان ہوتا ہے کہ گھر کیسے جاؤں۔ ہم لوگ بھی اِن پریشانیوں سے گذرے ہیں۔ امروہے میں مجلس ہوتی جاتے وقت موٹر کار کا انتظام تھا لوٹتے وقت ریلوے کا ڈبہ۔

آنے میں بہت دیر تھی وقت گذارنے کے لئے منتظمین نے ہمیں امروہہ گھمانا شروع کیا۔ ایک درگاہ میں لے گئے جہاں کا بچھو کر

ہاتھ پر رکھ لیجئے تو کاٹتا نہیں تھا۔ محلہ والے اندر سے ایک بڑا کالا بچھو لائے اور مجھ سے کہا ہاتھ پھیلایئے میں نے امن صاحب کی طرف اشارہ کرکے کہا یہ ہمارے بزرگ ہیں ان کے ہاتھ پر بچھو رکھیئے۔ بچھو ہمیں بچھو پر اعتبار نہیں تھا ورنہ نشانہ بنایا امن صاحب کو۔ ان کے ہاتھ پر بچھو رکھا گیا مگر اس نے کاٹا نہیں۔ اس تذکرہ کا مقصد یہ ہے کہ امن صاحب جتنے سنجیدہ تھے اصولوں کے پابند تھے اتنے ہی مذاق میں مزہ لینے والوں میں سے تھے۔ ان کے متعلق مذاق ہوتا کوئی فقرہ یا جملہ یا پھبتی کسی جاتی تو وہ اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

زندگی ایسی ہی چیز ہوتی ہے جس میں سردی گرمی بہار و خزاں سب کچھ شامل ہے۔ امن صاحب کی زندگی میں کیا کچھ تھا کہاں تک بتلایا جائے ان کی علمیت کے بارے میں تو سب جانتے ہی ہیں مگر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ عالم باعمل تھے۔ آج کل لوگ اصولوں کا ڈھنڈورہ پیٹتے ہیں۔ بڑی بڑی تقریریں بلند آوازمیں کرتے ہیں کہ کمزور طبقوں کے لئے یہ ہونا چاہیئے یہ کرنا چاہیئے مگر وہ کیا کرتے ہیں اس کا سوال ہی نہیں۔ امن صاحب جو کہتے تھے وہی عمل بھی کرتے تھے۔ میں نے ان کے رہن سہن کا ڈھنگ دیکھا ہے کیونکہ ان کے گھر آیا جایا کرتا تھا۔ ان کے یہاں ملازم کو بھی گھر کے بچے جیسا پیار ملا اس نے تعلیم حاصل کی اور ایک اچھی نوکری پاکر ٹیچر بن گیا۔ ان کے یہاں جتنے ملازمین آئے اچھی اچھی نوکریوں پر پہنچے اور یہ قابلِ ذکر بات ہے۔ آج کون ہے جو منسٹر یا اسپیکر جیسے عہدوں پر پہونچ کر بھی بس میں سفر کرے گا۔

آج آدمی بک رہا ہے یا بکنے کو تیار ہے ہر شخص کی ایک قیمت ہے کس کی کیا وہ بات جانے دیجئے جو لوگوں کو خرید لے وہ اس علاقے کا راجا بن جاتا ہے۔ دنیا والے انہیں دوست رشتے دار یہاں تک کہ گھر کے لوگ بھی ناراض ہو جاتے ہیں اس کے نام دھرے جاتے ہیں اصولوں کو مانا جائے تو غلط کام کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے اصولوں پر چلنا بہت مشکل ہے۔ اور اس کا امتحان بھی زندگی کے میدان میں ہوتا ہے اس امتحان کے بعد ہی سند ملتی ہے جیسے بی اے ایم اے کی ڈگری صرف نام سے نہیں ملتی اس کے لئے امتحان پاس کرنا ضروری ہے۔ اصول کے لئے بھی صرف جاننا ماننا ہی کافی نہیں ہے بلکہ امتحان میں کامیابی ضروری ہے۔ اصولوں کے امتحان بہت مشکل ہوتے ہیں۔ عزت جبھی ملتی ہے جب امتحانات سے کامیابی کے ساتھ گذر جائیں۔

امن صاحب کی یہ تعریف ہے کہ وہ اصولوں سے کبھی بھی نہیں ہٹے ان کو تبھی یہ عزت ملی۔ شاعری کی ہی بات لیجئے شعرا حضرات تعریف کرنے پر آئیں تو زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں تاماحل ہو جائیں یا ادر برائی کریں تو، جو لکھتے ہیں شاعر۔ لوگوں سے خوش ہو کر یا لوگوں کو خوش کرنے کے لئے قصیدے بھی لکھتے ہیں۔ مشاعروں میں واہ واہ کے لئے کیسی قسم کے اشعار لکھتے ہیں آپ حضرات خوب واقف ہیں لیکن امن صاحب کی ایک شاعری لیجئے نصف صدی سے زیادہ شاعری کی کتنا کچھ کہا۔ ان سے پوچھئے۔ کلام میں کہیں کوئی ایک شعر اصولوں کے خلاف دکھا دیجئے یا کسی غلط آدمی کی تعریف میں کوئی قصیدہ یا نظم یا اک شعر ہی دکھا دیجئے۔ جو کہا واہ واہ کے لئے نہیں عقیدت کی بنا پر کہا۔ دماغ و دل میں کوئی فاصلہ یا فرق نہ ہو سکتے لوگ کر پاتے ہیں

میں چونکہ سیاست میں رہ چکا ہوں اس لئے جانتا ہوں کہ اہمیت پانے یا بڑی جگہ پر پہنچنے سے انسان پر کیا گذرتی ہے جیسے جیسے آپ ابھرتے ہیں لوگ آپ کے خلاف ہوتے جاتے ہیں سب سے پہلے دوست ہی خلاف ہوتے ہیں کیونکہ وہ یہ سوچتے ہیں کہ یہ ہمارے ساتھ کا آدمی اتنا اوپر کیسے پہونچ گیا۔ آپ جتنا اوپر اٹھیں گے لوگ اتنے ہی عیب نکالیں گے۔ وہ اپنی عادتوں سے آپ کو تولیں گے اور برائی کریں گے۔ عیب نہ بھی ہو تو بھی عیب نکالیں گے جیسے لوگوں کو عیب نکالنے دوسروں میں برائیاں دیکھنے اور ڈھونڈنے کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں رہا لوگ اپنے معیار سے آپ کے متعلق اندازہ لگائیں گے فیصلہ کریں گے کوئی شراب کے معیار سے دیکھے گا کوئی رشوت کے۔ یعنی کوئی چمک ہے تو لوگ اس میں کالے دھبے ڈھونڈتے ہیں میں یہ سب کہہ کر رہا ہوں۔ اس لئے کہ اگر امن صاحب میں اگر کوئی برائی ہوتی تو لوگ ضرور کہتے کہ ان کے پاس کوٹھی ہے یا بچوں کے پاس اتنے مہنگے پلاٹ ہیں بھائی بھتیجوں کے پاس کارخانے یا دکانیں ہیں جو آج کل عام باتیں ہیں مگر امن صاحب کا دامن بے داغ رہا۔ میں نے

امن صاحب کا ذکر ہو رہا تھا ان کا گھر بھی دیکھا اور دریا گنج کا بھی ۔
جب تک میں دلی میں رہا یعنی ہماچل پردیش جانے سے پہلے ہمیشہ
اُن کے گھر جاتا۔ یا میں نے اُنھیں قریب سے دیکھا ہے وہ تمام بُرے
کاموں سے دور تھے اُن میں کوئی بُرائی یا عیب نہیں تھا۔

ابھی منیز لکھنوی مرحوم کا ذکر آیا تھا اُن کے امن صاحب شاگرد تھے
اور کئی شاگرد تھے ادیب لکھنوی، جوش ملیح آبادی، روشن اعظم گڑھی
اور نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی وغیرہ۔ جناب اثر لکھنوی جب بھی
دلی تشریف لاتے تھے تو میرے یہاں ٹھہرنے کا کرم فرماتے تھے۔
کیونکہ وہ سب سے بڑی عمر کے تھے، اس لئے اور شاگردان عزیز
اُن سے ملنے تشریف لاتے تھے۔ جوش ملیح آبادی بھی آتے تھے
امن صاحب کو بھی بلا لیتا تاکہ کچھ شعر و شاعری کی بزم گرم ہو۔ اُس
زمانے میں جوش صاحب اُن کی ٹانگ کھینچنے کی کوشش کرتے
تھے! کہ انسان ہو کر بھی شراب نہیں پیتے۔ امن صاحب نے
فرمایا! میرے والد نہیں پیتے تھے اور اسے بہت خراب مانتے
تھے اور دوسروں کو اسے پینے سے منع کرتے تھے۔ جوش صاحب
بولے: والد نے منع کیا مگر والد کے والد تو پیتے رہے ہوں گے تو آپ کس کا
کہا مانیں گے۔ یہ مذاق چلتے اور ہم لوگ لطف لیتے
ایک ایک مذاق میں کتنے مسئلے مرحلے اور کتنی باتیں طے ہوتیں،
تھیں۔ لیکن امن صاحب چاہے بزم مشاعرہ ہو یا ادبی نشست
دوستوں کی محفل ہو یا سیاسی جلسے اُصولوں کے حق میں اور برائیوں
کے خلاف آواز اُٹھاتے وہ بُرائی دیکھ کر خاموش نہیں رہتے کیونکہ
خاموشی بھی تو ایک طرح کی حمایت ہوتی ہے۔ جب امن صاحب
کسی جلسے یا مشاعرے کے صدر ہوتے تھے۔ کچھ لوگ نالاں بھی
ہوتے تھے کہ یہ اُصولوں کے بہت پابند ہیں ایسا نہیں ہونے دیں
گے ویسا نہیں ہونے دیں گے۔ بہرحال امن ہمیشہ اُصولوں پر قائم
رہے۔ میں امن صاحب کے ساتھ محفلوں میں رہا ہوں۔ ابھی
اُن کے شعر پر تقریر ختم کروں گا ؎

یوں تو بہت رہیں عشرت گاہیں
ان کی محفل اُن کی محفل

جوابی خط لکھا کیجیے تاکہ آپ کو جواب فوراً مل سکے جواب طلب
امور کے لئے جوابی خط بھیجنا ضروری ہے۔

بقیہ صفحہ ۴۲ کا

اُس کے ایک ہوتی ہیں جناب ادیب لکھنوی۔ ان کا کلام بہترین ہے مگر انہوں
نے ایک چیز اُنہیں دی سب سے پہلے تو اُن سے گوشہ نشینی لی
اور اب بھی جب میں نے ڈائس پر آنے کے لئے درخواست
کی تو صاحب نے فرمایا سٹیج پر بیٹھا نہیں جاتا تھا میں تو
مجمع میں بیٹھ رہا ہوں۔ امن صاحب اور ادیب صاحب
ہم دوسرے تعلق رکھتے ہیں عام میں شعر و ادب ہی نہیں
بلکہ تحقیق بھی پیدا ہوئی۔

امن صاحب کی ذات اعزاز کی محتاج نہ تھی۔ عوام
کی ہر طرح خدمت بھی کی اور رہنمائی بھی مگر روزانہ کی زندگی
میں ذرہ بھر بھی فرق نہ آیا۔ وہی سادگی، وہی خلوص، وہی
صدق دلی اور وہی خدمتِ انسانیت کا جذبہ۔ جو جوانی میں
تھا وہی اب بھی رہا۔ بلکہ سادگی پہلے سے زیادہ ہو گئی۔
کوئی اعزاز امن صاحب کی شان میں اضافہ نہیں کر سکتا
تھا پھر بھی حکومتِ ہند نے اُن کو پدم بھوشن کا اعلیٰ اعزاز
عطا کر کے ان کی خدمت کا اعتراف کیا۔ اسی سلسلے میں
ہم لوگوں نے امن صاحب کو ایک استقبالیہ دیا تھا اس
موقعہ پر میں نے جو نظم پڑھی وہ پوری تو مجھے یاد نہیں
صرف مقطع یاد ہے ؎

اے جعفری قربانی پیغمبر کے بدلے
ہے امن ابھی اور سدا امن رہے گا

مجھے اُمید قوی ہے کہ امن صاحب کے پرستار شمع
امن کو ہمیشہ روشن رکھیں گے۔ اُن کی یاد میں ایک
مستقل ادارہ قائم کریں گے جس کے ذریعے مرحوم کے
شعر و سخن، علم و ادب، فلسفۂ حیات و موت، دین و
مذہب اور صدق و صفا سے عوام فائدہ اُٹھا سکیں گے
اور یکجہتی کی ایک نئی بنیاد پڑ سکے گی۔

دیوان
قیمت پندرہ روپے

تقریر صدر بزم مقالات عالیجناب حسین علی جعفری نیشنل کمشنر اسکاؤٹس

خواتین و حضرات

حضرت امن لکھنوی کی ذات بابرکات ایسی تھی کہ جن کے اوصاف زبان و بیان کے دائرے میں نہیں آسکتے۔ ایسی خدا پرست راست گو۔ عالی مقام اور مجسمۂ اخلاق و علم ہستیاں کم پیدا ہوتی ہیں۔ جو سوتی ہوئی دُنیا کو جگا کر جب اس جہان فانی سے رخصت ہوتی ہیں تو ایسے نقش چھوڑ جاتی ہیں جو انہیں زندہ جاوید کی صورت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ امن صاحب کی ذات گرامی ایسی ہی تھی۔

امن صاحب سے مجھے شرف ملاقات اس وقت حاصل ہوا جب میں ہندو کالج میں فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا۔ ۲۴ یا ۲۵ دسمبر ۱۹۴۳ء کی بات ہے پنڈت امر ناتھ ساحر دہلوی کے دولت کدے پر سالانہ مشاعرے میں (یہ مشاعرہ تاریخی ہوتا تھا) موصوف شرکت کے لئے آئے تھے۔ میں نے انہیں دنوں شاعری میں نیا نیا قدم رکھا تھا۔ نہ میں امن صاحب کے متعلق زیادہ جانتا تھا نہ وہ میرے متعلق جانتے تھے مشاعرے کی طرح یہ تھی۔

چٹکنا غنچۂ و گل کا صدائے خندۂ دل ہے

آپ تو جانتے ہی ہیں نو آموزوں کو مشاعرے کے شروع ہی میں پڑھا دیا جاتا ہے۔ ابتدائی دور میں غزل پڑھنے کو مجھے بلا لیا گیا میرا اک شعر امن صاحب کو بہت پسند آیا اور وہی شعر مجھے اُن کے نزدیک لے گیا میں آپ کے سامنے بھی وہی شعر پڑھے دیتا ہوں ؎

مخالف ختم تو ہوتے ہی لو اجل بھی ہو گئی ہم
مرا جینا تو مشکل تھا مرا مرنا بھی مشکل ہے

غزل ختم ہونے کے کچھ لمحات بعد امن صاحب نے مجھے پاس بلا کر بہت تعریف کی جو میرے لئے اب تک مشعل راہ ہے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کیا کرتے ہیں۔ میں نے جواب دیا پڑھتا ہوں ہم دونوں نے جو باتیں کی وہ ادھوری ہیں تفصیل وہ میں دُہراؤں گا نہیں۔ انہوں نے میرا امتحان لیا تھا کہ اعظم گڑھ کا رہنے والا ہے کچھ جانتا ہے یا نہیں۔ میں نے بھی اُسی لہجے میں جواب دیا تو بہت خوش ہوئے۔ میرے شعر کی تعریف کرتے ہوئے مجھ سے کہنے لگے، بیٹے جو تمہارے جذبات اب ہیں وہ جوانی میں نہیں ہونے چاہئیں۔ میں نے بھی جواب دیا جناب ایسے جذبات تو جبھی آتے ہیں جب جوانی اُبھرتی ہے۔ بڑھاپے میں نہیں آتے جب بڑھاپا آئے گا تو ایسے جذبات چھوڑ دوں گا۔ اس مشاعرہ کے بعد تو اُن کی خدمت میں بیٹھنے کے اکثر موقعے ملے بہت سے مشاعروں۔ جلسوں، سیمیناروں میں اُن کے ہمراہ شرکت کی جہلم کی بہت مجلس میں یا حسین ڈے پر برابر ملاقات ہوتی رہی دلّی میں ہی نہیں دلّی کے باہر بھی کبھی اندور کبھی علی گڑھ کبھی سعیدپور ساتھ سفر کیا۔ یو پی کے بہت سے اضلاع میں ساتھ ساتھ گئے۔ میرے کرم فرما جناب جسٹس ویاس دیو مصرا بھی اکثر ساتھ رہے۔ ایک دو مرتبہ جناب ادیب لکھنوی بھی ساتھ تھے۔ وہ سفر وہ محفلیں وہ جلسے اب تک نظروں کے سامنے ہیں۔ جوشی کی بستیں ہوتیں گھر رات باتیں کرتے بیتتی کبھی کسی کا واقعہ کبھی کسی کا قصہ۔

ہم نے امن صاحب کو بہت نزدیک سے دیکھا اُن کا رہن سہن، کس طرح کھاتے ہیں کس طرح اُٹھتے۔ بیٹھتے ہیں کس طرح خدا کی عبادت کرتے ہیں اور سب سے بڑی بات جو میں نے اُن میں دیکھی (۱۹۴۳ء کی پہلی ملاقات سے اُن کے انتقال تک) کہ وہ تعریف تو بار ہا بہت سے لوگوں کی کرتے تھے مگر اُن کے منہ سے کبھی کسی کی برائی نہیں سنی۔

امن صاحب کی طبیعت کے متعلق میں کیا کہوں۔ اُن کی علمی۔ مزاحیہ اور سبق آموز گفتگو اب تک دل کی تسکین کا باعث ہے۔ لیکن اب جب کہ وہ نہیں ہیں اور ہم اس زمانے پر نظر ڈالتا ہوں تو آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور دل تڑپ جاتا ہے۔

امن صاحب کی ایک خاص صفت اُن کی طبع مزاح تھی وہ شگفتہ طبیعت کے انسان تھے بلکہ حاضر جواب تھے اور بات کہنے کا سلیقہ تھا ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ہمیں حسن پور قصبہ میں شرکت کے لئے امروہہ ضلع مرادآباد جانا تھا راستے

میں گھٹا کا پُل پڑتا تھا جو اُس زمانے میں کشتیوں کا تھا۔ کچھ کشتیوں کو مشاعرہ مرمت کے لئے کھول دیا گیا تھا۔ پُل تو ٹوٹا ہوا تھا اور بیچ کا مرو بہہ گیا رہا تھا اور سامنے تک پہنچ جاتا تھا اور ایک بیچ چھپا تھا۔ سب باری باری گئے مگر عام کام واپس آ گئے پُل والے نہیں مانے آخر پر اُنمبر آیا میں گیا دس پندرہ منٹ میں سب کشتیاں جڑ گئیں اور ہم لوگ پُل پار ہو گئے کچھ دور چل اُنے پہ امن صاحب نے پوچھا جھوری کیا پُل والوں سے کیا کہہ دیا کہ وہ لوگ فوراً بات مان گئے جب کہ ہم سب وہاں سے بات کر کے لوٹ آئے تھے نہ مجھ سے کام بنا نہ مصرا جی سے میں نے جواب دیا اجناب میں نے اُن لوگوں سے کہا کمبختو کیوں اپنی موت بلا رہے ہو جانتے ہو کملا پتی ترپاٹھی ہیں بخشیں گے نہیں۔ تو صاحب ۱۰ منٹ سے زیادہ دیر کشتیاں باندھنے میں نہیں لگی امرو بہہ پہنچے تو وہاں والے سخت ناراض تھے الگ بٹھا دیئے گئے دیر بہت ہو گئی تھی جو آنا تھا وہ شاہ ہوا نماز تو قضا ہو ہی چکی تھی کھانا بھی قضا ہو گیا۔ اُس دن صبح جلدی چلنے کی وجہ سے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا ایک صاحب بلانے آئے پنڈال میں جاتے جاتے انہوں نے فرمایا کھانا جلسے کے بعد ہی کھائیں گے بس وہ مصرا جی نے کہا "جی ہاں بھو کا شیر دور سے دہاڑتا ہے" لیکن امن صاحب کا انداز ملاحظہ فرمائیے کہا صاحب یہی بات نہیں ہے بلکہ یہ ہے "جو ظرف ہے خالی وہ صدا دیتا ہے"!

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہمارے سامنے تھیں ہم نے ان کا کتنا لطف اٹھایا کیا بتائیں۔ اُن کی برجستگی کی بہت سی مثالیں اور اشعار مجھے یاد ہیں مگر وقت اتنی اجازت نہیں دیتا کہ میں اور کچھ ذکر کروں۔

امن صاحب منسٹر بھی رہے ڈپٹی اسپیکر بھی، پبلک ریلیشنز کمیٹی کے چیئرمین بھی رہے اور اسٹیٹ ٹرانسپورٹ اتھارٹی کے چیئرمین بھی وہ جس عہدے پر رہے جس کرسی پر بیٹھے اُسے منزل معراج تک پہنچا دیا۔ وہ جن جگہوں پر رہے وہ امن کی عزت اور فخر کا باعث نہیں بنی بلکہ اُن جگہوں کو قبول فرما کر امن صاحب نے اُن عہدوں کو عزت بخشی۔ آج کل اگر کسی کو دو دن کے لئے بھی راج مل جائے تخت و تاج مل جائے تو اُس کی صورت کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔ میں تو دلی میں دیکھتا ہوں

کہ جن کے پاس کل بھر پیٹ روٹی بھی نہیں تھی وہ اگر ایک دن کے لئے کرسی پر بیٹھ گیا تو بیٹے بیٹیوں اور اپنے لئے الگ الگ مکان بنوا لئے، مہمانوں کے ٹھہرنے کے لئے الگ جگہیں بن گئیں یہ سب کیسے ہو گیا۔ امن صاحب ہمارے گاندھی وادی تھے۔ آج کل کے گاندھی وادی نہیں جب لوگ گاندھی وادی کہتے ہیں تو سب کچھ جھجھک محسوس ہوتی ہے ایسے بہت کم ہیں جو واقعی گاندھی وادی ہیں۔ امن صاحب اصلی گاندھی وادی تھے کیوں کہ گاندھی وادی کے پاس لنگوٹی کے سوا اور جائداد نہیں ہوتی یعنی اُس کے تن پر سادے کپڑوں کے علاوہ اور کوئی جائداد یا دولت نہیں ملے گی۔ ایسے آدمی بہت کم ہیں میرے کئی ساتھی، ساتھ کے پڑھے منسٹر ہیں، کچھ لیڈر، بہت سے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ میں سب کو نہیں کہتا مگر زیادہ تر کا حال معلوم ہے کل تک گھر میں روز چولہا نہیں جلتا تھا آج اُن کے بڑے بڑے مکان ہیں کوٹھیاں ہیں۔ لیکن یہ شخص یعنی امن لکھنوی جس پر ہم فخر کرتے ہیں اور مرتے دم تک فخر کرتے رہیں گے۔ اونچی اونچی کرسیوں پر بیٹھا منسٹر، ڈپٹی اسپیکر، چیئرمین رہا۔ بڑوں سے بڑوں سے دوستی رہی لیکن بڑے بڑے عہدوں پر رہتے ہوئے بھی امن صاحب اسی نوکری والان کے مکان میں رہے جس میں نہ ڈھنگ کی کھڑکی تھی نہ دروازہ۔ اور میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ جیسے تہی دست آئے تھے ویسے ہی چلے گئے لیکن دنیا والوں کو بتا دیا کہ جب ملک کی خدمت کرنی پڑتی ہے تو تہی دست رہنا پڑتا ہے اور تہی دست جانا پڑتا ہے بلکہ جو تھوڑا بہت سرمایہ پاس ہو وہ بھی خرچ کر دینا پڑتا ہے۔ یہ بڑا سبق ہے جو امن صاحب کی زندگی سے ہمیں ملتا ہے جو اور کہیں کم ہی ملتا ہے۔

جناب امن اور اُن کے برادر خورد جناب ادیب لکھنوی نے عزیز لکھنوی سے تلمذ حاصل کیا میں بھی جناب عزیز لکھنوی کے یہاں جایا کرتا تھا کیوں کہ میرے بہنوئی عزیز لکھنوی کے دوستوں میں سے تھے۔ جناب ادیب لکھنوی جو یہاں تشریف فرما ہیں میں سچ کہتا ہوں اگر عزیز لکھنوی کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو ان کا کلام نہ صرف جہاں تک شعر و سخن کا تعلق ہے اساتذہ کا ایک نمونہ

بقیہ صفحہ ۲۳ پر

جنابِ امن لکھنوی کی غزل اور نظم نگاری

تاریخ کے اوراق اس امر کے گواہ ہیں کہ اردو شعراء نے آزادی کی عظمت اور حب الوطنی کے نغمے گائے ہیں اور سیاسی انقلابات کی بھرپور عکاسی کر کے ہندوستان کے عوام میں نہ صرف اپنے کلام کے ذریعہ دلچسپی پیدا کی بلکہ ان کو اس تحریک کے لئے اکسایا بھی۔

چکبست۔ حالی۔ آزاد۔ حسرت موہانی۔ سیماب مولانا ظفر علی خاں۔ اقبال۔ تلوک چند محروم۔ بسمل الہ آبادی اور امن لکھنوی نے اپنی ولولہ انگیز نظموں سے قومی تحریک اور جنگِ آزادی کو تیز تر کرنے میں ناقابلِ فراموش رول ادا کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ انگریزی ظلم و استبداد کے خلاف اردو شعر و ادب میں وافر اور وقیع سرمایہ ملتا ہے۔

اس مختصر مضمون میں جنگِ آزادی کے سپاہی اور اردو کی قومی شاعری کے محکم ستون جناب امن لکھنوی کی قومی نظموں اور غزلوں کا مطالعہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ مایاکوفسکی پابلو نرودا اور ناظم حکمت کی طرح جناب امن صاحب نے بھی اپنے قلم سے تلوار کا کام لیا ہے۔ اپنی بے باک نگاری اور شعلہ نگاری کے صدقے وہ کئی بار جیل کی سلاخوں سے شاداں و فرحاں گذرے ہیں۔ وہ قید میں رہ کر بھی زنداں کی دیواروں پر ہاتھوں سے چاندنی چھنتی ہوئی محسوس کرتے [illegible] چاندنی رات کا بھرپور حظ اٹھاتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں

؎ دیوارِ زنداں پہ چاندنی چھنتی ہے پتوں میں
[illegible] صافیہ میں [illegible]

امن صاحب کا فن اردو شاعری کی [illegible] ہے۔ [illegible] نہ صرف غزل ہی میں طبع آزمائی نہیں کی ہے بلکہ نظم میں بھی اپنے قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ ان کی شاعری کا بنیادی اسٹائل [illegible] ان کے تجربات اور مشاہدات کا ہر لمحہ [illegible]

دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں رنگ برنگے پھول بھی ہیں اور خار دار جھاڑیاں بھی۔ جھوٹ، دھوکا، فریب اور طلسماتی فضا کے بجائے سچائی۔ حقیقت اور دل پر گذری ہوئی کیفیات کو جس خوبصورت انداز سے نظم کیا گیا ہے وہ اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ امن صاحب ایک سچے شاعر ہیں۔ وطن سے ان کو والہانہ پیار ہے۔ ان نظموں میں آزادی کی بڑی حسین رنگین تصویر دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ آزادی کے ایک لمحے کو غلامی کی حیاتِ جاوداں سے بہتر سمجھتے ہیں اور طلبا کو سعادت مندی کا سبق دیتے ہوئے طنزاً فرماتے ہیں۔

؎ یہ کیا کہ وطن کے گیت گاتے ہو تم
کیوں نیند کے ماتوں کو جگاتے ہو تم
کہتے ہو کہ ملک کو کریں گے آزاد
کالج میں شریر ہوتے جاتے ہو تم

شاعر ایک ایسا آلہ ہے جو ہمیشہ کام کرتا رہتا ہے کوئی بھی موسم ہو وہ اس کی ذرا سی تبدیلی کو بھی فوراً محسوس کرتا ہے اور اس کو ظاہر کرتا رہتا ہے۔ معاشرے میں اس کی ٹھیک وہی حالت ہے جو انسانی جسم میں آنکھ کی ہوا کرتی ہے۔ جب ہماری قومی زندگی کا پیراہن چاک چاک ہو رہا تھا تو اس پر آنسو بہانا اور اس کے رفو کی تدابیر کرنا شاعر کے لئے فطری امر تھا چنانچہ "مسلسل فریب" "دلِ مایوس سے خطاب" "وقتی [illegible]" اور "[illegible] و امید" جیسی نظمیں ہمیں اس دور کے حالات سے پوری طرح واقف کراتی ہیں۔ ان نظموں میں شاعر نے خارجیت اور داخلیت [illegible] کائنات [illegible] [illegible] ہمارا ناموس کی بنیاد ہوتا ہے [illegible] وہ خلوص ہے جو امن صاحب کو اپنے ملک اور قوم سے [illegible] رہا ہے۔

اردو شاعری میں قنوطیت [illegible] مرحوم [illegible]

عرصہ سے چلی آرہی تھی لیکن احسن صاحب نے اپنے قلم کے ذریعہ دُنیا کو جنت بنانے اور انسان کو تہذیب یافتہ بنانے کے لئے استعمال کیا۔ اُنھوں نے استحصالی طاقتوں کے خلاف عوام کی سرفروشی کی ستائش اور اُن کی آزادی کی جدوجہد کی پُرخلوص اور پُرزور حمایت کی۔ آغازِ جنگ عظیم سے ۱۹۴۲ء کی شدید جنگ جو نظمیں احسن صاحب نے کہیں ہیں اُن کا اگر تنقیدی مطالعہ کیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ وہ بھی آزادی سے مُتاثر ہو کر کہی گئیں ہیں۔ جذبات کا اُبال زیادہ ہے جس کے ذریعہ عصری آگہی اور سماجی شعور فن کارانہ پیرایۂ بیان میں سمویا گیا ہے۔ "جنگ" اور جنگ پر ایک نفسیاتی نظر ایسی نظمیں ہیں جن میں جنگ کی ہولناکیوں کا ذکر ہے۔ معصوم اور سادہ لوح عوام کی دل گدازداستان ہے۔ یہ اس قسم کی نظمیں ہیں جو محض شاعری کرنے کے لئے نہیں لکھی گئیں ہیں بلکہ اِن کی پشت پر وہی جذبہ متبرک خواہشِ امن موجود ہے جو گاندھی جی کے دل کی دھڑکن اور احسن صاحب کے مزاج کا خاصہ تھی۔

۱۹۴۷ء میں جب فرقہ پرستی کے جنون نے ساری ہند مسلم مذہبی اور تہذیبی روایتوں کو دفن کر کے درندوں کی طرح انسانوں کو پھاڑنا شروع کیا جب مسلمانوں اور ہندوؤں کے ضمیر میں ایسا خلا پیدا ہو گیا جہاں محبت اور انسانیت پر بھی نہ مارسکیں۔ تو اُس وقت بھی شاعر اُس طوفانِ مُنافرت کو محبت میں بدلنے کے لئے کمربستہ دکھائی دیتا ہے شاعر نے اس آزمائش میں اپنا دامن تنگ نظری اور درندگی سے آلودہ نہ ہونے دیا بلکہ انسانیت کے نام پر اُن تمام فرقہ پرستوں اور ان کے حامیوں پر طنز کئے جنہوں نے ہندوستان کے نام کو دُنیا میں ذلیل و خوار کر دیا تھا۔ "ہنگاموں کے آغاز پر" اور "ہنگاموں کے ختم ہونے پر" اسی طرح کی نظمیں ہیں۔ مگر اس مذہبی جنون اور دیوانہ پن کو کیا نام دیا جائے کہ جس نے جنگ آزادی کے سپہ سالار اور قوم کے میر کارواں، باپو گاندھی کا قتل ہی کر دیا۔ ایسا واقعہ نہ تھا کہ شعرائے کرام کے احساسات زخمی نہ ہوں اور اُن کا قلم جنبش نہ کرے چنانچہ احسن صاحب نے بھی اپنے خون کے آنسوؤں کا خزانہ گاندھی جی کی موت پر "شہادت کے بعد" کے ذریعہ نچھاور کر دیا۔ اِس عقیدت میں محض غم نہ تھا بلکہ گہری نظر سے اُن حالات کا جائزہ بھی لیا گیا تھا جنہوں نے مُلک کے ایک گروہ میں فاسستی رجحان پیدا کر دیا تھا اور جنھوں نے اپنے مقصد کے لئے اِس عظیم قومی رہنما پر بھی گولی چلانے سے دریغ نہ کیا جس کے جہاد بالنفس اور عمل نے انھیں سامراجی پنجہ سے چھڑایا تھا اور دُنیا کی قدموں میں سرِ ہمارے دہ بنایا تھا۔ اس نظم کے مُطالعہ کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ اُس میں تدا! مرثیہ پن نہیں ہے بلکہ یہ دلی لگاؤ، خلوص کی گرمی اور انسان دوستی کے جذبہ کی مظہر ہے اور اس میں بشنی فکر کا پہلو نمایاں طور پر موجود ہے۔

نظموں کے ساتھ ساتھ احسن صاحب نے جو غزلیں کہیں ہیں اُن میں بھی اُنہوں نے محض خیال یا تصور پرستی پر قناعت نہیں کیا بلکہ بدلتے ہوئے سماجی حالات سے اپنے ذہنی اور جذباتی مُطابقت کا زیادہ ثبوت دیا ہے اُن غزلوں میں اُس دور کی عام بے رونقی اور آرزوؤں کے بے رنگ رہ جانے کا اظہار سادگی اور خلوص کے ساتھ کیا گیا ہے اس میں انفرادی جذبوں کے اظہار کے مُقابلہ میں اجتماعی زندگی کی محرومیوں کا عکس زیادہ ہے غم جاناں کے مقابلہ میں غم دوراں کی تصویر واضح طور پر ہمارے سامنے اُبھر کر آتی ہے۔ اُس کی وجہ شاید یہ ہے کہ شاعر نے از خود حقیقی زندگی کی آنچ محسوس کی ہے اُس زمانے کی بے مہری اور تلخی کا خود تجربہ کیا ہے اُس نے اپنی ذات ہی کو ادھر اُدھر نہیں بہایا بلکہ تنگ نظری، تعصب، منافقت اور جہالت کا کھلی آنکھ سے مُشاہدہ کر کے تجربہ کیا ہے اور اُن پر ردِ عمل اظہار کر کے حالات اور ماحول کو آئینہ دکھایا ہے۔

ان غزلوں میں زیادہ تر وہی پُرانی علامتیں منزل، بہار، گلستاں، آشیاں، غربت، کارواں، دار و رسن، نشیمن وغیرہ کا استعمال کیا گیا ہے مگر شاعر نے اس دور کی مخصوص فضا کی بھرپور عکاسی کی ہے اور اِن علامات کا اُس دور کی واقعات سے براہِ راست تعلق دکھایا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ شاعر نے امن اور آزادی کے استقبال میں جو ترانے گائے ہیں وہ قابلِ صد مُبارک باد ہیں۔

ذکی طارق ۱۱، جی۔ٹی۔ روڈ۔ غازی آباد

منشی گوپی ناتھ امن لکھنوی — ایک سچے گاندھی وادی

عبداللطیف اعظمی

منشی گوپی ناتھ امن لکھنوی میں بہت سی خصوصیات جمع ہو گئی تھیں۔ وہ تحریک آزادی کے مخلص مجاہد، اردو کے خوش گو شاعر اور ممتاز صحافت نگار تھے، مگر ان تمام خصوصیات سے بڑھ کر ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی سادہ اور بے ریا زندگی تھی، ان سے میرے گہرے اور بے تکلف تعلقات تھے، ان کو بہت قریب سے دیکھنے اور ان کی زندگی کا مطالعہ کرنے کا مجھے موقع ملا ہے، میں نے انہیں مختلف حالات اور مختلف کیفیت میں دیکھا ہے، اس وقت بھی جب وہ محض صحافی تھے۔ اردو کے صحافی جسے ملتا کم ہے اور کام زیادہ کرنا پڑتا ہے اور بالعموم ضمیر کے خلاف لکھنا پڑتا ہے، اور اس وقت بھی دیکھا جب دلی میں اسمبلی قائم ہوئی اور امن صاحب وزیر بنائے گئے، یہ زمانہ صحافتی دور سے بھی زیادہ مشکل اور خطرناک تھا، کیوں کہ تنگی ترشی کی زندگی دیانت داری اور ایمان داری سے گذارنا نسبتاً زیادہ آسان ہے، لیکن اس وقت جب اقتدار کی کرسی میسر آتی ہو، دولت کی ریل پیل بھی ہو، آسائش کی زندگی میسر ہو اور آگے پیچھے خوشامد پسندوں کا جم گھٹا ہو، اس وقت اپنی سادگی، ایمان داری اور اصول پرستی کو قائم رکھنا مشکل ہوتا ہے، مگر امن صاحب نے دونوں زمانے دیکھا اور خوشی اور فخر کی بات یہ ہے کہ دونوں حالات میں اپنے کھرے اور بے لاگ اصولوں پرستی سے قائم رہے اور انہیں خوبیوں کی وجہ سے میں نے ان کو سچا گاندھی وادی کہا ہے۔ گاندھی وادی سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ سیاسی لحاظ سے پکے قوم پرور اور کانگریسی تھے، بلکہ میرا مطلب ہے کہ وہ روزمرہ کی زندگی میں اصول پرست، ایمان دار، بے ریا، قوم پرور اور فرقہ پرستی سے بلند اور اونچے تھے۔ اس وقت میں نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں انہیں بہت سوچ سمجھ کر استعمال کیا ہے اور انہیں واقعی میں نے ایسا ہی پایا جیسا لکھا ہے۔

[illegible] میں ایک نوجوان شاعر، نریش کمار شاد نے جو اپنے دور کے ترقی پسند شاعروں میں اچھی حیثیت کے مالک تھے اور شراب کے بڑے رسیا تھے، امن صاحب سے انٹرویو کرتے وقت سوال کیا تھا کہ آپ ایک سیاست داں ہونے کے باوجود ریاکاری سے دور اور ایک شاعر ہوتے ہوئے شراب سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟ اس کے جواب میں امن صاحب نے برجستہ فرمایا تھا کہ شاید یہی وجہ ہے کہ مجھ سے کوئی شخص خوش نہیں۔ "میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند" سیاسی دنیا میں رہتا ہوں مگر کسی گروپ سے وابستہ نہیں، شاعر ہوں لیکن لاابالی نہیں۔ انھوں نے یہ فرمایا، گاندھی جی کا یہ فرمان:

There are Compartments in Human Life

میرے لئے مشعل راہ کا کام کرتا ہے۔

شراب کے بارے میں کہا: میں شراب نوشی کو بدترین گناہوں میں نہیں سمجھتا، میرے بہترین دوستوں میں سے اکثر شرابی ہیں، اگرچہ مجھے شراب سے نفرت ہے تو محض اس لئے کہ شراب نوشی سے انسان اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو نقصان ہو جاتا ہے اور جتنا وقت شراب کے نشے میں ضائع کرتا ہے، اسے بہتر مصرف میں لا سکتا ہے۔

امن صاحب نے شراب کی قباحتوں کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، وہ حرف بحرف نریش کمار شاد پر صادق آیا۔ وہ شراب کے ہمیشہ عادی تھے اور ان شاعروں میں تھے جو بغیر شراب کے ایک بھی شعر نہیں کہہ سکتے، بالآخر اسی لت نے خود تباہ ہو گئے اور ان کا پیار

بھی تباہ ہو گیا ہوتا مگر موصوف کے دوست احباب اور
قدردوں نے اُس کی مدد نہ کی ہوتی۔ شراب نوشی ہی
کے سلسلے میں مجھے ایک اور واقعہ یاد آگیا۔ جس سے امن صاحب
کی اُصول پرستی اور پختہ ایمان پر بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے۔
غالباً ۵۲-۱۹۵۱ء کی بات ہے۔ امن صاحب "اُردو
سبھا" کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم کی تھی۔ اُس وقت
تک یوم جمہوریہ کا مشاعرہ، جو لال قلعہ میں منعقد ہوتا ہے،
حکومت کی سرپرستی اور اہتمام میں منعقد ہوا کرتا تھا۔ پہلی مرتبہ
ایک پرائیویٹ انجمن کو اس کا انتظام سونپا گیا۔ یعنی امن
صاحب سے کہا گیا کہ وہ اس مشاعرہ کے انتظام کی ذمہ داری
قبول کریں۔ اُردو سبھا کی مجلس انتظامیہ میں یہ مسئلہ زیرِ غور
آیا تو امن صاحب نے یہ شرط پیش کی کہ اِس مشاعرے
میں کوئی ایسا شاعر مدعو نہیں کیا جائے گا جو شراب پی کر
مشاعروں میں آتا ہے اور [illegible]
اس مسئلے پر بڑی گرما گرم بحثیں ہوئیں۔ مگر امن صاحب اپنے
موقف پر ڈٹے رہے۔ اس مجلس میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر
بھی موجود تھے، جن کے تعاون کے بغیر دلی میں کوئی مشاعرہ
بمشکل کامیاب ہو سکتا تھا۔ یہی کیفیت اب بھی قائم ہے۔
اس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ سحر صاحب کے ایسے
متعدد شعراء سے گہرے تعلقات تھے جو شراب کے شوق
سے عادی تھے اور ان میں چند ایسے بھی تھے جن کی شرکت
مشاعروں کی کامیابی کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھی۔ مگر
اس کے باوجود سحر صاحب نے بڑی صفائی کے ساتھ
فرمایا کہ آپ لوگ جس کو چاہیں مدعو کریں، جس کو چاہیں نہ بلائیں
میرے ذمہ جو کام سپرد کیا جائے گا میں اُس کو انجام دوں گا۔
چنانچہ انھوں نے واقعی اپنے اس وعدے کو پورا کیا اور مشاعرے
کو اپنے مکمل تعاون سے سرفراز کیا، مگر حضرت جوش ملیح آبادی
کو مدعو [illegible] مجاز مرحوم کو مدعو نہیں کیا۔ یہ سب کو معلوم
ہے کہ جوش شراب پیتے ضرور تھے اور پابندی کے ساتھ
مگر اُن کے کچھ اُصول بھی تھے اور پینے کا وقت معین تھا،
اس پر سختی سے عمل کرتے تھے، مگر افسوس امن صاحب کی
اس شرط کو توڑنے کے لیے اپنے اُصول کے برعکس شراب
کی بوتلیں لے کر مشاعرے میں آئے اور قریب ہی بیٹھ کر
اپنے مخصوص احباب کے ساتھ شراب نوشی میں مشغول
ہو گئے۔ مشاعرے کے صدر اُس وقت کے چیف کمشنر
شنکر پرشاد تھے۔ جب مشاعرہ کی کارروائی شروع کرنے
کا وقت آیا تو انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پوچھا: کیا
جوش صاحب نہیں آئے ہیں؟ امن صاحب اپنے
جذبات کو ضبط کرتے ہوئے فرمایا: دیکھئے وہ بیٹھے شراب
نوشی میں مشغول ہیں۔

جوش صاحب اُس زمانے میں سرکاری ملازمت
میں تھے اور [illegible] صاحب دلی کے چیف کمشنر تھے۔ جن
کی وہی حیثیت تھی جو آج کل لفٹننٹ گورنر کی ہے، مگر ظاہر
ہے وہ کیا کر سکتے تھے۔ بہرحال اس کشیدہ فضا میں مشاعرہ
شروع ہوا اور جب حضرت جوش کی باری آئی تو انہوں
نے مشاعرہ کی شرط کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے،
شراب کی حمایت میں نظم پڑھی۔ پھر کیا تھا مشاعرے
میں ہنگامہ برپا ہو گیا اور اب پروگرام کے برخلاف متعدد
شعراء نے شراب کی مخالفت میں قطعے اور متفرق اشعار پڑھنے
لگے۔ مشاعرہ براہ راست ریڈیو سے براڈ کاسٹ ہو رہا
تھا، بڑی مشکل سے حالات پر قابو حاصل کیا گیا۔ اس کا
اثر کئی [illegible] دلی کی ادبی اور شعری فضا پر برقرار رہا۔

اس موقع پر امن صاحب کی سادگی اور عوامی زندگی
کا ایک اور واقعہ بیان کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ جب وہ
دلی اسٹیٹ کے وزیر تھے تو وہ دفتر جاتے وقت گھر سے
پیدل جاتے اور واپسی میں بس سے آتے۔ مجھے اس پر
یقین نہیں آتا تھا کہ ایک وزیر ایسا بھی کر سکتا ہے۔ وہ کہتے
تھے کہ میرے گھر سے اولڈ سکریٹریٹ کچھ زیادہ دور نہیں ہے
ویسے میں ٹہلنے اور پیدل چلنے کا بھی عادی ہوں۔ اس کے علاوہ
شدید مصروفیات میں بھی نظم و ضبط اور ڈسپلن کا پابند
ہوں۔ اس لیے [illegible] کہ پیدل جاتا ہوں مگر کبھی
دفتر جا کر [illegible] نہیں ہوتا خیر جانا تو اُن کے اختیار میں

تھے مگر بس کا سفر میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ خاص طور پر دلی میں بسوں کا جو حال ہے وہ آپ سب جانتے ہیں۔ اور دفتر بند ہونے کے بعد جو حالت ہوتی ہے وہ آپ سب پر عیاں ہے۔ اس لئے میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیسے بس میں سوار ہوتے ہوں گے۔ ایک مرتبہ دیکھنے کا اتفاق ہوا اور یہ دیکھ کر مجھے تعجب ہوا کہ جب اُن کی بس آئی تو لوگوں نے پہلے اُن کو سوار ہونے کا موقع دیا، پھر خود سوار ہوئے۔ اسی طرح بس میں بھی کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ اُن کو اپنی سیٹ دے دیتا تھا۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اُن کا یہ احترام محض وزیر کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ ذاتی طور پر اُن کی لوگ بہت زیادہ عزت کرتے تھے۔ یہ اُن کے خلوص اور اُن کی بے لوث خدمات کا نتیجہ تھا۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب کسی وزیر کو اپنے عہدے سے ہٹنا پڑتا ہے تو اُس کی زندگی میں ایک انقلاب آجاتا ہے۔ دوست احباب اور ارادت عقیدت کے مجسول نچھاور کرنے والے کنارہ کش ہو جاتے ہیں، عیش وعشرت اور ٹھاٹ باٹ کی جگہ بے رونقی اور حسرت و یاس، رسماسی اور چہل پہل کی جگہ گورستان جیسی خاموشی نظر آتی ہے اور پورا گھر ماتم کدہ بن جاتا ہے، مگر جب دلی کی اسمبلی ٹوٹ گئی اور امن صاحب کی وزارت ختم ہوگئی تو اُن کی زندگی پر ذرا بھی اثر نہیں پڑا، اس لیے کہ جب وزارت کی وجہ سے اُن کی زندگی اور رہن سہن پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا تو اب اس کے چلے جانے سے کیا فرق پڑ سکتا ہے؟!

گاندھی جی کے نام لیوا تو ویسے بہت ہیں، مگر اُن کے اصولوں پر پابندی اور سچّی کے ساتھ عمل کرنے والے بہت کم ملیں گے۔ مگر امن صاحب اُن چند قوم پرور شاہوں میں سے تھے جو زندگی کے ہر لمحے اور ہر دور میں پوری ایمان داری کے ساتھ اُن کے اصولوں پر عمل کرتے رہے، چاہے جیل اور نظر بند کی زندگی ہو یا معمول کی آزاد زندگی۔ قول و فعل میں جتنی یکسانیت اور ہم آہنگی مجھے امن صاحب کے یہاں نظر آئی، اُس کی مثالیں عنقا تو نہیں مگر کمیاب ضرور ہیں۔ اسی کا ایک نتیجہ تھا کہ تقسیم ملک کے بعد جب دلی پر قیامت ٹوٹی تو اِن کے محلے میں اقلیت کے افراد اور خاندان بالکل محفوظ رہے، انھوں نے اپنی عزت و آبرو اور جان کو خطرے میں ڈال کر مسلمانوں کی حفاظت کی۔ ایسی مثالیں دلی اور ملک کے دوسرے مقامات پر بھی ملیں گی جب شریف ہندوؤں نے مسلمانوں کی اور معقول مسلمانوں نے ہندوؤں کی جانیں بچائیں، انھیں شریف اور معقول لوگوں میں شنی گوپی ناتھ امن بھی تھے۔

امن صاحب کی سیرت و شخصیت کے اور بہت سے تابناک اور سنہرے پہلو ہیں، جن پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے، مگر اس جلسے کے سامعین کے صبر و تحمل کا مزید امتحان لینا نہیں چاہتا، کیوں کہ وہ بڑی بے صبری کے ساتھ مشاعرے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس لیے فی الحال اسی مختصر مضمون پر اکتفا کرتا ہوں۔
یار زندہ صحبت باقی است۔ شکریہ!

عبداللطیف اعظمی

منشی سیٹھ اتم چند چندن ساکن ٹونک راجستھان خود شریک مشاعرہ نہیں ہو سکے۔ مندرجہ ذیل غزل ارسال فرمائی۔

غزل

کیا کیا نہ تو نے یارب مجھ کو عطا کیا ہے ۔۔۔ سو سو زباں سے تیرا سو بار شکریہ ہے
پیشِ نظر الٰہی یوں دل کا آئینہ ہے ۔۔۔ میں تجھ کو دیکھتا ہوں تو مجھ کو دیکھتا ہے
ہر شے مری نظر میں روشن ہے نور تیرا ۔۔۔ کعبہ ہو یا کلیسا دل تجھ کو پوجتا ہے
دن رات ہو رہی ہیں پوری مری مرادیں ۔۔۔ تیرے کرم سے دیا دامن بھرا پڑا ہے
آنے نہ دینگا بندہ کچھ فرق اپنے دل میں ۔۔۔ بندہ نواز رہے گا جیسا نباہ رہا ہے
اسکے سوا نہیں ہے دل میں کوئی تمنا ۔۔۔ ہر اک فقیر تجھ سے تجھ کو ہی مانگتا ہے
روز ازل سے انساں پتلا ہے تو غبار کا
چندن ہے تیرا چندن اقصہ یہ بنا ہے

گوپی ناتھ امن — ایک مطالعہ

مرحوم گوپی ناتھ امن ہماری مشترکہ تہذیب اور صحت مند روایتوں کے صرف علم بردار ہی نہیں تھے بلکہ یہ خوبیاں اُن کی زندگی میں شیر و شکر کی طرح شامل تھیں جنھیں ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اُن کا دامنِ زندگی بھی دودھ کی طرح صاف و شفاف رہا۔ اربابِ نظر جانتے ہیں کہ سیاست میں برسرِ اقتدار رہتے ہوئے اپنے دامن کو ہر طرح کی آلودگیوں اور آلائشوں سے بچائے رکھنا بجائے خود ایک کارنامہ ہے اور یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ امن صاحب نے بہرطور یہ کارنامہ انجام دیا۔ میرے خیال میں، اگر ایک طرف اُن کی کردارسازی میں صاف ستھرے گھریلو ماحول اور تعلیم و تربیت کو بنیادی حیثیت حاصل تھی تو دوسری طرف مختلف مذاہب کے رہبروں کی زندگی کا مطالعہ اور اُن سے ذہنی وابستگی لگاتے بھی اُن کے مزاج میں سلامت روی اور کردار میں صحت مندانہ استقامت پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

مرحوم گوپی ناتھ کے نام کا امن ایک ایسا جزو لاینفک بن گیا کہ گوپی ناتھ کو امن سے یا امن کو گوپی ناتھ سے جدا کر دیجئے تو جانے پہچانے لوگوں کے لئے بھی شناخت کرنا دشوار ہو جائے گی اور صرف یہی نہیں بلکہ جو توازن و تناسب اُن کے نام کو اُن کے تخلص، کے ساتھ تھا بالکل وہی اُن کی شخصیت کو اُن کی شاعری سے بھی۔

امن صاحب نے اُس زمانے میں آنکھیں کھولیں جب لکھنوی سلطنت کے زوال کو تقریباً نصف صدی گذر چکی تھی مگر لکھنوی تہذیب کے زوال کو غالباً ابھی نصف صدی باقی تھی۔ اُن کے آباؤ اجداد رائے بریلی ایک قصبہ دلمئو کے باشندے تھے۔ اور آصف الدولہ کے زمانے ہی سے شاہی دربار سے وابستہ ہو گئے تھے۔ اور لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اسی کائستھ گھرانے میں جناب مہادیو پرشاد عاصی کے یہاں انیسویں صدی کے خاتمہ اور بیسویں صدی کی ابتدا سے کچھ ہی قبل یعنی ۱۶ ستمبر ۱۸۹۸ء کو ایک بچہ پیدا ہوا۔ جو نئی صدی میں پرانی صدی کی کچھ بہترین روایتوں کا داعی اور نقیب بننے والا تھا۔ عمر کے ابتدائی دس سال جو اٹھان پرداخت اور افذ و اکتساب کے اعتبار سے انسانی زندگی میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی سرزمین پر گذرے۔ مولانا عزیز لکھنوی جیسے استاد کا فیضان نظر حاصل کیا اور ان ہی دنوں ذہن کے سوچنے سمجھنے اور دل کے دھڑکنے کا ایک انداز متعین ہو گیا۔ لکھنؤ کی آب و ہوا میں شاعری کی تاثیر تھی۔ اور یادش بخیر یہاں کی فضاؤں میں مجلس و ماتم کی آنسوؤں سے بھیگی آوازیں برابر گونجتی رہتی تھیں۔ جس کے پہلو میں ایک انسان کا دل ہو اور سلجھا ہوا دماغ، وہ اس ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انیس کے مرثیے لکھنوی معاشرت کی ان امتیازی خصوصیات کا حسین اور بہترین امتزاج ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ گوپی ناتھ امن انیس سے خاصے متاثر نظر آتے ہیں اور انیس کے رنگ میں انہوں نے کامیاب طبع آزمائی بھی کی ہے۔ پانچویں جماعت میں تعلیم کے دوران ہی مشق سخن شروع کر دی تھی۔ مگر عوام میں شاعر کی حیثیت سے پہلی بار روشناسی ۱۹۲۰ء میں پولیٹیکل ستیہ گرہ کے موقع پر حاصل ہوئی۔ اور جب سے آخر وقت تک تقریباً آٹھ دہائیوں کے دوران انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ ان کے موضوعات میں خاصا تنوع ہے۔ سیاسی حالات سماجی واقعات، ادبی معاملات، اور مذہبی شخصیات، یہ ہیں ان کی شاعری کے عناصر ترکیبی۔ جن کا مزاج ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اور جن کی نوعیت کا فرق بھی ناقابلِ انکار۔ مگر اس

کے باوجود ان چاروں موضوعات پر اُن کے رنگینیٔ قلم کی جنبشوں میں ایک ہم آہنگی ہے اور اس رنگارنگی میں ایک یکجہتی۔ جو توجہ ہے یہ دھیمی آنچ کا جوان کے دل کی دھڑکنوں سے اُن کے دماغ میں پوشیدہ چنگاریوں کے سلگتے رہنے کے باعث پیدا ہوتی ہے یہی کیفیت اگر مزاج کا حصہ بن جائے تو شخصیت میں سادگی و پرکاری پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پھر اس آدمی کے 'انسان' ہونے کا اعتراف کیا جانے لگتا ہے اور اگر انسانیت کے یہی اقدار شعر کے پیکر میں بھی ڈھلنے لگیں تو شاعری براہِ راست نوعِ انسانی کی خدمت کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ ایسی شاعری میں چونکہ گہرے سلوک اور پختہ اعتقاد کی کارفرمائی شامل رہتی ہے اس لئے اُس کے لب و لہجہ میں ایک دھیما پن ضرور ہوتا ہے مگر اُس کی تہ میں ایثار و اخلاق کی ایک زیریں لہر ہوتی ہے جو قاری کو کچھ دیر اور کچھ دور تک اپنے ساتھ رکھتی ہے۔

گوپی ناتھ امن کی شخصیت اور شاعری کا مطالعہ ایک ایسا ہی تجربہ ہے۔ اسلامی شخصیتوں سے متعلق اُن کی منظومات میں یہ دلآویزیاں پوری آب و تاب کے ساتھ موجود نظر آتی ہیں اور سر دست بحث بھی اُن کی شاعری کے اسی پہلو سے مقصود ہے۔ رسولِ خدا کی شان میں دو نظمیں، حضرت علی، امام حسن، امام حسین، حضرت عباس، حضرت علی اصغر اور حجت آخر کی مدح میں بارہ قصیدے، نو قطعات، چار سلام، اور دو مرثیے اور کئی نظمیں حضرت عیسیٰ کی شان میں میرے پیشِ نظر ہیں اور یقیناً اس کے لئے یہ دعویٰ غلط ہوگا کہ اس ضمن میں اُن کے رشحاتِ قلم کا یہ مکمل مجموعہ ہے، اس کے علاوہ بھی اُنہوں نے بہت کچھ کہا ہوگا جو میرے مطالعہ تک نہ آسکا کیونکہ ہر سال کچھ نذرِ عقیدت پیش کرنا اُن کے معمولات میں سے تھا۔ ایسا کیوں تھا اس کی وجہ بہت ہی صاف گوئی اور انکساری کے ساتھ اُنہوں نے خود ہی بیان کی ہے:

میں نہ زاہد نہ عبادت ہی کی تدبیر آتے
ذہن عالم تو سارہ مجھ کو نہ تفسیر آتے
عقل علم و ادب میں جو گیا نہیں کی توفیق
شیعہ اجلاس میں ایک قابلِ تعزیر آئے
شکل و صورت ہے نہ سیرت ہے نہ عادت مجھ پاس
کہ ارے نہ چہرے سے لئے کوئی تصویر آئے
کیا سبب ہے کہ پھر اک بندۂ بے علم و شعور
چند لوگوں کو نظر قابلِ توقیر آئے
الغرض اس کا سبب ایک ہی اس کا باعث
جو عقیدت ہو تو اشعار میں تاثیر آئے
ایسی محفل میں بصد عجز و خلوص آتا ہوں
کہ جہاں تذکرۂ حضرتِ شبیر آئے
پیش کر دیتا ہوں کچھ نذرِ عقیدت ہر سال
تاکہ اس سے مرے اعمال میں تنویر آئے

گوپی ناتھ امن ایک سیدھے سادے شریف انسان تھے، راست روی اُن کا اشعار ہی نہیں بلکہ مزاج بھی تھا اور اس راستے کی پہنائیوں میں اس قدر زیادہ پائیدار اور مستحکم تھیں کہ میدانِ سیاست میں برسوں سرگرم حصہ لینے کے باوجود کہیں کج روی یا ناہمواری پیدا نہیں ہوئے مگر انہوں نے اپنی پاکبازی کو کوئی ذاتی کارنامہ نہیں سمجھا بلکہ خدا کے نیک بندوں سے عقیدت اور اُن کے فیض و عرفان ہی کو اپنا دامن داغدار نہ ہونے کی وجہ سمجھتے رہے، یہ سرگزشت اور عقیدت اور اُن کا خوشگوار باہمی ردِ عمل بہت ہی ایک دلچسپ ہے:

یہ اُسی کا فیض ہے مجھ کو جو کچھ شہرت ملی
ورنہ کبھی مجھ سے نہ کوئی سر ہوا
زندگی سیاست اپنے ذہن پہ چھا نہ سکا
نیک بندوں میں تھا اپنا کیوں کر نہ ہوا
زندگی کا بیشتر حصہ سیاست میں گیا
اور سیاست داں مگر کوئی بھی دشمن نہ ہوا
داغ لو کتنے ہی ہوں گے وہ نظر آتے نہیں
کیونکہ میں مدحت گرِ محبوبِ پیغمبر ہوا
امن بے جوشِ عقیدت بے نیازِ نسل و نام
اس لئے مجھ کو نہ خوفِ پرسشِ محشر ہوا

امن صاحب اور ریڈیو

از
رفعت سروش

گو پلی نائیکہ امن کا نام اور کلام تو اس وقت سے ذہن نشین ہے جب سے میں نے ہوش سنبھالا کیونکہ تحفۂ ویکلی) اور نقاتہ کا پورا کا مطالعہ میں نے بچپن سے کیا ہے۔ لیکن امن صاحب سے باقاعدہ نیاز حاصل ہوا ۱۹۵۱ء میں جب میں بمبئی سے دہلی آیا۔ مجھے یاد ہے امن صاحب سے پہلی تفصیلی ملاقات انجمن ترقی اردو کی ایک میٹنگ میں (علی منزل کوچہ پنڈت) ہوئی۔ اس میٹنگ میں نیاز فتح پوری بھی موجود تھے۔ میری ایک نظم زیر بحث تھی۔ گفتگو کچھ تیکھا رخ اختیار کر گئی۔ میں نے نیاز صاحب کی توقع کے بالکل خلاف، برملا اُن کی نسل کے احساس برتری کی مذمت کی اور اس موقع پر امن صاحب نے گفتگو کو متوازن کیا۔ مجھے امن صاحب کی فراخ دلی اور وسیع النظری پسند آئی اور تب سے میں اُن سے ایک نیاز مند کی طرح ملتا رہا مشاعرہ کا اسٹیج ہو یا کوئی نجی نشست امن صاحب اپنی گفتگو کے لطیف انداز کو کبھی نہیں چھوڑتے جس میں ظرافت کی ہلکی سی چاشنی ضرور ہوتی تھی۔

۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۲ء تک امن صاحب سے میری ملاقاتوں کا سلسلہ صرف مشاعروں اور ادبی محفلوں تک محدود تھا لیکن ۱۹۶۲ء میں جب میرا تبادلہ دوسری سروس سے اردو مجلس میں ہوا تو امن صاحب سے ملاقاتوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ ——— یہاں ایک بات عرض کر دوں کہ میں آل انڈیا ریڈیو سے ۱۹۴۵ء سے منسلک ہوں اور اس ضمن میں مجھے ذوالفقار علی بخاری جیسے شخص سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا اس لئے نشر و اشاعت کے سلسلے میں میرے اپنے ذاتی خیالات بھی ہیں اور میں محض مشہور ناموں سے مرعوب ہونے کی روش اور معاملہ فہمی سے آزاد ہوں۔ براڈکاسٹنگ اپنی جگہ ایک فن ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر اچھا عالم ایک اچھا براڈکاسٹر بھی بن جائے۔ اس میں بولے جانے والے لفظ کا ادراک بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور باقی صفات ثانوی درجہ رکھتی ہیں۔ امن صاحب فصاحت زبان کے اسرار سے واقف تھے۔ اور نشریات کے لئے وہی زبان لکھتے تھے جو وہ بولتے تھے۔ اور چونکہ وہ بولتے تھے سادہ اور سلیس زبان اس لئے اُن کی ریڈیائی تقریریں کہانی بن جانے کی حامل تھیں۔ جیسا بولنا ویسا لکھنا ——— کہنے میں یہ بات بہت آسان اور معمولی نظر آتی ہے۔ مگر یہ کتنا مشکل کام ہے۔ اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس کوچے سے گزرے ہیں۔ دراصل جب انسان نفس مضمون کو براہِ راست الفاظ میں ادا کرنے سے قاصر ہوتا ہے تو مشکل انداز بیان اور دور از کار تشبیہہ اور استعاروں کا سہارا لیتا ہے۔ اور یہ تکنیک آدمی کے ذہنی الجھاؤ کو واضح کرتی ہے۔ سادہ اور بامحاورہ زبان کا ایسا استعمال کہ اسی میں تاثیر بھی پیدا ہو جائے بڑی مشکل سے آتا ہے اور نثر میں اس کا وہی درجہ ہے جو شاعری میں سہل ممتنع کا۔ امن صاحب چونکہ زبان و بیان پر قادر تھے۔ اور آسان زبان میں اپنی بات کو واضح کرنے کا انہیں ملکہ تھا۔ اس لئے اُن کی ریڈیائی تقریریں براڈکاسٹنگ کے اس اعلیٰ معیار پر پوری اترتی ہیں کہ جیسا بولئے ویسا لکھئے۔ اُن کو بولے جانے والے لفظ کی عظمت کا ادراک بدرجہ اتم ہے ——— امن صاحب کی یہ خوبی ہے جس کے باعث میں اُن کو بحیثیت براڈکاسٹر کے اردو کے چند بہترین مقرروں میں شمار کرتا ہوں۔

اس خوبی کے علاوہ امن صاحب کی دوسری اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ اُن کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت وسیع تھا اور وہ متنوع موضوعات پر قلم اٹھانے کا حق اور سلیقہ رکھتے تھے۔ چنانچہ موضوعات ادبی ہوں کہ یا سیاسی سماجی

یا مذہبی — (خلاقی ہوں) یا قومی)۔ امن صاحب کو
ان موضوعات پر دسترس تھی۔ اور انھوں نے بغیر
کسی تکلف کے نہایت خندہ پیشانی سے درخواست
کو قبول کیا اور اپنی تقریری موضوع کا پورا حق ادا کیا۔
یہ چستگی ہر ایک کے حصہ میں نہیں آتی۔ میرا تجربہ ہے کہ
بہت سے لوگ جو ان مضامین کے ماہر سمجھے جاتے ہیں
اسی وقت محسوس کرتے ہیں جب وہ ریڈیائی تقریر لکھتے
ہیں۔ کیونکہ جامعیت اور اختصار کے ساتھ محدود وقت
میں نفس مضمون کو پیش کرنا بھی ایک فن ہے۔

تحریر شدہ تقریروں کے علاوہ ریڈیائی مباحثوں میں
شرکت کے لئے زبان اور موضوع پر عبور کی اور بھی زیادہ
ضرورت ہے۔ اور ساتھ ہی ایک بیدار ذہن کی بھی کہ
گفتگو کی روانی اور بحث کے زور میں غیر ضروری اور
قابل اعتراض باتیں نہ کی جائیں۔ اور یہ گفتگو دلچسپ
بھی ہے۔ امن صاحب کو اس فن پر پورا عبور حاصل تھا
وہ چاہے کسی موضوع پر بولیں سنجیدگی اور شگفتگی کو ہاتھ
سے نہیں جانے دیتے تھے۔ اور یہ ایک بڑی خوبی
ہے۔ اب تو خیر مباحثوں کو ریکارڈ کر لیا جاتا ہے
اس میں یہ آسانی ہے کہ ضرورت کے مطابق
ترمیم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن امن صاحب کا تعلق
براڈکاسٹنگ سے اس دور میں رہا جب ریکارڈ کرنے
کی روایت نہیں تھا۔ وہ الفاظ کو تول کر بولنے کے اسی
وقت سے عادی تھے۔

نثر کی طرح امن صاحب کا منظوم کلام بھی ریڈیو
پروگراموں میں بہت مقبول رہا ہے۔ ان کی زبان
لکھنؤ اور دہلی کے امتزاج کی زبان ہے اور اس گنگا جمنا
سے ڈھلی زبان میں غزل کے علاوہ سماجی اور سیاسی
موضوعات پر ان کی نظمیں ریڈیو کے اس معیار کے
عین مطابق ہوتی ہیں کہ شاعر کا ہر لفظ جو اس کے منہ
سے نکلے وہ سننے والے کے دل میں اتر جائے۔

ریڈیو سے امن صاحب کا تعلق محض ایک براڈکاسٹر
کی طرح ہی نہیں تھا۔ بلکہ فن نشریات اور اس
کے لوازمات سے ماہرانہ واقفیت کے باعث انہوں
نے مختلف کمیٹیوں کے ممبر کی حیثیت سے اپنے مفید مشوروں
سے بھی نوازا۔ امن صاحب محض ایک ادیب ہی نہیں،
ایک شاعر اور صحافی بھی تھے اور مجاہد آزادی بھی۔ آزادی
کی جدوجہد میں انگریزی حکومت کے دنوں قید و بند
کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ اور ان کا شمار
ان رہنماؤں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے قلم اور عمل دونوں
کے ذریعہ ملک کی آزادی اور آزادی کے بعد تعمیر وطن
کے لئے کام کیا۔ وہ اپنی ذات و صفات سے قومی یکجہتی
کے ایک بے مثال نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور بحیثیت
ایک قومی رہنما کے ان کی حیثیت مسلم ہے۔ آزادی کے بعد
زندگی کے مختلف شعبوں کے شعبہ نشر و اشاعت کی نئے
سرے سے شیرازہ بندی میں جب اردو پروگراموں کی نئی تنظیم کا
سوال آیا تو امن صاحب نے صلاح کار کمیٹیوں میں نمایاں
رول انجام دیا۔ اردو پروگراموں میں قومی زندگی کے
نقش و نگار کو بحسن و خوبی پیش کیا جائے۔ اور ہر
پروگرام قومی یکجہتی اور انضمام قومی کی روح پیش کریں
زبان عام فہم ہو۔ ان خیالات کو فروغ دینے میں امن صاحب
کا بہت بڑا حصہ ہے اور انھوں نے نہ صرف لفظی طور پر
بلکہ عملی طور پر بھی ان کا ثبوت دیا۔

مذہب کا تقابلی مطالعہ ان کا محبوب موضوع ہے۔
ان کی متنوع ریڈیائی تقریروں میں قوم کے موضوعات پر
اور گرونانک جینتی کے موقعوں پر کی گئی تقریریں اب تک
لوگوں کے کانوں میں گونجتی ہیں۔ جو اس امر کا ثبوت ہیں کہ
مذہبی رواداری اور سیکولرزم کا دوسرا نام گوپی ناتھ امن
ہے۔

اور امام حسین علیہ السلام سے بے حد متاثر تھے۔ اُنہوں نے حضرت علی اور امام حسین کی مدح میں نظمیں بھی کہیں۔ سلام اور نوحے بھی کہے اور اپنے خیالات سے مرثیہ ادب میں اضافہ کیا۔ وہ محرم کی اکثر مجلسوں میں بھی شریک ہوتے تھے اور قصیدہ خوانی کی محفلوں میں بھی، اور اپنی عقیدت کے جذبات کو بے تکلفی کے ساتھ ظاہر کرتے تھے۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بے پناہ ارادت رکھتے تھے۔ اور اُن کا یہ خیال تھا کہ چودہ سو برس پہلے گمراہ انسانیت کو سیدھے راستے پر لانے اور انسان کو اس کی فطرت صالحہ کی طرف پلٹانے کے لئے انھوں نے قربانیوں سے معمور جو کوشش کی اس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ انہیں سنسکرت، ہندی، فارسی اور اردو کے ہزاروں اشعار یاد تھے۔ اور وہ اکثر اپنی گفتگو کو ان اشعار سے مزین کیا کرتے تھے۔ جو اُن کے حافظے میں محفوظ تھے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے وہ ہندی میں بھی شعر کہتے تھے اور انہوں نے دیوان حافظ کا ترجمہ بھی ہندی میں کیا اور شاید اپنی دیگر مصروفیات کی بنا پر پورا نہ کر سکے۔

گاندھی جی جس ہندوستان کی تعمیر کے خواہاں تھے امن صاحب اُس کی ایک زندہ تصویر تھے۔ اب یہ تصویر مغربی تہذیب کی سیلن سے اُن لوگوں کے گھروں میں دھندلی پڑ چکی ہے جو اپنی سیاسی قیادت کو معتبر بنانے کے لئے ہر گھڑی گاندھی جی کا نام جپتے ہیں۔ سچائی تو یہ ہے کہ آج ہمارے قومی فنون کے دائرے میں ایک بھی ایسا مصوّر موجود نہیں ہے جو گاندھی جی کی دھندلائی ہوئی تصویر کے نقش و نگار کو دوبارہ رنگ آمیزی کر کے روشن اور منور کر دے۔

امن صاحب کا ادبی اثاثہ اُن کا سیاسی ترکہ جو مضامین کی صورت میں موجود ہوگا اس قابل ہے کہ اسے کتابی شکل میں شائع کیا جائے اور مستقبل کی نسلوں کے لئے محفوظ کر دیا جائے۔ کیونکہ ایسے لوگوں کی یادیں اور یہی محفوظ سرمایہ ہوگا جو ہندوستان کی آنے والی نسلوں کو ہندوستانیت کی سمت میں قدم بڑھانے کی ترغیب دے گا اور جو ہندوستانیت اب نظر نہیں آتی وہ ایک بار پھر نظر آئے گی۔

غزل

ڈاکٹر حسین حقیر آستانی (بمبئی)

رخصتِ سفر کے ساتھ ہی عزمِ سفر بھی ہو
وہ امتحانِ دیدۂ و ذوقِ نظر بھی ہو

کچھ تو گمانِ گردشِ شمس و قمر بھی ہو
طلبِ سحر کے ساتھ ہی تابِ سحر بھی ہو

ایسا کوئی راستہ سوجھا نہیں ہمیں
جو دل کو دور دست کرے بے خطر بھی ہو

لائیں کہاں سے ڈھونڈ کے ایسا مقام
ویرانہ بھی، چمن بھی ہو، غربت بھی گھر بھی ہو

کیا کیا نہ ہم کلام کریں اُن سے اگر بنے
لیکن نیاز و ناز کا اُن پہ اثر بھی ہو

کس سے کریں گے بات یہ پھوڑیں تو سر کہاں
ان بیکسوں کا مسکن دیوار و در بھی ہو

شکوہ جو کر رہے ہیں شبِ تار کا حقیر
روزِ سیاہ کی ذرا اُن کو خبر بھی ہو

ضروری گزارش

کیا آپ اپنی کتاب چھپوانا چاہتے ہیں
یا
فروخت کی ایجنسی دینا چاہتے ہیں

- فوری طور پر ہم سے رجوع کریں۔ کتاب کا معیاری ہونا شرط
- کتاب چھپوانے یا فروخت کرنے میں ہم مدد کر سکتے ہیں
- اگر آپ کو کسی اردو اکاڈمی یا دیگر ادارے سے جزوی مالی امداد ملی ہے تو اشاعت کے لیے ہمیں لکھیے۔
- معلومات اور شرائط کے لئے جوابی لفافہ کے ساتھ ذیل کے پتے پر خط لکھیے۔

منور وقار دوسی ایڈیٹر شانِ ہند فلیٹ نمبر ۶ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۲

اُستاذی محترم منشی گوپی ناتھ امن

از میر مشتاق احمد

امن صاحب کے نام سے میں عرصہ دراز سے واقف تھا۔ ہند کے مشاعروں میں ان کا کلام سُننے کا شوق رہتا تھا مگر ان سے مُلاقات ۱۹۴۲ء کی تحریک میں جیل میں ہوئی۔ بس کیا کہنا دو دیوانے مل کر بیٹھ گئے۔ جیل میں اُن کو قریب سے دیکھنے کے بعد میں اُن کی شخصیت سے اِس قدر متاثر ہوا کہ کوئی کام ان سے مشورہ کئے بغیر نہ کرتا تھا۔ نیکی کے سانچے میں ڈھلا ہوا یہ انسان نہایت خلیق و بردبار اور متین، فارسی اور اُردو پر عبور رکھنے والا، مزاح پسند طبیعت والا تھا۔ جیل میں بھی وہ مزاحیہ چٹکلے اور اشعار سُناتے رہتے تھے۔ جیل کیا فردوس عرفاں کی ایک مجلس تھی۔

امن صاحب کو میں نے ہمیشہ مستقل مزاج، سادگی پسند اور پُرخلوص پایا۔ وہ خطرہ لینے سے کبھی گھبرائے نہیں۔ ان کی شاعری زندگی کی ٹھوس حقیقتوں پر مبنی ہے۔ مجھے بجا طور پر فخر ہوگا میں ایسی عظیم شخصیت کا شاگرد ہوں۔ اُردو دنیا میں کئی شعراء ان کی نوازشات کی وجہ سے بہت نام ور ہو گئے ہیں۔ کچھ شخصیتیں کرسی سے بنتی ہیں مگر کچھ شخصیتیں کرسی کو زینت دیتی ہیں۔ امن صاحب کی شخصیت وہ ہے جو کرسی کو زینت دیتی ہے۔ کرسی ہو یا نہ ہو سماج میں ان کا ایک مقام رہا جو ان کی اپنی کاوش اور علم کا نتیجہ تھا۔

ملک آزاد ہوا، بٹوارے کی وجہ سے انسان وحشی درندے بن گئے، ان ہنگاموں کا نقشہ امن صاحب نے اپنے اشعار میں بہت خوبی سے کھینچا ہے اور کیفیت حق کا اظہار کیا ہے وہ کتنا صحیح ہے اِس کا اندازہ وہ لوگ ہی لگا سکتے ہیں جنہوں نے ۱۹۴۷ء کا زمانہ دیکھا ہے۔ ان وحشیانہ کیفیات کو بیان کرنے کے بعد امن صاحب اپنے عزم کا اظہار کرتے ہیں اور اس انداز سے کہ پڑھنے والے پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ محبت کے نغمے سُناؤں گا پھر بھی پریت کے گیت گاؤں گا پھر بھی۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے امن صاحب کے یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

جو ہندو مسلمان پر وار کھائے ترنگے پہ نہ مسلم کو آئے
جو سکھ پریم کا راستہ بھول جائے جو عیسائی رسم وفا کو بھلائے

محبت کے نغمے سُناؤں گا پھر بھی
پریت کے گیت گاؤں گا پھر بھی

یعنی جیل کی زبان میں ہندو مسلم سکھ عیسائی سب اپنی ایسی کی تیسی کرنے پر اُتر آئیں تب بھی میں پریم محبت کی راہ پر گامزن رہوں گا۔ پھبتی کسنے میں امن صاحب کو مہارت حاصل تھی۔ حصولِ آزادی کے وقت انگریزوں کے وفادار حکومت پرست ہندوستانیوں کی دلی حالت کا اچھا نقشہ کھینچا ہے اگر طنزیہ اندازِ بیان دیکھنا ہو تو گاندھی جُرم ہے نظم غور سے ملاحظہ فرمایئے۔ ان کی مزاحیہ شاعری بھی اعلیٰ درجے کی ہے ایسی عظیم شخصیت جیسے سماجی رہنما، قومی شاعر اور سب سے بڑھ کر ایک شفیق تھی میں استاذی کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں۔ یہ وہ محبتیں کہاں؟ چند ... جیل سے کچھ یوں صدی سے زیادہ ہی پہلے ... ہوں کی یا وہ بھی غنیمت ہے۔

نالہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیئے
بے نوا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

ناقابل فراموش

سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست کی ناقابلِ فراموش دستاویز جس کے متعلق متفقہ فیصلہ ہے کہ جس اُردو داں نے یہ کتاب نہیں پڑھی اس نے اُردو ہی نہیں پڑھا قیمت مجلد رنگین ساٹھ روپے علاوہ محصول ڈاک۔

دفتر شان ہند، انصاری مارکیٹ، فلیٹ ۵ دریا گنج دہلی ......

گوپی ناتھ امن پیکرِ عقیدت

از عزیز وارثی
سکریٹری انجمن اتحاد وارثیہ
[illegible] دہلی

علامہ گوپی ناتھ امن لکھنوی کی خوبیوں کے عنوان سے مختلف اخبارات ورسائل میں متعدد ادبا، وشعرا اور دیگر اہلِ قلم سے اظہارِ خیال فرمایا ہے۔ میں بھی اُن کی ہر خوبی کا معترف اور اُن کا ادنیٰ نیازمند ہوں۔ امن صاحب دلی کی سیاسی، ادبی سماجی ثقافتی، روحانی اور مذہبی انجمنوں میں ہمیشہ بہت ممتاز اور نمایاں رہے۔ وہ آزادیٔ وطن کے عظیم سپہ سالاروں میں سے تھے۔ فارسی اُردو ہندی گرمکھی اور انگریزی کے جید عالم تھے۔ اُردو اور ہندی کے مفکر تھے۔ اور ایک بہترین ایڈمنسٹریٹر تھے۔ مجھے اُن کی اس خوبی نے خاص طور پر مجھے متاثر کیا ہے کہ وہ صبغۃ الحق کے سچے بھگت تھے اسی لئے اونچے درجے کے انسان تھے۔ میرا خیال ہے اگر کوئی بھی شخص انسانیت کا علمبردار ہے تو پھر وہ ہر میدان کا شہسوار ہو جاتا ہے۔

دلی میں امن صاحب نہ جانے کتنے ذمہ دار عہدوں پر فائز رہے مگر اُن تمام مدارج اور مراتب کے لباس میں بھی وہ انسانیت کے پیکر ہی نظر آئے۔ میں نے اُن کو ڈپٹی اسپیکر کے رُوپ میں دیکھا وزیر کی حیثیت میں بھی۔ صدر محکمہ تعلقات عامہ بھی رہے۔ اور دلی پبلک لائبریری بورڈ کے چیئرمین بھی ہوئے۔ ٹرانسپورٹ اتھارٹی کے صدر بھی رہے۔ مگر اُن کے لباس کی سادگی، گفتگو کی وضع داری، منکساری کا جذبہ اور رہن سہن کا انداز کبھی نہیں بدلا۔ پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی کی محفلوں سے آنند وہن و شتی گلزار دہلوی کی تعمیرِ اردو تک اُن کی شرکت ضروری و لازمی رہی۔ جب تک اُن میں چلنے پھرنے کی طاقت رہی وہ تشریف لاتے رہے۔ اور اپنی تخلیقات سے محظوظ فرماتے رہے۔

امن صاحب عالمِ انسانیت کے سبھی بزرگوں سے عقیدت رکھتے تھے۔ چاہے وہ ہندو دھرم کے ہوں یا مذہبِ اسلام کے یا سکھ دھرم کے [illegible] [illegible] [illegible]

بھگوان شری کرشن کو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی امن کی تحریریں، اُن کے کلام کے مجموعے اور بیشتر مضامین اُن کی خوبی کے شاہد ہیں کہ وہ سچے اور پکی عقیدت رکھنے والے انسان ہیں۔ اگر ان کے نام سے گوپی ناتھ حذف کر دیا جائے صرف امن لکھنوی لکھا جاتے اور کبھی مسلمان سے کوئی یہ کہہ دے کہ امن صاحب ہندو ہیں تو مسلمان قسم خدا کی یہ کہے گا کہ سنسرم نہیں آتی ایک مومن کو کافر کہہ رہا ہے۔ ہندو پاک کے مسلمان اور دلی کے مسلمان بالخصوص اُنہیں ہمیشہ وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اتنی مدلل اور بامقصد تقریر فرماتے تھے کہ سامعین پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ انہیں بہت سے لوگ شیعہ کہتے تھے۔ اس میں خدانخواستہ کسی اور کی تضحیک اور دل آزاری مقصود نہیں بلکہ اُن کا وہ رتبہ ہے جو اُن کی قابلیت کی، علمیت اور واقفیت نے اُنہیں مراتب و مدارج کے ساتھ یہ رتبہ دیا تھا۔ شیعان ہند و پاک اور دلی والے انہیں مجتہد کا درجہ دیتے تھے۔

دلی کی کربلا یعنی شاہ مرداں ہو یا پنچکوئیاں روڈ کا امام باڑہ یا کشمیری گیٹ کا پنجہ شریف ان مقامات پر جو بھی پروگرام ہوتے تھے امن صاحب کا اُن میں شریک ہونا ضروری اور لازمی تھا۔ ان مقدس مقامات کے علاوہ شیعہ حضرات سوئی والان، پہاڑ گنج میں بھی مجالس منعقد کراتے تھے اور امن صاحب منبر پر بیٹھ کر باقاعدہ مجلس پڑھتے تھے۔ اُن کی معلومات اور اندازِ بیان اتنا موثر ہوتا تھا کہ لوگ عقیدت مند اُن سے باقاعدہ مصافحہ کرتے اور مصافحہ کے بعد وہی ہاتھ اپنے سینے سے لگاتے تھے کہ یہ عقیدت کا بہترین اظہار تھا۔

یہ تو درست ہے کہ سنسکرت اور ہندی پر [illegible]

ہندی میں اُن کی ایک ٹھمری ملاحظہ فرمائیں اُس زمانے کے لکھنؤ کا بھی ذرا خیال رہے۔

پیارے پیا کے کوئی دیس موہے لے چلے
پیا کے دیس کی ٹیڑھی میڑھی گلیاں
ڈھونڈھت شیش مہیش، کوئی لے چلے
پیارے پیا کے کوئی دیس موہے لے چلے

گھر میں شاعرانہ ماحول تھا اُس سے جناب امن اور اُن کے برادرِ خورد جناب کرشن لال ادیب لکھنوی جیسی شخصیتیں میدانِ سخن میں اُبھریں۔ جناب ادیب لکھنوی سے کون واقف نہیں اور مجھ پر تو خاص طور پر مہربان ہیں۔ علامہ ادیب کے کلام بلاغت نظام کے اشعار نمونے کے طور پر پیش کرتا ہوں ذرا معیار اور پختگی ملاحظہ فرمایئے۔

کس کی پیری یا جوانی رہ گئی ہم جیسے سُننے کو کہانی رہ گئی ہے
یوں تو دنیا میں کوئی رہتا نہیں رہ گئے جن کی کہانی رہ گئی
ساتھ پیری نے دیا تا حدِ گور ہم دو قدم چل کر جوانی رہ گئی
ایسے ایسے نوجواں بھی آئے گئے ہم دیکھتی جن کو جوانی رہ گئی
رہ گئی کی زمین میں دو اشعار اور پیشِ خدمت ہیں سے
ہر کلی یوں مسکرا کر رہ گئی ہو جیسے لب تک بات آ کے رہ گئی
رونقِ محفل بڑھ گئی اُن کی نظر ہم مفلسی آنکھیں بہا کے رہ گئے
اُن کا ایک اور مطلع پیش کرتا ہوں۔

تذکرہ جو اس انجمن میں میرے افسانے کی خاک
خاک بھی جائے جس محفل میں پروانے کی خاک
بادِ گردوں کا سودا ہے تو اس قابل ہو
خاک پائے رہروانِ جادۂ منزل ہو

ان اشعار کے پیش کرنے کا میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ میں یہ عرض کر سکوں کہ جناب امن کی ولادت اور پرورش جس خاندان میں ہوئی وہاں شاعرانہ ماحول تھا۔ لکھنؤ کی ادبی فضا میں اس ذوق کو پھولنے پھلنے کے مواقع ملے۔ ادبی نشستوں اور مشاعروں میں امن صاحب کلام پیش کرتے تھے جہاں اُس زمانے کے مستند شعراء موجود ہوتے تھے۔

لکھنؤ سے امن صاحب غازی آباد آئے۔ وکالت شروع کی ساتھ ہی تحریکِ آزادی کا پیام عوام تک پہونچانے میں سرگرم ہو گئے۔ اُن کے آنے سے مقامی کانگریس میں نئی زندگی آ گئی۔ امن صاحب کے ہمسائے تھے چودھری چرن سنگھ جی جنہیں امن صاحب نے کانگریس کمیٹی کا ابتدائی ممبر بنایا تھا۔ دونوں کی دوستی مشہور تھی۔ امن صاحب نے غازی آباد میں انجمن شعراء کی بنیاد ڈالی اور عالی شان کل ہند مشاعرے کرا ڈالے۔ کتنے ہی مقامی حضرات شعر کہنے لگے اور عوام میں سخن فہمی کا شعور اُبھرا۔ غازی آباد میں بزم اکبر آبادی اور اُن کے صاحبزادگان، مولوی محمد یحییٰ تنہا، مولوی ظہیر، جناب ادیب لکھنوی وغیرہ قیام پذیر تھے جن سے شاعری کا ماحول بنا مگر روحِ رواں تھے جناب امن لکھنوی۔

وکالت سے امن صاحب صحافت میں آئے اور اسی سبب سے غازی آباد سے دلی منتقل ہو گئے۔ ۱۹۳۳ء میں چھتہ صوفی محلہ پیپل مہادیو حوض قاضی دلی میں انھوں نے [illegible] یہاں شاد صاحب کے مکان میں سکونت اختیار کی۔ شاد صاحب فرمایا کرتے تھے [illegible] تو وہ دکان [illegible] میں لالہ دیوان چند رہتے تھے اور وہ اتنے بڑے آدمی ہوئے کہ ان کے نام سے چاندنی چوک میں دیوان ہال بنا۔ امن صاحب آپ بھی بہت بڑے آدمی بنیں گے۔ واقعی یہ مکان امن صاحب کو اتنا راس آیا۔ وہ دلی میں وزیر بنے اور شاد صاحب کی پیشن گوئی صحیح ثابت ہوئی۔

میں پیپل مہادیو رہتا ہوں اس لئے جناب امن صاحب سے ملاقات ہونے لگی اور جلد ہی میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ یہ نامور شاعر، مفکر، صحافی اور سیاست داں ایک عظیم الانسان بے مثل ہے۔ بے شک اور مشک چھپائے نہیں چھپتے یہی حال شاعری کا ہے۔ امن صاحب کے آنے ہی حوض قاضی کے ادبی اور ثقافتی ماحول میں نئی زندگی آ گئی۔ نئی نئی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ موسیقی، مصوری، بحث و تحقیق، تنقیدی نشستیں، ڈرامے اور بزمِ سخن کا اہتمام ہونے لگا۔ جن میں امن صاحب کے اثر و رسوخ سے باہر سے بھی بڑی بڑی شخصیتیں اکثر شرکت فرماتی تھیں۔ مشاعروں میں وہ رنگ جمتا اور

شاعروں کو سخن شناسوں کی داد و تحسین ملتی تھی کہ وہ پھر آنے کے متمنی رہتے تھے جس کے متعلق فہیم بیگ چغتائی نے کہا تھا کہ "یہاں مجھے اتنی داد مل گئی کہ اب زندگی بھر داد نہ بھی ملے تو کوئی غم نہیں" ایک مرتبہ جوشؔ ملیح آبادی نے اپنے انداز میں داد دیتے ہوئے فرمایا تھا "سب .... دلی والے تو مر گئے لے دے کے یہیں رہ گئے ہیں" اس ماحول سے محلے کے نوجوانوں میں ذوقِ شاعری اُبھرا اور امن صاحب نے اسے جلا دی یعنی۔ ع۔

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا

راقم الحروف نے اسی زمانے میں علامہ امن صاحب کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ امن صاحب کی علمیت، بلیغ النظری وغیرہ کا تو میں قائل تھا ہی مگر اُن کی حوصلہ افزائی اور شفقت سے میں خاص طور پر متاثر ہوا۔ امن صاحب کا طنز و مزاح اتنا ستھرا ہوتا تھا کہ وہ جس بھی محفل میں بیٹھتے باغ و بہار بن جاتی۔ اُن کے طنز و مزاح کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ لبوں پر مسکراہٹیں بکھر جاتیں مگر کیا مجال جو کسی کے ماتھے پر شکن یا دل میں میل آجائے۔ چھتہ صوفی میں شاد صاحب کے دیوان خانے کے بڑے صحن میں ہفتہ وار طرحی مشاعرے ہونے لگے جس میں سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں طرح کا کلام ہوتا تھا۔ ان میں شرکت کرنے والے امن صاحب کے علاوہ جناب چندی پرشاد شیدا، لبھن دیال شاد، مہابیر نرائن شوق، شیام لال روشن، بیجناتھ پال، اثری بسمل، امیر چند، کیلاش علی رام شرر وغیرہ ہوتے تھے۔ راقم الحروف بھی کلام پیش کرنے کی جسارت کرتا تھا۔ کلام پڑھنے والوں میں بیشتر امن صاحب سے اصلاح لیتے تھے۔ میں نے رنگِ طنز و مزاح میں طبع آزمائی شروع کی اور یہی رنگِ شاعری عمر بھر کے لئے اختیار کر لیا۔ قبلہ امن صاحب نے میرا دل بڑھایا۔ آج مجھے محسوس ہوتا ہے کہ استادِ محترم نے مجھ پر کتنا کرم فرمایا کہ اس قابل بنا دیا کہ میں اپنا دیوان "گلِ خنداں" (جو زیرِ طبع ہے) مرتب کر سکوں اور ہندوستان کے مختلف شہروں میں ہونے والے مشاعروں میں دلی کے مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے شریک ہو سکوں۔

خاندان میں ایک موت ہو جانے سے امن صاحب کا دل قاضی حوض کے مکان سے اُچاٹ ہو گیا اور وہ نوگھرے والان میں جا کر رہنے لگے لیکن چھتہ صوفی میں ہفتہ وار مشاعروں، جلسوں یا محفلوں میں ضرور شرکت فرمانے تھے کبھی کبھی امن صاحب کے مکان پر بھی ادبی نشستیں جمتیں ہم سب نوگھرے والان میں اُن کے دولت کدے پر حاضر ہوتے اور اُن محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔

امن صاحب مصروف ترین آدمی تھے سیاست صحافت، سماجی خدمت، شعر و ادب سب ساتھ ساتھ چلتا رہتا حالانکہ اُن کا دل کبھی کبھی کہہ اُٹھتا تھا

ع۔

یہ کنارِ چمن کی ہوائیں
یہ نمودِ سحر کی ادائیں
غنچے کہتے ہیں مسکرائیں

اور میں مبتلائے سیاست

آزادی ملنے کے بعد ملک میں جو عام انتخابات پہلی مرتبہ ۱۹۵۲ء میں ہوئے تھے اُن میں جناب امن بھی دلی اسمبلی کے لئے اُمیدوار تھے۔ مقابلہ زوردار تھا۔ ہم پہلے مہادیو والے لوگوں نے امن صاحب کی طرف سے انتخاب میں جی جان سے محنت کی۔ امن صاحب اپنی شخصیت، قابلیت، خدمات اور ہر دلعزیزی کی بنا پر جیت گئے ہماری محنت سپھل ہو گئی ایسا لگتا تھا جیسے ہم ہی ممبر بنے ہوں امن صاحب نے وہ چناؤ کتنے کم روپیوں میں لڑا اُس کی مثال آج تک نہیں ملی۔ الیکشن میں کامیابی کے بعد ڈپٹی اسپیکر بنے، وزیر بنے مگر وہ سب امن صاحب کی وہی شان تھی یعنی بانس کی چارپائی، کھدر کا معمولی اوڑھنا بچھونا۔ غرور تو نام کو بھی چھو نہیں گیا تھا۔ جو گیا کٹ وہ چغتائی سے ملے مدد فرمائی۔ شاعروں کے لئے تو استقبال میں اور زیادہ اپنا پن ہوتا تھا۔ میں جب بھی گیا نہ محبت سے ملتے تھے مدد کے لئے تیار رہتے تھے اور میری غزلوں کی اصلاح کے لئے کافی وقت

نکال لیتے تھے ان کا تازہ کلام سننے کا بھی موقع ملتا تھا۔ مجھے تعجب ہوتا تھا کہ اتنا مصروف آدمی شاعری کے لئے فرصت کیسے نکال لیتا ہے۔ لیکن امن صاحب کی زود گوئی کا یہ عالم تھا کہ وہ مشاعروں میں جاتے جاتے دس پانچ منٹ میں اشعار کہہ لیتے تھے اور اُن پر جی کھول کر داد بھی لوٹ لیتے تھے کیونکہ ہر شعر سے اُستادی ٹپکتی تھی۔

امن صاحب کی طبع موزوں کو تحریک آزادی نے خاص طور پر متاثر کیا۔ اُن کے کلام میں حب الوطنی، قوم پرستی نمایاں ہیں۔ جیل میں بھی مشقِ سخن جاری رہی۔ مشاعرے منعقد کئے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے رہنما امن صاحب کے ساتھ جیل میں تھے۔ اُن میں سے کئی امن صاحب کے شاگرد بنے، مہاویر تیاگی، دکھوکل تلک، مظفر حسن، میر مشتاق احمد، حکیم خلیل الرحمٰن نار، رام لال ورما ہندی وغیرہ۔ ویسے بھی امن صاحب کی رسائی بڑے سے بڑے رہنما تک تھی۔ کئی وزیر اعظم امن صاحب سے ملنے اُن کے گھر آئے۔ پرانے ساتھی آتے تو محفلیں جمتیں، سخن فہم مہمان ہوتا تو شعر و شاعری کا بازار گرم ہوتا۔ اُن کا حافظہ بلا کا تھا۔ ہزاروں اشعار یاد تھے اور وہ شعر کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرماتے تھے کہ یہ شعر کس نے کس موقع پر کہا ہے۔ کبھی کبھی تو ایک ہی مفہوم کے درجنوں اشعار اور مختلف زبانوں کے حوالے سناتے تھے۔ اشعار سنجیدہ بھی ہوتے تھے اور مزاحیہ بھی، پھبتیاں بھی کسی جاتیں تھیں مگر معیار سے گری بات کسی کے منہ سے کبھی نہیں سُنی۔

امن صاحب کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہونا ایک اعزاز تھا۔ میں اُن کے قریب بیٹھ کر کتنا کچھ سیکھ لیتا تھا وہ شعر کے محاسن و معیوب مجھے سمجھا دیتے تھے۔ اور باتوں باتوں میں بھی باریکیاں بتا دیتے تھے اُن کے مزاح سے مشاعرے کا ماحول بہتر ہی بن جاتا تھا۔ مثلاً ایک دفعہ ایک شاعر نے مشاعرے میں جب یہ مصرعہ پڑھا ؏

کوشش غیر کی ہوں نام ہمارا ہو جائے

امن صاحب نے ذرا بلند آواز سے داد دے دی وہ شاعر تو اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ بہت اچھا مصرعہ ہے مگر داد کی وجہ سے مصرعے کے معنی ہی بدل گئے۔ اور سامعین نے ایک قہقہہ لگا دیا۔

ایک دن جناب رفعت سروش سے باتوں میں امن صاحب کا ذکر چلا۔ پرانا قصہ تھا جب جناب گلزار زتشی دہلوی کی انجمن تعمیر اُردو کی نشست میں ایک صاحب اپنی غزل پڑھ رہے تھے جس پر تنقید ہونی تھی۔ جب وہ غزل پڑھ چکے اور کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا تو گلزار صاحب نے منور لکھنوی سے کہا۔ "آپ ہی کچھ فرمائیے" منور صاحب نے کہا میں کیا کہوں گا، یہ غزل تو میری ہی اصلاح کی ہوئی ہے۔ اس پر امن صاحب فوراً بولے "پھر تو صاحب مجھ کو اعتراض ہے" (منور صاحب امن صاحب کے دوستوں میں سے تھے) اس غزل کا ایک مصرعہ "کر جیسے" سے شروع ہوتا تھا اور امن صاحب نے کر کے بعد جیسے کو غلط بتایا۔ آخر منور صاحب نے امن صاحب کی بات مان لی۔ اس واقعہ کے متعلق رفعت سروش صاحب نے جو بات کہی وہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ انہوں نے کہا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ علم کی دو توپیں آپس میں ٹکرا گئیں۔ اس فقرے سے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ امن صاحب کا علم کی دنیا میں کیا مقام تھا اور لوگ انہیں کس نظر سے دیکھتے تھے۔

امن صاحب کا اصلاح فرمانے کا ڈھنگ بھی لاجواب تھا شاگردوں کو خود ذہن پر زور ڈال کر کلام کہنے کے لئے حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ پھر اُن اشعار میں ایک آدھ لفظ بدل کر شعر میں وہ جان ڈال دیتے تھے کہ وہ بہت بلند ہو جاتا تھا۔ اس میں نئے معنی آجاتے تھے۔ سنجیدہ کے مقابلے میں مزاحیہ کہنا زیادہ مشکل کام ہے کیونکہ بات بھی ہو اور انداز بھی۔ اگر سامعین کے لبوں پر تبسم نہ آئے تو معاملہ پھس پھسا رہ جاتا ہے۔ میں مندرجہ ذیل اپنے چند اشعار پیش کرتا ہوں اُن میں امن صاحب نے جو اصلاح فرمائی وہ بھی تحریر کرتا ہوں۔

شیخ نے تو پانی مانگا تھا مگر دے دی شراب
(تو ہے)

پی کے پوچھا کیا تھا میں نے کہا یہ تھی شراب

آرام جن میں کرتا تھا پی کر شراب روز
(خراب)

اب مجھے یاد کرتی ہیں وہ نالیاں سبحے
...ن نظر داد دیں اسے کہ اصلاح میں روز کو گلاب کے
...تہ بلکہ کر اردو اور انگریزی لفظ سے کیا فائدہ اٹھایا ہے
...ں بات یہ بھی کہ گلاب ایک قسم کی شراب بھی ہوتی

...راب دیتا رہا روز اگر نہ دی ہوتی
اسی لئے کبھی اللہ میاں کچھ نہ کہا
...اشنا ہو کے پاسبان رہا کریم پورے
خزاں کے دور میں لطفِ بہار کون دیکھے گا

ایک دن میری موجودگی میں امن صاحب روشن دہلوی
غزل پر اصلاح فرما رہے تھے۔ روشن صاحب نے شعر پڑھا

میں نے رفتارِ زمانہ دیکھ کر
اپنے بیٹے کو لڑکا کر دیا

...صاحب نے اصلاح فرمائی ہے

میں نے رفتارِ زمانہ دیکھ کر
اپنے لڑکے کو لڑاکا کر دیا

اب آپ خود ہی خیال فرمائیں کہ امن صاحب سا
...ستاد ملنا کتنے مقدر کی بات ہے۔ اُن کی تعریف کرنا مقصود
...اغ دکھانا ہے میں تو یہی کہوں گا ہے

قسمت مری نصیب مرا بخت ہے مرا
مجھ کو جناب امن سا اُستاد مل گیا

...اپنے کلام کی مقبولیت اور مشاعروں میں کامیابی
...کر روشن دہلوی نے بھی اپنی غزل کے مقطع میں امن
...صاحب کے متعلق کہا ہے

یہ ہے لکھنوی امن کا فیض روشن
نہ اکڑو یہ دلی کا پانی نہیں ہے

امن صاحب کا کلام ایک پیام ہے، اُن کی شاعری
...مشن ہے۔ چاہے وہ قومی تحریک ہو یا حصولِ آزادی
...وقت فرقہ وارانہ فساد سے مکدر فضا یا آزاد ہندوستان
...تعمیر امن صاحب اعلیٰ اقدار کو اپنی شاعری کے ذریعے
...تک پہنچاتے رہے۔ کاروانِ منزل میں کئی غزلیں

ایسی ہیں جنہیں آپ نظم بھی کہہ سکتے ہیں یا موضوع جس میں ایک
تسلسل ہے۔ ہنگاموں کا زور ہونے پر یا "آزادی کے چراغ"
یا "گاندھی جی کی شہادت" جیسی نظمیں ایک ایسا صاحب
دل ہی لکھ سکتا ہے جس کے من میں تڑپ ہو اور روح میں
اضطراب۔

امن صاحب نے کئی کتابیں تصنیف فرمائیں جو
مختلف زبانوں میں شائع ہوئی تھیں اور مشاہیر نے اُن کی تعریف
بھی فرمائی۔ اپنی ایک تقریر میں جواہر لعل نہرو جی نے امن
صاحب کی ایک کتاب کا ذکر کرتے ہوئے ان کے انداز
بیان کو سانی سکور کا ایک حل بتایا تھا۔ ادبی خدمات
کے لئے آپ کو دلی ساہتیہ کلا پریشد اور اردو اکادمی یو۔پی
کے عطیے ملے اور امن صاحب کی خدمات و صفات کے لئے
صدر جمہوریہ ہند نے ۱۹۷۷ء میں پدم بھوشن سے نوازا۔ امن
صاحب قلم کے دھنی تھے بہت لکھا آج بھی اُن مسودات
کو کتابی شکل دے دی جائے تو درجنوں جلدیں شائع ہو سکتی
ہیں۔

پیروڈی جیسی شوخ صنف کو بھی امن صاحب نے
منہ لگایا۔ اُستادوں کی زمینوں میں غزلیں کہیں اور خوب
کہیں مثلاً فانی بدایونی کی مشہور غزل "دیکھتے جاؤ" میں
ذرا ایک شعر ملاحظہ فرمایئے ہے

جوانوں کا بڑھاپا دیدنی تھا اولڈ دلی میں
نئی دلی میں بوڑھوں پر جوانی دیکھتے جاؤ

جناب امن کے دوسرے مجموعۂ کلام "بہ رنگ" میں ایسی
کئی غزلیں شامل ہیں۔ امن صاحب نے ایک کتاب بڑے
آدمیوں کے طنز و مزاح تصنیف فرمائی اُس سے ان کی زندہ
دلی کی کچھ جھلک باقی ہے مگر اصلی لطف تو اُن لوگوں نے
اٹھایا جنھیں امن صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل
ہوا ہو۔ عمر کے آخری برسوں میں وہ چلنے پھرنے سے معذور
ہو گئے تھے مگر زندہ دلی کی وہی کیفیت تھی کیا مجال جو چہرے
پر ذرا بھی شکن ہو۔ میں جب بھی جاتا انہیں یا تو کسی
کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھتا یا شطرنج کھیلتے ہوئے

ہنسی مذاق جاری رہتا۔ ایک دن ایک صاحب نے حال
چال پوچھا فرمایا حال تو اچھا ہے مگر چال خراب ہے۔ ایک
اور صاحب نے حال پوچھا تو برنارڈ شا کا حوالہ دیتے
ہوئے کہا "اوپر کی منزل تو بالکل ٹھیک ہے مگر نیچے کی منزل
بیٹھ گئی ہے۔ آپ خود ہی سوچ لیجیے جو شخص اسی برس کی
عمر میں بھی اس قسم کی باتیں کر سکتا ہے وہ کتنا زندہ
دل انسان ہوگا۔ امن صاحب مذاق کرنے پر آتے
تو ہم شاگردوں کو بھی نہیں بخشتے تھے مگر اس مذاق
میں بڑا سلیقہ اور احتیاط ہوتی تھی۔

صحافت کے میدان میں امن صاحب نے جہاں سنجیدہ
موضوعات پر قلم اٹھایا وہاں مزاحیہ کالموں میں سیاسی، سماجی
مسئلوں پر ہنسی ہنسی میں بڑی بڑی باتیں تحریر فرماتے
لوگ اخباروں میں ان کالموں کو خاص دلچسپی سے پڑھتے تھے
"تیج" اخبار میں "نقش و نگار" اور "سنسار" اخبار میں "نرم گرم"
مزاحیہ کالم امن صاحب کے قلم کے رہینِ منت تھے۔ ان
میں ادبی چاشنی ہوتی تھی اور زندگی کی حقیقتیں اور تاریخی
واقعات کا تذکرہ بھی۔ فرقہ پرستوں، حکومت پرست ٹوڈیوں
سے نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی اخباری معرکے بھی ہو جاتے
تھے۔ ایک مرتبہ ایک مسلم لیگی اخبار میں چھپا ؎
کانگریس آ رہی ہے ننگے پاؤں ۔۔ جی میں آتا ہے بڑھ کے قدم چوما
امن صاحب نے اگلے دن لکھا کہ اس شعر کے مصرعۂ اولیٰ
کے رکنِ آخر کے بعد سوالیہ نشان اور مصرعۂ ثانی میں نقطہ نہ
کے نیچے دو نقطے بڑھا کر پڑھیے۔

"تیج" اور "سنسار" میں مزاحیہ کالموں کے علاوہ مختصر نظمیں
بھی ہوتی تھیں جن میں رنگِ ظرافت میں واقعاتِ حاضرہ
پر تبصرہ ہوتا تھا۔ عوامی جلسوں، تقاریر میں بھی مزاحیہ اشعار اور
ادبی چٹکلوں کا خوبصورت استعمال ہوتا تھا۔ اسمبلی میں ہوں،
پارلیمنٹ میٹنگ میں۔ ادبی نشست میں ہوں یا سیاسی میٹنگ
میں اپنے مزاح سے ماحول کو تر و تازہ بنائے رکھتے اور کسی
کبھی تو نہایت نازک موقعوں پر ایک لطیفہ یا تازہ مزاحیہ شعر ایک
نیا سین موڑ پیش کر دیتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ امن صاحب جیسی عظیم شخصیت
تے بہت ہی کم ہے۔ ہر جگہ نام کمایا یہاں تک کہ
سال کی عمر میں یونیورسٹی کے امتحان میں بیٹھے اور اول آ
میدان سیاست میں جن کی ایمانداری کی دھاک تھی
کی جان اور سماجی خدمت کے میدان کی آبرو کیا
امن صاحب کی یاد آتی ہے تو جی بھر آتا ہے۔
کو دیکھ کر بھی ہنسنے کے لئے کلیجہ چاہیے۔ آخری دن جب
نے جب طبی معائنے کے لئے کہا "زبان دکھائیے"
صاحب نے کہا جناب زبان درازی اچھی نہیں
امن صاحب نے کبھی اوروں کے سامنے اپنے آنسو
رکھے۔ موج میں سبھی نے دکھ اٹھائے قید و بند اور
کے آثار چہرہ پر اچھے اچھوں کے چھکے چھڑا دیتے ہیں
امن صاحب اور ہی قسم کے انسان تھے۔ آنسو
پینے کی ہمت رکھنے والا ہی تبسم کے پھول کھلا سکتا
ہے۔ ایسا آدمی مزاحیہ شاعر یا مزاح نگار ہو سکتا
امن صاحب عمر بھر ہنستے ہنساتے رہے میں تو
صفی لکھنوی ہی کہہ سکتا ہوں ؎
ہنسانے والا رلا کے اٹھا

بقیہ صفحہ ۴۲ کا ۔ جعفر مین شفیع کورا کہ
بدلتے ہوئے دیکھنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا
جب کبھی میں ان کے برادرِ خورد عالی جناب گ
ادیب کی آواز سنتا ہوں تو یہی مغالطہ ہو
امن صاحب بول رہے ہیں "عرض کردو
بھائیوں کی آواز بے حد ملتی ہے بلکہ کئی بار
اور جب بھی ان سے ملتا ہوں تو اگلی سطر ا
خدا نے امن صاحب کا چہرہ سامنے

؎ آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہو گئے راکھ انتہا یہ ہے

منزل بہ منزل

۱۱۔ لکھنؤ کے سریواستو کائستھ خاندان میں ۲۰ ستمبر ۱۹۰۵ مطابق اشونی ماس شدی پروا یعنی پہلے نوراتر سے بروز بدھ ۵ بجے صبح ولادت ہوئی۔

۱۱۔ مشہور سنت حاجی وارث علی شاہ کا آشیرواد ملا

۱۱۔ آغاز اسکولی تعلیم (پہلے تو گھر ہی دادا جان نے تعلیم کی ذمہ داری سنبھالی تھی) امین آباد اسکول میں داخل ہوئے

۱۱۔ پہلا شعر کہا۔

۱۱۔ انگریزی نظم کا اردو نظم میں ترجمہ کیا (اس وقت پانچویں جماعت کے طالب علم تھے)

۱۱۔ الہ آباد یونیورسٹی کے میٹریکولیشن کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ اسی سال لکھنؤ میں کانگریس کے اجلاس میں پہلی بار شریک ہوئے۔

۱۱۔ لکھنؤ کے سیشن کورٹ میں پہلی ملازمت کی لیکن تین ماہ بعد ہی لکھنؤ میونسپل بورڈ کے ہیلتھ ڈپارٹمنٹ میں کلرک کی حیثیت سے تقرر ہو گیا جہاں سات برس تک کام کیا۔

۱۱۔ الہ آباد ہائی کورٹ کے جونیئر لا (مختار شپ) کے امتحان میں کامیاب ہوئے قومی جلسوں میں نظمیں پڑھنا شروع کیا اور گاندھی جی سے متاثر ہو کر اپنا تخلص امن رکھا۔ کانگریس کے باقاعدہ ممبر بنے

۱۹۲۱۔ "انقلاب" اخبار میں پہلی نظم چھپی۔ سفینہ کالج لکھنؤ کے آل انڈیا مشاعرے میں شریک ہوئے۔

۱۹۲۰۔ وزیر گنج وارڈ کانگریس کمیٹی کے اعزازی سکریٹری بنے

۱۹۲۰۔ لکھنؤ ضلع کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ کے رکن ہے والنٹیر بورڈ کے جنرل میں مقرر ہوئے ترک موالات کی تحریک میں سرگرم، ۲۰، ۱۵ فروری لکھنؤ کو گرفتاری دینے والے ۔۔۔ میں نام تھا مگر گاندھی جی تحریک ملتوی کر دی۔ گاندھی جی کے تعمیری پروگرام اور کانگریس کی تنظیم میں برابر کام کرتے رہے۔

۱۹۲۲۔ "اودھ پنچ" لکھنؤ میں پہلا مضمون شائع ہوا۔

۱۹۲۴۔ میرٹھ میں مختار شپ کی پریکٹس شروع کی

۱۹۲۵-۲۶۔ غازی آباد میں وکالت شروع کی۔ کانگریس کی تنظیم اور پرچار کے لئے بہت کام کیا۔ قومی تحریک میں جیل گئے۔ تعمیری کام میں تن من دھن سے مدد کی (ہریجن اُدّھار، تعلیم بالغان، قومی یکجہتی، ایک پیسہ چندہ تحریک، نیوز بلیٹن چھاپنا اور والنٹیروں کی بھرتی وغیرہ) غازی آباد میرٹھ، دہلی، ہاپوڑ شہروں اور ان کے گرد و نواح کے دیہات میں بہت کام کیا۔ غازی آباد نگر کانگریس کمیٹی کے سکریٹری رہے۔

۔ انجمن مشاعرہ قائم کی اور بہت کامیاب مشاعرے کئے ہندی میں شاعری شروع کی

۱۹۲۷۔ غازی آباد میں پہلا "گردوارہ" قائم کیا۔

۱۹۲۸۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انٹر کے امتحان میں کامیابی حاصل کی

۱۹۲۸۔ سائمن کمیشن اور شیخ چلی، منظوم کتاب شائع ہوئی۔

۱۹۳۰-۳۱۔ نمک قانون توڑنے اور جلسے میں تقریر کرنے کے جرم میں ڈیڑھ برس کی قید سخت کی سزا ملی۔ میرٹھ جیل اور فیض آباد جیل میں رکھے گئے۔ لیکن گاندھی اِرون سمجھوتے کے سبب مارچ ۱۹۳۱ء لکھنؤ میں رہا کر دیئے گئے۔ جیل کے ساتھیوں میں شری لال بہادر شاستری اور چودھری چرن سنگھ وغیرہ تھے

۱۹۳۲۔ قومی تحریک میں ۶ ماہ کی قید سخت کی سزا ہوئی۔ فتح گڑھ جیل میں رکھے گئے

۔ رہائی کے بعد وکالت سے میدان صحافت میں آگئے۔ لالہ شنکر لال (دلی کے انقلابی نیتا) کے "وقت" اخبار میں کچھ ہفتے کام کیا۔

۱۹۳۳-۳۴۔ دلی کے مشہور روزنامے "تیج" اخبار کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں رہے جہاں شری شونا تھ بنا گر اور

شری رام لال ورما جی کے ساتھ کام کیا۔ بعد میں جوائنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ اس زمانے میں کئی رسائل وجرائد کے لیے مضامین اور کالم لکھتے رہے۔ مثلاً ادیب چمنستان وغیرہ۔ ۱۹۴۲ء میں تیج ویکلی کے ایڈیٹر بنے اور ۱۹۴۳ء میں تیج اخبار کے ایڈیٹر کی ذمہ داری سنبھالی۔ ان صاحب کے مضامین انھیں خاص طور سے نقش و نگار قارئین بہت پسند کرتے تھے۔ تیج کے اسپیشل نمبروں (کرشن جنم اشٹمی یا شہید نمبر) میں مضمون، نظمیں اور تصاویر کے نیچے اشعار لوگ دلچسپی سے پڑھتے تھے۔

— ملک کے مختلف حصوں میں مشاعروں، جلسوں میں شرکت کی۔ خاص طور پر قومی مشاعرے اور تحریک آزادی کے جلسوں اور شعری مجالس میں حصہ لیتے تھے

۱۹۴۴-۴۷۔ دلی صوبہ کانگریس کمیٹی کے پرچار منتری رہے۔ (یہ صوبہ متھرا سے مظفر نگر تک پھیلا ہوا تھا)

۱۹۴۵۔ کانگریس کی گولڈن جوبلی پر ایک کتاب "کانگریس کا پچاس سالہ کام" تصنیف کی۔

۱۹۴۶۔ ادیب فاضل (بی۔ اے آنرز ان اردو) پنجاب یونیورسٹی سے اعزاز کے ساتھ کامیاب ہوئے اور اس میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔

— منشی پریم چند کی ہندوستانی سبھا کی مجلس عاملہ کے اساسی رکن بنے

۱۹۳۹۔ آل انڈیا اردو کانفرنس دلی کی نیشنل کمیٹی کے ممبر بنائے گئے

۱۹۴۰۔ بھارت چھوڑو تحریک میں صوبہ دلی کانگریس کمیٹی کے پرچار کا کام سنبھالا اور والنٹیئرز لائے۔ دلی میں گرفتاری ہوئی اور فیروزپور جیل میں ڈیڑھ برس نظر بند رہے۔ جیل میں ساتھیوں میں شری بیجو پٹنائک، شری ایم ایم شاہ، چودھری برہم پرکاش، [illegible] راؤ صاحب، میر مشتاق احمد وغیرہ تھے۔ جیل میں مشاعرے کراتے۔ کلچرل پروگرام میں حصہ لیتے۔ [illegible] مختلف موضوعات پر تقریریں [illegible] کرتے رہے۔

۱۹۴۵-۴۷۔ رہائی کے بعد گاندھی گراؤنڈ میں منعقد دلی صوبہ [illegible] کمیٹی کے پہلے جلسے کی صدارت کی اور صوبہ کانگریس کے پرچار سمتی کے ممبر بنائے گئے۔

— سامراج واد پر ایک کتاب لکھی جس کا مسودہ مکتبہ جامعہ میں فسادات میں نذر آتش ہو گیا۔

— دلی میں فرقہ وارانہ فسادات کے روکنے کے لئے مجاہدانہ انتھک کام کیا۔ اقلیتوں اور مظلوموں کی امداد کے لئے کوشاں رہے۔ شانتی ویوستھا کے پرچار منتری بنے۔

۱۹۴۶۔ "ہندی چمن" نامی کتاب دکشنی بھارت ناگری پرچار سبھا کی طرف سے ہندی میں شائع ہوئی جس میں شعراء کا تذکرہ تھا۔

۱۹۴۷-۴۸۔ ہندوستان کے آئین کے کچھ ابواب کا اردو میں ترجمہ مہاتما گاندھی کا آشیرواد ملا۔ ان صاحب نے باپو کے مضامین کا ترجمہ اردو میں کیا

۱۹۴۷۔ صوبہ دلی کانگریس کمیٹی کے ڈیلیگیٹ برسوں رہے اور پرچار سمتی کے نائب صدر رہے

۱۹۴۸-۵۱۔ صوبہ دلی کے پریس آفیسر بنے۔ اخبارات میں فرقہ پرستی، سماج دشمن عناصر کی راہ روی پر قابو ہی نہیں کیا بلکہ ان عناصر کی [illegible] کی۔

ان صاحب نے قوانین میں کمیوں کی وجہ سے آفیسری سے استعفیٰ دیا مگر ہندوستان کے وزیر سردار پٹیل نے وہ استعفیٰ واپس کر دیا اور بعد میں [illegible] میں دفعہ ۱۹۱ میں ترمیم کی گئی۔

۱۹۴۸۔ شری جے پرکاش نرائن جی کے ساتھ "پرجا" نکالنے کی اسکیم بنی، مگر مالی دشواریوں کی وجہ جامہ نہ پہنایا جا سکا۔

۱۹۴۸-۴۹۔ کانگریس پریزیڈنٹس نامی کتاب تصنیف کی [illegible] شائع نہ ہو سکی۔

۱۹۵۰۔ پنجاب یونیورسٹی کے منشی فاضل کے امتحان میں [illegible]

۔ کاشی وانی کے ہم زبانوں کے مشاعرے میں اردو کے نمائندہ شاعر کی حیثیت سے شرکت کی

۔ اُردو سبھا قائم کی

۱۹۵۱ ۔ پہلا مجموعۂ کلام "کاروانِ منزل" شائع ہوا۔ جس میں تحریکِ آزادی اور حصولِ آزادی کے وقت کا کلام شامل تھا۔

۔ کل ہند انجمن ترقیٔ اردو کی مجلس عاملہ کے رکن بنے۔

۱۹۵۲ ۔ دلی ریاستی اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے عوامی انتخابات میں کامیاب ہوئے اور ڈپٹی اسپیکر بنائے گئے۔ تعلیم بالغان کے لئے راجیندر بابو، سبھاش بوس، جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل کی سوانح عمریاں لکھیں۔

۔ گوالیار میں آل انڈیا اسپیکرز کانفرنس میں شرکت کی

۱۹۵۴ ۔ "اردو ساہتیہ کا اتہاس" نامی کتاب ہندی میں تصنیف کی۔

۱۹۵۵ سے ۱۹۵۲ ۔ دلی اسٹیٹ ٹرانسپورٹ اتھارٹی کے چیئرمین رہے

۱۹۵۲ سے ۱۹۵۴ ۔ دلی اسٹیٹ میں چودھری برہم پرکاش کی کابینہ میں ڈویلپمنٹ منسٹر ہوئے۔ اطلاعات ترقی قانون، لیبر ہاؤس سپلائی، ہریجن کلیان، جیل، ٹیکس اور سماج کلیان محکمے دیئے گئے۔

۱۹۵۴ ۔ لکھنؤ میں دیوناگری لپی سدھار کانفرنس میں شرکت کی۔ سری نگر میں وکاس منتریوں کے سمیلن اور آل انڈیا لوکل سیلف گورنمنٹ کانفرنس میں دلی راجیہ کی نمائندگی کی۔

۱۹۵۵ سے ۱۹۷۴ ۔ ۱۹ برس دلی پردیش الوزت سمتی کے بلا مقابلہ صدر چنے جاتے رہے۔

۱۹۵۵ ۔ جامعہ اردو علی گڑھ کا خطبۂ صدارت پڑھا۔

۱۹۵۵ ۔ پاکستان (لاہور) میں مجلس پڑھی جس میں کئی دن کئی کئی گھنٹے امام حسین کی زندگی شہادت اور مشن پر تقریر کی۔

۱۹۵۵ اردو کے اخبار روزانہ سنسار کے چیف ایڈیٹر رہے

۱۹۵۶ ۔ دلی ودھان سبھا کی بھاشا سمتی، سوتنترتا سینانی سمتی اور سوتنترتا اتہاس سمتی کے ممبر رہے۔

۱۹۵۱ سے ۱۹۵۹ ۔ دلی لائبریری بورڈ اور دلی پبلک لائبریری کے چیئرمین رہے

ساؤتھ ایسٹ ایشیا لائبریری کانفرنس کی صدارت کی۔

۱۹۵۷ ۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے پرچار وبھاگ میں اردو پرچار سیل کے کنوینر رہے۔

۱۹۵۷ سے ۱۹۵۹ ۔ فلم سنسر بورڈ کی شمالی ہند ایڈوائزری پینل کے ممبر رہے۔

۱۹۵۸ آل انڈیا اردو کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کے سکریٹری رہے۔ دلی پردیش ہندی سمیلن کے کئی سمیلنوں اور جلسوں میں شریک ہوئے۔

۱۹۵۸ ۔ دلی نگر نگم کے چناؤ کے لئے کانگریسی امیدواروں کا انتخاب کرنے والے پینل کے ممبر رہے۔

۱۹۵۸ سے ۱۹۶۶ ۔ تعلقات عامہ کمیٹی کے چیئرمین بنائے گئے اور انہوں نے لفٹیننٹ گورنر دلی کے صلاح کار کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے ساتھ ہی لیبر ایڈوائزری کمیٹی، گرہ وکاس وبھاگ، ہریجن کلیان بورڈ، سماج کلیان وبھاگ وغیرہ کے چیئرمین رہے۔

۱۹۵۹ ۔ اکھل بھارتیہ الوزت سمتی کے نائب صدر منتخب ہوئے۔

۱۹۶۱ ۔ پاکستان میں دوسری مرتبہ مجالس پڑھنے گئے۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد کی سوانح عمری کا اردو میں ترجمہ کیا۔

۱۹۶۳ ۔ دوسرا مجموعۂ کلام "پورنگ" شائع ہوا۔ صدر جمہوریۂ ہند کو اردو کے سلسلے میں میمورنڈم دیا۔ دلی ساہتیہ سبھا کے نائب صدر بنے۔

۱۹۶۴ اکھل بھارتیہ انوذت نیاس کے سنستھاپک نیاسی بنے اور انورت دہار بنوانے میں مدد کی۔

۱۹۶۶ دلی کی اندرم مہا نگر پریشد کے، دلی راجیہ گاندھی اسمارک ندھی کے صدر بلا مقابلہ چنے گئے۔

۱۹۶۷ ۔ آل انڈیا بھاشا سیمینار میں شریک ہوئے۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے سرگرم سماجی خدمت سے رفتہ رفتہ الگ ہو کر گوشہ نشین ہو گئے

۱۹۶۸ اس وقت بھی ۵۰ کمیٹیوں اور انجمنوں سے متعلق تھے

۱۹۶۹ ۔ گاندھی جنم شتابدی پرچار وبھاگ کے اردو سیل کے

اعزازی اچاریہ نے ۔۔ ذمی جی کے منقولات کا اردو
ترجمہ کیا۔ اور گاندھی جی سے متعلق اردو نظموں کا مجموعہ
عقیدت کے پھول تالیف کیا۔

۱۹۷۱ ۔ انورت سیوی کا اعزاز آچاریہ تلسی کی طرف سے دیا
گیا اور امن صاحب کو جیون بھر کے لئے اکھل بھارتیہ
انورت سمتی کی مجلس کا اعزازی رکن اور دہلی پردیش
سمتی کا سرپرست بنایا گیا۔ بڑے آدمیوں کے
طنز و مزاح ۔ کتاب تصنیف کی

۱۹۷۴ ۔ دہلی پرشاسن کی ساہتیہ کلا پریشد نے اعزاز دیا۔

۱۹۷۶ ۔ اتر پردیش اردو اکاڈمی نے ادبی خدمات کے
سلسلے میں انعام سے نوازا

۱۹۷۷ ۔ صدر جمہوریہ ہند نے پدم بھوشن کا اعزاز دیا۔

۱۹۸۰ ۔ دہلی ہگزیکٹو کے کمشنر شری بے این سنگھ نے
شریہ [illegible] دایک ادبی جریدے ؟ کا امن خصوصی
شمارے کا اجرا کیا اور امن صاحب کے اعزاز
میں جلسہ ہوا۔

۱۹۸۳ ۔ ۱۰ جولائی ۱۹۸۳ء کو انتقال ہوا۔

ہندی کے مسلمان شعراء

یہ کتاب ہندی اردو کی تحقیق۔ مسلمان بھائیوں کا
ہندی سے تعلق اور خدمت مسلمان شعراء ہند کے
سوانح حیات مع تصاویر مرتب ہے جس پر ویسٹ
بنگال اردو اکاڈمی نے مصنف کو دو ہزار روپے اور بہار
اردو اکاڈمی پٹنہ نے ۳ ہزار روپے نیز اردو اکاڈمی نے
ایسی معیاری و قابل قدر کتاب کی اشاعت پر ماہنامہ
شان ہند کو دو ہزار روپے انعام دیا گیا ہے۔ یہ ایک
نادر الوجود اور بے نظیر کتاب ہے جس کا بدل موجود نہیں
ہے۔ محققین کالجوں اور یونیورسٹیوں کی لائبریریوں
نیز ادبی اداروں کے لئے مفید ترین تحفہ ہے۔ قیمت
۵۱ روپے اور ڈی لکس ایڈیشن ساٹھ روپے۔ اب صرف
ڈی لکس ایڈیشن ہی کی چند جلدیں باقی ہیں۔

دفتر شان ہند فلیٹ ۸، انصاری مارکیٹ
دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

آخری نظر

فرش نظر، نہشت نظر، انداز نظر کے بعد ابوالبیان
حضرت جنیت رتنے ہندوردوی کا پانچواں دیوان
"آخری نظر" حال ہی میں شان ہند نے بہترین انداز
میں شائع کیا ہے۔ آخری نظر آپ کی ذاتی لائبریری
کے لئے ایک ایسا انمول اضافہ ہے جسے آپ فخر کے
ساتھ باذوق احباب کو دکھا سکیں گے

قیمت: پندرہ روپئے

دفتر شان ہند فلیٹ ۸، انصاری مارکیٹ
دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شمالی ہند کے مشہور غزل گو

حضرت گوہر عثمانی کا

مجموعۂ کلام

اعتراف

شائع ہو گیا ہے۔ بہترین کلام مشاہیر ملک
کے گراں قدر مضامین سے مزین
قیمت -/۲۵ روپے
تقسیم کار: ماہنامہ شان ہند فلیٹ ۸
انصاری مارکیٹ دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

کھانے کی گولی	کاپر ٹی	نرودھ
NIRODH		

کوئی بھی طریقہ اپنایئے

davp 84/223

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹیو بینک لمیٹڈ

رجسٹرڈ آفس ۷۸ محمد علی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

دہلی آفس۔ ۳۶۵۵ نیتا جی سبھاش مارگ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

فون:۔ ۲۶۸۲۶۶ —— ۲۶۴۳۷۲

★ ہمارے یہاں شرح سود تمام نیشنلائزڈ اور شیڈولڈ کمرشیل بینکوں کے مقابلہ ایک فی صد زیادہ ہے۔

★ ہندوستان کا پہلا کوآپریٹیو بینک جس کو زرِ مبادلہ میں کاروبار کے لئے لائسنس جاری کیا گیا۔

★ ہمارے بینک میں اوقاف کی جمع شدہ رقم کی آمدنی دفعہ ۱۲ (۵) الف (iii) انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔

اس کے علاوہ

★ ہم آپ کے آرام و آسائش کی ضروریات مہیا کرنے کے لئے آسان قسطوں پر قرضہ فراہم کرتے ہیں۔ ایک فیصدی کا فرق بہت بڑا فرق ہے۔ یہ آپ کی رقم میں ہزاروں روپیوں کا اضافہ کرتا ہے۔ آپ بھی اس کا فائدہ اٹھائیں۔

زین جی رنگون والا (منیجنگ ڈائرکٹر) ★ حسینی ایس ڈاکٹر (چیئرمین) ★ شمیم کاظم (اسسٹنٹ جنرل منیجر۔ شمالی ہند)

کیا آپ گلے کی تکلیفوں میں اکثر مبتلا رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے سخت پریشان ہیں، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ایسی پریشان کُن بیماری
سے گلا کاٹ دینے سے ہی چھٹکارا مل سکتا ہے ۔ ذرا ٹھہریئے! خالص دیسی ادویات سے تیار کیا ہوا "ٹونسلیکس" ایک بار
صرف ایک بار استعمال کر کے تو دیکھئے، پھر آپ کو گلے کے غدود بڑھ جانے، گلے کی سرسراہٹ، خراش، گلے کے ورم، زخم اور
دوسرے تمام امراض کی شکایت نہیں رہے گی ۔ اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا مریض ہو، جس کے گلے کے غدود (ٹانسلائٹس) کا
آپریشن ہوتا ہے تو اُسے اس دوا کے بارے میں ضرور بتائیے گا کیوں کہ پھر اُسے آپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی ۔ چھوٹے بچے
جو کھٹی میٹھی چیزیں کھا کر گلا خراب کر لیتے ہیں، اُن کے لئے بھی یہ بہت کام کی دوا ہے ۔ ہر گھر میں اس کا رہنا بہت ہی ضروری ہے۔

—— شمع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیباریٹریز، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

Phone: 275602
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002
Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644 57
Regd. No D- DNJ 353
MARCH 1985

قیمت : پندرہ روپے

خرید کر پڑھیے :
مانگ کر پڑھیے :
یا پھر
چوری کر کے پڑھیے

یہ ہے ہی اتنا خوب صورت،
اتنا دل کش،
اتنا مکمل کہ اسے کسی طرح بھی
حاصل کریں کیوں کہ
یہ فیض کی شخصیت اور فن پر ایک
شان دار ادبی دستاویز ہے۔ اِس میں شامل ہیں :

★ خلوت اور جلوت کے بھید کھولنے والے ذاتی نقوش۔
★ نادر و نایاب تصویریں۔
★ سدا بہار، ہزار رنگ و منتخب کلام۔
★ فیض کی شخصیت کے وہ ڈھکے چھپے گوشے جن پر سے پہلی بار پردہ اُٹھایا گیا ہے۔
★ ہندوستان، پاکستان، رُوس اور انگلستان کے دانش وروں کی مشترکہ کاوشوں کا گلدستہ۔

ساری اُردو دنیا میں شبستان کے "فیض نمبر" کا چرچا ہے

اس سے پہلے کہ اسٹاک ختم ہو جائے آج ہی اپنے قریبی نیوز ایجنٹ سے طلب کیجئے یا براہِ راست ہم سے منگوائیے۔

شبستان اردو ڈائجسٹ آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شان ہند
نئی دہلی
ایڈیٹر
سرور تونسوی
Dr. Zakir Husain Library
Jamia Nagar
J. M. I. New Delhi
JUN 1985

A leading role

At Shriram, the focus is always on good performance, whether in the factory, field, office—or auditorium. Artistic talent is promoted as systematically as work talent.

Employees of Shriram Fertilisers & Chemicals, at Kota and elsewhere, are given every opportunity to develop their talents—in music, dance, drama—and perform at their best.

Our Shriram Kala Mandir at Kota is equipped with the latest lighting and acoustics technology. And our Shriram Ramlila is a brilliant spectacle which attracts thousands from all over Kota and the neighbouring areas.

Shriram Fertilisers & Chemicals
(Prop. DCM LIMITED)

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۳ | رجسٹرار آف نیوز پیپر فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۲۲۲/۵۷ | رجسٹرڈ نمبر ڈی (ڈی این) ۲/۲۵۳

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں — ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاضؔ مجھ کو پیار
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں — یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
فیاض گوالیاری

ماہنامہ

شانِ ہند

نئی دہلی

ایڈیٹر سرور تونسوی

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے
زر سالانہ -/۲۴ روپے

جلد نمبر ۶ | اپریل ۱۹۸۵ء | شمارہ نمبر ۴

ہمارا تعلیمی نصاب اور طریق تعلیم

سیمسن کو جب اندھا کر دیا گیا، تو اس نے کہا۔
روشنی جیسی نعمت عظمیٰ کو اتنی چھوٹی اور نازک سی چیز میں کیوں رکھا گیا ہے کہ جو ظالم چاہے اسے بجھا کر اندھیرا کر دے۔ اسے تو سر سے پاؤں تک ہر جگہ ہونا چاہیئے تھا تاکہ کوئی مٹانا بھی چاہے تو مٹا نہ سکے۔

یہی حال ہمارے آج کے علم کا ہے کہ وہ ذہن کے صرف ایک ہی گوشے کو روشن کرپاتا ہے چنانچہ ہماری سیاست کے راکشس جب انسانوں کو اپنے کام میں لانا چاہتے ہیں تو بٹن دبا دیتے ہیں
ان کے ذہن کے اس روشن گوشے کو بجھا کر اپنے ہی نور چشموں کو اندھا کر دیتے ہیں۔
اور اندھیرا تو ہوتا ہی ہے۔ اس لیے کہ اس میں توڑ پھوڑ، لوٹ مار، غارت گری اور خون ریزی کے کام انجام دیئے جائیں، بدامنی پھیلائی جائے اور بدنظمی پیدا کی جا سکے!

ہمارا تعلیمی نصاب اور طریق تعلیم ایسا ہو کہ ہمارا علم ہمارے ذہن کے ہر گوشہ کو روشن کر دے۔ اور ہمارے وجود کو سراپا نکھار دے تاکہ ہمارا روشن سراپا ہماری طرف بڑھنے والے ہر ظالم کو چوندھیا دے۔ اور وہ ایسے ہونے پر مجبور کر دے۔

(ماخوذ از [illegible])

مدیر پرکاشک سرور تونسوی: ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے جامعہ پریس ... سے چھپوا کر دفتر شان ہند ... انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ وصبا چہ کرد؟

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

جناب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جنھیں ممالکِ غیر میں "سفیر اُردو" کہا جاتا ہے ۔ آج کل ناکام ۔ نااہل، جاہلِ مطلق اور نام نہاد اُردو کے مسلمان دانشوروں کی بلاوجہ مخالفت کا نشانہ بنے ہوئے ہیں ۔ کوئی "قومی آواز" میں رطب و یابس کا سہارا لے رہا ہے تو کوئی بیسویں صدی میں دل کا غبار نکال رہا ہے

حقیقت یہ ہے کہ برصغیر ہند و پاک میں کوئی بھی ایسا اُردو کا دانشور نہیں ہے جو اُردو سے متعلق کسی بھی موضوع پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے بہتر انداز میں تقریری یا تحریری طور پر برتری رکھتا ہو ۔ چنانچہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک غیر مسلم کی اس فوقیت کو یہ اُردو کے مسلمان نام نہاد دانشور تسلیم کر لیں۔

چنانچہ افسانہ سیمینار / ورکشاپ جو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے زیر اہتمام دلی اُردو اکاڈمی کی طرف سے غالب اکاڈمی میں پانچ دنوں تک جاری رہا اس کی مثال آج تک دُنیائے اردو میں کہیں نہیں ملتی ۔

مگر اُردو کے جنازہ بردوش یہ حضرات محض حسد اور کم ظرفی کی وجہ سے آئے دن کسی نہ کسی بہانے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے خلاف کوئی نہ کوئی فتنہ اٹھاتے رہتے ہیں ۔ یا ذو علی الاعلان اپنی کم عقلی نا اہلیت نیز جاہل ہونے کے ساتھ مذہبی تعصب کا ثبوت دیتے رہتے ہیں ۔

اتر پردیش کے وزیر خوراک کی اُردو دشمنی

جناب واسدیو سنگھ وزیر خوراک اتر پردیش کی اُردو دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی مگر اب وہ اُردو دشمنی کے ساتھ ساتھ اُردو کے پرستاروں کے خلاف بدزبانی پر بھی اُتر آئے ہیں ۔ اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ کو چاہیئے کہ وہ اپنے وزیر خوراک کو سمجھائیں اور انھیں بے قابو نہ ہونے دیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ واسدیو سنگھ اپنے ساتھ کچھ ممبرانِ اسمبلی کو رکھتے ہیں جن کی وجہ سے وزیر اعلیٰ کو شری واسدیو سنگھ کے خلاف کوئی عملی قدم اٹھانے کی جرأت نہیں ہو سکتی مگر وہ یہ تو کر سکتے ہیں کہ شری واسدیو سنگھ کو یہ بتا دیں کہ اُن کی ان طفلانہ حرکتوں سے ساری وزارت بدنام ہوتی ہے ۔ اور پھر کانگریس کی پالیسی نیز وزیر اعظم کے فرمودات کے بھی خلاف ہے ۔

علالت

کچھ دنوں سے آپ کا یہ نیاز مند علیل ہے جس کی وجہ سے شانِ ہند وقت پر شائع نہیں ہو رہا ۔ تاہم کوشاں ہوں کہ شانِ ہند وقت پر شائع ہو ۔

غزل

ڈاکٹر المحمود دیوان صاحب
دیوان (لندن)

مل جائے گر نظر کہیں خیر الانام سے
مطلب رہے نہ حور نہ جنت نہ جام سے

پینے کا شوق ہو تو بہت سے طریق ہیں،
چلّو، نظر، پیالہ، سبُو اور جام سے

آنکھوں میں پیار، لب پہ ہنسی بات میں فریب
لُوٹا کسی نے خوب ہمیں اہتمام سے

شعر و سخن میں آپ نے پیدا کیا کمال
محفل میں داد کیوں نہ ملے خاص و عام سے

دیوان، ہاں یہی تو ہیں تلمیذ آرزو
محفل میں نام لیتے ہیں سب احترام سے

بلائے ناگہاں

مسز عبدالقادر

حیدر میرا بچپن کا دوست تھا۔ ہم دونوں ایک ہی محلہ میں
رہتے تھے اور دونوں نے ایک ہی سکول میں تعلیم پائی تھی۔ سکول
[illegible] کے بعد اس نے کشمہ کی تجارت اختیار کی اور اس تجارت کی
وجہ سے اس کی بیشتر زندگی کافرستان میں گزری اب وہ ایک متمول
[illegible]ں کی حیثیت سے آرام و آسائش کی زندگی بسر کر رہا تھا۔
باوجود اس آسودہ حالی کے اس کی زندگی غیر مطمئن معلوم ہوتی تھی۔
ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا۔ اسے کسی کام میں دلچسپی نہ تھی۔
سوسائٹی سے متنفر تھا۔ سوائے میرے کسی سے زیادہ میل جول نہ
رکھتا تھا۔ میں نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ اس کی افسردگی کا راز معلوم
کروں۔ مگر موقعہ نہ ملا۔ ایک دفعہ فصل کے موقعہ پر میرا اپنے حصہ داروں
سے کچھ جھگڑا ہوگیا اور مجھے اپنے گاؤں جانا پڑا —— وہاں جاکر
[illegible]مینداری کی بندھنوں میں ایسا گرفتار ہوا۔ کہ دو سال تک چھٹکارا نہ
ہوا۔ اس عرصہ میں حیدر سے میری خط و کتابت جاری تھی۔
اس کے خطوں سے اکثر وحشت اور مایوسی کا جذبہ ٹپکتا تھا۔ دو
سال بعد جب میں واپس آیا۔ تو میں نے سُنا کہ حیدر بالکل گوشہ
نشین ہوگیا ہے —— دو تین دن تو گھر کے معمولی کام کاج میں
صرف ہوگئے۔ تیسرے دن شام کے قریب میں اس کے گھر گیا۔ میرا
لڑکا سلیم میرے ہمراہ تھا۔ حیدر کی حالت دیکھ کر مجھے دلی صدمہ
ہوا وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ بن رہا تھا۔ اس کا رنگ مٹیالا اور
بدن بد نما طور پر خشک ہو رہی تھی۔ اس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں سے
موت و ہراس کی علامات ظاہر تھیں۔ مجھے دیکھ کر ایک مُردہ سی
مسکراہٹ اس کے پژمردہ ہونٹوں پر کھیل گئی۔ میں اسے دیر تک حیرت
سے تکتا رہا۔ میری حالت سے آگاہ ہو کر وہ مری ہوئی آواز
سے کہنے لگا "کیا دیکھ رہے ہو" میں خاموش رہا۔ وہ دوبارہ
بولا۔ "اوہ! تم نہیں جانتے میری زندگی کس عذاب میں ہے۔ میں نے
[illegible] اپنا راز تم سے پوشیدہ رکھا۔ مگر اب زیادہ دیر تک یہ پوشیدہ
[illegible] سکتا۔ میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں"۔

(۲)

سلیم کمرے سے ملحقہ لائبریری میں رنگین پنسلوں سے تصویریں
بنانے میں مصروف تھا۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ حیدر کہنے لگا۔
سکول چھوڑنے کے بعد میری دوستی ایک ایسے شخص سے ہوئی۔ جو
کافرستان میں کشمہ کی تجارت کرتا تھا۔ یہ شخص انتہائی نیک نفس اور
دوست نواز تھا۔ وہ دنیا میں بالکل اکیلا تھا۔ اور تجارت کا کام
انجام دینے میں اسے بہت دقت ہوتی تھی۔ اس لئے اسے ایسے آدمی
کی تلاش تھی جو اس کے ماتحت کافرستان کے علاقہ میں دور دور کے
کشمہ فراہم کرنے میں اس کی مدد کرے —— ان دنوں میری عمر
صرف اٹھارہ برس کی تھی۔ میں بالکل ناتجربہ کار تھا۔ تاہم اس نے
مجھے دیانتدار اور محنتی پاکر تجارت میں حصہ دار بنا لیا۔ اور میں نے
اپنا کام اس قدر شوق اور محنت سے کیا کہ سال کے اندر اندر
ہماری تجارت چمک اٹھی —— انہی ایام میں ایک دفعہ میں ایک
کوہستانی ملازم کے ہمراہ دورہ کرتا ہوا راستہ بھول کر ایک غیر آباد
علاقہ میں جا پہنچا۔ گو یہ علاقہ نہایت سرسبز تھا۔ میوے سے
لدے ہوئے درخت ہماری خوراک کے لئے بکثرت موجود تھے
اور پیاس بجھانے کو جیبہ جیبہ پر حیات بخش چشمے جاری تھے۔ لیکن
رات کو سر چھپانے کے لئے جگہ ملنی دشوار تھی۔ تمام دن ہم جنگلوں
میں بھٹکتے رہے۔ حتےٰ کہ شام قریب ہوگئی۔ شکست خوردہ
آفتاب دن بھر کی خجالت سے زرد رو ہو کر لیلائے شب کی سیاہ
فام زلفوں میں منہ چھپانے لگا۔ جنگلی پرندے خوش فعل مچاتے
ہوئے اپنے گھونسلوں کے ارد گرد طواف کرنے لگے۔ اور گھنے
درختوں کی وجہ سے جنگل بے حد تاریک ہونے لگا۔ ہم اندھا
دھند آگے بڑھتے گئے۔ یکا یک جنگل ختم ہوگیا۔
ہم تاریک فضا سے باہر نکلے تو افق کے دلکش مناظر سے
ہماری آنکھیں روشن ہوگئیں۔ ہم ایک شاداب زرخیز میدان
کے کنارے کھڑے تھے۔ کہیں دور سے روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

ہم اس طرف بڑھے اور تھوڑی دیر میں ایک جھونپڑی کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے — جھونپڑی میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ دود کش سے دھوئیں کے مرغولے نکل رہے تھے اور بھنے ہوئے گوشت کی خوشگوار مہک اٹھ رہی تھی۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے دستک دی۔ ایک خشک رو منحوس صورت شخص نے دروازہ کھولا۔ میں نے رات بسر کرنے کی درخواست کی۔ اس نے ہم دونوں کو سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا۔ پھر ایک خوفناک قہقہہ لگاتے ہوئے اندر آنے کا اشارہ کیا — اس خوفناک قہقہے سے میرا دل ہل گیا۔ طرح طرح کے وسوسے اٹھنے لگے۔ مگر تھکان سے مجبور ہو کر چپ چاپ اس کے پیچھے ہو لیا۔ جھونپڑی کی اندرونی حالت بہت ردی تھی۔ دیواریں دھوئیں سے سیاہ ہو رہی تھیں۔ ہر چیز پر سیاہی مائل گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی اس نے ہمیں ایک شکستہ تخت پر بٹھایا۔ اور خود ہمارے کھانے کے بندوبست میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں اس نے بھنا ہوا گوشت اور مکی کی روٹیاں لا کر ہمارے سامنے رکھ دیں کھانے سے فارغ ہو کر میرے ملازم نے میرا بستر ایک طرف لگایا مگر میرا دل سونے کو نہ چاہتا تھا۔ مجھے اس منحوس صورت آدمی کی آنکھوں میں شقاوت مسکراتی دکھائی دیتی تھی۔ اس بدگمانی کے زیر اثر میرے دل میں ایک نامعلوم خطرہ پیدا ہو چکا تھا۔ میں اسی سوچ میں تھا کہ وہ قہوہ لے آیا نیند کو دور کرنے کے لئے میں نے خوب قہوہ پیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے سخت نیند کے جھونکے آنے لگے۔ میں نے چاہا کہ ملازم کو خبردار رہنے کی تاکید کر کے خود سو جاؤں مگر دیکھا تو وہ پہلے ہی گہری نیند کے مزے لے رہا تھا۔ میں نے اسے آوازیں دیں۔ جھنجھوڑا مگر بے سود مجھ پر نیند کا غلبہ زیادہ ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ ارد گرد کی چیزیں دھندلی نظر آنے لگیں۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا — رات کو مجھے نہایت خوفناک خواب دکھائی دئے۔ میں نے دیکھا کہ چند دیوزاد آدمی مجھے کندھے پر اٹھائے ہوئے کہیں لئے جا رہے ہیں۔ دفعتاً میرے سر میں سوئی سی چبھ کر اٹھی ایک عجیب کیفیت سے میرے پٹھے اینٹھنے لگے۔ دوران خون سر کی طرف زیادہ ہونے سے سر پھٹنے لگا۔ سخت تکلیف سے میری آنکھ کھل گئی۔ اُف! پناہ بخدا

میں نے ایک ایسا بھیانک منظر دیکھا کہ میرا خون خشک ہو گیا۔ بدن کے رونگٹے سوئیوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ اور دل ایک بڑے کلاک کی مانند ٹک ٹک کرنے لگا — آہ! میں ایک تیرہ و تار ڈراؤنی غار میں ایک لمبی سی چوبی میز پر چت پڑا ہوا تھا۔ میری مشکیں کسی ہوئی تھیں۔ اور سرہانے کی طرف ایک زبردست الاؤ جل رہا تھا۔ دہکتے ہوئے انگاروں کی سرخ سرخ کپکپاتی ہوئی روشنی میں دیواروں پر مہیب سائے ناچ رہے تھے۔ غار دوزخ کی بھٹی کی طرح لال اور گرم تھی۔ سخت گرمی سے میرا سر چکرا رہا تھا — میز کے قریب ایک دیوزاد آدمی کھڑا تھا۔ جس کا بالوں سے بے نیاز سر ایک پشاوری تربوز کی طرح سڈول تھا۔ اس کا سرخ چہرہ جس پر جلادوں کی طرح بڑے بڑے سیاہ لچھے گچھے تھے۔ انگاروں کی لال روشنی میں خون سے رنگا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ ہاتھ میں ایک لمبا شکاری چاقو پکڑے کسی کو کچھ احکام دے رہا تھا۔ انتہائی دہشت سے میری رہی سہی دم حلق میں اٹک گئی۔ اور سانس رک رک کر آنے لگی۔ اتنے میں [illegible] سنائی دی۔ جسے سنتے ہی سرخ چہرہ جلاد نے اپنا [illegible] ہاتھ اٹھایا۔ اور چاقو میرے سر میں گھونپنے لگا۔ میں شدت خوف سے پہلے ہی نیم جاں ہو رہا تھا۔ زخموں کی تکلیف سے بے ہوش ہو گیا۔

(۳)

مجھے ہوش آیا۔ تو میں ایک صاف ستھرے کشادہ کمرے میں ایک آرام دہ بستر پر پڑا تھا۔ کمرے میں بالکل سکوت تھا۔ ایک طرف آبنوسی [illegible] بڑے [illegible] پھیل رہا تھا۔ جس کی [illegible] اور [illegible] عطر کی [illegible] رہی تھی۔ چاندنی [illegible] کھڑکی سے داخل ہو کر فرش پر لوٹ رہی تھی [illegible] رفتہ رفتہ مجھے سب واقعات یاد آنے لگے۔ اور غار [illegible] آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ میں نے گھبرا کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ سرہانے کی طرف ایک [illegible] دیکھ کر میری چیخ نکل گئی [illegible] کسی [illegible] سر [illegible] کیا۔ [illegible] زندگی [illegible] زندگی سے مایوس کر دیا تھا

مگر آج آٹھ دن کے بعد تمہیں ہوش میں دیکھ کر بہت خوش ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔ اب کچھ فکر نہیں تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے ـــــ دلجوئی کے الفاظ سن کر میں نے ممنون نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا وہ ایک چالیس سالہ وجیہہ اور شکیل آدمی تھا۔ اس نیک دل انسان کی ڈھارس بندھانے، ہمدردی اور انتھک خدمتگزاری سے میری صحت بہت جلد عود کرنے لگی۔ اور میں بتدریج صحت یاب ہو گیا دوران علالت میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے محسن کا نام جواں بخت ہے اور وہ ایک قبیلے کا سردار ہے۔ میرے استفسار پر جواں بخت نے مجھے ایک عجیب و غریب داستان سنائی' اس نے کہا "اس علاقہ میں کئی ایک ایسی وادیاں ہیں۔ جو ہنوز دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ ہر ایک وادی کا راستہ اتنا خفیہ اور پُراسرار ہے کہ کوئی اجنبی اس میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اور ہر ایک وادی میں جُدا جُدا قبیلے آباد ہیں۔ چنانچہ یہ وادی بھی جس میں میرا قبیلہ آباد ہے اسی طرح کی ایک پوشیدہ وادی ہے۔ اور یہاں سے ایک دن کی مسافت پر ایک اور ایسی ہی پوشیدہ وادی ہے جس میں ایک رہزنوں کا قبیلہ آباد ہے۔ ان کی سردار ایک عورت ہے جس نے جوانی کا جوہر ایجاد کیا ہے اٹھارہ سے پچیس سال تک کی عمر کے نوجوانوں کے سر سے وہ اس جوہر کو کیمیاوی طریقے سے حاصل کرتی ہے۔ اور اس جوہر کے اثر سے باوجود سن رسیدہ ہونے کے ابھی تک جوان اور نوخیز نظر آتی ہے۔ اس جوہر کو حاصل کرنے کے لئے اس نے اپنے ملازم مختلف علاقوں میں اس غرض سے چھوڑ رکھے ہیں کہ وہ کسی طرح نوجوانوں کو اس کے لئے فراہم کریں ـــــ ان اسیر نوجوانوں کو اس کے ملازم منشیات سے بے ہوش کر کے خفیہ غاروں میں لے جاتے ہیں۔ جہاں وہ عورت ان کے سروں سے جوہر کشید کرتی ہے۔" میں نے پوچھا "آپ کو یہ باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟" اس نے کہا "ابتدا میں مجھے بھی ایک دفعہ اس کے آدمی پکڑ کر لے گئے تھے۔ لیکن میرے قبیلے والے اس غار کا کسی طرح کھوج لگا کر اور انہوں نے شبخون مار کر مجھے عین اس وقت چھڑا لیا جب کہ ایک سرخ چہرہ جلاد میرے سر کو زخمی کر رہا تھا" جواں بخت نے کلاہ اتار کر اپنا سر مجھے دکھایا جس پر جا بجا بڑے بڑے سفید داغ تھے۔ [illegible] بعد میں میں نے اب اس علاقہ میں اپنے جاسوس چھوڑ رکھے ہیں جب کوئی نوجوان ان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ تو مجھے اطلاع مل جاتی ہے اور چھاپہ مار کر ان نوجوانوں کو بچا لیتا ہوں۔ مگر وہ عورت احتیاطاً غاریں بدلتی رہتی ہے۔ مگر میں ہمیشہ کھوج لگانے میں کامیاب ہو جاتا ہوں۔ چنانچہ جس دن رہزن تمہیں اس ڈائن کے پاس لے جا رہے تھے مجھے جاسوسوں نے مطلع کیا۔ جس پر میں نے کئی ایک غاروں میں تمہیں تلاش کیا۔ اور آخر کار ایک غار پر حملہ کر کے تمہیں نجات دلوائی۔ میں کئی دفعہ اس عورت پر حملہ کر چکا ہوں مگر وہ ہر دفعہ میرے ہاتھ سے بچ کر صاف نکل جاتی ہے۔ کاش مجھے اس کی وادی کا راستہ معلوم ہو جائے۔ اور میں ہمیشہ کے لئے دنیا کو اس ڈائن کے وجود سے پاک کر دوں۔"

(۴)

میں تقریباً چھ ماہ جواں بخت کی وادی میں مقیم رہا۔ کئی دفعہ واپسی کا ارادہ کیا مگر اس کی بے لوث محبت میرے لئے زنجیر پا ہو گئی۔ چھ ماہ بعد میں نے دل کڑا کر کے اس سے اجازت طلب کی۔ وہ کچھ سوچ کر بے دلی سے کہنے لگا۔ "تم شوق سے جا سکتے ہو۔ مگر تمہیں یہاں سے آنکھوں پر پٹی باندھ کر جانا ہو گا۔" میں نے گھبرا کر کہا "یہ کیوں؟" وہ لجاجت سے بولا "عزیز من تمہیں پہلے بتا چکا ہوں۔ کہ یہ ایک پوشیدہ وادی ہے۔ اس لئے سوائے اپنے قبیلے کے کسی اور کو خفیہ راستوں کا راز بتانا ہمارے اصول کے خلاف ہے۔ اس اصول میں بے قاعدگی کی وجہ سے نقصان کا سخت خطرہ ہے۔ کیونکہ اگر ایک قبیلے کو دوسرے قبیلے کی وادی کا راستہ معلوم ہو جائے تو وہ شب خون مار کر وادی میں گھس آتے ہیں اور قبیلے کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ گو مجھے تم پر کوئی بدگمانی نہیں مگر اپنے قبیلے کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ ان کے قائم کردہ اصول کی خلاف ورزی میری طاقت سے باہر ہے۔" میں نے افسردگی سے کہا۔ "تو پھر میں یہاں کبھی نہ آ سکوں گا" "میرے خیال میں کبھی نہیں" اس نے کہا۔ میں نے کہا "لیکن آپ کی ملاقات" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ "یہ بھی تقریباً ناممکن ہے" اس ناگوار گفتگو نے مجھے مایوس کر دیا۔ مجھے اس سے دلی الفت تھی اس لئے اس کے فیصلے سے میرے دل پر گہری چوٹ لگی۔ اور میرے آنسو جاری ہو گئے وہ رویا تو نہیں مگر اس کے چہرے کا اڑتا ہوا رنگ اس کے اضطراب کا شاہد تھا وہ گاؤ تکیے پر کہنیاں ٹیکے کچھ سوچ رہا تھا اس کے شگفتہ چہرے پر سادی تجلیاں نمایاں تھیں۔ کافی دفعہ

کہا جب اس نے سر اٹھایا اور اپنی بکھری ہوئی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کے مسکرایا — وہ مجھ سے کہنے لگا — ہاں ایک صورت ہو سکتی ہے۔ اگر تم میرے سامنے یہ حلف لو یا قسم اٹھاؤ کہ میری برادری میں شامل ہو جاؤ — تو میرے قبیلے کو اطمینان ہو جائے گا۔ میں نے اس بخوشی فوراً منظور کر لیا۔ دوسرے دن جوان بخت نے اپنے تمام قبیلے کی دعوت کی۔ اور سب کے سامنے ایک نیم عریاں کاہن نے جوان بخت کی چھنگلیا سے چند قطرے خون نکال کر ایک طشتری میں ٹپکائے — پھر اپنی خاص زبان میں اس خون پر مجھ سے قسم لی گئی — جس کا مفہوم یہ تھا کہ اگر میری وجہ سے جوان بخت کو کسی قسم کی تکلیف پہنچے تو اس میں مجھے بھی وہی سزا دی جائے۔ اس کے بعد نیم عریاں کاہن کی ہدایت کے بموجب میں نے اس مقدس خون کو چکھا — اور اس رسم کے اختتام پر جوان بخت نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ اس کے بعد قبیلے کے سب لوگ یکے بعد دیگرے میرے گلے ملے اور خوشیاں مناتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ اگلے دن مجھے وادی کا راز بتا دیا گیا۔ اور جاتی دفعہ جوان بخت نے تاکید کی کہ جب تک میری عمر ۲۵ برس سے تجاوز نہ کر جائے — اس علاقہ میں اکیلا یا کسی اجنبی کے ہمراہ سفر نہ کروں — جوان بخت کے خاص آدمی مجھے اس جگہ پہنچا گئے — جہاں میرے حصہ دار کا پیدا کردہ شہر تھا — یہ خطہ جوان بخت کی وادی سے دو سو میل کے فاصلے پر تھا۔ میرا حصہ دار جو میری زندگی سے مایوس ہو چکا تھا — مجھے زندہ سلامت پا کر بہت خوش ہوا — جوان بخت کی دوستی سے میری تجارت کو بہت فائدہ پہنچا۔ کیونکہ جوان بخت کی وادی میں کٹھ بہت کثرت سے پائی جاتی تھی — اس کے آدمی ہمیشہ کٹھ پہنچاتے رہتے — اپنی آدمیوں کے ساتھ میں بھی ہر دوسرے تیسرے مہینے جوان بخت سے ملنے جایا کرتا۔ اسی طرح کئی سال گزر گئے — میری عمر ۲۵ برس سے تجاوز کر گئی اب میں بغیر محافظوں کے بے کھٹکے اس علاقہ میں سفر کرنے لگا — ایک دفعہ میں جوان بخت کو ملنے جا رہا تھا راستے میں ایک چھوٹی سی کوہستانی سرائے میں میری ایک خوش پوش مسافر سے ملاقات ہوئی یہ شخص بڑا باتونی تھا — باتوں ہی باتوں میں اس نے ذکر کیا کہ فلاں راستے سے آتے ہوئے کئی دفعہ اس ندی کے کنارے جو نشیبی گھاٹی کے عمق میں بہہ رہی ہے اس نے پریوں کو گاتے دیکھا ہے اس وقت تو میں نے اسے جھٹلا دیا — مگر وہ سرسے واپس ہوکر آتے ہوئے راستے میں مجھے اس ندی کا خیال آیا — جو یہاں سے زیادہ دور نہ تھی — میں نے گھوڑا اس راستے پر ڈال دیا — ندی کے کنارے پہنچا تو کہیں دور پار سے ہلکی ہلکی دلکش آواز جو نسیم بہار کی طرح لہروں پر مستی بکھیر رہی تھی سن کر میرے دل میں گدگدی پیدا ہونے لگی — میں نے گھوڑا آگے بڑھا دیا — برساتی ندی میں پانی بہت کم تھا — میں بآسانی اسے عبور کرکے پار کے گھنے جنگل میں داخل ہو گیا — اب گیت کہیں قریب ہی سنائی دیتے تھے — یہ نشاط انگیز راگنی مجھے اپنی طرف اس طرح کھینچ رہی تھی — جس طرح مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے آگے بڑھ کر معلوم ہوا کہ جنگل کو وسط سے کاٹ کر چھوٹا سا میدان بنا دیا گیا ہے اور اس میدان میں ایک خوشنما جھونپڑی ہے جس کے ارد گرد خوش رنگ پہاڑیوں کی بساط بچھی ہوئی ہے قریب گیا تو فرط حیرت سے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں — سوسن کے پھولوں کی پلنگڑی پر ایک پری جمال حسینہ ایک پہاڑی ساز پر دلکش لے میں گیت گا رہی تھی اور چند کوہستانی لڑکیاں پاؤں میں گھنگرو باندھے اس کے سامنے ناچ رہی تھیں — اس حسینہ کو دیکھ کر میں بہک گیا — اس کی بڑی بڑی خوشنما صندلی آنکھوں سے ایک ایسا کیف کا سیلاب امڈ رہا تھا — جس کی تیزرو میں میرے ہوش و حواس تک بہہ گئے — مجھے دیکھ کر انہوں نے راگ رنگ ختم کر دیا — حسینہ نے مجھے بلا کر بڑے اخلاق سے اپنے قریب بٹھایا اور ٹوٹی پھوٹی پشتو میں باتیں کرنے لگیں جب میرے حواس قدرے درست ہوئے تو میں نے اس حسینہ سے نام وغیرہ دریافت کیا وہ کہنے لگی میرا نام مہ لقا ہے — میں ایک کوہستانی رئیس کی لڑکی ہوں — والدین کے انتقال پر میرا دل ٹوٹ چکا ہے — یہ جگہ کبھی میرے باپ کی شکارگاہ تھی — یہاں اپنی کنیزوں کے ساتھ زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں —

میں نے تمام دن اس حسینہ کی صحبت میں گزارا — خوشی کے لمحے چٹکیوں میں گزر جاتے ہیں — سہ پہر ڈھلی تو ڈھلتی چھاؤں وقت کا پتہ دینے لگی — مہ لقا سے رخصت ہو کر جوان بخت

بکھ وادی کی طرف چل دیا۔ میں ابھی تک محبت کی چاشنی سے ناآشنا
تھا۔ آج پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ میں اپنا دل اس لڑکی کو دے
چکا ہوں۔ جواں بخت کے ملاقات کے بعد میں اپنے ڈیرے پر واپس
آیا۔ تو مہ لقا کی جدائی کا دن بہت مجھے شاق گزرنے لگی۔ بہت
کوشش کی کہ اس کو بھول جاؤں۔ مگر دل نہ مانا اور آخر کار اپنے
کاروبار سے بد دل ہو کر زیادہ تر جواں بخت کے پاس رہنے لگا
جواں بخت میری اس تبدیلی پر متعجب تھا۔ لیکن میں نے بڑی
خوش اسلوبی سے اپنے عشق کا راز اس سے چھپائے رکھا۔
مہ لقا کی جھونپڑی جواں بخت کی وادی سے کچھ زیادہ دور نہ تھی
اس لئے اکثر اس سے ملاقات ہوتی رہتی تھی وہ اکثر جائے رہائش
دریافت کیا کرتی۔ مگر میں نے کبھی اس سے جواں بخت کا ذکر نہ کیا۔
اسے ہمیشہ اپنے ڈیرے کا پتہ دیتا۔ جو میرے کاروبار کا مرکز تھا
یہ سن کر وہ بدگمانی سے منہ پھیر لیا کرتی۔ کیونکہ وہ ڈیرا یہاں سے
تقریباً دو سو میل کے فاصلے پر تھا — ایک دن جبکہ میں اسے
اپنی محبت کا یقین دلا رہا تھا۔ وہ بے اعتباری سے کہنے لگی۔
"تمہاری محبت کا میں کیسے یقین کر سکتی ہوں جب کہ تم اپنی جائے
رہائش تک مجھ سے چھپا رہے ہو" ندامت سے بے ساختہ یہ
کلمہ میرے منہ سے نکل گیا "دوسرے کا راز میں نہیں
بتا سکتا" میرے اس جواب پر وہ اپنی حسین آنکھوں میں آنسو بھر
کر بولی کہ آپ مجھے ایک بد قماش لڑکی سمجھتے ہیں۔ کیا میری ذات سے
کسی کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے — درحقیقت آنسو عورت کا
زبردست ہتھیار ہے۔ جسے دیکھ کر مضبوط سے مضبوط ارادے کا
مرد بھی زیر ہو جاتا ہے — آہ — میں بھی ان صدقات کو ہر بار —
کو دیکھ کر بے تاب ہو گیا اور ان خوشنما آنسوؤں نے مجھے مغلوب کر لیا
افسوس میں نے اپنا مقدس عہد توڑ کر اسے وادی کا راز بتا دیا۔

(۵)

رات کسی ماہ جبیں گنہگار کے دل کی طرح تاریک تھی جس کی
کثافت سے کائنات دھواں دھار ہو رہی تھی۔ تیسری تاریخ کا
ننھا سا چاند افق کی تاریک گہرائیوں میں کھو چکا تھا تارے سیاہ
بادلوں میں گم ہو چکے تھے — تمام دنیا ایک سیاہ دیو کی مٹھی میں
بند معلوم ہوتی تھی جواں بخت اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا

مگر میری آنکھوں میں نیند مفقود تھی ایک نامعلوم خطرہ مجھے
قریب تر معلوم ہو رہا تھا۔ کسی مبہم خوف سے میرا دل دھڑک
رہا تھا۔ میں جسمی اذیت محسوس کرتے ہوئے اپنے کمرے میں
بے چینی سے چکر لگا رہا تھا — آدھی رات کے قریب ایک
گرجدار آواز سے تمام وادی گونج اٹھی۔ اس گرجدار آواز
سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ آہ یہ اس حبیب قہار کے
کی آواز تھی جس پر خطرے کے وقت چوٹ پڑتی تھی —
خطرے کے الارم پر تمام قبیلہ بیدار ہو گیا۔ جواں بخت کے گھر
میں کھلبلی مچ گئی۔ اس نے نہایت عجلت سے ہتھیار لگائے
اور مقابلے کے لئے تیار ہو گیا — یکدم رہزنوں کا ایک بہت بڑا
گروہ جواں بخت کے محل پر ٹوٹ پڑا۔ وہ کمال بہادری اور
جوانمردی سے لڑا مگر رہزنوں کے ٹڈی دل کے سامنے اس کی پیش
نہ گئی۔ وہ مجروح ہو کر گر پڑا۔ رہزنوں نے اس کے ساتھ ہم سب
کی مشکیں کس لیں۔ اور ہمیں برق رفتار گھوڑوں پر لاد کر وادی سے
نکال لے چلے۔ ابھی وادی سے نکلے ہی تھے کہ جواں بخت کا باقی
قبیلہ تعاقب کرتا ہوا آ پہنچا۔ چند میل کے فاصلے پر دونوں لشکر
آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ ادھر میدان کارزار گرم ہو رہا تھا۔
ادھر ہم قیدیوں کو ایک غار میں پہنچا دیا گیا۔ غار میں اندھیرا چھایا
تھا اور ایک بپھرے ہوئے شیر کے پنجرے کے قریب ایک
عورت کھڑی تھی — اس عورت کو دیکھ کر میں حیرت و استعجاب
سے اچھل پڑا — آہ وہ مہ لقا تھی — وہ غصے سے دانت پیس
رہی تھی۔ حالت غیظ میں اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل
رہی تھیں۔ ایک کونے میں وہی خوش پوش مسافر کھڑا تھا۔
جو کبھی مجھے سرائے میں مل چکا تھا۔ جس نے مہ لقا کا اشارہ پا کر
جواں بخت کی مشکیں کھولیں اور اسے خوفناک شیر کے پنجرے
میں ڈال دیا بھوکے شیر نے آناً فاناً جواں بخت کو اپنے مضبوط
جبڑوں میں دبوچ کر ہلاک کر دیا — عین اسی وقت رہزنوں کے
لشکر میں بھگدڑ مچ گئی اور حملہ آور مار دھاڑ کرتے ہوئے غار کے
قریب پہنچ گئے۔ خطرے کو بھانپ کر مہ لقا فوراً غار سے باہر نکلی
اور اپنی جماعت سمیت جنگل میں غائب ہو گئی۔ حملہ آور جب غار
میں داخل ہوئے تو انہیں جواں بخت کا حسرتناک انجام دیکھ کر

لرزہ طاری ہوا۔ اس کی لاش واپس وادی میں لائی گئی۔ جہاں نہایت احترام سے اسے سپردِ خاک کیا گیا۔ چالیس دن تک ملک کا قبیلہ سوگوار رہا۔ آخر چالیسویں کی رسوم پر جبکہ تمام قبیلہ جمع تھا نیم عریاں کاہن نے کہا۔ بھائیو میں یہ نہیں جاننا چاہتا کہ تم میں سے غدار کون ہے۔ لیکن تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ غدار سزا سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ تم اک مقدس غار پر جواں بخت سے وفاداری کی قسم اٹھا چکے ہو۔ اور یہ کوئی معمولی چیز نہیں۔ جواں بخت کی عمر اس وقت پچاس سال کے قریب تھی اس لئے پچاس سال کے عرصہ میں غدار پر اس مقدس قسم کی لعنت پڑے گی اور وہ شیر کے ہاتھوں ہلاک ہوگا۔ نیم عریاں کاہن کے اس اعلان سے سب کے دل دہل گئے — کاہن کے ان الفاظ کا مجھ پر خاص اثر ہوا۔ مگر حوصلہ کر کے دل کو برقرار رکھا اور دوسرے دن اپنے ڈیرے کی طرف واپس ہوا۔ میں مجرم تھا۔ میرا سکونِ قلب رخصت ہو چکا تھا۔ اب تجارت میں بھی میرا دل نہ لگا میں تجارت چھوڑ کر اپنے دیس چلا آیا۔ چونکہ جواں بخت کی بدولت میں نے بے شمار دولت کمائی تھی میں امیرانہ زندگی بسر کرتا رہا لیکن میرا دل کبھی مطمئن نہ ہو سکا۔ اس نیم عریاں کاہن کے الفاظ ہمیشہ میرے کانوں کو گونجتے رہے۔ اب جس دن سے میرا پچاسواں سال شروع ہوا ہے۔ خوف سے مجھے زندگی وبال ہو گئی ہے رات کو شیروں کے دھاڑنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ شیروں کے خوفناک سائے دیواروں پر متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ اکثر ملک الموت کے سرد پاؤں کی چاپ محسوس کرتا ہوں۔ روحیں میرے اردگرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ جواں بخت کی کفن پوش لاش مجھے اشارہ سے بلاتی ہے۔ اور اسی خوف سے گوشہ نشین ہو رہا ہوں —

حیدر کی داستان سن کر میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ تمہیں وہم ہو گیا ہے۔ ورنہ ایسی قسمیں کچھ حیثیت نہیں رکھتیں اور نہ ہی تم نے جان بوجھ کر غداری کی۔ ایسی فضول قسموں کا خیال نہ کرو۔ یہاں شہر میں شیر کہاں سے آئے گا۔ میں بہت دیر تک اسے سمجھاتا رہا۔ ۱۰ بجے کے قریب میں اٹھا۔ میرا خیال تھا کہ سلیم ۱۱ بجے تک سو رہا ہوگا۔ میں لائبریری کی طرف گیا۔ تو وہ کرسی پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا۔ ابا میں نے چچا کی تمام باتیں سنی ہیں وہ بہت ڈرپوک ہے۔ میں نے اسے آہستہ سے ڈانٹتے ہوئے کہا سلیم ایسا نہیں کہا کرتے۔ وہ شوخی سے بولا۔ وہ درحقیقت بہت ڈرپوک ہے۔ دیکھو میں نے اسے ڈرانے کے لئے دیوار پر کیا بنایا ہے — میں نے دیوار کی طرف دیکھا سلیم نے اس پر اپنی رنگین پنسل سے ایک بہت بڑے شیر کی تصویر بنائی تھی۔ تصویر کو دیکھ کر میں بے اختیار ہنس دیا۔ اور اسے ساتھ لے کر باہر نکل آیا۔

(۶)

چونکہ رات کو میں دیر سے سویا تھا۔ اس لئے صبح دیر سے آنکھ کھلی تھی۔ ابھی میں بستر میں ہی تھا کہ حیدر کی موت کی خبر پہنچی۔ اسے رات کو کسی درندے نے ہلاک کر دیا تھا۔ میں اس وقت حیدر کے مکان پر پہنچا۔ وہاں پولیس جمع تھی۔ حیدر کی لاش بستر پر نہایت ابتر حالت میں پڑی تھی۔ اس کی شاہرگ کے قریب ایک بہت بڑا گہرا زخم تھا۔ اور کسی درندے کے خون آلود پنجے بستر کی سفید چادر پر صاف نمایاں تھے — میں سراسیمگی سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا لائبریری میں جا نکلا۔ اچانک مجھے سلیم کی بنائی ہوئی تصویر کا خیال آیا۔ مگر دیوار کی طرف دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ سلیم کی بنائی ہوئی شیر کی تصویر دیوار سے غائب تھی۔

پنڈت رتن پنڈوروی کی مایۂ ناز تصنیف

ہندی کے مسلمان شعراء

قیمت ۔/۵۱ روپے

اب ختم ہو رہی ہے۔ چند کاپیاں باقی ہیں۔

آل انڈیا مشاعرہ دیوبند

گوشۂ تفصیل صدیقی

کیفی الاعمانی

دیوبند (سہارنپور) میں میلہ کی دیگر تقریبات کے سلسلے میں ہر سال ایک آل انڈیا مشاعرہ بھی منعقد ہوتا ہے۔

دیوبند شہرِ علم ہے۔ یہاں کے علماء، فضلاء، شعراء اور بادہ حیانِ علم و ادب و حکمت میں ایک مقام رکھتے ہیں۔

دیوبند میں دارالعلوم دنیائے اسلام کا ایک تابندہ اور درخشاں ستارا ہے۔ دارالعلوم میں بھی طلباء کی کئی ادبی انجمنیں ہیں آج اسی گہوارۂ شعر و سخن، شہرِ ادب اور مرکزِ علم و حکمت میں یہ مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے۔ آج ۱۱ اپریل ۱۹۸۵ء کی شب ہے۔ لاہوا جاتے ہیں جناب حبیب صدیقی منیجر مسلم فنڈ صدارت کے لئے جناب محترم بی کے گوسوامی کمشنر میرٹھ ڈویژن کا اسمِ گرامی پیش کر رہے ہیں۔ ٹھاکر ملکھان سنگھ جی تائید کر رہے ہیں۔ اور کمشنر صاحب تالیوں کی جھنکار میں مسندِ صدارت پر جلوہ افروز ہو گئے ہیں۔ اس مشاعرہ کے کنوینر انور دیوبندی انور جلالپوری کو دعوتِ نظامت دے رہے ہیں لیجئے پھر تالیوں سے پنڈال گونج اٹھا ہے انور صاحب نے کمشنر صاحب سے چند کلمات فرمانے کی درخواست کی ہے۔ کمشنر صاحب نے اردو کے بارے میں نہایت ہی مؤثر انداز میں اس کی اہمیت پر زور دیا فرمایا:-

"میں نے اردو زبان شروع کی تھی اسی وقت سے مجھے شوق تھا۔ آپ نے مجھے اس مشاعرہ میں یاد کیا میں آپ کا شکر گزار ہوں"

وہ دیکھئے انور جلالپوری دیوبند کے ایک نوعمر شاعر ماجد صدیقی کو یاد فرما رہے ہیں۔ ماجد صاحب کسرِ نفسی کا مظاہرہ کر رہے ہیں میں تمہید باندھ رہا ہوں آنے والے مہمان کا کلام سننے کے لئے آیا ہوں پھر ارشاد ہوا یہ ہمارا المیہ ہے ؎

یہ سچ ہے کوئی بھی منزل یہاں قریب نہیں
مگر ہمارا تعاقب مرے ... نصیب نہیں

ماجد صاحب نے سب سے پہلے تو المیہ کا نام لیا۔ حیرت ہے کہ ماجد صاحب اسی ملک میں شہرت کی طرف گامزن ہیں۔ ہر قسم کی مراعات میسر ہیں، پھر بھی منزل نہ پانے کی شکایات اور عزم جواں حاصل نہ ہونے کی بات کر رہے ہیں۔ منزل گھبرا نے سے نہیں ملتی۔ اور عزم جواں سے کام لیجئے تو منزل خود قدم چومے گی۔ پھر اسی تنگ نظری کو ملاحظہ فرمایئے ؎

جس چمن کے مہکتے پھول ہیں ہم
اس چمن ہی میں کیوں فضول ہیں ہم

میں نے چیخ کر کہا سرحد پار کر جائیے اس پر میرے پاس بیٹھے ہوئے ٹھاکر ملکھان سنگھ جی چونکے ٹھاکر صاحب اردو کے پرانے شیدائی اور مجاہدِ آزادی ہیں سنئے ؎

ہم خزاں کو بھی کہہ رہے ہیں بہار
اس لئے آپ کو قبول ہیں ہم

آیئے چھوڑیئے اس مغلوب ذہنیت کو اور سلیم گنگوہی کو سنئے ؎

خود کو جو تھکتے نہیں جادو بیاں کہتے ہوئے
میں تو ڈرتا ہوں انہیں اپنی زباں کہتے ہوئے
عشق کی پُرخار راہوں کو سمجھ کر فرشِ گل
میں نے طے کی ہے کسی کی داستاں کہتے ہوئے

سلیم صاحب کی طبیعت خراب ہے جو شعر سنانے کا تھا وہ بھول گئے سنئے ؎

وحشتِ صیاد طاری ہے دلوں پر اس قدر
لوگ ڈرتے ہیں خزاں کو بھی خزاں کہتے ہوئے

اختر تلالپاری تالیوں کی جھنکار میں آکر فرما رہے ہیں ؎

اب یقیں یہ کر گھر سے نہیں نکلنا ہے
خود اپنی راہ بنانا ہے اور چلنا ہے
دیارِ شب میں اُجالے بکھیرنے کے لئے
تمام عمر چراغوں کی طرح جلنا ہے

آہ اور واہ کا شور کم ہوا تو ارشاد ہوا ہے ؎

گستاخی ہوئی پھر کوئی صدا آئے گی
کھول دو بند دریچوں کو ہوا آئے گی
آسمانوں کی طرح خود کو سمجھنے والو
ہوش اُڑ جائیں گے جب وقت قضا آئے گی
راہ پُرخار میں جب کوئی بھی ہمراہ نہ ہو
ساتھ دینے کے لئے ماں کی دعا آئے گی

اختر صاحب پنڈال میں گرمی پیدا کر کے کامران پلٹ رہے ہیں دیکھا تو چند خواتین بسر تمام گندگی واضح تصویر۔ ملک زادہ جاوید اختر فرما رہے ہیں ؎

آئے بڑھنا ہو تو حوصلہ چاہیئے
پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہیئے
ڈگریوں سے کہاں ملتی ہے نوکری
جس جگہ جائیے تجربہ چاہیئے
گھر سے نکلو نہ باہر صدا کے لئے
روز اخبار کو حادثہ چاہیئے

واہ شباب پر ہے اور آپ اسی پُروقار انداز سے گرج رہے ہیں ؎

تم کو دولت سے محبت نہیں ملنے والی
نوکِ تلوار سے طاقت نہیں ملنے والی
[illegible]
قتل ہونے سے شہادت نہیں ملنے والی

پہلی بار پنڈال میں ایک دھماکہ ہوا ہے۔ ارشاد ہوا ہے ؎

بے رخی اپنے بزرگوں کا رویہ ہے یہاں
ہم کو اس شہر میں عزت نہیں ملنے والی

دیوبند علم و حکمت کا مرکز ہے جاوید صاحب کی خوب خوب پذیرائی ہو رہی ہے شاعر کرا دو کیا چاہیئے لہٰذا آپ کس جمے ہوئے ہیں فرما رہے ہیں ؎

گھر نصیب ہو کوئی نہ سائبان رہے
یہی بہت ہے مرے سر پہ آسمان رہے
مری غزل کے شوالے میں کیرتن بھی ہو
ترے پڑوس کی مسجد میں بھی اذان رہے

پھر واد نے ہنگامہ کا روپ دھار لیا ہے کئی بار دہرا کر جاوید صاحب اپنی جگہ آ رہے ہیں اور اس عالم میں گلابی ساری زیب تن کئے ترنم کا پودی آکر یوں ترنم سے رنگِ محفل بدلنے چلی ہیں ؎

کرب ایک سوداگر قہر کا سبب ٹھیرا
فرد نے خطا کی تھی قوم نے سزا پائی

شعلہ سی لپکتی آواز —— گلابی ساری میں مجسم غزل —— غزل ہر اعتبار سے ذوق اور اللہ واللہ بس کچھ نہ پوچھئے پنڈال میں کیا سماں بندھا ہے۔ خدا نظر بد سے بچائے۔ پھر پنڈال کو گرما رہی ہیں ؎

مظلوموں کے دل کا ہر نالہ تاثیر میں ڈوبا ہوتا ہے
ظالم کو خبر کر دے کوئی انجام ستم کیا ہوتا ہے
[illegible]
جو تیغ کے سائے میں ہو ادا سجدہ وہی سجدہ ہوتا ہے

یہ شہر حریت پسند مجاہد کہا جاتا ہے [illegible] مجاہدوں نے جناب آزادی کے لئے جہاد کیا ہے۔ یہ شعر خوشگوار کم ہوا تو لہک رہی ہیں ؎

گلشن میں نشیمن کو میرے یہ کہہ کے جلایا مالی نے
جب کوئی نشیمن جلتا ہے گلشن میں اجالا ہوتا ہے

لیجئے یار لوگ تالیوں پر اتر آئے ہیں ایک اور ایک اور کا ہنگامہ سا ہنگامہ ہے ؎

وہ بھی دن بھی آجائے گا۔ لوٹنے والوں کو لوٹا جائے گا

کیا شستہ مطلع ہے —— ہلال سیوہاروی —— اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا ہے اور آپ یوں پنڈال کو لوٹنے چلی ہیں ؎

آؤ طوفاں سے ٹکرا کے چلیں — بعد میں جو ہوگا دیکھا جائیگا

اور آپ محفل کا رنگ بدل کر تالیوں کی گڑگڑاہٹ مائیک سے جدا ہو رہی ہیں دیکھا تو گلن بھارتی گرج رہے ہیں ؎

گوتم کے مہاویر کے گاندھی کے وطن میں
دعویٰ ہے کہ نفرت کا خدا پاش رہے ہیں
سچائی مگر یہ ہے اہنسا کے پجاری
وحشی کی طرح سب کا گلا کاٹ رہے ہیں

واہ اس قطعہ کا حق ہے لہٰذا واد تالیوں سے دی جا رہی ہے۔ ہم

آپ نے ایک طویل نظم سنائی۔ آپ کے بعد صادق صابری نے ایک کامیاب اور طنزیہ نظم پیش کی اور پاپولر میرٹھی محفل کو قہقہہ زار بنا کر چلتے بنے۔ انور جلالپوری پنڈال کا رنگ یوں بدلنے چلے ہیں ؎

سکوں نصیب نہ ہوگا فضا کہیں کی بھی ہو
گھٹن ضرور ملے گی ہوا کہیں کی بھی ہو
وہ گیسوؤں سے اٹھے یا سمندروں سے اٹھے
برسنا اس کی ہے قسمت گھٹا کہیں کی بھی ہو
ہمارے زخم۔ کریدے گی اور ہوا دے گی
چمن کی دشت کی، بادِ صبا کہیں کی بھی ہو
لہو کے رنگ سے رشتہ نہ توڑ پائے گی
ہتھیلیوں میں کسی کے حنا کہیں کی بھی ہو

انور صاحب داد تو ہر حال میں لے ہی لیتے ہیں داد و تحسین وصول کرکے ہمسر قادری کو دعوتِ سخن دے رہے ہیں۔ ہمسر صاحب فرما رہے ہیں ؎

مجھ پر جو کوئی چشمِ عنایات نہیں ہے
شائد مری تصویر مرے ساتھ نہیں ہے

میں نے نقادِ اعظم عزیز کاظمی سے دریافت کیا یہ چشمِ عنایات کوئی ہے ساتھ ہوا ہے لہ نہیں نبھا۔ کیوں انھوں نے اس مرحلہ پہ چشم پوشی کی ارشاد ہوا ہے ؎

مشکل ہے حقیقت پہ کوئی تبصرہ کرنا
افسانہ بنانا کوئی دشوار بات نہیں ہے
تو پرسشِ حالات سے پہلے یہ بتا دے
کیا میری تباہی میں ترا ہاتھ نہیں ہے

میں نے عرشی صاحب کو حضرت احسان دانش مرحوم کا ایک شعر سنایا ؎

کس کس کی زبان رُک کے جاؤں تیری خاطر
کس کس کی تباہی میں ترا ہاتھ نہیں ہے

دیکھا تو راغب عالم مظفر نگری غزل الاپ رہے ہیں ؎

واعظ کو بھی شرمندۂ احسان کیا ہے
اک بت نے ہمیں آج مسلمان کیا ہے

پھر عرشی صاحب شرمندۂ احسان پر صرف مسکرا دیئے اور عالم صاحب یوں خوش گلوئی کا مظاہرہ کر رہے ہیں ؎

پھر وعدہ وفا کر کے کسی وعدہ شکن نے
پوچھو نہ ہمیں کتنا پشیمان کیا ہے

چھا گا رہے ہیں ـــ ایک آواز ـــ چھا گئے لا ئے ـــ دوسری آواز ـــ داد بھی شباب پر ہے لپک رہے ہیں ؎

کیا سوچ کے ڈالا ہے مری لاش پہ آنچل
کمبخت نے احسان پہ احسان کیا ہے

عالم صاحب دوسری غزل بھی سنا کر خوب خوب داد وصول کئے اپنی جگہ آ رہے ہیں۔ اور اب فرحت احساس عنایت کر رہے ہیں ؎

ہمارے قتل پہ چپ کیوں ہے اے زمینِ وطن
تو کیسی ماں ہے جو بچوں کا سر گنا تی ہے
جو حادثات کے ڈر سے گھروں میں بیٹھے ہیں
انہیں تباہ کرگھر میں بھی موت آئی ہے

اب داد کا عالم نہ پوچھئے اور آپ انورؔ سنجیدگی سے فرما رہے ہیں ؎

شہر میں امن کا دستہ جو ہوا ہے تشکیل
اس میں شامل ہیں مرے گھر کے جلانے والے
آگ کی نذر سے جو سامان بچا تھا گھر میں
لوٹ کر لے گئے سب آگ بجھانے والے

لیجئے تالیوں نے پنڈال کا رنگ ہی بدل دیا ہے داد و تحسین پاکر ماہیک سے جدا ہو رہے ہیں اور علامہ انور صابری کے صاحبزادے اظہر صابری گرج رہے ہیں ؎

اس دَور میں تم دولت کمال ڈھونڈ رہے ہو
تپتے ہوئے صحرا میں اماں ڈھونڈ رہے ہو

مقامی سیاست انجمن کرتے ہیں بار بار سامنے آئی لیڈر منہ پھیر کے خرمستی پر اتر آئے ہیں، اور اظہر صاحب جھجک آئے ہیں یہ اچھا ہی ہوا ویسے آپ مشاعروں سے دُور رہتے ہیں لیکن اصرار پر سنانے آ گئے تھے آئیے اب ساغر خیامی سے یہ قطعہ سنیئے ؎

مفلسی کے شکار ہوتے ہیں　　　اک کمبل میں چار ہوتے ہیں
کھینچ لے جائے پانچواں نہ کہیں　　　سب کے سب ہوشیار ہوتے ہیں

یوں ہی قطعات رواں دواں سنا کر چلتے بنے آئیے دیوبند کے ایک ان پڑھ شاعر شمیم انصاری سے بھی کچھ سنیئے ؎

بڈھے سے کہہ دیا تھا کہ مجھ کو خوشی ہوئی

بس پھر رہی ہے گردشِ دوراں چھنگی ہوئی
چھنگی ہوئی شعرائے کرام والہانہ داد دے رہے ہیں اور شمیم صاحب یوں گلوخلاصی کر رہے ہیں۔ ؎

اپنی شبِ وصال ہوئی اتنی مختصر
اس نے نقاب اٹھایا تو سورج نکل گیا

پھر داد شباب پر ہے اور آپ مائیک سے کھسک رہے ہیں دیکھا تو مونس بریلوی تالیوں کی جھنکار میں آکر سنجیدگی سے عنایت کر رہے ہیں ؎

اک سال عمر اور بڑھی، زندگی سے گھٹ
دیوار سے پرانے کلینڈر اتر گئے
مقتل میں میرے سر کی بلندی کو دیکھ کر
قاتل کے تیور چڑھے ہوئے تیور اتر گئے

جس متانت سے مونس صاحب سحر کاری کر رہے ہیں اسی شان سے داد کے ڈونگرے بھی برس رہے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے ؎

ایسا ممکن تو نہیں ہے ایسا بھی ہو سکتا ہے
اب کے جو ساون آیا ہے پیاسا بھی ہو سکتا ہے
دیوانہ دیوانہ جاکر زندہ بچے ہو سکتا ہے
کل کا راجہ آج بھکاری جیسا ہو سکتا ہے
پورا سمجھ کر جس کو تم نے مار دیا بستی والو
وہ پردیسی میرا جیسا بھولا بھی ہو سکتا ہے

اب داد دینے والے تالیوں پر اتر آئے ہیں اور آپ فرماتے ہیں ؎

اب کے مناسب دام لگے تو بیچ ہی دونگا اپنا ضمیر
ورنہ اس سودے میں ایک دن گھاٹا بھی ہو سکتا ہے

مونس صاحب محفل کو تحت سے گرما کر تالیوں کے شور میں مائیک چھوڑ رہے ہیں اور حفیظ میرٹھی تالیوں کی جھنکار میں آکر عطا کر رہے ہیں ؎

اک دور بے ضمیر نے جینا سکھا دیا
حالات نے ہمیں بھی منافق بنا دیا

داد عطری کی سے شباب پر ہے اور آپ فرما رہے ہیں ؎

جینے تو دے مجھے نہ مرنے ہی دے مجھے
مجھ کو جلا دیا کبھی مرہم لگا دیا ...

سامنے والے وہاں حفیظ صاحب کی زبان اور مقام نہ سمجھ سکے داد دینے کا انداز وہی بازاری قسم کا تھا لہٰذا حفیظ صاحب مائیک چھوڑ کر پلٹ آئے ہیں۔ اندرون محفل شور و سخن جوش و فار کا داخلہ ممنوع ہے آج مشاعروں میں صرف سازندوں کی کمی رہتی ہے۔ ورنہ نہ جانے کتنے مسخرے۔ بھانڈ۔ گلوکار اس صف میں شامل ہو گئے ہیں۔ دیکھئے ہلال سیوہاروی فرما رہے ہیں ؎

بجٹ کے بعد جیسی ہم نے مہنگائی نہیں دیکھی
جو سچ پوچھو تو سر پر ہاتھ کا تو سینہ چھن گیا یارو
سکڑ گیا تیل راتوں کو بجلی ہی نہیں آئی
اندھیرے میں پیٹ بتا ہے جیسا بن گیا یارو

ایک شور سا شور اور غل غپاڑہ ہے اور ہلال صاحب داغ رہے ہیں ؎

کیوں مر رہے تھے لوگ الیکشن کے نام پر
کیا مل گیا عوام کو دونوں کے کھیل سے
دیکھا کیئے تھے مرکزی بلبوں کے روز خواب
محروم ہو کے رہ گئے مٹی کے تیل سے

پھر ہادروا کا ایک پنڈال شکن دھماکہ ہوا ہے اور آپ ایک طویل نظم سنا کر فرمائشوں کو نظر انداز کر کے چلتے بنے ادھر دیوبند کے ایک ابھرتے اور مترنم شاعر نواز خاں نواز غزل سرا ہیں ؎

رنج دے کے کیوں آخر مسکرا نہیں دیتے
تم سزا تو دیتے ہو، حوصلہ نہیں دیتے
منزلیں تو خود اپنے ہی عزم سے ملتی ہیں
رہنما سافر کو راستہ نہیں دیتے
اب تو مان لیجئے وقت کا یہ فتویٰ ہے
حق طلب تو کرتے ہیں حق ادا نہیں کرتے

نواز صاحب پنڈال کو گرما کر داد لوٹ کے اپنی جگہ آرہے ہیں۔ ادھر ایک اور ایک اور کا ہنگامہ بپا ہے پھر پنڈال کو چونکا رہے ہیں ؎

تیغ اپنی جگہ وار اپنی جگہ ہر حقیقت کو ظاہر اپنی جگہ
بھائی سے بھائی کی کچھ تقاضے بھی ہیں آنگن کے بیچ دیوار اپنی جگہ

لیجئے اب پنڈال میں بھونچال سا آیا ہے کئی بار دہرا کر خود بھی جھوم رہے ہیں ؎

اب کھنڈر میں کھنڈر ہی کھو دو دستو شیش محلوں کے آثار اپنی جگہ

مختصر یہ تھا سر کیف کون تھا ... جیت اپنی گی۔ ... اپنی جگہ
خمار صاحب تالیوں کے بے ہنگم شور میں شاداں لوٹ رہے ہیں
پھر ... ملک کو داد اکٹھا کرنے کے لئے ایک مختصر سی مترنم شاعرہ
... سلطانہ آکر یوں خوش گلوئی کا مظاہرہ کر رہی ہیں ہے

کوئی بھی منتا ہوا نظر نہیں آیا
گیا جب سے یہاں لوٹ کر نہیں آیا

دوسرے مصرعہ پر بار لوگ اور من چلے زیادہ اچھل کود کر رہے ہیں
تبھی بار دگر آکر اپنی دلکشی سے پنڈال کو گرمانے چلی ہیں ہے

وفا شعار تجھے جانتے ہیں سب لیکن
نہ جانے کیوں ترا مجھ میں اثر نہیں آیا
تم اپنے آپ کو الفت شناس کہتے ہو
یہی تو تجھ کو ابھی تک ہنر نہیں آیا
کسی نے خاک اڑائی ہے بدگمانی کی
زمانہ بیت گیا وہ ادھر نہیں آیا

یوں آداب مشاعرہ بالائے طاق رکھ کر داد کو ہنگامہ اور ہلڑ بازی کا
روپ دیا جا رہا ہے اور آپ لہک رہی ہیں ہے

گھروں میں کرتے ہیں ہم جو ان کا سب اظہار
نظر کوئی بھی مگر وار پر نہیں آیا

تاج صاحبہ پنڈال میں نغمگی بکھیر کر کامران لوٹ رہی ہیں اور
لکھنؤ کے معتبر غزل گو شاعر کرشن بہاری نور اپنے مخصوص انداز
سے عطا کر رہے ہیں ہے

نظر ملا نہ سکے اس سے اس نگاہ کے بعد
وہی ہے حال ہمارا جو ہو گناہ کے بعد
میں کیسے اور کسی سمت موڑتا خود کو
کسی کی چاہ نہ تھی دل میں مری چاہ کے بعد
ضمیر کانپ تو جاتا ہے اب کچھ نہ کچھ
وہ ہو گناہ سے پہلے کہ ہو گناہ کے بعد

اب داد کا عالم نہ پوچھئے۔ ارشاد ہوا ہے ہے

لب کی ہنسی سے دیدۂ تر تک ایک کہانی بیچ میں ہے
اس منظر سے اس منظر تک ایک کہانی بیچ میں ہے
ایسے ہی حصوں میں بٹا ہوں جیسے کسی ناول کے بعد
عزم سفر سے ختم سفر تک ایک کہانی بیچ میں ہے

تو ہما صاحب خوب خوب داد لوٹے مائیک سے جدا ہو رہے ہیں
اور جمیں صاحب کو کنسٹر صاحب پنڈال کو شاندار مغلیہ طرز پر بنانے
اور سجانے پر ایک شیلڈ عطا کر رہے ہیں اس پر تالیاں جاگ اٹھی
ہیں غالباً یہ بلی ... یا اصلاحیت اور باشعور ہمیتی نے جہاں مشاعرہ کو
لہو لعب سے پاک و صاف کیا ہے وہاں پنڈال بھی مغلیہ طرز سے
آراستہ کر دیا گیا ہے یوں اسی محفل غزل میں لوٹ چلئے اور ایک حسین
غزل اعجاز شمیم پوری سے سنئے ہے

کچھ بھی ہو لیکن اے دل تیرا کہا نہ ہو گا
ہم لوٹ آئیں گے گر وہ در کھلا نہ ہو گا
اہل خرد نہ الجھیں اہل جنوں سے ورنہ
ہم ضد پہ آگئے تو ہم سے برا نہ ہو گا
ہم نے تو اپنی کشتی طوفاں میں ڈال دی ہے
اب یہ خدا ہی جانے کیا ہو گا کیسا نہ ہو گا

اس شعر پر پھر تمام قیود اور تمام بندشیں ختم۔ دوسرے مصرعہ پر شعرا
کرام بھی جھوم رہے ہیں۔ شمیم صاحب بھی عالم کیف میں ہو کے
نغمگی بکھیرنے چلے ہیں ہے

اب تشنگی بجھا دے رندوں کی ورنہ ساقی
یا آج ہم نہ ہوں گے یا میکدہ نہ ہو گا

شمیم صاحب ایک بڑی ہی اچھی غزل اور سنا کر پنڈال کو چونکا کر کامران اپنی
جگہ آرہے ہیں۔ ادھر شہریار غزل خمار بارہ بنکوی غزل سرا ہیں ہے

اب آنسو سنبھلتے نہیں ہیں سنبھالے
تمہاری امانت تمہارے حوالے
محبت سے انکار کرنے سے پہلے
لبوں کی یہ مجبوری گردش سنبھالے
خمار اب تکلس بجھے اپنا دل وہ
نہ ہو جوئے کشش سے اٹھا لے

خمار صاحب اور داد لازم و ملزوم لہذا خوب خوب داد و تحسین
پاکر مائیک سے جدا ہو رہے ہیں۔ ان کا نمبر ہی کچھ ایسے وقت
آیا جب کسل اور غنودگی سامعین پر طاری ہے اب چار بج رہے
ہیں پھر فرمائشوں کا دور شروع ہو گیا ہے میں بھی تھک کر چور۔ بوجھل

شاعرِ صیہون　جناب گرفین جونز شرر گجرانوالوی

(جوزف انور)

> "صیہون خدا کا وہ گھر ہے جس کا بنی اسرائیل کے ہاتھوں تعمیر کرنے کا پیغام دینے کے لئے خدا نے کوہِ سینا پر حضرت موسیٰ کو کہا تھا۔ داؤد بادشاہ نے خدا کے اس گھر کی تعمیر کا ارادہ کیا تو خدا نے اُسے روکا اور کہا کہ اس کام کو تیرا بیٹا کرے گا۔ چنانچہ جب سلیمان بادشاہ نے یہ گھر بنوایا تو خدا سے دعا کی کہ جب کبھی بنی نوعِ آدم اس گھر کی جانب رُخ کر کے دعا مانگیں اور اپنے گناہوں کا اقرار کریں تو اُن کی دعا سن لینا اور اُن کے گناہوں کو معاف کرنا اور انھیں تمام مصائب سے نجات بخشنا۔"

دنیا کے تمام مذاہب اپنے اپنے مختلف جغرافیائی اقسام و حدود کے باوجود اپنے اپنے دور میں بنی نوعِ انسان کو ایک فلسفۂ حیات پیش کرتے رہے ہیں [illegible] سے آگاہ [illegible] اسے ایک صراطِ مستقیم دکھانے کی سعیِ جمیلہ کرتے رہے ہیں اس لئے کسی بھی مذہبی ادب یا مذہبی تعلیمات پر مبنی ادب پر جو ایک مسلک ضابطۂ حیات اپنے نظامِ فکر میں منضبط کئے رہتا ہے کسی قسم کی رجعت پسندی کا لیبل لگا کر اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی بھی مذہب نہ تو قوتِ عمل کو ضعف پہنچاتا ہے اور نہ ہی قوتِ خیال پر معتقدات کی کھوکھلی بنیادوں پر توہمات تعمیر کرتا ہے۔ ہر ایک مذہب نیک و بد کے درمیان حدِ فاصل کھینچ کر انسان کی قوتِ متخیلہ کو دعوت دیتا ہے کہ وہ نیکی اور بدی کی شناخت کر کے اپنے لئے صحیح راستہ متعین [illegible]یا۔

منٹو اپنے مضمون "مذہبی ادب کے مسائل" میں فرماتے ہیں "جو لوگ مذہبی ادب کا نام لیتے ہیں وہ خود اسے کسی مخصوص مذہبی و دیگر مسائل کو ادب کے ذریعہ پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بلکہ زندگی سے متعلق مخصوص نقطۂ نظر کی تبلیغ کے لئے ادب کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ یہ اعتراض کہ مذہبی ادب، ادب نہیں ہو سکتا، درست نہیں۔"

اقبال نے اپنی شاعری سے اسلامی فلسفۂ حیات کی تبلیغ [illegible] دقیق ہوئیں بلکہ توہمات کی کھوکھلی بنیادوں پر کاری ضربیں لگائی ہیں۔

اردو شاعری نے جہاں مذہبی شاعری کی افادیت کو قبول و ایجاب کی سند عطا کی ہے تو اردو کے شعراء نے [illegible] مذہبی علامات کو اپنے فکر و نظر کی اساس بنا کر [illegible] ہر قدم پر ان کو استوار کیا ہے وہیں ان علامات [illegible] شاعری کے گیسوؤں کی مشاطگی کی ہے۔ اسی لئے جہاں [illegible] حرم کی گلکشت دیکھا، [illegible] ابنِ مریم، جہاں انہیں مثبت معنوں میں [illegible] استعمال ہوتے دیکھا، وہیں صلیب بھی محبت، ایثار، قربانی کی ایک ایسی مستقل علامت بن گئی کہ شاید ہی کوئی شاعر ہوگا جس نے صلیب کو اپنا موضوع نہ بنایا ہو۔ مشہور نقاد [illegible] عشرت [illegible] کا کہنا ہے کہ شاعری کی افادیت بے پناہ ہے۔ اس پُر آشوب دور میں جب کہ [illegible] اور کافرانہ عقائد، الحاد دین و مذہب بن کر رہ گئے ہیں [illegible] انسانوں کے اذہان اور قلوب [illegible] پر ایمان و یقین کی دعوت دینے کے لئے شاعر کو واعظ کے پہلو بہ پہلو کام کرنا چاہیے۔

اس نقطۂ نگاہ سے جب ہم جناب شرر صاحب کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو شاعر کو [illegible] اپنے جرح کی شکل میں پاتے ہیں جو اپنی قوم کی بے حسی و زبوں حالی پر ایک دردمند دل کی تڑپ لئے ہوئے ان کے [illegible] ناسور دلا

"وہ ہو گیا"

"دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ آج ایک مہر ابی سلیم کو سے کر انہیں کے دروازے سے پوچھا تھا"

"اچھا تو آج کچھ نہ کچھ ہو کر ہی رہے گا میں بھی ذرا دیکھ لوں کشن لال کون سی چال چلتا ہے"

"خدا آپ کی جان اور آبرو سلامت رکھے یہ ہندو روز بروز شیر ہوتے جا رہے ہیں۔

"چھوڑ دیجئے ان باتوں کو مولانا۔ افراد کی غلطی جماعت کی طرف منسوب کرنا عیب نہیں ویسا موت اپنے وقت پر آنے کی قسمت کا لکھا کوئی مٹا نہیں سکتا۔ دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تر است "، میں تو دنیا میں صرف اللہ سے ڈرتا ہوں اور کسی سے نہیں۔

"مگر حفاظت شرط ہے"

"بزدل کے لئے"

کچھ دیر تک دونوں خاموش رہے تھوڑی دیر کے بعد مولینا نے کہا ہاں تو جس غرض سے میں آیا تھا وہ تو میں نے کہا ہی نہیں، اور باتوں میں وقت کافی گذر گیا۔

"فرمائیے"

"مولانا نے جیب سے ایک ڈبیا نکالی اور اس سے ایک گلوری نکال کر منہ میں رکھ لی

حسین بخش نے پوچھا۔ آپ شاید مشرقی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں"

بس بس آپ نے منہ کی بات چھین لی۔ میاں صاحب ایسی حسین لڑکی آپ کی نظروں نے شاید دیکھی نہ ہوگی۔ والدین امیر نہیں لیکن لڑکی میں لعل رکھتے ہیں۔ شباب دشمن نے مل کر مشرقی کو دو آتشہ بنا ڈالا ہے۔ اگر آپ آتے ایک نظر دیکھ لیں تو کلیجہ تھام لیں۔ بس یوں سمجھ لیجئے شراب اور چاندنی مل کر انسانی سراپا بن گئی ہے"

"مگر وہ تو بیوہ ہے"

"نام کو صرف شادی ہوئی تھی ابھی رسم رخصتی باقی تھی کہ اس کا نامراد شوہر چل بسا۔ ایسی لڑکیاں قسمت والے ہی کو ملتی ہیں اگر آپ کہیں تو میں اسے پکی کر لیں"

"ابھی عجلت کیا ہے میں حج سے پہلے فارغ ہو لوں"

"مگر شادی حج سے مانع نہیں ہو سکتی"

"اپنے خاص دوستوں کی ہی رائے لینی ضروری ہے۔

"میں منع نہیں کرتا لیکن اتنی گزارش ضرور کروں گا کہ اگر آپ اجازت دیں تو کسی بہانے وہ لڑکی آپ کو ایک نظر دکھا دوں یعنی جنت کی کوئی حور ہے وہ"

"کیا نامحرم کو دیکھنے کی اجازت شریعت دیتی ہے"

"کیوں نہیں اگر کہئے تو میں وہ حدیث پڑھ دوں کہ خود آنحضور نے اپنے بعض صحابہ کو انہیں شادی سے پہلے ان کی منگیتر کو دیکھنے کی اجازت دی تھی۔

"اچھا تو اگر کشن لال اس لڑکی کو دیکھ آئے تو کیا ہے۔ کہیں میری خضاب آلودہ داڑھی نے غمازی کی تو۔۔۔۔؟

"میں آپ کے ارادے میں خلل اندازی تو نہیں کر سکتا مگر وہی شنیدہ کے بود مانند دیدہ"

"میاں حسین بخش ہنس دیئے۔ بالشت بھر داڑھی ہوا میں ہل ہل کر اپنی نورانیت کا اظہار کرنے لگی۔ سامنے کے دانتوں نے رار قاش کیا کر دی جو ان جیسی ہونی چاہیئے تھی۔ اور پھر خدا حافظ کہہ کر مولانا اٹھے اور اپنے گھر کی راہ لی اور حسین بخش ایک مرتبہ پھر نوشاہ بننے کا خواب دیکھنے لگے۔

اعلان بحکم پریس رجسٹرار حکومت ہند
فارم نمبر ۴ (دیکھئے رول نمبر ۸)

ایڈیٹر پرنٹر اور پبلشر کا نام :- ودیا پرکاش سرور
قومیت : ہندوستانی
پتہ : فلیٹ نمبر ۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج
نئی دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۲
نام اور پتہ مالک :- ودیا پرکاش سرور
فلیٹ ۲۰ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
میں ودیا پرکاش سرور تصدیق کرتا ہوں کہ جو حالات اوپر دیئے گئے ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں
یکم مارچ ۱۹۸۵ء
دہلی
ودیا پرکاش سرور
دستخط

کلینڈر

بابت ________ سنہ ۱۹۸۵ء

طریقہ:- اس کلینڈر میں جس ماہ کی تاریخ معلوم کرنی ہو، اُس ماہ کے نیچے دن دیکھئے اور پھر دن کے مقابلہ میں بائیں سمت تاریخ دیکھ لیجئے!

نوٹ:- آپ کو یہ معلوم ہی ہے اگر ماہ فروری ۲۹ دن کا نہ ہو تو ماہ فروری، مارچ اور ماہ نومبر ایک دن شروع ہوتے ہوتے ہیں۔ اور یکم اکتوبر کو ہمیشہ وہی دن ہوگا جو یکم جنوری کو ہوگا اور جس دن ماہ ستمبر شروع ہوتا ہے اُسی دن ماہ دسمبر کی پہلی تاریخ ہوا کرتی ہے۔ البتہ ماہ مئی، جون اور اگست الگ الگ دن سے شروع ہوتے ہیں اور کوئی "صدی" اتوار، بدھ اور جمعہ سے شروع نہیں ہوا کرتی اور یکم مئی میں ایک سال ۳۶۵ دن ۵ گھنٹہ ۴۸ منٹ اور ۴۸ سیکنڈ کا ہوتا ہے۔

:	۔ ۔	۔ ۔	فروری	:	:	۔					
جنوری	۰	اگست	مارچ	۰	ستمبر	جولائی					
اکتوبر	مئی	۰	نومبر	جون	دسمبر	اپریل					
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷					
منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر	اتوار	سوموار	۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹
بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر	اتوار	سوموار	منگل	۲	[illegible]	۱۶	۲۳	۳۰
جمعرات	جمعہ	سنیچر	اتوار	سوموار	منگل	بدھ	۳	۱۰	۱۷	۲۴	۳۱
جمعہ	سنیچر	اتوار	سوموار	منگل	بدھ	جمعرات	۴	۱۱	۱۸	۲۵	۰
سنیچر	اتوار	سوموار	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	۵	۱۲	۱۹	۲۶	۰
اتوار	سوموار	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر	۶	۱۳	۲۰	۲۷	۰
سوموار	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر	اتوار	۷	۱۴	۲۱	۲۸	۰

مرتبہ:- سلام ساگری - ساگر (ایم پی) ۴۷۰۰۰۲

برائے .... سنہ ۱۹۸۶ء

طریقہ:- اس کلینڈر میں جس ماہ کی تاریخ معلوم کرنی ہو اُس ماہ کے نیچے دن دیکھئے اور پھر دن کے مقابلہ میں بائیں طرف مطلوبہ تاریخ دیکھ لیجیے۔

نوٹ:- آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ اگر ماہ فروری ۲۹ دن کا نہ ہو تو ماہ فروری، مارچ اور ماہ نومبر ایک دن شروع ہوتے ہیں اور یکم اکتوبر کو ہمیشہ وہی دن ہوگا جو یکم جنوری کو ہوگا اور جس دن ماہ ستمبر شروع ہوتا ہے اُسی دن ماہ دسمبر کی پہلی تاریخ ہوا کرے البتہ ماہ مئی، جون اور اگست الگ الگ دنوں سے شروع ہوا کرتے ہیں اور کوئی "صدی" اتوار، بدھ اور جمعہ سے شروع نہیں ہوتی اور یہ بھی معلوم ہے ایک سال ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے ۴۸ منٹ اور ۴۸ سیکنڈ کا ہوتا ہے۔

———×———

٠	٠	٠	فروری	٠	٠	٠					
جنوری	مئی	اگست	مارچ	جون	ستمبر	اپریل					
اکتوبر	٠	٠	نومبر	٠	دسمبر	جولائی					
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷					
بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر	اتوار	سوموار	منگل	۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹
جمعرات	جمعہ	سنیچر	اتوار	سوموار	منگل	بدھ	۲	۹	۱۶	۲۳	۳۰
جمعہ	سنیچر	اتوار	سوموار	منگل	بدھ	جمعرات	۳	۱۰	۱۷	۲۴	۳۱
سنیچر	اتوار	سوموار	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	۴	۱۱	۱۸	۲۵	٠
اتوار	سوموار	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر	۵	۱۲	۱۹	۲۶	
سوموار	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر	اتوار	۶	۱۳	۲۰	۲۷	
منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر	اتوار	سوموار	۷	۱۴	۲۱	۲۸	

مرتبہ:- سلام ساگری - ساگر (ایم پی) ۴۷۰۰۰۲

کویت بزمِ سخن کا طرحی مشاعرہ

پروفیسر فرید قریشی سحر اکبرآبادی
جنرل سکریٹری کویت بزمِ سخن
کویت

کویت بزمِ سخن کے زیرِ اہتمام طرحی مشاعرہ جناب ایم۔ ذی خاں کے دولت کدہ پر منعقد ہوا۔ علامہ سیماب اکبرآبادی کا مصرع

؎ فطرت بھی میرے ساتھ مسلسل سفر میں ہے

طرحی مصرع دیا گیا تھا۔ سفارت خانہ پاکستان کے کونسلر جناب عبدالحق صاحب نے طرحی مصرع کی صدارت فرمائی اور عبدالستار غزالی سابق ایڈیٹر ڈیلی نیوز کویت مہمانِ خصوصی تھے۔

مشاعرہ کا آغاز تلاوتِ کلامِ پاک سے ہوا۔ اور راقم نے نعتِ رسول بارگاہِ سرورِ کائنات پیش کی۔ اس کے بعد جن شعرائے کرام نے طرحی کلام پیش کیا اُن کے کلام کا انتخاب حاضرِ خدمت ہے

عبدالحمید جوش

کس کا خیال کس کی تجلی نظر میں ہے
ہر ذرہ آفتاب ہے جو رہ گزر میں ہے
منزل سمجھ رہا تھا وہ منزل نہ تھی میری
خود بھول سفر میں یا میری منزل سفر میں ہے

طاہر کیفی

تصویر تارِ زلف کی تارِ نظر میں ہے
کیا ربطِ باہمی مرے شام و سحر میں ہے

باقی احمد پوری

میں یہ کہوں گا میرے سفینے سے ہے بھنور
میں کیوں کہوں کہ میرا سفینہ بھنور میں ہے
آؤ جنوں کا ہاتھ پکڑ کر چلے چلیں
یہ عقلِ بدگماں اگر میں مگر میں ہے

محبوب امین نجمی

آسودہ حال اپنے وطن ہی میں کب تھا میں
گردش بھی اپنے ساتھ مسلسل سفر میں ہے

عبداللہ ساجد

موسم کا رنگ، خوشبو گردِ سفر میں ہے
کوئی نہ کوئی درد ہر اک رہ گزر میں ہے

عبدالستار عاصی

کہنے کو کام وقت کی مقراض کر گئی
اونچی اڑان پھر بھی مرے بال و پر میں ہے

فرید قریشی سحر اکبرآبادی

تیرے تصورات میں ہر پل حیات کا
گزرا ہے اس طرح کہ ابھی تک سفر میں ہے
ساحل کے شور و غل میں اداسی کبھی نہ تھی
یہ کس کی آرزو کا سفینہ بھنور میں ہے

محمد حسین صدیقی

جھاڑ گیا دامن اپنے پلے کچھ دی بنیائیں
دردی درد رہ گیا دامن تر میں ہے
چاہن والے دامن دے لکھاں اے دی
مشاعرہ جیدی یا دو ج خان گے گھر میں ہے

حامد کرتارپوری

پی جاؤ اشک جو کہ تری چشمِ تر میں ہے
صد شکر چیز گھر کی ابھی اپنے گھر میں ہے

کمال اظہر

حسرت سے ایک صاحبہ یہ کہہ رہی تھی کل
بچوں کی ریں ریں تو قائم کے گھر میں ہے
کیوں شام ہی سے آج بجھا جا رہا ہے دل
کیا زیست کا چراغ ہوا کے اثر میں ہے

خورشید مظفر

بے چین برق گرنے کو کیوں چھت پہ ہے مری
معلوم ہر کسی کو ہے جو میرے گھر میں ہے

عبدالحمید نجم

صحرا میں ہے سکون میسر نہ گھر میں ہے
سودا عجیب اہلِ محبت کے سر میں ہے

. . . .

میں دربدر ہوں آج بھی وہ اپنے گھر میں ہے

نجم کاکی

گرچہ ہوا کے رُخ پہ ہے الزام بے رُخی
پر خاک کی بساط کہاں تو پہنچ میں ہے

نعیم پرکار

جکڑا گیا ہوں ایسے میں رسم و رواج میں
طاقت کہاں اُڑان کی اب بال و پر میں ہے

انجم کلیمی

میں نے تو اپنی کشتی بھنور میں اُتار دی

. . . .

گلشن حیدرآبادی

ضبطِ الم کی خامشی میرے گھر میں ہے
کتنا عجیب لطف ہے جو درگزر میں ہے

جنت الہ آبادی

افسانۂ وجود مرا ہر سطر میں ہے
میرا بیان قصۂ ہر مختصر میں ہے

طرحی دور کے بعد غیر طرحی دور میں جناب قمر پرکار۔ کنول جعفری اور رانا محمد حنیف نے اپنے غیر طرحی اشعار پر خوب خوب داد پائی۔

مشاعرہ کے اختتام پر صدر مشاعرہ جناب عبدالحق صاحب نے فرمایا کہ میں منتظمین بزم شعراء حضرات نیز سامعین کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے آپ نے اچھے اچھے اشعار سننے کا موقع دیا۔ طرحی مشاعرہ شعراء حضرات کے لئے اُن کی ذہنی کاوش کو ایک قسم کا چیلنج ہوتا ہے۔ مگر یہاں یہ بات دیکھنے میں نہیں آئی بلکہ شعراء ایک دوسرے کو قدر و احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ بڑی توجہ سے ایک دوسرے کا کلام سنتے اور فراخ دلی سے داد دیتے رہے۔ ہر غزل میں اگرچہ قافیے وہی تھے لیکن خیالات جدا جدا تھے جس کی وجہ سے غزل نئے تخیلات اور حرکات سے مالامال ہوتی ہے۔ لفظوں کی تکرار جسے غالب نے اپنے کلام سے قلم زد کر دیا مگر عاقل نے اسے قلم زد نہ کیا اور اُسے غزل کا حسن کہا۔ اس طرحی مشاعرہ میں لفظی تکرار اچھی لگی اور غزل کا حسن برقرار رہا۔

آج کا مشاعرہ سابقہ دو برسوں میں پہلا طرحی مشاعرہ ہے۔ جو سب مشاعروں سے زیادہ کامیاب اور مختلف نوعیت کا رہا۔

اچھے شعراء نے عمدہ اشعار بھی دوستانہ ماحول میں [illegible] اور اس سے جو پُرکیف ماحول پیدا ہوا وہ کافی لمبے عرصہ تک ذہنوں پر نقش رہے گا۔ آخر میں صاحب صدر نے پھر ایک سب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی تقریر کا اختتام کیا۔ صا صدر کی تقریر کے بعد مہمان خصوصی جناب عبدالستار غزا مشاعرہ پر اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہوئے کہا۔ کہ عبدالحق کی اتنی اچھی اور عمدہ نیز جامع تقریر کے بعد کچھ اور کہنے کی گنجائش نہیں پاتا۔ صرف اتنا کہوں گا کہ اس طرحی مشاعرہ میں شریک شعرائے کرام نے جو ذہنی اور فکری کاوشیں کی ہیں سب مبارک باد کے قابل ہیں۔ اس طرحی مشاعرہ کے انت پر میں جناب ایم۔ ڈی۔ خاں صاحب کو بھی مبارک باد کرتا ہوں۔

صاحب خانہ جناب ایم۔ ڈی۔ خاں صاحب نے فرمایا کہ ہم کو ادب کی جانب لے جاتا ہے اور ادب کا شعور سکھاتا ہے۔ سب کو مل جل کر رہنا چاہئے اور ادبی ماحول کو خراب نہیں کرنا ہمیں لازم ہے کہ ادبی محفلوں میں ذوق و شوق سے زیادہ سے زیادہ تعداد میں آئیں تاکہ چند لمحات خوشگوار ماحول میں گزار کر مسکراتے ہوئے اپنے گھروں کو جائیں تاکہ ایسی ادبی سے بھرپور رہنمائی ہو۔

کویت بزم سخن کے صدر جناب طاہر کیفی نے اپنی تقریر کہا کہ میں تمام شعراء حضرات اور خاص طور پر عبدالحق صاحب عبدالستار غزالی صاحب کا شکر گزار ہوں۔ جنہوں نے بزم کی ہمت افزائی فرمائی۔ محمد حسین صدیقی کا بھی احسان کہ انہوں نے استاد امن کو نذرانۂ عقیدت اپنے اشعار میں کیا۔ طرحی مشاعروں سے حقیقت میں ادب کی خدمت ہو اس لئے ہماری بزم طرحی مشاعرہ جاری رکھے گی۔ طاہر کیفی نے خاں صاحب کی ادب پروری کا ذکر کرتے ہوئے اپنی تقریر اسٹیج سکریٹری کے فرائض راقم الحروف نے انجام دیئے۔ کے اختتام پر تمام شعراء اور سامعین کے لئے خاں صاحب جانب سے خورد و نوش کا بہترین انتظام تھا

. . . .

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بنک لمیٹڈ

رجسٹرڈ آفس ۷۸، محمد علی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

دہلی آفس ۲۶۵۵ نیتاجی سبھاش مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

فون نمبر ۲۷۴۲۶۶ — ۲۷۴۳۷۲

- ہمارے یہاں شرح سود تمام نیشنلائزڈ اور شیڈولڈ کمرشیل بنکوں کے مقابلہ ایک فیصد زیادہ ہے
- ہندوستان کا پہلا کوآپریٹو بنک جس کو زرِ مبادلہ میں کاروبار کے لئے لائسنس جاری کیا گیا۔
- ہمارے بنک میں اوقاف کی جمع شدہ رقم کی آمدنی دفعہ ۱۳ (۵) (الف) (iii) انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہے

اس کے علاوہ

- ہم آپ کے آرام و آسائش کی ضروریات مہیا کرنے کے لئے آسان قسطوں پر قرضہ فراہم کرتے ہیں۔ ایک فیصدی کا فرق بہت بڑا فرق ہے۔ یہ آپ کی رقم میں ہزاروں روپیہ کا اضافہ کرتا ہے۔ آپ بھی اس کا فائدہ اٹھائیں

زین جی رنگون والا	حسینی ایس۔ ڈاکٹر	شمیم کاظم
مینجنگ ڈائرکٹر	(چیرمین)	(اسسٹنٹ جنرل مینیجر۔ شمالی ہند)

غزل

جہاں میں فطرتاً ہر آدمی انساں نہیں ہوتا
چمن میں جس طرح ہر پھول عطر افشاں نہیں ہوتا
جو قطرہ اشکِ غم کا باعثِ طوفاں نہیں ہوتا
جنابِ خضر کے حصے کے وہ شایاں نہیں ہوتا
گلستانِ جہاں کی آبیاری غیر ممکن ہے
اگر دریائے دل کا انساں کا بے پایاں نہیں ہوتا
رہے گا تا ابد محتاج وہ مہرِ درخشاں کا
اگر خود بڑھ کے ذرہ نیرِ تاباں نہیں ہوتا
یہ وہ مے خانہ ہے جام و سبو جس میں نہیں ہوتے
شرابِ عشق کا پینا جہاں آساں نہیں ہوتا
وہ ہو جاتا ہے خود گم دم میں بن کر موجِ مضطر میں
اگر قطرہ حریفِ بحرِ بے پایاں نہیں ہوتا
شرابِ آگہی ہر جام و مینا میں نہیں ڈھلتی
ہر اک خم جلوہ گاہِ بادۂ عرفاں نہیں ہوتا
مہ و خورشید ہوں، گُل ہائے تر ہوں یا کہ انساں ہوں
بدلنا ان کی فطرت کا یہاں آساں نہیں ہوتا
نہیں ملتی یہاں قیمت کسی کے گرمیٔ دل کی
کہیں کوئی امتحانِ سینۂ سوزاں نہیں ہوتا
ترے دل کا گدا ہوتا ہے سلطانِ عالم دل کا
یہ مانا چشمِ ظاہر بیں میں وہ سلطاں نہیں ہوتا
حرارت اور حرکت ہی سے قائم بزمِ ہستی ہے
بغیر ان کے وجودِ عالمِ امکاں نہیں ہوتا
یہاں سر میں لیے سودائے آزادی جو آتا ہے
وہ دیوانہ اسیرِ گردشِ دوراں نہیں ہوتا
بدل دیتا ہے رنگِ بادہ رنگِ جام و مینا بھی
دلِ روشن نہ ہو تو چہرہ تاباں نہیں ہوتا
دیارِ عشق میں اس کو کبھی آنے نہیں دیتے
[illegible] ہو کے بھی جو صاحبِ ایماں نہیں ہوتا
صفِ انساں سے امجد ہم اُسے خارج سمجھتے ہیں
کبھی انسان کے دل میں جب غمِ انساں نہیں ہوتا

غزل

دور میں جب تک دلِ زندہ کے پیمانے رہے
ہر طرف آباد مے خانے کے مے خانے رہے
ہم گزر جاتے تھے طوفانِ امید و بیم سے
بادۂ جرأت سے جب لبریز پیمانے رہے
دیدہ و دل کو جہاں سے روشنی ملتی رہی
اب کہاں وہ مدرسے وہ تربیت خانے رہے
آج کے انساں میں انساں کا دل ملتا نہیں
آئینے ناپید ہیں اور آئینہ خانے رہے
زلفِ عالم میں جب الجھی تھی تو سلجھاتے تھے ہم
ہاں نہیں ہاتھوں میں اپنے بھی کبھی شانے رہے
خاک و باد و آب و آتش تو گلے مل بھی گئے
اور ہم انسان باہم جنگ کی ٹھانے رہے
پرتوِ حسنِ ازل سے جل اٹھی جب کائنات
رہ گئی اک شمعِ نور اور چند پروانے رہے
ہم سمجھ سکتے نہیں رازِ درونِ کائنات
یہ حقیقت جاننے والے بھی انجانے رہے
اک چراغ ایسا بھی تھا جو بن جلے روشن رہا
جل رہے تھے اس پہ کچھ ایسے بھی پروانے رہے
میکشوں کی بزم یہ بزمِ گلشن بن جائے گی
کچھ دنوں اس میں اگر امجد سے مستانے رہے

دیوان
ناصر کاظمی
قیمت بارہ روپے پچاس پیسے

پیشاب گھر آگے ہے

اقبال مجید

ایک باقاعدہ بسے ہوئے شہر کی شاہراہ، ایک اجنبی، پیشاب کی اذیت ناک شدت اور پیشاب گھر کی تلاش!

جب سب کچھ بنتا ہے تو پیشاب گھر نہیں بنتے۔ جب پیشاب گھر بنتا ہے تو لوگ وہاں پاخانہ کر دیتے ہیں۔

پتلون کی فلائی پر بار بار ہاتھ جاتا ہے۔ ایک کشادہ سی صاف ستھری دیوار پر لکھا ہے۔ یہاں پیشاب کرنا منع ہے دیوار سے لگ کر کر سایہ ہے لاتعداد خونچے والے بیٹھے ہیں سامنے سیدھی بھاگتی ہوئی شاہراہ ہے۔ دائیں بائیں دکانیں ہیں مال سے لدی ہوئی چورا ہے اور فوارے ہیں۔ چاروں کی دکانیں آئس کریم کینڈی، بھنے ہوئے چنے کی اسٹال، چوڑے چوڑے فٹ پاتھ کہیں کہیں کنارے کنارے لوہے کی خوبصورت ریلنگ اور آدمیوں کی بھیڑ، صاف ستھرے، تیز تیز چلتے اپنے آپ سے باتیں کرتے، چھوٹے بڑے آدمی۔

پیشاب کے مقام پر جلن ہو رہی ہے۔ فضول کو پوری قوت سے اوپر کی طرف کھینچنے کا عمل نہ جانے کب سے جاری ہے۔ یہ شاہراہ کسی ویران علاقہ سے کیوں نہیں مل جاتی یا پھر کوئی زیرِ تعمیر عمارت ہی فٹ پاتھ کے کنارے مل جائے جہاں آس پاس جھاڑیاں ہوں۔

بہت دیر کا ٹھہرا ہوا پیشاب جب ایک بارگی باہر نکلتا ہے تو جسم کے ایک ایک عضو کا تناؤ جس مسرت انگیز لذت کے ساتھ کم ہوتا جاتا ہے۔ وہ لطف، وطمانیت، قدرت کا ایک عظیم تحفہ ہے۔

ایک باقاعدہ بسے ہوئے شہر کی شاہراہ، ایک اجنبی، اذیت ناک شدت اور پیشاب گھر کی تلاش۔

زندگی میں سب سے مبارک عمل کیا ہے؟ OUT WAY کی تلاش۔ ہمارے اندر بہت کچھ گرفتار رہتا ہے ستایا کرتا ہے اور بے چین کر دیتا ہے ہم کو۔ جی چاہتا ہے کہ ہم اسے نوچ کر نکال دیں۔

بائیں طرف ایک سنیما ہال ہے۔ بکنگ ونڈو پر سناٹا ہے پر سنیما ہال میں پیشاب گھر ہوتا ہے۔ یک بارگی سارے جسم میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ پیشاب کی شدت اور بڑھ جاتی ہے۔ لیکن ہال کے پھاٹک پر تالہ لگا ہے۔ شاید ابھی شو کا وقت نہیں ہوا۔

چوڑی چکلی سڑک اپنے پورے طمطراق سے جاری ہے۔ فٹ پاتھ کے دونوں طرف سونے چاندی کی دکانیں ہیں۔ سوال یہ کہ یہ سارے کے سارے لوگ کیا ان میں ایک بار بھی پیشاب نہیں کرتے۔ دکانوں پر کپڑا خریدتے ہوئے لوگ کوک پی رہے ہیں۔ ایک درخت کے نیچے گنے کا رس کچلا جا رہا ہے۔ ایک طرف ٹھنڈے پانی کا ٹھیلہ کھڑا ہے پانچ پیسے گلاس۔ جگہ جگہ چائے کی بھٹیاں۔ پینے کا اتنا سامان لوگوں کے پیٹوں میں جا رہا ہے اور لوگ بغیر پیشاب کئے گھوم رہے ہیں۔ کیا وہ دنیا کا واحد فرد ہے جو پیشاب کی شدت میں مبتلا ہے۔ شاید ایسا نہیں ہے بات صرف اتنی ہے کہ وہ اجنبی ہے۔ یہ سارے کے سارے دکاندار، سڑک کی یہ بھیڑ، فٹ پاتھ کے یہ تماشائی سب ہی ان چور جگہوں کو جانتے ہوں گے جہاں پیشاب کیا جا سکتا ہے۔

چہرہ تکلیف سے بار بار رنگ بدلتا ہے۔ آدمی میں برداشت کی قوت کی بھی ایک حد ہوتی ہے جب پیشاب اپنی پوری شدت سے لگا ہو۔ نہ کھڑے رہنے میں چین ملتا ہے اور نہ چلنے [illegible] میں جب بار بار آنکھیں ادھر ادھر آس پاس کہیں فلائی کے بٹن کھول کر فارغ ہو جانے کا سوال کرتی ہوں تو زندگی کا [illegible] ہے۔ شاہر کی خوبصورت ترین شے۔ تیز سے تیز [illegible] حیثیت ناک واقعہ، خالی خالی

سائڈر جاتا ہے۔

یہ جلن مار سے ڈال رہی ہے۔
نسیں جیسے اب ٹوٹ جائیں گی۔
کہیں کوئی بوند باہر نہ آجائے۔

اجنبی ہونا تو ایک بہانہ ہے۔ آدمی کہیں اجنبی نہیں ہوتا ہے
صرف WAY OUT کی بات ہے۔ کسی سے بھی پوچھا جا سکتا ہے
اے چھوکرے! یہاں پیشاب کرنے کی کوئی جگہ ہے
آس پاس آگے ہے آگے ہے آگے!

ایک باقاعدہ بسے ہوئے شہر کی شاہراہ، ایک اجنبی، پیشاب
کی اذیت ناک شدت اور پیشاب گھر کی تلاش!!!

کیوں سیٹھ جی! یہاں پیشاب کرنے کے لئے کوئی جگہ ہے آس پاس؟
آگے ہے آگے۔

نیچے انڈرویئر بھی نہیں ہے لوگ لوٹے انڈرویئر پہن کر مطمئن
رہتے ہیں۔ شاید اسی لئے دیکھا گیا ہے کہ نیچے کے کپڑے اوپر کے
کپڑوں سے کم میلے نہیں ملتے۔

کیوں بابو جی! یہاں پیشاب کرنے کے لئے کوئی جگہ ہے آس پاس؟
آگے ہے آگے۔

بھنچی رانوں کے نیچے دبانے دبانے، درد کو سہتے سہتے بار بار
ابھرنے والی بے معنی جھنجھلاہٹ کو جھٹکے۔ کتنی دیر ہو گئی اور کتنا سفر کر
لیا۔ نہ راستے کہیں مڑا نہ کوئی گلی ملا اور نہ کسی دکان کا پچھواڑہ کہ ان
چند دکانوں کے پیچھے اکثر ایسا ہو جاتا ہے کہ کھڑے ہو جاؤ۔

کیوں سپاہی پوسٹ مین، ادھر کہیں پیشاب کرنے کی ــــ
آگے ہے آگے۔

فٹ پاتھ پر پرانی کتابیں لگی ہیں۔ کبھی کبھی پرانی کتابوں کے
ڈھیر سے نایاب کتابیں بھی مل جاتی ہیں۔ لیکن ٹھہرنے کا یارا نہیں ہر
ایک وقت ہو تب ہے اتنی مہلت کہاں۔

کیوں حاجی جی! ادھر کہیں پیشاب ــــ
آگے ہے آگے۔

یہ اسمبلی ہال ہے ٹھیک اس کے سامنے مختلف خیموں میں مختلف
تنظیموں کا احتجاج کرنے والے بھوک ہڑتالی پڑے ہیں۔ سیاست زندگی
کا ایک حصہ ہے کہ میں جمہوریت کی جڑیں مضبوط کرتا ہی ہوں گی۔

دادا یہاں پیشاب کے لئے ــــ
آگے ہے آگے۔

نہرو کا سب سے بڑا حریف ہندوستان کا پروگریسو موومنٹ تھا۔ اس
لئے انہوں نے سوشلسٹ ہندوستان کا چکر چلا کر سب کو بہکا دیا۔ ریلیز
جیسے ہو اور تبدیلی کی جلدی ہو تو سماجی ادارے TRANSFER تو کئے
جا سکتے ہیں TRANSFORM نہیں کئے جا سکتے۔ سماج آگے ہو گیا
اور ہم پیچھے۔ علاء الدین کا چراغ تو محض ایک کہانی ہے۔

بھیا! یہاں پیشاب ....
آگے ہے آگے۔

اردو کے ساتھ ۲۶ سال بڑی بے انصافی ہوئی۔ علی سردار جعفری
کا چیک دیر میں اور قاضی عبدالستار کا چیک بہت جلدی کیش ہو گیا۔ کتنی دیر
ان میں ابھی اور کھڑے رہنا پڑے گا بھئی۔

پیشاب
آگے ہے آگے۔

آپا جان میں وہ آپ کی۔ قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں سچ بول رہی ہوں
سارے محلے میں صرف آپا جان ہی بچا ہے۔ کیونکہ لوگ خود ہی پگڈنڈیاں
کی جلدی میں ہیں

لیکن وہ پیشاب گھر ــــ
آگے ہے آگے۔

جہاں ہو وہیں کھڑے ہو جاؤ، جسم کا تناؤ اور اندر کے درد کو
سمجھنے دو۔ ایسی حالت میں چلنے سے مثانہ اور زیادہ IRRITATE ہوتا
ہے سفر بند کرو۔

ممبیاں بیٹھی ہیں۔ بار بار رنگ بدلتے اوپر کی طرف مسکرا رہے ہیں۔
کتنا درد ہو رہا ہے۔

جب پیشاب کی شدت ناقابل برداشت ہو تو اس کے بارے میں
سوچنے نہیں رہنا چاہئے۔ نہیں تو IRRITATION اور بڑھ
جاتا ہے لیکن ہر بات کی حد ہوتی ہے۔

جلدی سے کمال کو بار بار جھٹکنا، کوئی سیدھی بات پوچھے تو الٹا جواب
دینا پیشاب کی شدت ذہن کو دیوالیہ اور سوچ کو مفلوج کر دیتی ہے

یہاں پیشاب گھر کہاں ہے؟
آگے ہے آگے۔

باقی صفحہ ۳۱ پر

کنوئیں میں گرا ہوا آدمی

مشتاق قمر

جانے منڈیر میں کوئی نقص تھا یا اس نے پاؤں ہی غلط رکھا تھا۔

وجہ کچھ بھی ہو وہ اس وقت کنوئیں میں تھا اور ٹھنڈے یخ بستہ پانی، سانپ، مینڈکوں اور رات کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں گھر چکا تھا۔ اندھیرا بڑی تیزی سے آنکھوں میں اترتا جا رہا تھا اور خنکی کے زہر سے شریانوں میں لہو منجمد ہو رہا تھا۔

وہ کنوئیں میں سر کے بل گرا تھا اور سیدھا تہہ تک چلا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ تیرنا جانتا تھا اور کنوئیں میں پانی بھی بہت تھا۔ اس لئے چوٹ سے محفوظ رہا اور سطح آب پر دوبارہ ابھرنے میں بھی کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کے گرتے ہی مینڈکوں نے ٹرٹرا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ کنوئیں میں مینڈکوں کی اتنی بڑی تعداد میں موجودگی پر اسے حیرت ہو رہی تھی۔ اس کے خواب و خیال میں بھی کبھی یہ بات نہ آئی تھی کہ اتنے چھوٹے سے کنوئیں میں اتنے زیادہ مینڈک بھی ہو سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے کبھی سنجیدگی کے ساتھ اس بارے میں سوچا ہی نہ تھا۔ اور اگر کبھی سوچا بھی تھا تو فقط اتنا کہ چند ایک مینڈک ہیں جو برساتی نالوں کے دھارے میں خود ہی ٹرا ٹرا کر خاموش ہو جاتے ہیں وہ انھیں ہمیشہ غیر اہم مخلوق تصور کرتا رہا۔ لیکن اب جب کہ زندگی کے [illegible] دائرے سے اس کا پاؤں پھسل چکا تھا اور وہ [illegible] کو ایک چھوٹے سے جان لیوا دائرے میں [illegible] پا رہا تھا۔ یہی غیر اہم مخلوق اس کے لئے بہت [illegible] ناقابل برداشت [illegible] گئی تھی۔

مینڈک مسلسل ٹرا رہے تھے اور ان کے اس طرح لگاتار ٹرانے سے اس کے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں مفقود ہو گئی تھیں۔ کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ چند لمحوں کی تنہائی میسر آ جاتی تو وہ شاید اس عذاب سے رستگاری کا کوئی راستہ نکال لیتا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کا سابقہ کبھی مینڈک جیسی مخلوق سے پڑے گا۔ اس میں اتنی سکت یقیناً تھی کہ وہ مینڈکوں کی موجودگی اور ان کے مسلسل ٹرائے جانے کی تکلیف دہ حقیقت سے مانوس ہونے اور اپنی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو مناسب ترتیب دینے تک کنوئیں کے یخ بستہ پانی کا مقابلہ کر سکے۔ لیکن کالے سیاہ ناگ جیسے سانپ کی موجودگی کے احساس نے اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیئے۔ مینڈک بذات خود کوئی بہت بڑا مسئلہ نہ تھے وہ ان سے کسی نہ کسی طور نبٹ سکتا تھا۔ لیکن مینڈکوں کی ٹراہٹ سانپ کو متوجہ کر سکتی تھی۔ سانپ کا خیال آتے ہی موت کا کوندا سا لپکا اور اس کے تن بدن کو چیرتا ہوا نکل گیا

وہ انتہائی ڈراؤنی اور غیر انسانی آواز میں چیخا ــــ

"میں عبدالکریم ولد کرم داد کنوئیں میں گر گیا ہوں۔"

اور پھر متواتر "میں عبدالکریم ولد کرم داد کنوئیں میں گر گیا ہوں" کا ورد کرنے لگا۔

تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد، سانپ کو گرد و پیش میں نہ پا کر اسے قدرے اطمینان ہوتا اس کی سوچنے سمجھنے کی قوتوں میں ترتیب سی آ جاتی تو اسے اس بات پر بڑا تعجب ہونے لگتا کہ آخر وہ اپنے نام کے ساتھ اپنی ولدیت کا اعلان بھی کیوں کر رہا ہے۔ صرف اپنا نام لینے پر اکتفا کیوں نہیں کرتا؟ لیکن پھر جب وہ لوگوں کو مدد کے لئے پکارتا تو بے ساختہ اس کے منہ سے "عبدالکریم ولد کرم داد" نکل جاتا جیسے کنوئیں میں گرے ہوئے آدمی کے لئے اپنی پہچان کروانا انتہائی لازمی ہو

اور اپنی پہچان ولدیت کے وسیلے سے ہی ممکن ہو سکتی ہو احساس
کے بغیر لوگوں کو مدد کے لئے آمادہ کرنا بالکل ناممکن ہو اور
پھر جوں جوں اس کے جیالوں میں تھکن کا زہر سرایت کرتا
چلا گیا اسے اپنی ولدیت کے بغیر اپنا نام اور گردو پیش کی ہر چیز
بے معنی سی محسوس ہونے لگی۔ اس سے قبل کبھی اسے اپنی ولدیت
کا اتنی شدت کے ساتھ احساس نہیں ہوا تھا۔ ولدیت کے
بارے میں اس کا تصور بے حد سادہ تھا وہ تو بس اتنا سمجھتا
تھا کہ بچوں کی صورت میں اپنی تجدید کرنے، چند بیگھے زمین محفوظ
کر رکھنے اور ایک بڑا سا مکان ۔ جس کے ایک کونے میں مویشی
باندھنے کا انتظام ہو، تعمیر کرنے کے بعد ولدیت کی ضرورت پیدا
ہو جاتی ہے۔ اس کی چمک دمک ماند پڑ جاتی ہے۔ زندگی کی ایک
پر ایک نئے، اپنی ہی ذات میں نکلی۔ ڈرامے کا آغاز ہو جاتا ہے۔
پردے اٹھتے گرتے رہتے ہیں زندگی بیسوں چھوٹی چھوٹی کہانیوں
کے سر پھیر لفافوں میں رواں دواں رہتی ہے۔ لیکن اب سے
یہ سب کچھ بے معنی سا لگ رہا تھا جیسے اب تک وہ ہر قسم کے مفہوم
سے عاری عام زندگی بسر کرتا رہا ہو۔ اس کے ذہن نے زندگی کے
تسلسل کو کبھی قبول نہیں کیا تھا۔ لہر کی شکستہ لکیروں کو ہی
اہمیت دی تھی اور یہ اس کے ہی تصور کا نتیجہ تھا کہ چھوٹے
بھائی کی شادی ہوتے ہی اس نے نئے اور پرانے مکان کے
درمیان دیوار کھینچ کر اپنی ولدیت کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا
تھا۔ وہ ایک طرف، اس کا بھائی دوسری طرف اور ان کا باپ!
وہ گویا کبھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ مٹی کی دیوار دونوں بھائیوں
کے درمیان مخاصمت کی بنیاد تو نہ بن سکی۔ جیسا کہ اکثر لوگوں
کا خیال تھا لیکن جل کی اکائی ٹوٹ گئی اور معاشرت کی دھند نے
دونوں مکانوں کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کے
بھائی اور گاؤں کے دوسرے مکانوں میں کوئی امتیاز باقی
نہ رہا۔ سب ایک ہی رنگ میں رنگے گئے۔ زندگی کی اس
بے رنگ یک رنگی سے اس نے کبھی اکتاہٹ محسوس نہیں کی تھی
مگر اب جب کہ وہ لحظہ بہ لحظہ گھٹتا جا رہا تھا۔ اسے شدت کے
ساتھ اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔ اس نے خواہ مخواہ
اپنے باپ کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے۔ وہ مرنے کے بعد
بھی کافی عرصے تک زندہ رہا تھا اور جب تک زندہ رہا گھر بار
پر رواں دواں زندگی کا جوبن چھایا رہا۔ لیکن دو ٹکڑے
ہونے کے بعد وہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکا۔ خون کی
متوازی لکیروں کو چاٹتے ہوئے موٹے موٹے سروں والے
کیڑوں کو اس کی لاش تک پہنچنے میں کسی مزاحمت کا سامنا نہ
کرنا پڑا۔ اور اب اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا
باپ اس کی نگاہوں کے سامنے انتہائی کسمپرسی کے عالم میں
ڈوب رہا تھا۔ جس طرح اس کا باپ دو ٹکڑے ہونے کے بعد
پھر کبھی زندہ نہ ہو سکا تھا۔ وہ بھی ایک بار ڈوبنے کے بعد
دوبارہ ابھر نہ سکے گا۔

اعترافِ گناہ کرنے والے مجرم کی طرح اس کا چہرہ ڈھلتے ڈھلتے
آنسوؤں سے تر بتر ہو گیا۔ پھر اسے خیال آیا اس نے بڑی دیر
سے کسی کو پکارا نہیں تھا۔ شاید کوئی راہگیر اس دوران میں یہاں
سے گزر گیا ہو۔ کنواں بڑے راستے پر واقع تھا۔ اور اتنی رات
گئے بھی ادھر سے کسی اکا دکا مسافر کا گزر کچھ ایسا بعید از قیاس
نہ تھا۔

وہ پوری قوت مجتمع کرتے ہوئے چیخا "میں ولد کرم داد کنوئیں میں
گر گیا ہوں"

جانے وہ پوری طرح حواس کھو بیٹھا تھا یا اس کے حواس
ضرورت سے زیادہ کام کرنے لگے تھے۔ اس بار اسے اپنی آواز
بالکل کھوکھلی سی لگی۔ اتنی کھوکھلی اور خفیف کہ شاید منڈیر تک
بھی نہ پہنچ سکی۔ "عبدالکریم" کے بغیر "ولد کرم داد" کے الفاظ
اتنے ہی بے معنی اور کھوکھلے تھے جتنا کہ "ولد کرم داد" کے بغیر
"عبدالکریم"۔

"میں عبدالکریم ولد کرم داد کنوئیں میں گر گیا ہوں" وہ جلدی
سے اپنی تصحیح کرتے ہوئے چیخا گویا وہ پرائمری کا طالب علم ہو اور
کسی انتہائی اہم امتحانی سوال کے جواب میں اس کی زبان لغزش
کا شکار ہو گئی ہو۔

پہلے کی طرح اب بھی اس کی پکار کنوئیں سے باہر کی تاریک فضا
میں بکھر گئی۔ مگر اب اسے اطمینان سا ہونے لگا۔ اس کا اعتماد بحال
ہو گیا۔ اور اسے لگا جیسے اب تک اس کی زبان میں "عبدالکریم ولد کرم داد"

ادا کرنے کی سکت باقی ہے اس چھوٹے سے کنوئیں کا پانی تو کیا قطبین کی ساری برف بھی اس کی شریانوں میں دوڑنے والے لہو کو منجمد نہیں کرسکتی۔

مینڈک مسلسل ٹرّا رہے تھے۔ وہ بدستور مدد کے لئے "میں عبدالکریم ولد کرم داد کنوئیں میں گر گیا ہوں" کا واویلا مچا رہا تھا۔ ابھی تک سانپ نمودار نہیں ہوا تھا۔ مگر سانپ کا کیا تھا کسی وقت بھی پھن پھیلائے حملہ کرسکتا تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ پانی کی خنکی میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور اس کی اصلی قوت مدافعت اسی تناسب سے جواب دیتی جا رہی تھی۔ اس کے جسم کا پانی کے اندر والا حصہ بالکل سُن ہو چکا تھا۔ اعتمادی سوئی کو گرنے سے بچانے کے لئے بڑی جد و جہد کرنی پڑ رہی تھی۔ ذہن کی اسکرین پر ابھر آنے والے خیالات کے دھبوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

اسے یوں لگا جیسے کچھ ہی دیر بعد وہ روزنی پتھر کی مانند پانی کی تہہ میں بیٹھ جائے گا۔ اور صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ عورتیں گاگریں اٹھائے پانی بھرنے آئیں گی تو سطح آب پر اس کی تیرتی ہوئی لاش زندگی کے ہر منفی مثبت عمل سے بیگانہ ہو چکی ہوگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔۔ وہ زندہ رہنا چاہتا تھا اس نے اب تک بے معنی اور ادھوری زندگی ہی بسر کی تھی۔ اس نے ۔۔۔ ہوا بھائی کو گلے نہیں لگایا تھا۔ اس نے بھتیجے بھتیجیوں کے سروں پر بھی ہاتھ نہیں رکھا تھا۔ انھیں لے کر بوڑھے برگد کی چھاؤں میں نہیں بیٹھا تھا۔ دیوان پر الٹی پلتی مار کر ان سے باتیں نہیں کی تھیں۔ باپ کے دو ٹکڑے کرنے سے قبل وہ اپنے بھائی بہنوں، بیوی بچوں کے درمیان دیوان پر بیٹھتا۔ ان کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں پر پیار کے دُودھ میں دُھلی ہوئی سرزنش کرتا۔ اچھے کاموں پر ان کی پیٹھ تھپکتا۔ ۔۔۔ کامیابیوں میں شریک ہوتا۔ تو اسے ایک عجیب سا فخر کا احساس ہوتا۔ پھر فخر کے احساس کے ہلکے سلکے سے ایک چہرہ نمودار ہوتا۔ یہ چہرہ ہو بہو اس کے باپ کا چہرہ ۔۔۔ اسے یوں لگتا اس کا باپ اس کے چہرے کے بطن میں چھپا بیٹھا ہے یہ چہرہ صدیوں سے اس گھر میں پل پل نمودار ہوتا رہا۔ اس کے باپ، اس کے باپ اس کے باپ اور جانے کس کس کو اسی طرح دکھائی دیتا رہا۔ اور وہ اس چہرے کے شعور سے زندہ رہنے کی توانائی حاصل کرتے رہے۔ مرنے کے بعد بھی زندہ رہے۔ اپنے باپوں کی طرح اپنے بیٹوں کے عمل میں بھی جاری رہے۔ گھر کی ایک ایک اینٹ، ایک ایک پتھر کی زبان سے بولتے رہے۔ دیواروں کی باہوں کے حصار میں ایک دوسرے پر سایہ بن کر پھیلے رہے لیکن جانے کیوں اس تک پہنچتے پہنچتے یہ جذبہ سرد پڑ گیا۔ چہرے کی چمک، دمک ماند پڑ گئی۔ لہو کی لکیر ٹوٹ گئی۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ ایسا کیوں کیا؟ اس چہرے کو کیوں مسخ کر دیا؟ اور تب اسے پوری شدت کے ساتھ احساس ہونے لگا کہ نہ منڈیر میں کوئی خرابی تھی۔ نہ پاؤں رکھنے میں کوئی چوک ہوئی تھی اسے اس مقدس چہرے کو مسخ کرنے پر یہ سزا ملی تھی۔

کنوئیں کا یخ بستہ پانی، مینڈکوں کی خوفناک، پُراسرار آوازیں اور ان آوازوں کی کوکھ سے جلد یا بدیر برآمد ہونے والا سانپ اس سزا کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے والے مختلف کردار تھے۔ وہ اس جان لیوا عذاب کے بھنور میں پوری طرح گھر چکا تھا اور اس کے لاشعور نے اس کے شعور، اور اس کے جسم نے اس کے ذہن سے بہت پہلے اس عذاب کی وجوہات کا کھوج لگا لیا تھا۔ اور اس کنوئیں میں گرتے ہی اس کی زبان نے پوری صدق دلی کے ساتھ اپنی ولدیت کا اقرار کر لیا تھا اپنی پہچان کا منبع دریافت کر لیا تھا۔

اچانک مینڈکوں نے ٹرّانا بند کر دیا اور سارے کنوئیں میں بڑی خوشگوار خاموشی پھیل گئی۔ اب تک اس کی نگاہیں کنوئیں کی تاریکی سے مانوس ہوکر کچھ کچھ دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں اس نئی تبدیلی پر اسے قدرے سکون سا محسوس کرنے لگا۔ کم از کم سانپ بے خبری میں تو حملہ نہ کر سکے گا۔ اسے اپنی مدافعت کے لئے کچھ تو موقع مل جائے گا۔

عین اسی وقت اسے سیاہ پھن والا ناگ دیوار کے ایک شگاف سے جھانکتا دکھائی دیا۔ اس نے ناگ کو کنوئیں کی منڈیر سے کئی بار دیکھا تھا اور کنوئیں کے مینڈکوں ہی کی طرح اس پر

کبھی کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ بس ایک بڑا سا غیر معمولی زہریلا کیڑا ہی سمجھا تھا۔ لیکن اب اپنے بالکل سامنے، اس حالت میں دیکھ کر کہ کسی وقت بھی وہ اس پر حملہ کر سکتا تھا۔ یہ سانپ اسے تاریک خلا سے بھی زیادہ بھیانک اور پُراسرار لگا۔ دونوں ایک دوسرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے۔

اچانک سانپ میں عجیب و غریب تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں پہلے اس کا پھن پھیلا پھر پھن میں بے شمار چھوٹے چھوٹے سر اگ آئے۔ ہر سر میں دو دو روشن چمکیلی آنکھیں اور ایک ایک زہر آلود لہراتی زبان تھی۔ اور ہر زبان میں چیختے چلاتے مینڈک پروئے ہوئے تھے۔

وہ بے اختیار چیخ اٹھا۔ اعتماد کی سوئی تیزی سے گرنے لگی۔ یک لخت سانپ بل سے باہر آ گیا۔ اور بڑی سرعت کے ساتھ اس کے اردگرد پانی کی سطح پہ ایک چکر کاٹا۔

وہ جانتا تھا سانپ پانی میں منہ نہیں کھولتا۔ اس نے لمبا سا سانس لیا اور پانی میں ڈبکی لگا دی۔

اسے اپنی داد فریاد کی ناکامی پر بے حد تعجب ہونے لگا کنواں آبادی سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ تین چار کھیتوں کے بعد آبادی شروع ہو جاتی تھی۔ پہلا گھر اس کے باپ کے دوست بابا فضلو کا تھا۔ دونوں ایک ساتھ پلے بڑھے۔ زندگی بھر ساتھ ساتھ رہے ایک ساتھ فوج میں بھرتی ہوئے۔ ایک ساتھ پنشن پر آئے۔ اور اس دن جب اس کا باپ بابا فضلو اور ان سب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ گیا تھا۔ بابا فضلو کی حالت دیدنی تھی۔ نہ آنکھ میں آنسو، نہ ہونٹوں پر آہیں۔ گم سم لگتا تھا وہ خود مر گیا ہو۔ بابا فضلو۔ اس کے باپ کے جگری دوست کو علم ہو جائے کہ عبدالکریم یوں ڈوب رہا تھا تو وہ اسے بچانے کے لئے جان کی بازی تک لگا دے۔ اس کے گھر کے ساتھ ہی اس کے باپ کی منہ بولی بہن کا گھر تھا۔ اسے اس کا باپ ہی دور کے گاؤں سے بیاہ لایا تھا۔ بیاہ کے چند برسوں بعد ہی وہ بیوہ ہو گئی۔ اولاد تھی نہیں۔ میکے والوں نے واپسی کی تحریک چلائی مگر اس نے دو ٹوک نہ کر دی "کرم داد میرا بھائی ہے "بھائی" کے پڑوس کو چھوڑ کر بہن بھلا کہاں جائے؟"

اسے اپنے باپ کی وسعت کا بھرپور احساس ہونے لگا۔ رشتوں کی بند گٹھڑیاں ایک ایک کر کے کھلنے لگیں اور ہر گٹھڑی میں اسے اپنے باپ کی نئی، وسیع تر صورت ہی دکھائی دی۔ اگلا مکان اس کے باپ کے دوست بابا جانے کے بیٹے کا اور اس کے ساتھ عبدالرحیم ولد کرم داد۔ اس کے چھوٹے بھائی کا گھر تھا۔ اور پھر خود عبدالکریم ولد کرم داد کا گھر تھا۔ اور اس کے ساتھ اس کے باپ کے باپ کے بیٹوں پوتوں کے گھر تھے۔ گاؤں کے ہر مکان کے صحن پر اسے اپنا باپ کسی نہ کسی شکل میں بیٹھا دکھائی دیا۔ اور پھر یہ سلسلہ آبادی سے باہر قبرستان کی ہر قبر کی لوح پر کندہ الفاظ۔ اور ان سے بھی پرے گاؤں میں قیام ہونے اور باہر نکلنے والے رستوں تک جا پہنچا تھا لیکن رشتوں کے اس سلسلہ کو مکمل کرنے والی ایک اہم کڑی غائب تھی اور جب وہ اس کڑی کی ٹوٹی ہوئی کڑیاں جوڑنے کی کوشش کرتا تو دو گھروں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے والی کچی دیوار پر سولی نصب ہو جاتی۔ اور پھر دو ٹکڑوں میں بٹی ہوئی لاش اس پر لٹک جاتی۔ جس کے عین نیچے خون کی دو متوازی لکیریں اور بڑے بڑے سروں والے کیڑے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ اس لکیر کو چاٹتے ہوئے لاش کی طرف بڑھتے دکھائی دیتے اس کے تن بدن پر کپکپی چھا جاتی۔۔ اس کا سر ندامت سے جھک جاتا۔ لیکن عین اسی وقت لاش کے دونوں ٹکڑوں میں حرکت پیدا ہونے لگتی اور دونوں ٹکڑے آہستہ آہستہ ایک دوسرے کی طرف بڑھنے لگتے۔ تب اسے بے انتہا خوشی ہوتی۔ اس کا باپ مرا نہیں تھا۔ اس کا خیال غلط تھا۔ وہ ابھی تک زندہ تھا۔ صرف اس کا چہرہ مسخ ہوا تھا۔ یہ چہرہ خود اس نے مسخ کیا تھا۔ اور اب اسے دوبارہ اپنی اصلی حالت میں لوٹانے کی ذمہ داری بھی اسی پر عائد ہوتی تھی وہ ضرور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوگا۔

اس کا اعتماد آہستہ آہستہ بحال ہونے لگا۔ کنوئیں سے باہر اسے قریبی رشتوں، قرابتوں کا اس قدر وسیع جال پھیلا ہوا تھا۔ اور اس وسیع جال میں اس کے باپ کو مرکزیت کا درجہ حاصل تھا۔ وہ کبھی نہیں ڈوب سکتا۔ کنوئیں کا پانی اتنا

ساری خشکی کے باوجود اسے مفلوج نہیں کر سکتا۔ کالا ناگ اور تاریک خلا کی مانند پھیلا ہوا اس کا خوفناک پُراسرار پن اور اس میں آگ برسی ہوئی ان گنت چمکیلی آنکھیں، اور زہر آلود زبانوں میں پروئے ہوئے مینڈکوں کا درد زرخ۔ کنوئیں کی بڑی سے بڑی مصیبت بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ چہرا شائے ہجوم میں وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کا باپ بھی اس کی بے گناہی کی گواہی دینے کے لئے موجود تھا۔ اس کے باپ کی ہزاروں بانہوں نے اسے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ اس کا باپ کنوئیں سے باہر اور اندر ڈا پنے کٹے ہوئے جسم کے باوجود، اس کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہا تھا۔ اور اس کی رگوں میں دوڑنے والے لفظوں کی ندی افق سے پھوٹ نکلنے والی چاندنی کی طرح ہزاروں صدیوں پر پھیلی ہوئی تھی اور اس ندی کے ایک ایک قطرہ پر بڑی جاندار داستانیں رقم تھیں جن کا ایک ایک حرف قطبی تارے کی مانند دمک رہا تھا۔

اس نے پورے اعتماد کے ساتھ پانی کے باہر سر نکالا اور پوری قوت کے ساتھ چیخا "میں عبدالکریم ولد کرم داد ہوں"

اس نے نہ تو پانی میں دوبارہ ڈبکی لگائی اور نہ ہی اپنی پکار کے دوسرے حصے "کنوئیں میں گر گیا ہوں"، کو دہرانا ضروری سمجھا۔ اب کے اپنی پکار کا دوسرا حصہ اسے کچھ غیر ضروری سا لگا۔ اس کی آواز بھی خاصی بدلی ہوئی تھی جیسے اس نے کسی کو مدد کے لئے پکارنے کی بجائے صرف اپنے آپ پر بھروسہ کرتے ہوئے خلاء کے مقابلہ میں نعرہ لگایا ہو۔ اور پھر وہ بار بار "میں عبدالکریم ولد کرم داد" کے نعرے لگانے لگا۔ سانپ کہیں پانی میں روپوش ہو چکا تھا صرف پانی کی سطح پر ہلکی ہلکی سی لکیریں رہ گئی تھیں۔ شاید سانپ نے اسے تاکنے کی کوشش میں متعدد چکر کاٹے تھے۔

"کون؟ کون ہو تم؟" اچانک کسی نے کنوئیں کی منڈیر سے آواز دی۔

"میں — میں عبدالکریم ولد کرم داد ہوں" اس نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ جواب دیا۔

باہر سے ہلکا سا قہقہہ گونجا "ارے! تم کریم ہو"

"ہاں۔ میں عبدالکریم ولد کرم داد ہوں۔

جواب میں طنزیہ قہقہہ اور مغلظات گالی کے ساتھ ڈوبتی ہوئی آواز میں اسے سنائی دیا "سالا۔ جیسے عدالت میں کھڑا حلفیہ بیان دے رہا ہے۔"

اور پھر چند ہی لمحوں میں کنوئیں سے باہر، اس کا باپ اپنے مختلف رشتوں اور قرابتوں کے رنگ روپ میں آن موجود ہوا۔ کنوئیں میں ٹوکرا پھینکا گیا اور جھڑکی دینے کے سے انداز میں اسے ٹوکرے میں بیٹھنے کی ہدایت کی گئی۔ وہ بدستور "میں عبدالکریم ولد کرم داد" کے نعرے لگاتے ہوئے ٹوکرے میں بیٹھ گیا اسے طنزیہ مسکراہٹوں کی برسات میں ٹوکرے کو کھینچ کر باہر نکالا گیا اس نے باہر قدم دھرتے ہی گرد و پیش میں نگاہیں دوڑاتے ہوئے پوچھا "عبدالرحیم ولد کرم داد کہاں ہے؟"

مجمع سے فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا اور اس سے قبل کہ اس کا بھائی اس کے قریب آتا وہ دوزانو ہوتے ہوئے سجدہ میں گر گیا اور پھر بڑی دیر بعد سر اٹھاتے ہوئے بھیگی پلکوں کے ساتھ دعائیہ لہجہ میں بولا۔

"مولا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے تو نے عبدالکریم ولد کرم داد کو کنوئیں سے نجات دلائی۔ اللہ تیرا لاکھ لاکھ۔"

اس بار مجمع سے کوئی طنزیہ قہقہہ بلند نہ ہوا۔ وہ سب حیران حیران نظروں سے اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے روشنی کے اجنبی ہالے کو دیکھنے لگے۔

لطیفہ : پیشاب گھر آگے ہے

نہیں نہیں یہاں پر اسی جگہ پیشاب گھر کہاں ہے؟

آگے ہے آگے۔

نہیں نہیں ابھی ابھی ٹھیک اسی مقام پر پیشاب گھر کہاں ہے۔

آگے ہے آگے۔

نہیں نہیں میری خلائی کے بلنوں سے بالکل جڑا ہوا پیشاب گھر کہاں ہے!

آگے ہے آگے۔

کوئی بھی طریقہ اپنائیے

کیا آپ گلے کی تکلیفوں میں اکثر مبتلا رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے سخت پریشان ہیں، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ایسی پریشان کن بیماری
سے گلا کاٹ دینے سے ہی چھٹکارا مل سکتا ہے۔ ذرا ٹھہریئے! خالص دیسی ادویات سے تیار کیا ہوا "ٹونسلیکس" ایک بار،
صرف ایک بار استعمال کر کے تو دیکھئے، پھر آپ کو گلے کے غدود بڑھ جانے، گلے کی سرسراہٹ، خراش، گلے کے ورم، زخم اور
دوسرے تمام امراض کی شکایت نہیں رہے گی۔ اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا مریض ہو جس کے گلے کے غدود (ٹانسلائٹس) کا
آپریشن ہونا ہے تو اسے اس دوا کے بارے میں ضرور بتائیے کیونکہ پھر اسے آپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چھوٹے بچے
جو کھٹی میٹھی چیزیں کھا کر گلا خراب کر لیتے ہیں، ان کے لئے بھی یہ بہت کام کی دوا ہے۔ ہر گھر میں اس کا رہنا بہت ہی ضروری ہے۔

—— شرع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیبارٹریز، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

Phone: 275602
Regd No D- (DN) 353
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002
APRIL 1985
Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644 57

خرید کر پڑھیے :

مانگ کر پڑھیے :

یا پھر

چوری کر کے پڑھیے

یہ ہے ہی اتنا خوب صورت ،

اتنا دل کش ،

اتنا مکمّل کہ اسے کسی طرح بھی

حاصل کریں کیوں کہ

یہ فیض کی شخصیت اور فن پر ایک

شان دار ادبی دستاویز ہے ۔ اِس میں شامل ہیں :

قیمت : پندرہ روپے

★ خلوت اور جلوت کے بھید کھولنے والے ذاتی نقوش ۔

★ نادر و نایاب تصویریں ۔

★ سدا بہار ، ہزار رنگ و منتخب کلام ۔

★ فیض کی شخصیت کے وہ ڈھکے چھپے گوشے جن پر سے پہلی بار پردہ اُٹھایا گیا ہے ۔

★ ہندوستان ، پاکستان ، رُوس اور انگلستان کے دانش وروں کی مشترکہ کاوشوں کا گلدستہ ۔

ساری اُردو دنیا میں شبستان کے "فیض نمبر" کا چرچا ہے

اس سے پہلے کہ اسٹاک ختم ہو جائے آج ہی اپنے قریبی نیوز ایجنٹ سے طلب کیجئے یا براہِ راست ہم سے منگوائیے ۔

شبستان اردو ڈائجسٹ ، آصف علی روڈ ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شانِ ہند
نئی دہلی
مدیر
سرور تونسوی
JUN
Dr. Zakir Husain Library
Jamia Nagar
J. M. I. New Delhi

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ | رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۵۷ / ۴۴ ۲ | رجسٹرڈ نمبر ڈی ۲۵۳

ہندو پرست ہوں نہ مسلمان پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریبان پرست ہوں

ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاضؔ مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انسان پرست ہوں

فیاضؔ گوالیاری

ماہنامہ

شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر سرورؔ تونسوی

فی پرچہ - ۲/۵۰ روپے
زرِ سالانہ - ۲۴/- روپے

جلد نمبر ۴۶ | مئی ۱۹۸۵ء | شمارہ نمبر ۵

الحاج حافظ یوسف دہلوی صاحب کا انتقال

دینی۔ ادبی، علمی، تعلیمی، سماجی، قومی اور فلمی حلقوں میں یہ اطلاع یقیناً باعثِ صد ہزار افسوس ہوگی کہ ۲۴ مئی ۸۵ء مطابق ۳ رمضان المبارک بروز جمعہ سہ پہر کو "شمع" گروپ کے سربراہ اور ماہنامہ "شمع" اور "شمع" گروپ کے دیگر رسائل کے مدیرِ اعلیٰ عالیجناب الحاج حافظ محمد یوسف دہلوی کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

گزشتہ نصف صدی میں حافظ صاحب موصوف نے اُردو زبان کی جو خدمت کی وہ بڑی بڑی یونیورسٹیاں اور ہزار ہا ادارے بھی نہ کرسکے۔ اُردو زبان کی تاریخ میں یہ واحد اور مسلمہ سچائی ہے کہ تمام روئے زمین پر جہاں بھی کوئی اُردو پڑھنے والا ہے وہاں ماہنامہ "شمع" نے زبانِ اُردو کے سفیر کی حیثیت سے اپنی روشنی پہنچانے میں مقدور بھر کوشش کی اور آج اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جاسکتا کہ اُردو ماہنامہ "شمع" اپنی اشاعت اور مقبولیت کے لحاظ سے اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ حافظ صاحب دہلوی کے انتقال پُر ملال سے مدیر "شانِ ہند" اپنے ایک ایسے مُربی اور سرپرست سے محروم ہوگیا جس کی مثال ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔

عزیزانِ گرامی یونس دہلوی، ادریس دہلوی اور الیاس دہلوی نیز حافظ صاحب کے دیگر تمام لواحقین سے ادارہ شانِ ہند اظہارِ تعزیت کرتا ہے اور دُعا ہے کہ خدائے قادرِ مطلق حافظ یوسف دہلوی صاحب کے فرزندانِ ارجمند کو اپنی امان میں رکھے اور اس صدمہ کے برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین) ۔ ماہنامہ شانِ ہند کی آئندہ اشاعت میں مرحوم حافظ صاحب سے متعلق یادوں پر مبنی سلسلہ بہ کوشش یار بہ انداز محرمانہ کروں گا جسے مستقل عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔ فقط

دلِ سوگوار

سوگوار کاوش سرورؔ تونسوی

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

دلی اُردو اکاڈمی کے سالانہ بجٹ میں تین گنا اضافہ

دلی اُردو اکاڈمی کے ایوارڈ دیتے وقت جناب ایم۔ ایم ولی صاحب لفٹیننٹ گورنر دلی نے فرمایا کہ دلی اُردو اکاڈمی کا ۱۹۸۴-۸۵ء کا سالانہ بجٹ دس لاکھ روپیہ تھا مگر اس میں پانچ لاکھ کا اضافہ کردیا گیا تھا مگر اب سال ۱۹۸۵-۸۶ء کے لئے اس کا بجٹ تیس لاکھ روپے کردیا گیا ہے۔

دلی کے ہر اُردو دوست کو خوش ہونا چاہئے کہ حکومت دلی اُردو کی بقا و حیات کے لئے کسی قسم کی مالی کنجوسی نہیں دکھا رہی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جس قدر رقم اس سال دلی اُردو اکاڈمی کے لئے منظور کی گئی ہے شاید کسی دوسرے صوبے کی اُردو اکاڈمی کے لئے اتنی رقم منظور نہیں کی گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دلی اُردو اکاڈمی نے اپنی سرگرمیوں کے باعث حکومتِ دلی اور دلی کے عوام پر ثابت کر دیا کہ وہ اپنے فرائضِ منصبی کو بطریقِ احسن انجام دے رہی ہے۔ اس سلسلے میں "شانِ ہند" کی اشاعت ماہِ مارچ میں تفصیلی طور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

جناب ایم۔ ایم۔ ولی صاحب کے اس اعلان کے بعد اُردو اکاڈمی دلی پر اور بھی ذمہ داری عائد ہوگئی ہے کہ وہ اب ایسے کارہائے نمایاں انجام دے کہ حکومتِ دلی کے علاوہ عوام بھی یہ کہنے پر مجبور ہوجائیں کہ واقعی اُردو اکاڈمی دلی نے حکومت کی فراخدلانہ امداد کو اُردو کے لئے خرچ کرکے قابلِ تعریف کام انجام دئے ہیں۔

بے شک دلی اُردو اکاڈمی کے ممبران اور سکریٹری صاحب اس بات کا خاص خیال رکھیں گے کہ ان پر جو اعتماد حکومت نے کیا ہے اسے کسی طور بھی زک نہ پہنچے۔ اس کے باوجود ہر اُردو پرست کا حق ہے کہ وہ دلی اُردو اکاڈمی کو ایسے سجھاؤ دے جو واقعی اُردو کے لئے مفید ہوں لہٰذا اس ضمن میں "شانِ ہند" بھی لب کشائی کی جرأت کر رہا ہے

امید ہے کہ شانِ ہند جس اعتماد اور خلوصِ نیت سے چند معروضات پیش کر رہا ہے اُردو اکاڈمی کے ارکان بصد وسعت و کشادہ دلی اسے اسی نظر سے دیکھیں گے

اولین گذارش تو یہ ہے کہ ہمارے چیف ایگزیکیٹو کونسلر جناب جگ پرویش چندر صاحب نے فرمایا تھا کہ اردو اکاڈمی کو ایک ایسی ڈائرکٹری شائع کرنی چاہئے جس میں ہر ایسے کتب فروش کا مکمل پتہ ہو جو اُردو کی کتابیں فروخت کرتا ہے ہر ایسی لائبریری کا نام اور پتہ ہو جس میں اُردو کتابیں موجود ہیں اور یہ لائبریری اُردو کتب خریدتی ہو ہر ایسے کالج اور یونیورسٹی کا نام اور پتہ بھی اس ڈائرکٹری میں ہونا ضروری ہے جس کی لائبریری میں اُردو کتب خریدی جاتی ہوں اور وہاں اُردو پڑھائی جاتی ہو۔ تاکہ اس ڈائرکٹری سے اُردو کی کتابوں کی نکاسی ہوسکے

جناب جگ پرویش چندر صاحب کے اس فرمان پر جناب شریف الحسن صاحب نقوی سکریٹری اردو اکاڈمی دلی نے اعلان کیا تھا کہ اس مالی سال میں ایسی ڈائرکٹری یقیناً شائع کی جائے گی خدا کرے کہ ایسا ہو مگر نقوی صاحب کی خدمت میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ ممبران اُردو اکاڈمی میں اکثریت ایسے حضرات کی ہے جو اس کام کو اس کی اہمیت کی اہلیت نہیں رکھتے لہٰذا انہیں اکاڈمی کے کچھ ممبران کے علاوہ دیگر ماہرین کی امداد بھی لینی ہوگی۔ اور اس ڈائرکٹری کو بہترین طور پر مکمل اور مفصل شائع کیا گیا تو یہ ڈائرکٹری کئی ہزار کی تعداد میں فروخت ہوسکے گی اور اکاڈمی اگر اسے کاروباری انداز سے شائع کرے تو اسے مالی فائدہ بھی ہوگا۔

دوسری عرضداشت اُردو اکاڈمی کی مرکزی لائبریری کے سلسلے میں ہے۔ کیونکہ اب اکاڈمی کے پاس اتنا روپیہ ہے کہ وہ اردو کی

بہترین کتاب مرکزی لائبریری کے لئے خریدنے کی سکت رکھتی ہے۔ اب
تو یہ طریق کار رہا ہے کہ سیکڑوں بہترین کتابیں یہ کہہ کر واپس کر دی گئی
ہیں کہ یہ لائبریری میں موجود ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے اگر اکادمی کا کوئی
[illegible] رکن اس سلسلے میں ثبوت چاہئے تو مہیا کیا جا سکتا ہے کہ کئی
بہترین کتابیں یہ کہہ کر واپس کر دی گئیں کہ یہ کتابیں پہلے سے لائبریری
میں موجود ہیں حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔ مرکزی لائبریری کو
[illegible] ہونا چاہئے کہ کوئی بھی سکالر اپنی ضرورت کی اُردو کتاب اس
لائبریری سے حاصل کر سکے۔ اگر صرف ایک لاکھ روپیہ بھی اس ضمن میں
(صرف مرکزی لائبریری پر) ہر سال خرچ کر دیا جائے تو قریب قریب
اُردو کی ہر بہترین اور مفید کتاب جو اس وقت بازار میں میسر ہو گی خریدی
جا سکتی ہے۔

۳۔ اگر مدھیہ پردیش اُردو اکادمی، مہاراشٹر اُردو اکادمی اور یوپی اُردو
اکادمی اُردو کی بہترین اور مفید مطلب کتابیں شائع کر سکتی ہیں تو کیا
وجہ ہے کہ دلی اُردو اکادمی اس ضمن میں خاموش رہے۔ یو۔پی
اُردو اکادمی نے تو دو صد سے زائد ایسی کتابیں شائع کی ہیں کہ جن
سے ہندوستان میں اُردو پھر سے زندہ ہو گئی ہے حالانکہ مدھیہ پردیش اور
مغربی بنگال اُردو اکادمیوں کے بجٹ دلی اکادمی سے کم ہیں اگر یہ
اکادمیاں یہ خدمت انجام دے سکتی ہیں تو دلی اُردو اکادمی کے لئے تو
ذرائع کی کوئی کمی نہیں ہے لہٰذا اسے بھی ایسی اُردو کتابیں شائع
کرنی چاہئیں جو واقعی اُردو کی آبرو ہوں۔ اس ضمن میں یہ انتہائی ضروری
ہے کہ خویش پروری، دوست نوازی اور اقربا پروری سے اجتناب
کیا جائے۔

۴۔ اُردو کے ماہنامے جو خالص طور پر اُردو کی خدمت کر رہے
ہیں [illegible] رومانیات اور جنس و سیاست وغیرہ سے پاک ہیں
[illegible] اس ضمن میں سب سے پہلے جہاں اختر اردو اکادمی
[illegible] رسائل کو جہاں اختر کی اچھی لائبریریوں میں اکادمی کی طرف سے
[illegible] درج کیا۔ چنانچہ ہندوستان بھر میں جہاں اختر کی اٹھارہ [illegible]
[illegible] جہاں اختر اُردو اکادمی کی طرف سے خریدا گیا۔ اسی
طرح [illegible] اُردو اکادمی نے اردو کے ماہناموں کو مالی امداد دی جیسے
[illegible] شاعر بمبئی کو بھی پوری مالی امداد دی گئی۔ چنانچہ دلی اُردو
اکادمی کو اُردو کے ایسے ماہناموں کی طرف خصوصی توجہ مبذول کرنی
چاہئے جو واقعی اُردو کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں۔ اس سال
جہاں اختر اُردو اکادمی نے بھی رسائل کی مالی مدد کی ہے۔

۵۔ لال قلعہ کا مشاعرہ یا کوئی بھی اچھا مشاعرہ اُردو اکادمی کی
جانب سے منعقد ہو اس کی رُوداد اور مشاعرہ میں سنایا گیا شعرائے کرام کا
کلام مع تصویر ہر سال گلدستہ کی شکل میں شائع کیا جائے اور اس
کی مناسب قیمت رکھی جائے۔ ہر گلدستہ کی ایک صد جلدیں شان
ہند تاجرانہ نرخ پر خریدے گا۔ پچھلے سال اُردو اکادمی نے جو گلدستہ
شائع کیا تھا اسے خریدنے کے لئے دفتر شان ہند میں کئی فرمائشیں
موصول ہوئیں مگر اس کا کیا علاج کہ یہ گلدستہ محض مفت تقسیم
کے لئے مخصوص کر دیا گیا اور جن لوگوں تک اسے پہنچنا چاہئے تھا
وہ محروم رہ گئے حالانکہ وہ اس کی مناسب قیمت بھی ادا کرنے کو
تیار تھے۔

۶۔ دلی کے سینئر سیکنڈری سکولوں کی لائبریریوں اور مرکزی
لائبریری اُردو اکادمی کے لئے دلی اردو اکادمی تیس تیس کی
تعداد میں کچھ کتابیں خریدتی ہے نہ معلوم ان کتب کا انتخاب
کرتے وقت کون کون سی پابندیوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور
وہ کون حضرات ہیں جو ان کتابوں کا انتخاب فرماتے ہیں مگر یہ
کہنے میں کوئی خدشہ نہیں کہ ان کتب کا انتخاب کرتے وقت یقیناً
دھاندلی سے کام لیا جاتا ہے اور اقربا نوازی نیز بد دیانتی کو بروئے
کار لایا جاتا ہے۔ ہائر سیکنڈری کے طلبا تو درکنار ان کے اساتذہ
کرام بعض کتب کے ناموں تک کے لغوی معنی بتانے سے معذور ہیں جو کہ
ان لائبریریوں کے لئے خریدی گئی ہیں۔ ادارہ شان ہند قریباً ایک
صد ایسی کتابوں کی فہرست مرتب کر کے اُردو اکادمی کو بھجوا رہا ہے
جو واقعی سیکنڈری سکولوں کے طالب علموں اور ان کے ٹیچرز کے
لئے مفید نہیں اور بے فائدہ ہیں۔ اس وثوق سے ترتیب دی جا رہی
ہے کہ اُردو اکادمی دلی کا کوئی بھی ممبر کسی ایک کتاب کے بارے
میں بھی یہ کہنے کی ہمت نہ کر سکے گا کہ وہ ان طالب علموں یا ان کے
ٹیچرز کے لئے مفید نہیں ہے۔ اس مرتبہ یہ کتابیں خریدتے وقت
ترقی اُردو بورڈ کو یقیناً ناجائز حد تک نوازا گیا ہے۔

۷۔ اُردو اکادمی دلی نے بھی کتابت سکھانے کا سکول کھول
رکھا ہے۔ اُردو کتابت سکھانے کے لئے اسکول خواہ وہ ترقی

اُردو بورڈ کی جانب سے جاری کئے گئے ہوں یا مختلف صوبوں کی اُردو اکاڈمیوں کی جانب سے شروع کئے گئے ہوں دراصل اُردو کتابت کی قدیم اور مسلمہ روایات کو مٹانے کی ایک نا پاک کوشش ہے ۔ ان سکولوں میں کتابت لیتھو کی بجائے آفسیٹ سکھائی جاتی ہے جس میں حروف کی نوک پلک سنوارنے کی طرف قطعاً دھیان دینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی کیونکہ آفسیٹ کتابت کی جب فلم تیار ہوتی ہے تو اس کی چھپائی اپنے آپ صاف آتی ہے ۔ اُردو اکاڈمیوں اور ترقی اُردو بورڈ والوں کے پاس سرکاری روپیہ ہوتا ہے لہٰذا وہ چوروں کا مال اور لاٹھیوں کے گز کے مصداق جس قدر چاہے فضول خرچی کرلیں مگر عام طور پر اُردو کتابوں کو شائع کرنے والے ناشر جو چند سرمایہ داروں کو چھوڑ (کر) اور اُردو رسائل و اخبارات کے ادارے آفسٹ کی گراں کتابت کے متحمل ہو ہی نہیں سکتے ۔ اب عام طور پر اُردو کی کتابیں اڑھائی صد اور پانچ صد کی تعداد میں چھپنی شروع ہو گئی ہیں اور اُردو کے رسائل و جرائد کی اکثریت بھی محدود اشاعت ہی رکھتی ہے ۔ لہٰذا اس قدر کم اور محدود اشاعت میں شائع ہونے والی کُتب ۔ رسائل اور جرائد اتنی سکت ہی نہیں رکھتے کہ آفسٹ کی کتابت کا بوجھ برداشت کر سکیں ۔ اور بازار میں لیتھو کی کتابت کرنے والے کاتبوں کا کال ہے اگر کوئی پرانا کاتب لیتھو کی کتابت کرنے پر رضامند بھی ہو تا ہے تو وہ اُجرت آفسٹ کتابت کے تناسب سے مانگتا ہے یعنی دوسرے لفظوں میں آفسٹ کتابت نے لیتھو لکھنے والے کاتبوں کو بھی یہ راستہ دکھا دیا ہے کہ وہ لیتھو کی بجائے آفسٹ کی کتابت کریں کیونکہ اس میں اُجرت زیادہ ملتی ہے اور محنت کم کرنی پڑتی ہے ۔ کتابت کے یہ سکول کھولنے والوں میں سے کیا کوئی یہ بتا سکے گا کہ اڑھائی صد یا پانچ صد کی تعداد میں چھپنے والی کتابوں اور کم تعداد میں چھپنے والے رسائل و جرائد کس طرح آفسٹ کتابت اور پرنٹنگ کے اخراجات برداشت کر سکیں گے ۔ کیونکہ کم سے کم پانچ ہزار کی تعداد میں کوئی کتاب یا رسالہ وغیرہ شائع ہو تو وہ آفسٹ کی کتابت اور آفسٹ پرنٹنگ کے اخراجات برداشت کر سکتا ہے ۔ اگر واقعی اُردو کو زندہ رکھنا ہے تو لیتھو کتابت کو زندہ رکھنا ہی ہو گا اگر چہ ترقی اُردو بورڈ ۔ ساہتیہ اکاڈمی اور نیشنل بُک ٹرسٹ اور کچھ سرمایہ دار ادارے ہی زندہ رہ سکتے ہیں دوسرے چھوٹے چھوٹے ادارے اور رسائل و جرائد ختم ہو جائیں گے اس لئے ہماری مودبانہ گزارش ہے کہ اُردو اکاڈمی لیتھو کتابت کو زندہ رکھنے کے لئے اکاڈمی کے زیر تحت چلنے والے اُردو کتابت سکول میں بجائے آفسٹ کتابت کے اُردو لیتھو کتابت سکھانے کا انتظام کرے ۔ دلی اُردو اکاڈمی کے زیر اہتمام چلنے والے اُردو کتابت سکول کے انچارج جناب حافظ صاحب لیتھو کتابت کے بہترین استاد ہیں وہ یہ خدمت بخوبی انجام دے سکتے ہیں ۔

پچھلے دنوں ترقی اُردو بورڈ نے ایک سیمنار کیا تھا جس میں ملک کے اُردو پبلشرز کو مدعو کیا گیا تھا ۔ اس سیمنار پر کئی ہزار روپیہ برباد کر دیا گیا اور ہمیں افسوس ہے کہ کسی بھی اُردو پبلشر نے لیتھو کتابت کے بارے میں ایک لفظ تک بھی نہ کہا ۔ اُردو ترقی بورڈ کا کیا ہے وہ چاہے تو آفسٹ کتابت کی بجائے بلاک بنوا کر بھی کتابیں شائع کر سکتا ہے کیونکہ عوامی روپیہ سرکار نے اس کے ہاتھ میں دے رکھا ہے وہ جس طرح چاہے برباد کر سکتا ہے مگر سوچنا تو یہ ہے کہ کیا اُردو ترقی بورڈ ۔ ساہتیہ اکاڈمی یا نیشنل بک ٹرسٹ ہندوستان میں اُردو کو زندہ رکھ سکے گا ؟

اس سلسلے میں ہم وزیر تعلیم سے بھی یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ ان تینوں اداروں کو یہ ہدایات جاری کریں کہ اردو کی تمام کتابیں لیتھو پرنٹنگ میں شائع کی جائیں ۔ اس سے کتابوں کی پرنٹنگ پر یقیناً بہت کم روپیہ صرف ہو گا اور کتابیں کم قیمتوں پر فروخت کی جا سکیں گی ۔ آج کل اُردو ترقی بورڈ جو کتابیں شائع کر رہا ہے ان کی قیمتیں محض اس لئے زیادہ ہیں کہ انھیں آفسٹ پرنٹنگ سے چھاپا جاتا ہے ۔ عوام یہ کتابیں قطعاً نہیں خرید سکتے ہاں لائبریریوں میں یہ کتابیں خریدی جاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس مرتبہ اُردو اکاڈمی دلی نے زیادہ تر کتابیں ترقی اُردو بورڈ کی مطبوعہ ہی خریدی ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دلی اُردو اکاڈمی پر کوئی ایسا دباؤ تھا ہے کہ وہ ترقی اُردو بورڈ کی مطبوعات خریدنے پر مجبور ہو گئی ۔

۸ ۔ جب یو پی اُردو اکاڈمی ۔ بنگالی اُردو اکاڈمی اور بہار اُردو اکاڈمی کلکتہ میں شائع ہونے والی اُردو کتب کا

ی مقابلہ میں شریک ہونے کی دعوت دیتی ہیں تو کیا وجہ ہے
لی اُردو اکاڈمی صرف دلی تک ہی اپنے آپ کو محدود
ے جبکہ اس کا بجٹ ہندوستان بھر کی اُردو اکاڈمیوں
مقابلہ میں زیادہ ہو گیا ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ اب
ا اُردو اکاڈمی بھی مجموعی اُردو خدمات وغیرہ ایسے انعامات
ع کرے اور انعامی مقابلہ میں شریک ہونے والی کتب کو
ام میں دی جانے والی رقم کا ۲۵ فیصدی دلی میں شائع ہونے
ی کتب کو دے۔

۹۔ اگر کسی کتاب کو کوئی اکاڈمی یا ادارہ انعام دیتا ہے
س دوسری اکاڈمی کے پیٹ میں درد کیوں ہونے لگتا ہے
ایہ شرط بالکل ختم کر دی جانی چاہیئے کہ اگر کسی کتاب پر کسی
رے یا دوسری اکاڈمی نے انعام دیا ہوگا تو دلی اُردو اکاڈمی
ے انعام نہیں دے گی۔

۱۰۔ اتر پردیش اُردو اکاڈمی نے اس سال ایک لاکھ
۰ ہزار روپیہ کے انعامات اُردو کتابوں کو دیئے ہیں
ب کہ اس کا بجٹ ۲۹ لاکھ روپیہ ہے اور اب دلی اُردو
ڈمی کا بجٹ ۳۰ لاکھ روپیہ ہو گیا ہے تو انعامی کتب
دی جانے والی رقم میں کافی اضافہ کیا جانا چاہیئے۔
وقت دہلی اُردو اکاڈمی ۲۸ ہزار روپیہ کتابوں کے
ام کے سلسلہ میں خرچ کرتی ہے اب اسے کم از کم سوا
ھ روپیہ اس سلسلہ میں تقسیم کرنا چاہیئے تاکہ زیادہ سے
یادہ شعرا نئی شیروانیاں بنوا سکیں اور جو شراب کے عادی
ا انھیں چند روز راحت نصیب ہو۔

۱۱۔ آج سے چالیس پچاس سال پہلے جب کوئی کمزور فلم کسی
ما ہال میں نمائش کے لئے پیش کی جاتی تھی تو اس کے
ھ زندہ ناچ اور گانے کا پروگرام رکھ دیا جاتا تھا۔
ی دو چار ریلیں چلنے کے بعد کسی بازاری عورت کا ناچ اور
ا ہوتا تھا جس سے فلم بین حضرات ایک ٹکٹ میں دو مزے
صل کرنے کی غرض سے اس کمزور فلم کو بھی دیکھنے میں نقصان
یں سمجھتے تھے۔ بالکل اسی طرح دلی اُردو اکاڈمی کے
پروگرام جن میں عوام کی شرکت کی زیادہ توقع نہ ہو تو عین

اسی طرح ایک پاس میں "دو مزے" حاصل کرنے کے لئے عوام
کو لالچ دیا جاتا ہے کہ فلاں قوال کی قوالی ہوگی یا فلاں صاحب
غزلیں سنائیں گے۔

قوالی۔ غزلوں وغیرہ کے پروگرام ضرور ہونے چاہئیں مگر
ایک پاس میں دو مزے کے طور پر نہیں بلکہ بالکل الگ تھلگ
پروگرام ہوں اور ایسے شاندار ہوں کہ جیسے اکاڈمی کے ادبی پروگرام
ہوتے ہیں۔ آرٹسٹوں کی بھیڑ اکٹھی کرنے کی بجائے صرف ایک
آرٹسٹ کا ہی پروگرام ہو مگر یہ آرٹسٹ واقعی آرٹسٹ ہو۔
جیسے بمبئی کی سرلقا بیگم — سجاتا فلم سٹار یا اور اسی طرح کی دیگر
بہترین موسیقی کا پروگرام پیش کرنے والی دیگر آرٹسٹوں کا پروگرام
کرایا جا سکتا ہے۔ چار بیت کا پروگرام خوب تھا اسے دوبارہ
رکھا جائے نہ کہ ہر بار صاحب سنگھ کو سٹیج کی زینت بنایا جائے
پاکستان کا ایرا غیرا آرٹسٹ جونہی واگہہ کی سرحد پار کرتا
ہے وہ پاکستان کا مشہور اور مقبول آرٹسٹ بن جاتا ہے۔
حالانکہ پاکستان کا ایک ہی آرٹسٹ غلام علی خاں ہندوستان میں
اپنے فن کا سکہ بٹھا سکا ہے۔ صابری برادرس نے اپنی ساکھ
کو خود نقصان پہنچایا۔ اس لئے ہر پاکستانی آرٹسٹ کو فن کی
معراج نہ سمجھ لیا جائے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر صاحب تو ایسے
فن کاروں کی دائی ہیں پھر نہ معلوم قابل ذکر آرٹسٹوں کو کیوں مدعو
نہیں کیا جاتا۔

۱۲۔ اُردو اکاڈمی ہو یا ترقی اُردو بورڈ یہ تب ہی قائم رہ
سکیں گے اگر اُردو کی تعلیم جاری رہ سکے گی۔ لہٰذا ہر اکاڈمی اور
خصوصاً دلی اُردو اکاڈمی کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ سکولوں میں
اردو کی تعلیم کا سلسلہ جاری کرانے کی حتی المقدور کوشش کرے
اس کے علاوہ بالغوں کو اُردو پڑھانے کا انتظام معقول ہونا
ہوتا چاہیئے۔ انجمن ترقی اُردو ہند کے صدر دفتر میں اُردو
اکاڈمی کے تعاون سے بالغان کو اُردو پڑھانے کا سلسلہ
بڑے زور و شور سے شروع کیا گیا تھا مگر اب اس کا کہیں نام
بھی سننے کو نہیں آتا۔ جب اُردو پڑھنے لکھنے والے ہی نہ ہوں گے
تو پھر یہ اُردو اکاڈمیاں یہ اُردو ترقی بورڈ۔ یہ اُردو کی کتابیں۔
یہ انجمن ترقی اُردو اور یہ اردو رسائل و جرائد کہاں رہیں گے۔

مت بھولیے کہ اُردو پڑھنے والوں کی تعداد ہر سال کم سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ اُردو کے نام پر لقمۂ تر حاصل کرنے والے۔ اُردو کے نام پر ہر قسم کے فائدے اٹھانے والے اور اُردو کو سرکاری زبان قرار دیئے جانے کے لئے شور مچانے والے سب اپنے بچوں کو ہندی اور انگریزی پڑھا رہے ہیں۔ جب ہم خود اُردو کے علمبردار اُردو کے سلسلے میں ایماندار نہیں ہیں تو پھر اُردو کیسے زندہ رہ سکے گی۔ اس لئے ہمیں اُردو کی تعلیم کو ابتدائی اسکولوں سے لے کر کالجوں تک شروع کرانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔ خواہ اس کے لئے اُردو اکاڈمی کے سالانہ بجٹ کا زیادہ تر روپیہ اسی کام پر ہی کیوں نہ خرچ کر دیا جائے۔

امید ہے کہ دلی اُردو اکاڈمی کی تعلیمی سب کمیٹی اس سلسلے میں کوئی ٹھوس قدم اٹھائے گی تاکہ راجدھانی میں اُردو پڑھانے کے انتظامات معقول ہو سکیں۔

ہمیں یقین ہے کہ مندرجہ بالا معروضات پر دلی اُردو اکاڈمی کے ذمہ دار ارکان پوری پوری توجہ فرمائیں گے اور جس بے لاگ خلوص کے ساتھ ہم نے یہ معروضات پیش کی ہیں اسی خلوص دل کے ساتھ ان پر عمل کیا جائے گا۔

سرمایۂ بلاغت

علم بلاغت و عروض پر ایک
شاندار ادبی دستاویز

پنڈت رتن پنڈوروی

۴۰/- روپے

کویت بزم سخن کی
انعامی طرحی غزلوں کا فیصلہ

جناب سید وحید فرید قریشی سحرؔ اکبرآبادی جنرل سکریٹری کویت بزم سخن کویت اپنے گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ جوشؔ اور ساحرؔ ایوارڈز کے لئے جن طرحی غزلوں کا انتخاب کیا گیا ہے وہ اس خط کے ساتھ بذریعہ رجسٹری روانہ کی جا رہی ہیں۔ تاکہ آپ ماہنامہ شانِ ہند میں اس کا اعلان کر سکیں۔ انعامات کی تقسیم کے سلسلے میں ہم فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے ساتھ پروگرام ترتیب دیں گے اور آپ کو باقاعدہ مطلع کریں گے۔

غزلوں کے اس انتخاب سے کویت بزم سخن کی انتظامیہ اور سرپرست جناب جگل والا صاحب کو بھی اتفاق ہے۔

۱۔ مصرعِ طرح: ع پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی
- ۱۔ جناب نسیم حیرتی دہلی
- ۲۔ جناب آبر سرہندی سرہند (پنجاب)
- ۳۔ جناب ناز مانکپوری جونپور۔ یوپی

۲۔ مصرعِ طرح: ع دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
- ۱۔ جناب قمر مرادآبادی ۔ مرادآباد ۔ یوپی
- ۲۔ جناب نعیم انور بھوپالی ۔ جہانگیر آباد (بھوپال)
- ۳۔ جناب آبر سرہندی صاحب سرہند (پنجاب)

اس سلسلہ میں وزیراعظم ہند یا پریذیڈنٹ آف انڈیا کی خدمتِ عالیہ میں بھی باقاعدہ درخواست کی جا رہی ہے تاکہ یہ انعامات ان مکینہ مقام شخصیتوں میں سے کسی ایک کے ہاتھوں سے تقسیم کرائے جا سکیں۔ انشاءاللہ ماہِ جون کے شمارے میں مفصل طور پر اعلان شائع ہو سکے گا۔

سترِ مغفرت
منظوم ترجمہ شریف گیتا
پنڈت رتن پنڈوروی
۱۲/- روپے

حضرت نازش حیدری دہلوی (مرحوم)

۱۴ فروری ۱۹۸۵ء کو نازش حیدری دہلوی مرحوم کی پہلی برسی کے موقع پر دفتر "شانِ ہند" میں نیاز مندانِ نازش حیدری تشریف لائے اور نازش صاحب کی یاد میں شعری نشست کا اہتمام کیا گیا۔ ذیل میں حضرت نازش حیدری کی تین غزلیں ملاحظہ فرمائیے۔ جنہیں سلام ساگری نے بھجوایا ہے۔ (ادارہ)

شہر میں تنہا ہوں میں لذت کشِ آزارِ دوست
مجھ سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کوئی شہکارِ دوست

مسکراہٹ کی ضیا کرنیں طلوعِ مہر کی
پھول کھلنے کا عمل آئینۂ گفتارِ دوست

اس حرارت سے ابھی تک ہے رگوں میں خون گرم
ہلکی ہلکی آنچ دیکھی تھی سرِ رخسارِ دوست

وقت تھک کر سو گیا ہے ٹھنڈی چھاؤں میں
گردشیں ٹھہری ہیں زیرِ سایۂ دیوارِ دوست

سوچیے تو کتنی صدیوں کا سفر درکار ہے
دیکھیے تو کس قدر نزدیک ہے دیوارِ دوست

وقت کا فرمان نازش ٹل نہیں سکتا کبھی
سب کی قسمت کا نوشتہ ہے سرِ دیوارِ دوست

ہر چیز حسین و رنگیں تھی ہر ذرہ یہاں تابندہ تھا
تھی اپنی جراحت پر دنیا دل میرا جب تک زندہ تھا

محرومِ ملاقات اس سے رہے نزدیک نہیں تھا جو خود سے
ہم جس کو اپنا کہہ نہ سکے شہرِ دل کا باشندہ تھا

کچھ نوشتۂ زمانہ پا نہ سکا میں اپنے کسی کام آ نہ سکا
دنیا مجھ سے شرمندہ رہی دنیا سے میں شرمندہ تھا

الجھا قدم دیتا تھا جب پاؤ گے سکوں مستقبل میں
جب حال نے ماضی کو بدلا مستقبل پھر آئندہ تھا

ایسے میں بلاتا کوئی آفاق کی گردش کو ساقی
ہر جرعۂ صہبا دیدہ میں تھا ہر پیمانہ رقصندہ تھا

ملتا تو اسے ویرانے میں تو والۂ صحرائے ملا
صحرا کی ہوا کا ہر جھونکا صحرا میں کیا جوئندہ تھا

شاد در محبت کیف آور ہر سانس تھا موج سے نازش
ہر راہ وصلی موسیقی میں ہر حادثہ تھا سازندہ تھا

ماحول کے سکوت سے اکتا رہے ہیں لوگ
پھر کوئی حادثہ ہو کہ گھبرا رہے ہیں لوگ

شاداب ہیں کہ غم کی ہوا کھا رہے ہیں لوگ
شعلوں میں رہ کے پھول کھلا رہے ہیں لوگ

گھبرا کے دے دیا ہے ستاروں نے راستہ
حکمت سے آسماں کی طرف جا رہے ہیں لوگ

ٹوٹی ہیں آج شیشۂ تسلیم کی حدیں
ہنس ہنس کے حادثات سے ٹکرا رہے ہیں لوگ

افسردہ ولولے سے چہروں کے باوجود
گلزارِ کائنات کو مہکا رہے ہیں لوگ

ہوتی ہے ہمکلام فضائے خموش بھی
فطرت کے ہر غرور کو لچکا رہے ہیں لوگ

یہ چلتے پھرتے عکس ہیں کچھ دیر کے لیے
فطرت کے آئینے میں نظر آ رہے ہیں لوگ

کیا غم رہِ طلب میں جو سر پر ہے آفتاب
قدموں میں اپنے سایہ لیے جا رہے ہیں لوگ

امید کے چراغ بھی نازش بھڑک اٹھے
کرنوں کی آس روحِ صحرا پا رہے ہیں لوگ

پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر دیا پرکاش سرور نے خواجہ پریس جامع مسجد دہلی میں چھپوا کر شہ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی سے شائع کیا

محمد یوسف پاپا
24-C، جامعہ اسٹاف کوارٹرس
جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

ادبی طوائف اور طبلچی نقاد

(اس مضمون سے میرا منشا، کسی کی دل آزاری اور بے عزتی ہرگز نہیں۔ میں نے تعمیری اور اخلاقی جذبے کے تحت یہ مضمون لکھا ہے۔)

طوائف، رنڈی، کسبی یہ ایسے الفاظ ہیں جو ہر ادب اور زبان میں ملتے ہیں۔ یہ الفاظ ان عورتوں کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں جن کا ذریعہ معاش، ناچ گانا یا جسم فروشی ہے ناچ گانا ایک نمبر کا کام کہا جاسکتا ہے اور جسم فروشی دو نمبر کا۔ دو نمبر کا کام اب بھی بُرا مانا جاتا ہے۔ لیکن ایک نمبر کا کام (ناچنا گانا) اب تو فن بن گیا ہے۔ اس لئے ایک نمبر کا کام کرنے والی طوائفیں فن کار بن گئی ہیں۔ ممکن ہے کچھ انٹلکچولز INTELLECTUALS کے نزدیک دو نمبر کا کام بھی فن ہوگیا ہو۔ فن اس لئے ہوسکتا ہے کہ اس میں بھی مختلف آسن ہوتے ہیں جن کا ذکر کوک شاستر میں وضاحت کے ساتھ بالتصویر ملتا ہے۔ نمبر دو کا کام کرنے والی طوائفیں ہمیشہ بُری نگاہ سے دیکھی گئی ہیں۔ لوگ اجالے میں ان کے محلے سے گزرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ خیر اب تو گورنمنٹ نے دو نمبر کے کام پر پابندی لگادی ہے اور اسے غیر قانونی قرار دے دیا ہے۔ صرف ایک نمبر والیوں کے محلے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو نمبر کا کام پورے معاشرے میں پھیل گیا۔ اس کی دسترس چھوٹے بڑے ہوٹلوں سے لے کر گھر تک ہے۔ اس کام کو بڑھاوا دینے والے ہمارے کچھ نام نہاد دانشور ہیں۔ جو اسے بُرا نہیں سمجھتے۔ سادہ لوح عورتیں سمجھ رہی ہیں کہ نمبر دو کے کام سے ان کا رتبہ اونچا ہورہا ہے اور وہ بھی سوسائٹی میں انٹلکچولز مانی جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ گھریلو عورت اور نمبر دو کا کام کرنے والی عورت میں امتیاز مشکل ہوگیا ہے آج بھی معاشرے میں نمبر دو کا کام پردے میں ہوتا ہے۔

جو باقاعدہ طوائفیں ہوتی تھیں اور نمبر دو کا کام کرتی تھیں ان کا الگ ایک محلہ ہوتا تھا۔ ان کی اپنی ایک تہذیب تھی۔ ان کے اپنے اصول تھے۔ لیکن کہیں کسی محلے پر یہ بورڈ نہیں لگا رہتا تھا کہ یہ طوائفوں کا محلہ ہے یا یہ طوائف کا گھر ہے۔ بلکہ یہ علم سینہ بہ سینہ چلتی تھی۔ ان کی زبان شستہ اور انداز بہت ہی شائستہ ہوتا تھا۔ آپ تشریف لے جاتے تو بڑے اہتمام سے آپ کو بٹھاتیں پان پیش کرتیں۔ آپ جس خواہش کے تحت جاتے وہ پوری کی جاتی ان کی شائستگی کا یہ عالم تھا کہ لوگ اپنے بیٹوں کو تہذیب سیکھنے کے لئے ان کے گھر بھیجتے تھے لیکن احتیاط کا یہ عالم تھا کہ کسی اخبار میں ان باتوں کا اشتہار نہیں نکلتا تھا۔ بڑی بڑی مشہور طوائفیں گزری ہیں جیسے جانکی بائی چھپن چھری، گوہر جان، تخیلی طوائف امراؤ جان ادا وغیرہ وغیرہ۔ ان کے کام بیشک قابل ملامت اور لغزیں تھے۔ اور ہیں۔ لیکن بہت ہی خاموشی اور سلیقے سے ہوتے تھے۔ بے حیائی حیا کے اندر تھی۔ سڑک پر نہیں آئی تھی۔

طوائفوں کا وجود معاشرے میں کیونکر ہوا۔ اس کی بہت سی وجوہات ہوسکتی ہیں مثلاً غربت، شادی کی دشواریاں، غنڈوں کے ذریعہ پیدا کی گئی مجبوریاں وغیرہ وغیرہ۔ یہ پیشہ کسی عورت نے آج تک شوق یا ہابی کے طور پر اختیار نہیں کیا۔

طوائفیں اس پیشہ کو ہمیشہ گھناؤنا اور غلط سمجھتی رہیں۔ جب بھی انہیں موقع ملتا تھا فوراً اس پیشے سے تائب ہوکر معاشرے کی ایک شریف رکن بن جاتی تھیں۔ لیکن ان طوائفوں کے علاوہ اب ایک نیا گروہ پیدا ہورہا ہے۔ جو شوق کے تحت اس پیشے میں آتی ہیں ان میں اکثر پڑھی لکھی ہوتی ہیں۔ شاعری کرتی ہیں۔ مشاعرے پڑھتی ہیں۔ مضامین لکھتی ہیں۔ کتابیں چھپواتی ہیں۔ انھیں ادبی طوائف کہتے ہیں۔ ادبی طوائفوں اور روایتی طوائفوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ روایتی طوائفیں نمبر دو کا کام پردے میں کرتی تھیں۔ ادبی طوائفیں سرعام کرتی ہیں یا کرنے کی خواہشمند ہیں۔ روایتی طوائفیں شائستہ اور مہذب ہوتی تھیں۔ ادبی طوائفیں بد تمیز اور منہ چڑھی ہوتی ہیں۔ بولتے وقت روایتی طوائفوں کے منہ سے پھول جھڑتے تھے ان کے منہ سے گالیاں جھڑتی ہیں۔ جن کو سن کر طبلچی نقاد

بدمست ہو جاتا ہے۔ ان کا ملنے کا انداز فنکارانہ ہوتا تھا لوگوں کی طبیعت خوش ہو جاتی تھی۔ ادبی طوائفوں سے ملئے تو ایسا لگتا ہے کہ کسی ناعورت سے مل رہے ہیں۔ بظاہر عورتوں کی ساری جسمانی چیزیں ان کے پاس ہوتی ہیں لیکن انداز مردوں اور عورتوں کے بیچ میں آجاتا ہے۔ ہمیشہ جلوں میں اپنے کو مذکر بولتی ہیں۔ روایتی طوائفوں کے یہاں اپنے پیشے کی ترقی کے لئے کسی طرح کی پبلسٹی وغیرہ نہیں ہوتی تھی۔ ادبی طوائفوں کے یہاں اشتہارات دئے جاتے ہیں کتابیں نکالی جاتی ہیں۔ وہ اپنے پیشے سے متنفر تھیں۔ انھیں اپنے پیشے پر گھمنڈ ہے۔ روایتی طوائفوں کے یہاں تربیت کے لئے لڑکے بھیجے جاتے تھے تو مہذب ہو کر نکلتے تھے۔ ادبی طوائفوں کے یہاں تربیت کے لئے کسی لڑکی کو دوپٹہ، قمیص اور شلوار پہنا کر بھیج دیجئے تو چار دن کے بعد وہ لڑکی سڑک پر صرف چڈی پہنے سگریٹ پیتی ہوئی چہل قدمی کرتی دکھائی دے گی۔ ہمارے طبلچی نقاد اس تبدیلی پر بہت خوش ہوں گے۔ اور فرمائیں گے کہ چار دن میں لڑکی کی کایا پلٹ گئی۔ کیا ڈھل کر نکلی ہے۔ مرزا رسوا کی ہیروئن امراؤ جان ادا میں عورت کا دل تھا۔ جب وہ گاتی تھی کہ

"مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی
اس کافر کی ادا یاد آئی"

تو دل کھچتا تھا۔ جب ادبی طوائف کچھ عجیب انداز میں اس طرح گاتی ہے کہ

"گولیاں کھا کے پاس آجاؤ
میرے دل کی لگی بجھا جاؤ"

تو دل کھچنے کے بجائے کوئی اور چیز کھچتی ہے۔ روایتی طوائفیں اپنے ایک سے کہتی تھیں "حضور تشریف لائیے سیج آراستہ ہے" یہ کہتی ہیں "اے آجا کمرے میں" (اور کمرے کا بھی کیا قید ہے) وہ مجبوراً اس پیشے میں آتی تھیں۔ ادبی طوائفیں خوشی خوشی سمجھ کر اس پیشے کو اختیار کرتی ہیں۔ اور بے حیائی کی بنیاد پر اپنے کو بہت اونچا سمجھتی ہیں۔ روایتی طوائفوں کے ساتھ غربت کی مجبوریاں ہوتی تھیں۔ ان کے ساتھ دولت کی فراوانی ہے ان کے یہاں شادی کی مجبوری رہتی تھی۔ کوئی شادی کرنے کو تیار نہیں ہوتا تھا ادبی طوائفوں کے یہاں شادی کی کوئی مجبوری نہیں۔ ہزاروں دولتمند تیار ہیں جس سے چاہیں شادی کریں۔ یہ شادی کر بھی لیتی ہیں۔ لیکن ان کے یہاں شوہر کی حیثیت اس زنجیر کی سی ہوتی ہے جو اونچے آدمی کے ڈیلوں میں لٹکی رہتی ہے اور ہر جلسی میں کھینچی جاتی ہے یعنی جب دل حسرت پوری کرنے کے لئے کوئی نہیں ملتا۔ تو بعد کراہت اور مجبوری اس فرض کی ادائیگی شوہر نامدار کے ذمہ کی جاتی ہے۔ روایتی طوائفوں کے یہاں پولیس اور غنڈوں کا بھی خطرہ رہتا تھا۔ ادبی طوائفوں کے یہاں پولیس اور غنڈوں کا کوئی خطرہ نہیں بلکہ انتظار رہتا ہے اگر اتفاق سے مل گئے تو پھر ان کی بھی خیریت نہیں۔ وہ دوبارہ اس گلی سے گزرنا چھوڑ دیتے ہیں اور ہر ایک سے کہتے پھرتے ہیں کہ اس گلی میں ایک خطرناک چیز رہتی ہے ادھر مت جانا ہم ذمہ دار نہیں۔ روایتی طوائفیں موقع ملنے پر اس پیشے سے نکل آتی تھیں اور شرافت کی زندگی گزارتی تھیں۔ ادبی طوائف کے یہاں واپسی نہیں ہے۔ ان کے نزدیک اس پیشے سے واپسی کا مطلب جنت سے دوزخ میں جانا ہے۔ روایتی طوائفیں ایک گوشے میں رہ کر اپنی عمر گزار دیتی تھیں۔ ادبی طوائفیں، طوائف الملوکی پیدا کرتی ہیں ادھر سے ادھر پوری دنیا میں "لو دیہی لو دیہی" کہتی بھاگتی پھرتی ہیں روایتی طوائفیں اپنے گاہکوں سے اجرت لیتی تھیں۔ ادبی طوائفیں اجرت لینے کے بجائے مناسب اجرت دیتی ہیں۔ ان سے سب سے زیادہ طبلچی نقاد فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ کماتی ہے اور وہ کھاتے ہیں۔ روایتی طوائفوں کے یہاں ایک معیار ہوتا تھا۔ ادبی طوائفوں کے یہاں معیار صرف اتنا ہے کہ جس نے بھی تعریف کی اس سے فرمایا "آجائیے"۔ ان کی ایک مخصوص بستی ہوتی تھی یہ گشتی ہوتی ہیں اور شہر شہر ہی نہیں ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرتی رہتی ہیں۔ روایتی طوائفوں کی فطری خواہش NATURAL URGE مر سی جاتی تھی۔ ادبی طوائفوں کے یہاں فطری خواہش اور زیادہ تندرست ہوتی ہے اور جب اٹھتی ہے تو اس وقت یہ اندھی ہوتی ہیں۔ جو بھی ملتا ہے اس پر کود پڑتی ہیں۔ یہ نہیں دیکھتیں کہ وہ کون ہے۔ ان طوائفوں کے یہاں ایک خاص آدمی ہوتا تھا ان کے یہاں یہ فرض طبلچی نقاد ادا کرتا ہے۔ روایتی طوائفوں کے

یہاں کام کے لئے ایک کمرہ مخصوص ہوتا تھا۔ ادبی طوائف کے یہاں روئے زمین کا ہر ٹکڑا کام کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے مثلاً سڑک، پارک وغیرہ وغیرہ۔ روایتی طوائفوں میں عورت پن ہوتا تھا۔ ان میں زنانہ پن ہوتا ہے۔ جیسے زنانے کے مزاج کے خلاف آپ نے کوئی بات کہی وہ فوراً ری ایکٹ (REACT) کرتا ہے اور لہنگا اٹھا کر کہتا ہے "لے دیکھ لے کیا رکھا ہے" "آپ کتنے بھی باہمت ہوں اُدھر دیکھ نہیں سکتے۔ اور اگر دیکھ لیں تو پتھر کے ہوجائیں گے۔ اس لئے بے حیا سے بے حیا بھی ان کے سامنے جانے سے ڈرتا ہے۔ ادبی طوائفیں بھی لہنگا اٹھا کر دنگ کردیتی ہیں۔ کبھی تحریری لہنگا اٹھاتی ہیں کبھی تقریری۔ جس سے سارے اعضاء خفیہ سامنے آجاتے ہیں۔ جس طرح لوگ مصورِ غم اور مصورِ فطرت وغیرہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ مصورِ اعضاء نہانی ہوتی ہیں۔ روایتی طوائفیں پان کھاتی تھیں ان کے منہ سے خوشبو آتی تھی۔ یہ سگریٹ پیتی ہیں اور شراب سے شوق فرماتی ہیں ان کے منہ سے تمباکو اور شراب کی بدبو آتی ہے روایتی طوائفوں کے یہاں جنریاتی بے حیائی تھی۔ ان کے یہاں جارحانہ بے حیائی ہے۔ روایتی طوائفوں کے یہاں صرف جسم فروشی تھی۔ ان کے یہاں جسم کے ساتھ ساتھ ضمیر فروشی بھی ہے۔

ہر دور میں تقریباً ہر شاعر نے دو طرح کی شاعری کی ہے۔ ایک نمبر ایک کی شاعری اور دوسری نمبر دو کی شاعری۔ نمبر ایک میں عام اور تہذیب کے اندر کی شاعری آتی ہے۔ نمبر دو میں غیر مہذب اور ریرنا ف قسم کی شاعری آتی ہے۔ جو چھاپی نہیں جاتی۔ خاص محفلوں میں سنائی جاتی ہے۔ جس کے اشعار سینہ بہ سینہ چلتے ہیں۔ نمبر دو کی شاعری کے مشہور شاعر لکھنؤ کے رفیع احمد خاں گزرے ہیں۔ جن کے دوہا اشعار آج تک لوگوں کو یاد ہیں لیکن آج بھی کوئی اُنہیں چھاپنے کی جرأت نہیں کرتا۔ جوش نے بھی دو نمبر کی شاعری کی ہے۔ ایسے ایسے بلیغ اشعار کہے ہیں کہ یہ ادبی طوائفیں کیا کہیں گی۔ ادبی طوائفوں اور اچھے شاعروں میں یہ فرق ہے کہ یہ دو نمبر کی شاعری کو شوق سے چھپواتی ہیں۔ ہر جگہ سناتی ہیں اور طبلچی نقادوں سے دادِ تحسین وصول کرتی ہیں اچھا شاعر یہ کام نہیں کرتا اسے طبلچی نقاد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بیوی اور شوہر کے تعلقات کو دنیا جانتی ہے۔ لیکن شب کی تنہائی میں بیوی اور شوہر کے درمیان جو کچھ بھی ہوتا ہے۔ شوہر یا بیوی میں سے کسی کو بھی جرأت نہیں کہ جو کچھ ہوا ہے اسے برسرِ عام بیان کرے۔ ممکن ہے اپنے بہت ہی قریبی دوستوں کے اصرار پر تنہائی میں کچھ باتیں بتائے۔ لیکن اس طرح کی شہوانی کیفیات کو اعلیٰ درجے کی شاعری بنا کر پیش کرنا کہاں کی انسانیت اور کون سا کمال فن ہے۔ ادبی طوائفوں کی شاعری کا محور یہی جنسی تشنگی اور بھوک ہے۔ جس کا ڈھنڈورا سرِ عام پیٹا رہا ہے۔ اگر کوئی لڑکی کم عمری میں جنسی بے راہ روی کا شکار ہو گئی ہے۔ تو اس کی جنسی پیاس عمر بھر تک نہیں ملتی۔ اس کے لئے لوشن فور آور سروس Twenty four hours service کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی کیفیت ادبی طوائفوں کی ہے۔ یہ بے حیائی کے جس معیار تک پہنچی ہیں۔ سب جانور بھی اس بلندی تک نہیں پہنچ پاتے ہیں۔ کچھ بد جانور ضرور ایسے ہیں جو اس فعل کو سرِ عام کرتے ہیں اور انہیں ذرا بھی غیرت نہیں آتی۔ دوسرے جانور جیسے ہاتھی۔ شیر سانپ وغیرہ کی حمیت کا یہ حال ہے کہ جفتی کے وقت کوئی آدمی پہنچ جائے تو اسے زندہ نہیں چھوڑتے۔

اب میں چند اقتباسات کے ذریعہ اپنی بات کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں اور فیصلہ پڑھنے والوں پر چھوڑتا ہوں کہ جن کے یہ اقتباسات ہیں وہ کس کیٹیگری میں آتی ہیں۔ ایک شاعرہ کہتی ہے۔

لاؤ ہاتھ اپنا لاؤ ذرا

. . . .

ناف کے اس طرف
اس کی جنبش کو محسوس کرتے ہو تم؟
بس نہیں چھوڑ دو

. . . .

میرے اندر اندھیرے کا آسیب تھا
زیست کے ذائقے کو ترستی ہوئی

. . . .

تو نے اندر مرا اس طرح بھر دیا۔

. . . .

اس نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعرہ حاملہ ہے۔ لیکن ایسا لگتا ہے

کہ دنیا میں پہلی مرتبہ صرف یہی حاملہ ہوئی ہے اور بقیہ ساری عورتیں بس یوں ہی ہیں۔ حاملہ ہر شادی شدہ یا غیر شادی شدہ عورت ہو سکتی ہے۔ لیکن شریف عورت سرِ عام یہ فرمائش نہیں کر سکتی کہ "لاؤ ہاتھ اپنا زیرِ ناف ٹٹولو اور ایک خاص مقام پر لا کر روک دو۔" اس طرح کی فرمائش اگر ملک کی سب عورتیں کرنے لگیں اور مرد ان کی فرمائش پوری کرنا شروع کر دیں تو پوری قوم کے ہاتھ زیرِ ناف پھنس کر رہ جائیں گے۔ ملک کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ رپورٹر آئے گا اخبار میں نکلے گا کہ "فلاں ملک کے سارے مرد عورتوں کے زیرِ ناف ہاتھ ڈالے بیٹھے ہیں۔ بہت ہی عبرت کا مقام ہے مدد کی ضرورت ہے" یو این او کی طرف سے ریزولیوشن آئے گا کہ "ہم آپ سے استدعا کرتے ہیں کہ اپنے ہاتھ وہاں سے ہٹائیے اور جہاں پہلے تھا وہیں لائیے" بہت سے ممالک سے عطیات آئیں گے اور یہ کیا جائے گا کہ "فلاں ملک کے سارے ہاتھ زیرِ ناف مصروف ہیں ان کی مدد ہر ملک کا فرض ہے ورنہ پوری قوم بھوکوں مر جائے گی۔" اب ہاتھ ناف کے نیچے سے باہر آیا تو جذبات سے مغلوب ہو کر وہ فرماتی ہیں "ان انگلیوں کو مجھے چوسنے دو چاٹنے دو۔" آپ نے جانوروں کو چاٹتے ہوئے دیکھا ہوگا کتنی بھیانک شہوت رستی ہے۔ پوری قوم کو جانور بنانے کا نسخہ ہے۔ اس سے آگے کہتی ہے کہ "زیست کے ذائقے کو ترستی تھی میں" یہ لائن چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کہ صرف شوہر سے کام نہیں چلے گا ہر روز وہی دال۔ وہی دال یہ کیا بات ہوئی جب تک دس بیس قسم کے ذائقے ہر روز حاصل نہ کئے جائیں بات نہیں بنتی۔

اس پر ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ایک فقیر تھے مانگ کر کھاتے تھے۔ ایک صاحب نے انھیں مدعو کیا۔ وہ گئے ڈٹ کر کھایا۔ کچھ دیر کے بعد میزبان نے دیکھا کہ میاں صاحب کسی دوسرے کے گھر بیٹھے کھا رہے ہیں۔ پہلے میزبان نے کہا کہ میاں ابھی تو آپ میرے گھر سے کھانا کھا کر آ رہے ہیں۔ یہاں پھر بیٹھ گئے کھانے کے لئے۔ میاں صاحب نے فرمایا "بھیا جب تک دس گھر کا چاشنا نہ لوں میری طبیعت نہیں بھرتی۔ کہیں چٹنی مل گئی۔ کہیں اچار مل گیا۔ کہیں گوشت مل گیا۔ کہیں دال مل گئی۔" یہی حالت ادبی طوائفوں کی ہے۔ ان کی شاعری بھی مختلف ذائقوں کی متلاشی ہے۔ ایک گھر سے انھیں تسکین نہیں ہوتی۔ آگے فرماتی ہے "تم نے اندر مرا اس طرح بھر دیا" اس لائن سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کے اندر جو خلا تھا جس کو بذریعہ مرد بھر دیا گیا ہے۔ اب وہ زمین کا نقش ہو گئی ہے۔ اس مطلب کے علاوہ دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہر پڑھنے والے کے دل میں یہ حسرت ہوگی کہ کاش وہ اندر بھرنے والا میں ہی ہوتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر نوجوان جس کو بندوق میں کارتوس بھرنا چاہئے ملک کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ وہ کسی نہ کسی کے اندر کچھ نہ کچھ بھرنے کا متمنی رہے۔ جب نوجوانوں کو اس طرح کی آسانیاں فراہم ہو جائیں گی تو وہ بندوق کی طرف کیوں جائیں گے۔ شاعرہ دوسری نظم میں فرماتی ہے۔

یہ کیسی لذت ہے جسم شل ہو رہا ہے میرا
یہ کیا مزہ ہے کہ جس سے ہے عضو عضو بوجھل
یہ کیوں کیا ہے کہ سانس رک رک کے آ رہا ہے
یہ میری آنکھوں میں کیسی شہوت بھرے اندھیرے اتر رہے ہیں
لہو کے گنبد میں کوئی در ہے کہ وا ہوا ہے...... وغیرہ وغیرہ

ان لائنوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی شخص شاعرہ کے ساتھ مصروفِ کار ہے۔ وہ لذت اندوزی کے ساتھ ساتھ کمنٹری بھی کرتی جا رہی ہے کہ اب یہ ہو رہا ہے اب وہ ہو رہا ہے۔ اور پڑھنے والے کو وہ لطف حاصل ہو رہا ہے کہ حقیقتاً وہی مصروفِ کار ہے۔ یہ طریقہ کارِ شہوت کے لئے انٹاکسیکیشن ہے اور اشتہار بھی۔ جو پڑھے گا سیدھا اس کے دروازے پہ جائے گا۔ لوگوں کی لائن لگ جائے گی سب دل کو پکڑے ہوئے اپنے نمبر کے انتظار میں کھڑے ہوں گے جسم کو فراغت کا موقع نہیں ملا وہ میرا جی کا نسخہ استعمال کرتا ہے اس طرح یہ شاعرہ پوری قوم کو قعرِ ذلت کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی قعر میں ڈھکیلنے کی خواہشمند ہے۔

ایک شاعرہ کی ایک نظم "شب خون" میں چھپی تھی جس کی پہلی اور آخری لائن ملاحظہ ہو کہتی ہے "میں اپنی شرمگاہ پر منہ رکھ کر سونا چاہتی ہوں" "شب خون" کو یہ نظم بہت اچھی لگی اور پوری نظم کو کا غیر محفوظ کر لیا۔ ان کو اس نظم کے ساتھ اس کا اسپانسر بھی چھاپنا چاہیئے تھا تاکہ پوری وضاحت ہو جاتی اور "شب خون" کی تنقیدی بصیرت میں چار چاند لگ جاتے۔ ایک صاحب نے ایک دفعہ ایسا ہی ایکسپلینیشن دیا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ "مجھے ایسا محسوس

ہوتا ہے کہ جیسے پوری دلی میری نظر نگاہ میں گھس گئی ہے۔ ان کے ایک ساتھی نے اپنی نامناسب جگہ میں قیام کو تکلیف دہ سمجھتے ہوئے ان سے استدعا کی کہ "بھیّا مجھے نکال دے"۔ یہ بات ان کے ساتھی نے دوسرے ساتھیوں سے بھی کہہ دی۔ وہ بھی آئے اور درخواست کی کہ سنا ہے آپ نے فلاں صاحب کو نکال دیا ہے مجھے بھی نکال دیجئے۔ اس طرح درخواست گزاروں کی لائن لگ گئی جب وہ نکالتے نکالتے تھک گئے تو اپنے ساتھی سے بہت خفا ہوئے کہ یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے اب میں کسے کسے نکالتا پھروں۔ اسی طرح اگر لوگ اس شاعرہ کے پاس ہمدردی کے تحت پہنچیں اور کہیں کہ آپ منہ بنا لیجئے ہم حاضر ہیں۔ دو چار حاضری تک تو کوئی بات نہیں لیکن اس کے بعد کیا ہوگا۔ اگر آپ سنجیدگی سے تجزیہ کریں تو یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ حیا کی دیویوں کا اس قسم کی شاعری کرنا اور وہ یہ کہ اسے چھپوانا اور محفلوں میں پڑھتے پھرنا ذہنی دیوالیہ پن کے علاوہ اور کچھ نہیں ورنہ آپ بتائیے کہ پیشاب اور پاخانے پر منہ رکھ کر سو جانا ادب کی کون سی خدمت ہے مجھے اس قسم کی شاعری چھاپنے والے رسائل اور اس قسم کی شاعرات کی تعریف میں رطب اللسان طبلچی نقادوں پر اس لئے غصہ آتا ہے کہ وہ ذہنی عیاشی غلیظ دماغی اور شاطرانہ سازشی چالوں کے ذریعہ ہر بات پر مشرقی طبلے کی تھاپ کے ساتھ عورت اور اس کے توسط سے معاشرے کا استحصال کر رہے ہیں۔ اور عورت کی سادہ لوحی اور اس کے نام نہاد حامیوں کی کم عقلی پر رونا اور ترس آتا ہے جو عورت کے استحصال کا ڈھنڈورا سارے دنیا میں پیٹ رہے ہیں لیکن تعریف کا سہرا چپکا کر استحصال کرنے والی ایجنسیوں کی جانب ان کی نظر نہیں جاتی۔ یہ کیسی ستم بازی نہیں؟ اب آپ خود سمجھئے کہ یہ ایسا ایکسپلائٹیشن ہے جس کے تصور سے بہتوں کو ابکائی آ جائے اور بات قے تک پہنچے۔

ہمارے طبلچی نقاد اسے بڑی محنت سے سراہتے ہیں۔ اس لئے کہ انھیں بھی بدبو ہی پسند ہے۔ جیسے ایک صفائی کرمچاری کہانی میں غلاظت لئے ہوئے ایک عطار کی دکان سے گزرا۔ خوشبو کے اثر سے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ جب اسی کے سامان سے تھوڑی سی چیز سنگھائی گئی تو پھر اسے ہوش آیا اور ناک بند کئے ہوئے بھاگا۔ طبلچی نقاد بھی غیر بدبو والی شاعری سن کر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔

ایک شاعرہ فرماتی ہے

مجھے موج موج بدن کی بے چینیوں سے
مغلوب ہونے کی وحشت دیوانہ کئے ہوئے ہے
مگر ہمارے ملک میں انسانوں کو پیار کرنے اور پیار کرتے دکھانے
کی اجازت نہیں ہے۔
اسی لئے تو آستین سے ناک صاف کرتے بچے نالی پر بیٹھی لڑکی
کو دیکھ کر باولوں کی طرح ہنستے ہیں۔

اسی انداز کی باقی سب لائنیں ہیں۔ اس نظم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاعرہ کے ملک میں مرد عورت، بڈھے بڈھیاں، لڑکے لڑکی جوان لڑکے جوان لڑکی کو سرعام سڑک پر سب کے سامنے مباشرت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ انہیں یہ تکلیف ہے۔ کوئی ملک ایسا نہیں ملے گا جہاں ماں باپ اپنے بیٹے اور بیٹیوں سے پیار نہ کرتے ہوں بھائی اپنے بہن سے نہ پیار کرتا ہو۔ بیوی اپنے شوہر سے پیار نہ کرتی ہو۔ جوان مرد، جوان عورت سے پیار نہ کرتا ہو۔ لیکن یہ پیار ان کے نزدیک پیار نہیں ہے۔ بلکہ اس کے نزدیک مرد کے ساتھ سرعام سڑک پر مختلف آسنوں کے ساتھ شہوانی جذبوں کی تشنگی دور کرنے کی نمائش کا نام پیار ہے ورنہ انہیں یہ شکایت کیوں ہوتی۔ سڑک پر بھی لوگ دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن دکھانے کے لئے خاص اسٹیڈیم ہونا چاہئے جس میں داخلہ بغیر ٹکٹ ہو۔ اس اسٹیڈیم میں شاعرہ اپنے عہد کے طبلچی نقادوں کے ساتھ جائے اور کرتب دکھائے۔ اسٹیڈیم کی دیواروں پر کوک شاستر اور کھجراہو۔ سب آسنوں کی رنگین تصویریں ہونی چاہئے۔ جس سے لطف دوبالا ہو جائے۔ یہ شاعرہ کے نزدیک انسان کا پیار ہے۔ لیکن شاید انہیں معلوم کہ اس قسم کے پیار کا تصور تو جانوروں کے پیار سے مستعار لیا جاتا ہے۔ سب جانور بھی نہیں کیونکہ ان میں کافی پیار دار بھی ہوتے ہیں۔ شاعرہ کی پیار کی برادری میں صرف بد جانور آتے ہیں جو اس کی منشا کے مطابق سب کے سامنے پیار کرتے ہیں۔ ایک بد جانور زیادہ ایڈوانسڈ ہوتا ہے اس کے یہاں ایک پیار کرتا ہے چار

لائن میں کھڑے انتظار کرتے ہیں ۔ شاعرہ بھی اسی تصور کی قائل ہے ۔ یہ پیار کی مخصوص دعوت کی قائل نہیں ۔ بلکہ پیار کا جھنڈا اڑانا چاہتی ہے ۔ جھنڈا ارا - دعوتِ عام کو کہتے ہیں جس میں ہر کس و ناکس شامل ہو سکتا ہے ۔ ادبی طوائفیں روسی تصور کی قائل معلوم ہوتی ہیں جن کے یہاں مباشرت کوئی خاص بات نہیں ہے ۔ یہ تو صرف جلد کا رگڑنا ہے جس طرح آپ جاڑے میں ہاتھ گرم کرنے کے لئے دونوں ہتھیلیاں رگڑتے ہیں ۔ اس سے بھی کم اہم ان کے یہاں شہواتی رگڑ ہے ۔ اس تصور کا آدمی اپنے کو انسان کہتا ہے اور اسے شرم نہیں آتی ۔ اسی تصور کو لئے ہوئے طبلچی نقاد ادبی طوائفوں کے پیچھے دھنیا دھا دھنیا سے بے خبر ان کا طبلہ بجاتا ہوا چلا جاتا ہے اور طبلے سے آواز آتی ہے ۔

"رینگ آف اسکن ۔ رینگ آف اسکن"

آگے یہ شاعرہ لڑکے اور لڑکیوں کو بھی اپنی گرفت میں لینا چاہتی ہے ۔ یہ چاہتی ہے کہ بچپن ہی سے لڑکوں کی جنسی دسترس لڑکیوں پر بھرپور رہے ۔ یہ لڑکوں کو آستین سے ناک پونچھ کر لڑکیوں کی طرف دیکھ کر پاگلوں کی طرح ہنسنا بالکل پسند نہیں کرتی ہے ۔ بلکہ یہ چاہتی ہے کہ لڑکے نالیوں پر بیٹھی لڑکیوں کو دیکھ کر ہنسنے کے بجائے وہ حرکت کریں جو نر جانور مادہ جانوروں کی شرمگاہوں کو سونگھ کر کرتے ہیں ۔

ان نظموں کے ہر ہر لفظ میں برہنہ اور گھناؤنی شہوت پرستی کوٹ کوٹ کر بھری ہے ۔ اس بے حیائی ۔ بدکرداری اور حیوانیت کو طبلچی نقاد ادب عالیہ کہتے ہیں ۔ اس موقع پر مجھے ساحر کی وہ نظم یاد آ رہی ہے جس میں اس نے ثنا خوانِ تقدیس مشرق کو للکارا ہے ۔ لیکن وہ تو صرف چکلوں کی زندگی کو دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا جہاں عیاش طبقے کے لوگ اپنا کوڑا خود ڈالنے جاتے تھے جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں کہ ان چکلے والیوں کی سماج میں کوئی عزت بھی نہیں تھی لیکن ادبی طوائفیں تو کھلول میں گندگی انڈیل کر معاشرے کو اور نسلوں کی تباہی کا وسیلہ بننے کے باوجود حاشیہ برداروں کی بدولت باعزت ہیں ۔ طبلچی نقاد ان کی غلاظت کو فن کا نام دے کر مذہب میں ڈھو

جاتا ہے اور وہاں سے فراڈ کی دم پکڑ کر نمودار ہوتا ہے ۔ اور ادبی طوائف کی بے ہودہ تحریر پر سر دھنتا ہے۔ "بریں عقل و دانش بباید گریست" ادب عالیہ کے اس تصور سے نوٹنکی کا ادب بھی یاد آ جاتا ہے ۔ ایک نوٹنکی میں جوکر اور اس کے ساتھ ناچنے والی ڈھیٹ گا رہے تھے ۔ لڑکی گاتی تھی ۔

بول ترا کیا ناؤں (نام) رے   ندی کنارے گاؤں رے
پیپل جھومے مورے آنگن   ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں رے

پھر جوکر گاتا تھا ۔

بول ترا کیا ناؤں رے   ندی کنارے گاؤں رے
کھٹ پتہ جب کھیلن لاگے   لے گئے داؤں رے

"کھٹ پتہ" "چارپائی کے تاش" کو کہتے ہیں ۔ اب احساس ہوا کہ وہ جوکر ادب عالیہ پیش کرتا تھا اگر یہ نظمیں ادب عالیہ میں آتی ہیں تو ان نظموں کو کہنے والیوں سے مدتوں پہلے نوٹنکیاں ادب عالیہ میں پیش کر چکی ہیں اور اب بھی پیش کر رہی ہیں ۔ لیکن طبلچی نقادوں نے ان پر کبھی کچھ نہیں لکھا ۔ ایسی شاعری اور تنقید دونوں جنسی ناآسودگی کا نتیجہ ہوتی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اپنی بھڑاس نکالنے کے لئے آپ سب کے سامنے ننگی کھڑی ہو جائیں اور تماش بین کی بھیڑ لگ جائے ۔ طبلچی نقاد ادبی طوائفوں کی شاعری کو باغیانہ شاعری کہتے ہیں میرے خیال میں یہ بغاوت انسانیت سے ہے اخلاقی قدروں سے ہے بلکہ اپنے آپ سے ہے ۔ معاشرے کی کسی خرابی سے نہیں ۔ اس بغاوت میں کوئی مثبت پہلو نہیں ۔ یہ کیسی بغاوت ہے کہ جس چیز کو دیکھنے اور برتنے کے لئے لوگ ہزاروں روپے خرچ کرتے ہیں ۔ وہ چیز آپ سرِعام ساری دنیا کو بغیر ٹکٹ دکھانا چاہتے ہیں ۔ اور دعوتِ عام دے رہے ہیں اس بغاوت سے تو ساری دنیا کا فائدہ ہے صرف آپ کا نقصان ہے ۔ اس سبب سے کہ عادت پڑ جائے گی اور جب حسن ڈھل جائے گا ۔ پھر کوئی نہیں پوچھے گا اور پیسے دینے کے باوجود گرفت میں نہیں آئے گا ۔ پھر کیا ہوگا یہ صرف طبلچی نقاد ہیں جو ادبی طوائفوں کو ایسی شاعری پر اکسا رہے ہیں ۔ اگر اس شاعری کے خلاف نعرۂ احتجاج

بلند نہ کیا گیا تو اس میں سیتا کی بیٹی کا سب سے زیادہ نقصان ہے۔ طبلچی نقاد قدم قدم پر مغرب کی مثال دیتے ہیں۔ بیشک مغرب بلکہ یورپ کے کچھ ممالک میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ لیکن ہمارے لئے تمام جانوروں کی پیروی ضروری تو نہیں ایک صاحب نے اپنا ذاتی تجربہ بیان کیا کہ سویڈن کے ایک صاحب اپنی بیوی اور اٹھارہ سالہ نہایت خوبصورت بیٹی کے ساتھ ان کو بھی لے کر چشمے پر غسل کرنے کے لئے گئے۔ جہاں حوض بنا ہوا تھا وہاں باپ، بیٹی اور بیٹی اور بیوی تینوں مادر زاد ننگے ان کے سامنے کھڑے ہو گئے اور فرمائش کرنے لگے کہ آپ بھی کپڑوں سے آزاد ہو جائیے۔ پھر نہائیں۔ اسے مغرب کی ترقی یافتہ تہذیب کہتے ہیں جو پتھر کے زمانے سے بھی پہلے کی ہے۔ مغربی لوگ دوبارہ جنگل کی تہذیب میں واپس چلے گئے ہیں۔ انسانیت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کے لئے وہ ٹھیک ہے لیکن جو معاشرہ ابھی تک بچا ہوا ہے۔ اسے تو بخش دو۔ لیکن طبلچی نقاد اس معاشرے کو بھی بد جانوروں کے معاشرے میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ طبلچی نقادوں سے دست بستہ درخواست ہے کہ وہ ادبی طوائفوں سے کہیں کہ وہ یورپ میں جا کر اپنی "دکان" کھولیں وہاں آسانی ہی آسانی ہے۔ اس معاشرے کو انسانی معاشرہ ہی رہنے دیں۔ اگر ان طبلچی نقادوں کو ادبی طوائفوں کی جدائی شاق گزرے تو ان سے بھی دست بستہ عرض ہے کہ اپنے الفاظ کے طبلے بجاتے ہوئے انھیں کے ساتھ چلے جائیں۔ وہاں جا کے تو ننگی رچائیں۔ ہمیں امید ہے کہ دونوں کے فن کی صحیح داد وہی قومیں دے سکیں گی۔ پھر ہماری ادبی طوائف کو افسوس اور شکایت کا موقع نہیں ملے گا کہ

"ہمارے ملک میں انسانوں کو پیار کرتے اور پیار کرتے دکھانے کی اجازت نہیں۔"

ودیا پرکاش سرود تولسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس حبشہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر دفتر شان ہند فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق

سردار دیوان سنگھ مفتوں کی سوانح حیات "ناقابلِ فراموش" کو ایک منفرد اور نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ کسی صف شکن مجاہد کی زندگی بکھری ہوئی ہے بلکہ اسے اردو صحافت کے طالب علموں کے لئے ایک گرانقدر اضافہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ایک قابل تقلید صحافی کی ساٹھ سالہ صحافتی زندگی اور تجربات کا نچوڑ پیش کر دیا گیا ہے۔ مفتوں صاحب نے اپنی اس طویل صحافتی زندگی میں مشکل سے مشکل حالات میں بھی کوئی ایسی تحریر پیش نہیں کی۔ جو ان کے ضمیر [illegible] آتی ہو اور آج کے نام نہاد صحافیوں کو ان کی زندگی سے سبق لینا چاہئے۔ جو ننگیاں چھاپتے ہیں اور دعوے کرتے ہیں کہ باوضو ہیں۔ اردو صحافت کے طالب علموں کیلئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ مفتوں صاحب کی زندگی تا ایک زمانے کے لئے چیلنج بنی رہی۔

ناقابلِ فراموش کی قیمت ساٹھ روپے

صحافیوں کو محصول ڈاک معاف۔

دفتر شان ہند۔ فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۲

دو بچوں کے درمیان
تین سال کا وقفہ رکھیئے
نرودھ
کاپر ٹی
کھانے کی گولی
کوئی بھی طریقہ اپنائیے

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹیو بینک لمیٹڈ

جہاں آپ کی رقم دوسرے کسی بھی بینک کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے بڑھتی ہے

* اب ۹٪ سالانہ سود حاصل کیجئے

چھ ماہ اور اس سے زائد لیکن ایک سال سے کم مدت کے لئے

* فکسڈ ڈپازٹ پر شرح سود

5	سال اور اس سے زائد مدت کے لئے	12٪	سالانہ
3	سال اور اس سے زائد لیکن 5 سال سے کم مدت کے لئے	۱۱٪	" "
2	سال اور اس سے زائد لیکن 3 سال سے کم مدت کے لئے	۱۰٪	سالانہ
1	سال اور اس سے زائد لیکن 2 سال سے کم مدت کے لئے	۹½٪	سالانہ

آپ اپنی رقم کو دوگنی اور تین گنی بھی کر سکتے ہیں۔
آپ کے ایک ہزار روپے چھ سال میں =/2033 بن جاتے ہیں۔
آپ کے ایک ہزار روپے دس سال میں =/3262 بن جاتے ہیں
یہ بینک دوسری کسی بھی تجارتی بینک سے کم نہیں۔
یہاں سے غیر ملکی زرمبادلہ کا کاروبار بھی ہوتا ہے

تشریف لائیے

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹیو بینک لمیٹڈ

36 نیتاجی سبھاش مارگ، دریا گنج، نئی دہلی - 2

فون: 268266 264374

ٹیلیکس: 31-5453 ZAIN IN

* ریزرو بینک کے احکامات کے مطابق کسی بھی وقت تبدیل کئے جا سکتے ہیں۔

گوشۂ عقیل صدیقی

آل انڈیا مشاعرہ مظفر نگر

کریم الاحسان فرید

مظفر نگر کی سالانہ نمائش کی تقریبات کے سلسلے میں ایک آل انڈیا مشاعرہ بھی ہوتا ہے چونکہ مظفر نگر نے د جاہت جھنجھانوی مولانا الم مظفر نگری، احسان دانش، شباب کیرانوی، ڈاکٹر تنویر علوی کیرانوی، نظیر کستولوی، مشیر جھنجھانوی، شوکت تھانوی ایسے اساتذہ کرام اور مشاہیر شعرا کو اہل ملک کے سامنے پیش کئے وہاں جنگ آزادی کے مجاہد پیدا کئے، اور بہادر جیالے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حافظ ضامن علی شہید، منور کرشاملی قاضی عنایت علی بھی اسی سرزمین سے اٹھے جنھوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں حصہ لیا آج اسی مقدس اور قابل احترام دھرتی پر یہ مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے اس مشاعرہ کو کامیاب کرانے میں ضلع کے حکام اور افسران بالا تک دلچسپی لیتے ہیں دو سال سے یہ مشاعرہ ایسے بڑے لوگوں کو سونپا جا رہا ہے جو بجوشی اس کا جملہ بار اٹھا لیتے ہیں امسال عبدالقیوم اور محمد عرفان مالک مون سن انجینئرز نے اس مشاعرہ کے تمام اخراجات خود برداشت کئے ہیں یعنی اردو دربار دلی اور سرحدی آج کارخانہ داروں، دھنا سیٹھوں کی سرپرستی میں پنپ رہی ہے لیکن یہ سرپرستی صرف مشاعرہ تک ہے یہ سب کاروباری باتیں ہیں ہر سرمایہ دار کسی مصلحت کے تحت اتنا خرچ برداشت کرتا ہے ورنہ اسے اردو کی تباہی و بربادی سے کیا دلچسپی ۔ !

آج ۳ر مئی ۸۵ء کی شب ہے میں ڈاکٹر عنوان چشتی تنویر چشتی اور برادرم نجم مظفر نگری کے ہمراہ عظمت باغ و تقسیم خانہ، یہ تمام جائداد وقف ہے اور کیا لطف ہے اس جائداد کا ایک حصہ نوے سال کے لئے پٹہ پر ایک سنیما کے مالک کو دے دیا گیا ہے اب یہ اللہ جانے یا کہنے والے کہیں یہ جائداد سرماد کر دی گئی ہے کیا شرعاً اوقاف کی جائداد کسی غیر شرعی کام کے لئے دینا جائز ہے ۔ ؟ اور وہ بھی سنیما کے لئے ۔ ؟) سے نمائش کے لئے پیدل ہی چل دئے ہیں بمشکل تمام یہ حضرات رکشا پر چلنے کو رضامند ہو گئے ہیں جبکہ ویسے ہی دیر ہو چکی تھی دیکھا تو پنڈال کے دروازہ پر ایک جم غفیر ہے ادھر مشاعرہ شروع ہو چکا ہے اندر جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے باہر سے چیخ چلا رہے ہیں لیکن کون سنتا ہے فغان درویش والا معاملہ درپیش ہے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے ایک داروغہ جی آئے انھوں نے ڈیوٹی پر تعینات ایک سپاہی سے کہا دروازہ کھولو اس طرح اندر جانے میں کامیابی ہوئی اسٹیج پر ابھی جگہ باقی تھی ۔ میں نے اپنے لئے جگہ ساد ھنا کھوٹے کے قریب ہی تجویز کر لی نظامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں پونے گیارہ ہو چکے ہیں جناب دیپک کمار اسٹیٹ منسٹر کو آپریٹو اتر پردیش کا نام نامی صدارت پیش کیا جا رہا ہے اور ساتھ ہی ان کی گلپوشی بھی کی جا رہی ہے پہلا جواں سال باہمت مون سن کے مالک عرفان صاحب کو بھی پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا گیا ہے کیمرہ والے حرکت میں آئے اختر گوالیاری نہ جانے کیوں مقامی شعراء کی طرح پڑھا دئے گئے ہیں حالانکہ یہ ان کا مقام نہیں تھا جس نے بھی یہ فہرست ترتیب دی ہے مراتب کا لحاظ نہیں رکھا دیکھا تو سادھنا کھوٹے صاحبہ جو کہ بمبئی ٹی۔وی۔ پر اناؤنسر ہیں اسی لباس میں شعراء کو مدعو کر رہی ہیں میں ان کے بہت ہی قریب بیٹھا ہوں وہ کیا کہہ رہی ہیں کچھ بھی تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے لیجئے انصاری دیوبندی کیف بھوپالی جیسے متحرک رہتے ہیں

> چاند سورج کو حسیں میں کہہ تو دوں
> طیش میں ان کا جواب آ جائے گا
> ہم نے بھی قاتل کو قاتل کہہ دیا
> دیکھئے اب کیا عذاب آ جائے گا

اس شعر پر یار لوگ آپ کو داد ہی نہیں دے رہے بلکہ بار بھی پہنا رہے ہیں ارشاد ہوا ہے۔ ؎

حالِ دل ان سے نہ کہنا اے شمیمؔ
روٹھ جائیں گے عتاب آ جائے گا

شمیم صاحب داد وصول کئے اپنی جگہ آ رہے ہیں اور اب اسلم الٰہ آبادی غزل سرا ہیں ؎

قاتلوں کے مجمع تک یہ خبر بھی پہونچا دو
میرے شہر میں بچے پھر جوان ہوتے ہیں
کچھ تو حالِ دل کچھ تو گفتگو کیجئے
راستوں کے سناٹے بدگمان ہوتے ہیں
بے غرض کسی سے بھی اب کوئی نہیں ملتا
مصلحت کے آئینے درمیان ہوتے ہیں

اسلم صاحب خوب خوب داد لوٹے انک سے جدا ہوا رہے ہیں اب جواں سال جواں فکر اور مترنم شاعر نجم مظفر نگری آ کر غزل سرا ہیں ؎

جو دل شکن ہو وہی، صورت مفر ٹھہرے
یہ حال ہو تو کہاں نقطۂ نظر ٹھہرے
مرے لئے تو برابر ہیں رہبر و رہزن
میں بے نیاز ہوں کوئی ہمسفر ٹھہرے
اب ان کے ہاتھ میں جو بھی ہو فیصلہ دل کا
میں کم نگاہ ہوں وہ صاحب نظر ٹھہرے

نجم صاحب بھی داد و تحسین پا کر آ رہے ہیں دیکھا تو ایک مذاق سر و سینہ با ریش مبارک مائک پر آ کر رواں دواں سنا کر چلتے بنے یہ طلیع عادل لکھنوی کا سن ہی لیجئے۔

ہے نہ ڈاڑھی اور نہ مونچھیں صرف سر کے بال ہیں
عورتیں اور بجلی ہیں مرد سب نقال ہیں

وہ دیکھئے اس جمود کو توڑنے کے لئے حق کانپوری آ گئے ہیں فوالشول کو نظر انداز کر کے محفل کو گرما رہے ہیں ؎

یہ ستارے سو نہ جائیں یہ سماں بدل نہ جائے
تری راہ تکتے تکتے مری جان نکل نہ جائے
ذرا دیر کو ٹھہر جا یہی گردشِ زمانہ
میری زندگی بدل کے کوئی خود بدل نہ جائے

پنڈال پر جدائی کیفیت طاری کر کے خود بھی جھوم کر فرما رہے ہیں ؎

حسن اپنا نہ بارِ دگر دیکھئے تک گئی آئینہ کی نظر دیکھئے
پہلے اپنی بساطِ نظر دیکھئے پھر زمانہ کے عیب و ہنر دیکھئے

لیجئے اب داد دینے والے پنڈال کو اڑانے کی ٹھان رہے ہیں اور آپ یوں سحرکاری کر رہے ہیں۔ ؎

اک نظر دیکھ لینا غضب ہو گیا آپ ہی آپ ہیں اب جدھر دیکھئے

داد کا وہی عالم ہے اور آپ اسی سج دھج سے محفل کو گرما رہے ہیں ؎

دل یہ کہتا ہے اسی شوخ کو دیکھ کر

محترمہ سادہ رضا صاحبہ ذرا ـــــ حق صاحب مسکرا کر فرما رہے ہیں۔ شعر لکھ رہی ہیں ـــــ مظہر صاحب ـــــ ضرور لکھیں لیکن ؎

اک نظر کچھ نہیں عمر بھر دیکھئے

لیجئے تالیاں جاگ اٹھی ہیں اور حق صاحب ایک اور ایک اور کے شور کو اڑاتے ہوئے مائک سے کھسک آئے ہیں اور صادق صابری فرما رہے ہیں ؎

رزق اللہ دیا کرتا ہے سرکار نہیں
صرف سرکار اسے بانٹ دیا کرتی ہے
دوسروں کا جو ہڑپ جائے یہ اس کا فن ہے
ہاں جو چلاّئے اسے ڈانٹ دیا کرتی ہے

پنڈال قہقہوں کے نرغے میں ہے اور صادق صاحب رواں دواں سے داد وصول کئے چلتے بنے چونکہ اس اطراف میں سادہ رضا صاحبہ پہلی بار آئی ہیں نہ وہ ادھر کے عوام کے مزاق سمجھتی ہیں نہ عوام ان کی زبان اور انداز کو پسند کرتا ہے زبان کا وہی لب لہجہ ہے جو ۷۰ء تک پر لے لئے وقت ہوتا ہے یہ دیہاتی سامعین کا مشاعرہ ہے ان کی شخصیت سے کوئی بھی تو متاثر نہیں ہوا اور مشاعرہ ہوٹنگ کی نذر ہو رہا ہے اس نازک حالت میں انور جلالپوری کو یہ زحمت دی جا رہی ہے کہ وہ اس مشاعرہ کو ڈوبنے سے بچائیں ان کا نام سن کر تالیوں سے ان کا خیر مقدم کیا جا رہا ہے ان کی گلپوشی کی جا رہی ہے سادہ رضا صاحبہ کا انتخاب برا نہیں تھا لیکن دیہال کامیاب نہیں ہوئیں ہر مشاعرہ کمیٹی یہی چاہتی ہے کہ ان کا مشاعرہ کامیاب ہو لیکن کبھی کبھی انتخاب غلط بھی ہو جاتا ہے آئیے پھر اسی محفلِ غزل میں چلئے اور عبدالحق سحر مظفر نگری سے یہ حسین غزل سنئے ؎

کرب کے رخ پہ آثار اپنی جگہ
درد سے پھر بھی انکار اپنی جگہ

رحمتوں کے طلب گار اپنی جگہ
اک پشیماں گنہگار اپنی جگہ

اب داد کا عالم کچھ اور ہی ہے سحر صاحب یوں سحرکاری کر رہے ہیں

فصل گل کی جدائی بہار چمن　　پھول اپنی جگہ خار اپنی جگہ
آج بھی منتظر سرفروشوں کی ہے　　اے سحر عظمت دار اپنی جگہ

سحر صاحب خوب خوب داد سمیٹے اپنی جگہ آ رہے ہیں اور اب مشہور انقلابی شاعر کامل شفیقی جونپوری آکر ایک نظم عطا کر رہے ہیں نظم پوری نہ کر سکے اور بے خودی کے عالم میں مائک سے جدا ہو رہے ہیں اور راز الہ آبادی یوں گلوکاری کا مظاہرہ کر رہے ہیں ؎

میرے خون کی سرخی کیسا رنگ لائی ہے
آج میرے قاتل کی آنکھ ڈبڈبائی ہے
وقت کے خداؤں کی یہ بھی ناخدائی ہے
آج عین ساحل پر ناؤ ڈگمگائی ہے

ادھر داد شباب پر ہے ادھر خمار صاحب ہاتھ لہرا کر چیخے ؏
یہ بھی میرا بھائی ہے وہ بھی میرا بھائی ہے

اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا ہے اور راز یوں زور آزمائی کر رہے ہیں ؎

کل منافقتوں کو بیعتا جو کہتا تھا　　آج اس کے ماتھے پر داغ بے وفائی ہے
یہ بھی اک تماشا ہے عالم محبت کا　　جرم تھا اس آنکھ کا چوٹ دل نے کھائی ہے

راز صاحب کامران پلٹ رہے ہیں اور سرور بارہ بنکوی غزل الاپ رہے ہیں ؎

اتنا ~~[illegible]~~ چھپایا ÷ صورت خانہ کعبہ تو اترائیے نہیں
بے پردہ میرے سامنے آ بیٹھیے ÷ یوں آئینہ سے آئینہ ٹکرائیے نہیں
وعدہ جو کیجیے تو خیال وفا رہے ÷ جھوٹی کسی کے سر کی قسم کھائیے نہیں
حضرت یہ ہم سے پوچھ اس تہذیب کا ÷ کم ظرف کیا بتائیں گے مستی شراب کی
حالت دیکھے دل خانہ خراب کی ÷ یاد آ گئی ہے جب بھی تہذیب شباب کی

سرور صاحب محفل کو گرما کر اپنی جگہ آ رہے ہیں اور شانتی صبا غزل سرا ہیں ؎

راز دل اپنا زمانے کو بتاتے کیوں ہو
میری تصویر زمانے کو دکھاتے کیوں ہو
لوٹ آؤ کہ در و بام بلاتے ہیں تمہیں
تم مرے شہر میں آئے ہو تو جاتے کیوں ہو

آپ اس بھونچال کا اندازہ نہیں کر سکتے جو دوسرے طرح پر پنڈال میں برپا ہو رہا ہے شگفتہ غزل پڑھنے والی تام [illegible] مجسم نغمہ ہیں ایک سماں بندھا ہوا ہے - اور آپ اسی بانکپن سے لہرا رہی ہیں ؎

رونے دھونے سے مقدر تو سنور نے سے رہا
بھیگی پلکوں پہ حسیں خواب سجاتے کیوں ہو
کوئی بھی شب مری قسمت میں سکون بخش نہیں
تم چراغوں کی طرح مجھ کو جلاتے کیوں ہو
جس کو پینے کا سلیقہ نہ پلانے کا شعور
ایسے کم ظرف کو محفل میں بلاتے کیوں ہو

اب یار لوگ پھولوں کی ورشا کرنے پر اتر آئے ہیں یہ تفریح بڑی دیر سے چل رہی ہے شاید انھیں معلوم نہیں ہے کہ اس خسلوہ میں ایسی ناشائستہ حرکت کبھی نہیں ہوتی ہے اور یہ محفل ادب بھی ہے دیکھا تو منظر بھوپالی محفل کا جائزہ لے کر غزل چھیڑ رہے ہیں ؎

زلف کے سائے میں زندگی گزاری ہے
دھوپ بھی تمہاری ہے چھاؤں بھی تمہاری ہے
بچ کے ہم کدھر جاتے اس سیاسی جنگل سے
اک طرف درندہ ہے اک طرف شکاری ہے

اب داد پر ہنگامہ کا گماں ہو رہا ہے اور اسی اعتماد سے لہرا رہے ہیں ؎

باپ بوجھ ڈھوتا تھا کیا جہیز دے پاتا
اس لئے وہ شہزادی آج تک کنواری ہے
کہہ دو میر و غالب سے ہم بھی شعر کہتے ہیں
وہ صدی تمہاری تھی یہ صدی ہماری ہے

منظر صاحب صبا کے لیے خوب خوب جچے اور خوب خوب داد و تحسین لوٹے مائک سے جدا ہو رہے ہیں ادھر فرحت احساس لوان دار سنا کر ہیجان اور وجد طاری کر رہے ہیں ایک شعر آپ بھی سنتے چلئے ؎

میں اک ذرا سا دیا ہوں وہ تیز آندھی ہے
میں اس سے ہار بھی جاؤں تو میری ہار نہیں

آئیے اب سلیم کھتولوی سے ان سنائی غزل سنئے ؎

ہمارا کسی جگہ ماتم نہیں ہے　　تمہاری آنکھ پھر بھی نم نہیں ہے

کوئی ساتھی کوئی ہمدم نہیں مگر خود اعتمادی کم نہیں ہے
شریفوں کا چلن اپنانے والو شرافت کی سزا بھی کم نہیں ہے
نقیبِ شہر سے پوچھو تو لوگو تری آواز میں کیوں دم نہیں ہے

سلیم صاحب داد وصول کئے اپنی جگہ لوٹے جا رہے ہیں اب کوئی بمبئی سے آئی ہوئی دیپا آ رہی ہیں میں نے محترم منظر صاحب سے عرض کیا یہ دیپ سے دیپا بنا ہے غالباً دیکھا تو دیپا صاحبہ کچھ سلیٹانی اسکو سرپٹا سنا رہی ہیں ؎

جب بھی دیپا مرا آشیانہ جلا اہلِ گلشن یہ سمجھے سحر ہو گئی

اسادریافت پر خطیر رقم برباد کی گئی ہے یہ بھی سادہ صاحب کے ہمراہ بمبئی سے چلی آئی ہیں یہ بھی نہیں ہیں ہوٹنگ کی تاب نہ لا کر پلٹ آئی ہیں۔ ادھر مقرب حسین مقرب بھی آج کوئی خاص رنگ نہ جما سکے اور انور جبلپوری اس منظر کو دیکھ کر خود ہی سنانے کے لئے آ گئے ہیں فرما رہے ہیں ؎

نہ بام و در نہ کوئی سائبان چھوڑ گئے
مرے بزرگ کھلا آسمان چھوڑ گئے
تمام شہر کے بچے یتیم کبھی تو نہیں
کھلونے والے جو اپنی دکان چھوڑ گئے
وہ جس کو پڑھتا نہیں کوئی بولتے سب ہیں
جناب میر بھی کیسی زبان چھوڑ گئے

انور صاحب داد و تحسین پا کر پھر زحمتِ سخن دے رہے ہیں مظہر رزمی کیرانوی کو — رزمی صاحب غزل سرا ہیں ؎

چراغِ شہرِ محبت بجھا دئے کس نے
ہر ایک راہ میں شعلے سجا دئے کس نے
نہ زلزلہ ہے نہ طوفان ہے اور نہ آندھی ہے
تو پھر یہ پیڑ اچانک گرا دئے کس نے
ہمارے ساتھ نہ تھا کوئی راہبر کے سوا
تو پھر یہ راہ میں کانٹے بچھا دئے کس نے

رزمی صاحب بھی داد پا کر اپنی جگہ آ رہے ہیں اور اب ترنم ناہیوری آکر تھوڑے سکوت کے بعد لحنِ داؤدی میں غزل چھیڑ رہی ہیں ؎

کلیوں کو حسن اور گلوں کو نکھار دے
اجڑے ہوئے چمن کو سامانِ بہار دے

گذر رہا ہے ایک عمر غموں کے حصار میں
دو چار دن خوشی کے بھی پروردگار دے
شایانِ اعتماد محافظ بھی اب نہیں
ایسا نہ ہو کسی کے سینے میں خنجر اتار دے

داد کا سانچہ ریکارڈ بھی اس ہنگامہ پر دیکھ رہا ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے کئی بار دہرا کر اسی سج دھج سے محفل کو لوٹنے چلی ہیں ؎

ہاں اے نیاز مند درِ بے نیاز پر
آواز دے رہا ہے تو پھر بار بار دے

ترنم صاحبہ کامران آ رہی ہیں اور اب تالیوں کے شور میں دیوبند کے جوان سال خوبرو خوش پوش خوش گلو شاعر نواز دیوبندی کیا آئے کہ فرمائشوں کا ایک علی غباڑہ ہے اور آپ غزل سرا ہیں ؎

رنج دے کے کیوں آخر مسکرا نہیں دیتے
تم صدا تو دیتے ہو حوصلہ نہیں دیتے
اب تو مان لیجئے وقت کا یہ فتویٰ ہے
حق طلب تو کرتے ہیں ہم دعا نہیں کرتے

دوسرے مصرعہ پر بھونچال سا آیا ہے اور نواز صاحب فاتحِ محفل بنے فرما رہے ہیں ؎

منزلیں تو خود اپنے عزم ہی سے ملتی ہیں
رہنما مسافر کو راستہ نہیں دیتے
کیا غضب کیا تو نے کمسنوں کے ہاتھوں میں
دل تو دل ہے آخر آئینہ نہیں دیتے

نواز صاحب داد لوٹے مائک سے جدا ہو رہے ہیں اور حبیب ہاشمی ایک سنی سنائی غزل الاپ رہے ہیں ؎

سورج کے خداؤں کی یہ کور نگاہی ہے
ظلمت میں اجالا ہے کلیوں میں سیاہی ہے
محسوس یہ ہوتا ہے یہ دورِ تباہی ہے
شیشے کی عدالت ہے پتھر کی گواہی ہے
دنیا میں کہیں ایسی تمثیل نہیں ملتی
قاتل ہی محافظ ہے قاتل ہی سپاہی ہے

لیجئے ضمیر داد نے بھونچال کو جنم دیا ہے السیہ پر ختم کر رہا ہوں اب حبیب صاحب سے اور کچھ نہیں سنا جائے گا اور

اس شعر کے بعد رد ہی کیا جاتا ہے ویسے وہ آٹھ جیسے صنعیں ہیں۔
صرف اس شعر نے جمایا ہے - آپ جا رہے ہیں ایک غزل سنانے
کے لئے کلکتہ سے آئے ہیں۔ دوسری غزل تو جب سنی جاتی جو پہلی
غزل کا کوئی اثر چھوڑتے۔ لیجئے ساغر خیامی وہی سنے سنائے
قطعات سنا کر چلتے بنے آئیے تو اس جمود کو توڑیئے اور راحت اندوری
سے سنیئے ؎

کبھی دماغ کبھی دل کبھی نظر میں رہو
یہ سب تمہارے ہی گھر ہیں کسی بھی گھر میں رہو
ہے اب یہ حال کہ در در بھٹکتے پھرتے ہیں
غموں سے میں نے کہا تھا کہ میرے گھر میں رہو

داد کا یہ پنڈال شکن دھماکا کم ہوا تو گرج رہے ہیں ؎

ہمیں چراغ سمجھ کر بجھا نہ پاؤ گے
ہم اپنے گھر میں کئی آفتاب رکھتے ہیں
یہ میکدہ ہے وہ مسجد ہے وہ ہے بت خانہ
کہیں بھی جاؤ فرشتے حساب رکھتے ہیں

پھر آہ اور واہ کا ایک شور سا شور رہے اور آپ للکار
رہے ہیں ؎

ابھی تو صرف پرندے شمار کرنا ہے
یہ پھر بتائیں گے کس کو شکار کرنا ہے
بہت غرور ہے تجھ کو اے سر پھرے طوفان
مجھے بھی ضد ہے کہ دریا کو پار کرنا ہے

اب داد دینے والے ہاتھ لہرا کر اچھل کود پر اتر آئے ہیں
اور آپ تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں جا رہے ہیں اور زبیر رضوی
تالیوں کی جھنکار میں آکر مجھے ترنم سے غزل الاپ رہے ہیں ؎

کہاں جاؤں گا میں عشق رائیگاں لے کر
یہ اپنے رنج یہ اپنی اداسیاں لے کر
کہاں برس گئیں کس کو بھگو گئیں جانے
چلے تو ہم بھی تھے گھٹاؤں کا سائباں لے کر
نئے گھروں میں ہم اُڑان بھول گئے اور نہ صحرا میں
پرندے لوٹ گئے اپنے آشیاں لے کر

غزل کے بعد گیت چھیڑ رہے ہیں سامعین میں سے
کئی من چلے گیت کی لے پر تالیاں بجا رہے ہیں اور زبیر صاحب
اسی ہنسی مذاق میں جا رہے ہیں دیکھا تو کوئی نذیر الہ آبادی آ رہے
ہیں کیا سنایا کس نے کیا سنا اسے اللہ ہی جانے - آپ کو یار
لوگوں نے اڑا دیا ہے لیجئے کل کے شعلہ اور گلوکار شاعر انور مرزا
پوری کئی سال کے بعد منظر پر آئے ہیں اب تو ان کی عمر اور صحت
کا تقاضا ہے کہ وہ گھر پر ہی آرام کریں - گھسے پٹے اور بوڑھے ترنم سے
وہی عامیانہ اشعار سنا رہے ہیں ؎

میکدہ والے نہ ہندو نہ مسلماں سمجھے
جو بھی میخانہ میں آیا اسے انساں سمجھے
آشیانے میں مرے آگ لگی تھی لیکن
دیکھنے والے گلستاں میں چراغاں سمجھے

انور صاحب زور آزمائی کر کے جا رہے ہیں اور افضل صدیقی
فرما رہے ہیں ؎

کیا کیا نگاہِ ناز بھی جادو جگا گئی
محفل میں اہلِ دل کو بھی بیدل بنا گئی
میری وفا کے تذکرے اس کی زبان پر
جنگل کی آگ جیسے شہر تک بھی آگئی

اس بار نفرتوں ہی سے لو دے سر پھرے
فصلِ وفا تو اب کے برس جل جلا گئی

افضل صاحب داد وصول کئے جا رہے ہیں ادھر صدر مشاعرہ
تشریف لے جا رہے ہیں ادھر جناب سعید مرتضےٰ صاحب کی
صدارت کا اعلان کیا جا رہا ہے ادھر کیف
بھوپالی عالمِ رویا میں تھرک رہے ہیں ؎

گیت گانے لگے شمسی تو خدا سے ڈرنا
شاعری چھوڑ دے بیکل تو ہمیں خط لکھنا
ماں نے آنگن میں لگائی تھی جو انگور کی بیل
اس میں پھولے کوئی گچھا تو ہمیں خط لکھنا

آپ لڑکھڑاتے چلتے بنے اور ہلال صاحب نے ایک پرانی
نظم سنا کر رنگ محفل بدل دیا اب سادھنا کھوٹے غالباً میرا
کی غزل سنا رہی ہیں ؎

ہم ادھر ہیں تو وہ ادھر تنہا		ہیں محبت میں کس قدر تنہا

میرے ہمراہ ساری دنیا ہے
ساری دنیا مری میں مگر تنہا
ہر مسافر کو راہ دکھلا کر
جل گئی شمع رہ گزر تنہا

ساد صفا صاحب جارہی ہیں ادھر تالیوں کی جھنکار میں شمیم جے پوری آکر لحن داؤدی میں غزل سرا ہیں سہ

غیرتِ عشق اب ان کا گھر چھوڑ دے
جی نہیں چاہتا ہے مگر چھوڑ دے
عشق میں نارسائی بڑی چیز ہے
جس میں منزل ہو وہ رہگزر چھوڑ دے
میں سمجھ لوں گا سب کچھ مجھے مل گیا
میرا دستِ طلب تھام کر چھوڑ دے

شمیم صاحب محفل کو نغمگی میں ڈبو کر اپنی جگہ آ رہے ہیں اور پروفیسر عنوان چشتی عطا کر رہے ہیں سہ

جو خط لکھو تو ہمارا سلام بھی لکھو
پھر اس کی چھت پہ اترنے لگے کبوتر کیا
یہ کیسا شخص ہے کیوں جنگلوں کی بات کرتا ہے
کہ اس میں شہر کی شائستگی دیکھی نہیں جاتی

عنوان صاحب بجلی سے کام لے کر آ رہے ہیں اور محترم نذیر بنارسی رواں دواں سنا رہے ہیں ایک شعر سنیئے سہ

ہم لوگ تو خود ہی طوفاں ہیں، اٹھتا ہوا طوفاں کیا دیکھیں
دیکھیں گے جواب کے قدموں پر چھلکتا ہوا طوفاں دیکھیں گے

لیجئے شہریار غزل خمار بارہ بنکوی اسی دلکش ترنم سے غزل سرا ہیں سہ

غم چھپانے سے چھپ جائے ایسا نہیں
بے خبر تو نے آئینہ دیکھا نہیں
دو سہارے سے اٹھ کے آنکھ نم ناہو گئی
آج سمجھا کہ میں تجھ کو بھولا نہیں
ترکِ مے کو ابھی دن ہی کتنے ہوئے
کچھ کہا ہے کو زاہد تو اچھا نہیں

اہلِ منزل ابھی سے نہ مجھ پر ہنسیں
پاؤں ٹوٹے ہیں دل میرا ٹوٹا نہیں
ہر نظر مری بن جاتی زنجیر پا
اس لئے جاتے ہوئے مڑ کے دیکھا نہیں

خمار صاحب نے ایک غزل اور سنائی اور خوب داد و تحسین پا کر کامران جا رہے ہیں اور ساتھ ہی مشاعرہ بدوش مشاہد بجنوری آ کر شعراء کرام کی کاپی کر کے مشاعرہ میں جان ڈال کر چار بجے مشاعرہ کا اختتام کر کے جا رہے ہیں اور مشاعرہ بھی ختم ہو رہا ہے۔

اس مشاعرہ کو اس سال کا سب سے مہنگا مشاعرہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا عام شہرت یہ ہے کہ اس مشاعرہ پر ساٹھ ہزار روپے خرچ ہوئے اور ساد صفا کھونے ہی پر کم از کم پندرہ (یہ بھی مشہور رہے) خرچ کر ڈالے گئے یہ حقیقت ہے کہ لال قلعہ کے مشاعرہ کے بعد یہ سب سے عظیم مشاعرہ ہے اور جس طرح وہ ناکام ہوتا ہے اسی طرح یا لوگوں نے اسے بھی آندھی میں اڑا دیا، مقامی چپقلش اور سیاست کی کار فرمائی ہے ورنہ یہ مشاعرہ تاریخی اور یادگاری ہوتا ہے جناب محمد عرفان۔ عبدالقیوم (موہن سن انجینئرز) معین عالم عثمانی وغیرہ نے اس مشاعرہ کو کامیاب کرانے میں ہر ممکنہ جدوجہد اور کوشش کی اگر چند ایک لوگوں کو اس مشاعرہ کو پسند نہیں آیا تو وہ کیا کریں اور ان کا قصور بھی کیا ہے؟ اس مشاعرہ کو کامیاب کرانے میں حساس رہے ہو یہ بھی کہ ان دو مقبول [illegible] کی کوئی بات [illegible] خلاف ہو گئے اور علاقہ پیرہ پیلنڈہ کرتے [illegible] کی نہ بھی لیسے جب تک ایک دھر دار کھیل کے رو پیرو ہر حال طے ہو جاتا ہے تقدیر ہے ہیچ

دلوں میں [illegible] تو کیا ہے ہم نہیں سمجھے
اور کیا عرض کروں خدا حافظ سہ

جو کر رہے ہیں پسِ پردہ دشمنی اب تک
بڑے خلوص سے آئے تھے وہ کسی کے لئے

قافلۂ حجاز
اسلامی تاریخی ناول
صادق سردھنوی
۴۰/- روپے

[illegible]

القرآن المنظوم

مرتبہ : کبیر کوثر

[illegible]

- قرآن پاک کا اردو، ہندی، انگریزی میں منظوم ترجمہ
- قرآن مجید کے ترجموں کی تاریخ ساز اولین پیش کش
- قرآن مجید کے متن کے ساتھ ساتھ اردو ہندی میں لفظ بہ لفظ کبیر کوثر کا منظوم ترجمہ
- قرآن حکیم کا متن اور عبد اللہ یوسف علی کا انگریزی ترجمہ جسے حکومت سعودی عربیہ کی سند منظوری حاصل ہے۔
- ہندوستان کے علمائے کرام جناب ابوالحسن، منت اللہ صاحب امیر شریعت بہار اور اڑیسہ، قاضی القضات مولانا نظام الدین، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم وغیرہ کی اسناد پسندیدگی سے مرصّع۔
- فوٹو آفسیٹ پر دو رنگی طباعت۔ رنگین سرورق
- ہدیہ دس روپیہ فی پارہ علاوہ محصول ڈاک۔ یا حسب حیثیت

کبیر کوثر کی دلکش، نظر افروز، سہل المفہوم مساعیٔ جمیلہ کا نادر و نایاب تحفہ

پہلا پارہ یکم جون ۱۹۸۵ء سے دستیاب ہے

تقسیم کار

ماہنامہ "شان ہند" فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲

کل ہند مسیحی اردو مصنفین ایسوسی ایشن کی الہ آباد کے مشاعرہ اور کانفرنس کی سرگذشت برگشتہ

جوزف انور

جناب رشید احمد صدیقی کا خیال ہے کہ طنز و مزاح ایک ایسا مشغلہ ہے کہ ذرا سی چوک ہو جائے تو عامل خود اس کا شکار ہو جاتا ہے مگر ساتھ ہی جناب شکیل الرحمان کا کہنا ہے کہ طنز و مزاح خلوص و محبت کی انتہا بھی ہوتی ہے لہٰذا سرگذشت برگشتہ کو خلوص کی انتہا ہی سمجھا جائے گا کیونکہ ہم مزاح نگار ہیں نہ طنز نگار ہیں۔ ہم تو بقول اکبر الہ آبادی اتنا ہی جانتے ہیں کہ ؎

کیا ہے باقی جناب قبلہ میں
کچھ حدیثیں ہیں ایک ڈنڈا ہے"

بدایوں میں کل ہند مسیحی اردو مصنفین یعنی AICUHA کی کانفرنس ہوئی مگر ہم نہیں گئے۔ ایک تو تلاش بسیار کے باوجود ہم پتہ نہیں لگا سکے کہ بدایوں ہندوستان کے نظام میں کس مردم خیز خطہ میں واقع ہے اور کچھ ہم بیگم کے سوالات کے اطمینان بخش جوابات بھی نہ دے سکے۔

یہ بدایوں کہاں واقع ہے کیا وہاں کیمپٹی فال جیسا جھرنا ہے؟

نہیں۔

ڈل لیک جیسی جھیل تو ہوگی۔

نہیں۔

تو پھر وہاں ہے کیا؟

شعر و ادب کا گہوارہ ہے۔ اردو کے مشاہیر شعرا و ادبا کا گڑھ ہے۔

یہ چتور گڑھ فتور گڑھ جیسی جگہ میں نہیں جانے والی۔ یہ تمہارے ایسوسی ایشن والے بھی تمہاری طرح مٹ پونجیے ہیں۔ ارے تم لوگ سری نگر، اوٹی، کوڈی کنال میں مشاعرے کیوں نہیں کراتے۔ بیگم چونکہ دور کی کوڑی لائی تھیں لہٰذا قہر درویش برجان درویش کے مصداق چپ رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔

بدایوں کے بعد ۱۹۸۳ء کا اجلاس AICUMA نے بریلی میں منعقد کیا۔ اس مرتبہ بریلی کے بازار میں جھمکوں کی ترغیب سے بیگم کو بہ آسانی پھسلایا جا سکتا تھا مگر ہمارا ماتھا خود ٹھنکا۔ کہیں دھوکہ دھڑی تو نہیں۔ کیونکہ اہل جنوں کے لئے تو سرزمین ہند میں کئی دشت و قبیل ہیں مگر اہل خرد کے لئے آگرہ اور بریلی کے سوا اور کہیں ٹھکانہ نہیں۔ مبادا یہ دست قضا و قدر سے بچے تیس پینتیس مسیحی اردو شعرا بریلی کے بھینٹ چڑھ گئے تو ان تیس چالیس ہزار مسیحی قوالوں کا کیا ہوگا۔ جن کا شادی بیاہ کے موقع پر لت بجنے کے لئے ہمارے پاس فی الحال کوئی نعم البدل بھی نہیں۔ اسی دور اندیشی کے باعث ہم نے اپنے جیب و گریباں کو بچا لینے ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔ آپ کہیں گے ہم فضول خائف تھے آخر یہ اردو شاعری کے خلاق رفو گر کس کام آتے۔ مگر صاحب سچ پوچھئے تو ہمیں یہ جیب و گریباں کی ترکیب ہی سمجھ میں نہیں آئی۔ اللہ جانے کس جیب کترے کی ایجاد کردہ ہے۔

امسال یعنی ۱۹۸۴ء کے ماہ نومبر میں انجمن کی سالانہ کانفرنس الہ آباد میں منعقد ہوئی تھی اور یہ معنت کی در دسری ہمارے دیرینہ دوست پادری کیو۔ جے۔ زیدی صاحب نے اپنے سر لی تھی ایک عرصے سے کچھ ہم بھی سر بکف گھر سے باہر نہیں نکلے تھے لہٰذا ایک دن رات کے پچھلے پہر ہم نے بیگم کا موڈ خوشگوار دیکھا تو دھیمے سے پوچھ ہی لیا۔

اب کے الہ آباد میں کانفرنس ہے۔ سنگم دیکھو گی۔

سنگم۔ ہاں سنگم تو ضرور دیکھوں گی۔

وہ مارا ہم نے دل ہی دل میں کہا اور دوسرے دن ہی زیدی صاحب کو لکھ دیا کہ حریم ناز سے بیگم صاحبہ بھی بصد ناز جلوہ فگن ہونا چاہتی ہیں لہٰذا حرم سرا کا انتظام کر رکھیں مگر جواب ندارد۔ سوچا آخر مرنا تو اسپتال ہی میں ہے مگر اکبر الہ آبادی کی روح کو ثواب پہنچانے کو عمر عزیز کے کچھ دن ہوٹل میں بھی گزار لئے جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں لہٰذا

ہم بیگم کو ساتھ لے کر ۱۱ کی رات کے بارہ بجے الہٰ آباد پہنچ ہی گئے
چونکہ طبعاً کچھ محتاط قسم کے ہیں چنانچہ یہ دیکھنے کہ زیدیؔ صاحب نے
حرم سرا کا انتظام کیا بھی ہے کہ نہیں، بیگم کو ویٹنگ روم میں چھوڑ کر
سینٹ جانسن سکول جہاں مدعوئین کے قیام و طعام کا انتظام کیا
گیا تھا رکشا لے کر چل پڑے۔ سینٹر گرجے کے قریب پہنچے تو پتا لگا
عجب ہو کا عالم تھا۔ نہ کوئی آدم نہ کوئی آدم زاد۔ ہم کنکھیوں سے
رکشا والے کی صحت و نیت کا محاسبہ کیا۔ چابیوں کے گچھے کو
مٹھی میں لے کر خود اپنی کا پنجہ بنا لیا گو رکشا والا اپنے وضع سے
میں قاتل کوئی تو آوارہ تھا۔ بخیریت تمام منزل مقصود یعنی جانسن
سکول پہنچا دیا۔ گیٹ پہ دو کم عمر لڑکے کھڑے تھے شاعر و اُردو
کیا خاک سمجھتے۔ لہٰذا ہم نے اردو دُسفلی میں پوچھا۔
کیوں بھیا یہاں کچھ الٹے سیدھے قسم کے لوگ آئے ہیں۔
"ہاں" اور انھوں نے ایک کمرہ کی جانب اشارہ کر دیا۔
کمرے میں پہنچے تو عجب منظر دیکھا۔ پلنگ سے پلنگ سٹے پڑے
تھے۔ یار لوگ لمبی تانے سو رہے تھے۔ فہیم شملوی اور شوق جالندھری
جاگ رہے تھے
آ۔ با فہیم صاحب۔ ا ر۔ بو شوق صاحب۔ ہم نے نعرۂ
بیداری لگایا۔
یار لوگوں نے کروٹ بدلی۔ کنکھیوں سے ہمیں دیکھا اور پھر
آنکھیں موند لیں۔ یعنی پلنگ سلامت، صاحب سلامت تو
صبح بھی ہو جائے گی۔ ہم بھی تاڑ گئے کہ یہاں حرم سرا تو کجا۔
زیدی صاحب بمشکل تمام خواجہ سراہی کا انتظام کر پائے ہیں۔
رات ویٹنگ روم میں ومترام کیا اور صبح جب بیگم کے ساتھ
جانسن سکول پہنچے تو یکے بعد دیگرے طالب، قربان، اختر ہوکیفی
اور دیگر شعراء حضرات سے بغلگیر ہوئے۔ طالب صاحب نے
چھوٹتے ہی نو من کا بوجھ سر پر رکھ دیا۔
امال الور صاحب کہاں چلے گئے تھے ہم لوگ تو آپ کو اور
بھابی کو ڈھونڈنے سٹیشن آئے تھے۔ ہم بھی مسکرا دیئے۔
ظاہر ہے صبح کی چائے پینے ان حضرات کو سٹیشن تو آنا ہی تھا پھر بھی
ہم نے دل برداشتہ اپنے جبڑوں کو چوڑا کرتے ہوئے ان حضرات
کے خلوص کو شرف قبولیت بخشی۔

چنانچہ ایک رکشا میں شعرا حضرات سے آئے اور آئیں تو زیدیؔ
صاحب بھی آ گئے۔ کچھ حضرات کے تیوری پر بل دیکھے تو زیدی
معاملہ کی نزاکت کو سمجھ گئے۔ اظہار معذرت کرتے ہوئے فرمایا۔
"سکول میں بچوں کے امتحانات چل رہے ہیں بارہ بجے ختم ہو تو
سب کی رہائش کا خاطر خواہ انتظام کر دیا جائے گا۔ ظاہر ہے
جانسن سکول پھر سکول ہے کوئی برلنگٹن ہوٹل یا ریڈ سٹار گیسٹ
ہاؤس تو ہے نہیں۔ قاقم و سنجاب میسر نہ ہو تو فرش گل پر قناعت کرنے
میں کوئی مضائقہ نہیں۔
ہم دل ہی دل میں نادم ہو رہے تھے کہ ایک ہم ہی تنہا ہیں
اپنی بیگم کو آوارگانِ عشق کی محفلوں میں لیے ڈولتے ہیں مگر معلوم ہوا
قربان صاحب بھی اپنی چہیتی بیگم اور منظور صاحب بھی اپنی ڈارلنگ
تمنا منظور کو ساتھ لائے ہیں ساتھ ہی جب دو تین اضافے
نظر آئے تو ہمارے منہ سے سبحان اللہ نکل گیا یعنی بقول
اکبر الہٰ آبادی ؎

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں

بارہ بجے تک تو اکا دکا، بارہ بجائے بارہ رکشائیں اور آ
گئیں۔ یارش بخیر لندن سے علامہ شرر گجرانوالوی صاحب اور
ہندوستان کے مختلف صوبوں سے واقف جالندھری، اکبر آ
سوشیل اختر، ساحل لدھیانوی، منظور لکھنوی، تمنا منظور
العزیز، جگت سنگھ، طالب، قربان شوق، ای پیڈر راکازہ، راعنہ
ثاقب، عشرت آدیب، مجبور، رضا لکھنوی، فہیم شملوی،
میرٹھی، ادیب میرٹھی، سیگل اجمیری، ڈینسا اجمیری، وکٹر کیفی
یونس جالندھری، جولیس نحیف یہاں خاصا رنگ جما چکا
میلہ لگا چکے تھے۔ مسیحی دانشوران کا یہ جم غفیر انڈو پاک نہیں تو انٹر
انگلینڈ مشاعرہ تو یقیناً تھا۔ تاہم ہمارے نفس امارہ کو سکون
نہ تھا۔ جس من موہنی کامنی کے دیدار کو آنکھیں ترس رہی تھیں
کہاں ہے؟ ہائے وہ ۳۶ - ۲۴ - ۳۶ کے طلسمی اعداد کیا
سے ضرب کیا ہوا مجسمہ حسن و جمال کہاں ہے۔ میاں ہماری مراد
حسینہ بانو پہلوان یا کرشنا کملوں سے نہیں بلکہ اس ہما میرٹھی
ہے جس میں سے پانچ عدد حوتی چاول بہ آسانی نکالی جا سکتی

محبوب کو خط لکھتے رہے ایک سال تک۔ وہ بلا ناغہ ہر روز اپنے محبوب کو
خط لکھتے رہے اور ایک سال کے بعد انھیں معلوم ہوا کہ ان کی محبوبہ
ڈاکیے کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ ابھی ہم زیدی صاحب کو کچا اور
آڑے لیتے مگر اللہ کے اس آڑے وقت ایک معقول سی صورت و شکل
دو معقولات کے مصداق ہمارے آڑے آگئیں نقش و نگار
خمار آور شبی زلفیں، لب لعلیں پر سرخی عناب، ہم کوئی موزوں شعر
گنگنانے ہی والے تھے کہ زیدی صاحب نے قصہ کوتاہ کر دیا۔

ان سے ملئے۔ یہ ہیں مسز زیدی اور آپ ہیں آزاد صاحب
ہم نے سلام کیا اور بیگم زیدی نے دعا کی۔ سچ پوچھئے تو زیدی صاحب
زاہد صد سالہ سے بھی گئے گزرے ہیں کہ ایسے زہر شکن کے
ہوتے ہوئے ابھی شاعری تک شروع نہیں کی۔ ہمارا خیال ہے کہ "غزل
دیکھ کر میں غزل کہہ رہا ہوں" کے آسان ترین فارمولے ہی کو لیا گیا تو
ماشاء اللہ دن میں پانچ غزلیں کہہ سکتے ہیں۔

لیجئے جناب عالی جناب پرنسپل ونیت پال صاحب نے کانفرنس کا
افتتاح بھی فرما دیا۔

دوسرے دن دوپہر کے تین بجے مجلس عاملہ بہ الفاظ دیگر مجلس کاملہ
کی میٹنگ ہوئی تھی۔ غالب صاحب نے سوچا اگر کانفرنس سے پہلے اس
دو دھر کو سر سے دور کر دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ تجویز عمدہ تھی۔ سب متفق بھی
تھے مگر ان دنوں راز صاحب غائب تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں آپ شمع
حسرت کو حل کر سکتے ہیں مگر کوئی مسئلہ حل نہیں کر سکتے اور یہ بھی درست
ہے کہ راز صاحب کی حیثیت ہمارے درمیان سنگ میل کی ہے تیر ہو
کر چپا بکسی کو پکڑ کے ٹھہرا دیجئے۔ ورنہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے
آمین سرچشم آمین ہی نہیں کہیں گے بلکہ اگر اکوا کی مجلس عاملہ ایسا
ہی سناؤ رکھے کی ہم اکوا کی مجلس عاملہ یہ محسوس کرتی ہے کہ تاج محل
چونکہ محبت کا لافانی شاہکار ہے اس لئے احسان کیوں نہ اسے
خرید لیا جائے تاکہ اس کے کشادہ صحن میں بیٹھ کر ہمارے شعرا حضرات
لافانی شاہکار غزلیں کہہ سکیں، تو ہم تو یہی کہیں گے اجی صاحب
تاج محل ہی کیا ساتھ میں لال قلعہ کو بھی خرید لیا جائے۔ پھر ہم
بھی دیکھیں ہمارے بغیر وہاں کے آل انڈیا مشاعرے ہوتے ہیں
لیجئے راز صاحب بھی آگئے۔

اکوا کی مجلس عاملہ کی بزنس میٹنگ بھی دیدنی ہوتی ہے
یہ ڈاکٹر طالب صاحب کے زیر صدارت ہوا کرتی ہے۔ یوں تو طالب
صاحب اتنے حلیم الطبع واقع ہوئے ہیں کہ آپ چالیس روپے
لگا دیجئے اُف تک نہ کریں مگر بزنس میٹنگ میں وہ واقعی
بزنس مین بن جاتے ہیں۔ یہ ان ہی کی دماغی پیداوار ہے کہ
مجلس عاملہ کا ہر ممبر حسب حیثیت انجمن کے لئے عطیہ کا اعلان
کرے۔ اس طرح بڑی خوبصورتی سے وہ مجلس عاملہ کے ممبروں
سے مال مسروقہ اسی وقت فراہم کرا لیتے ہیں اس دفعہ خواتین
نے پہل کی اور پہلے ہی ٹرپ کا یکہ پھینکا یعنی ڈیڑھ سو کا اعلان
فرما دیا۔ پھر کیا تھا چشم زدن میں تمام ٹرپ کے پتے میز پر آگئے
اور تقریباً ڈھائی ہزار جمع ہو گئے۔ سبحان اللہ جب ایسوسی
ایشن کے ممبران اس گرمجوشی کے ساتھ اپنے عطیات کا اعلان
کرتے ہیں ایسی ایسوسی ایشن نہ کسی حکومت کی پشت پناہی کی
محتاج ہو سکتی نہ کسی مشن کی دست نگری کی سیاروں کا آفتاب
سر آنکھوں پر مگر بندہ تو بقول اکبر الہ آبادی یہی کہے گا۔

مرے شکووں سے کیوں بھرتے ہیں وہ اخبار کے کالم
کوئی یہ شیخ سے کہہ دے کہ سنئے قبلۂ عالم
جدھر صاحب ادھر دولت، جدھر دولت ادھر چندہ
جدھر چندہ ادھر آنر، جدھر آنر ادھر بندہ

اب جہاں چندہ ہے تو کوئی چندہ زن بھی ہوگا۔ ہماری مراد
ہمارے خازن شوق جالندھری سے ہے جو رائے پور میں گلاس
میموریل سنٹر کے ڈائریکٹر بھی ہیں۔ اس دفعہ ان کے ساتھ بھی
عجیب لطیفہ ہوگیا۔ کانفرنس کے اخراجات کے لئے انھوں نے
بینک سے ڈرافٹ بنوایا۔ بینک کلرک دور اندیش نکلا۔ اس
نے سوچا رائے پور میں گیس میموریل تو بن ہی نہیں سکتا کیونکہ
ONG والوں نے ابھی تک وہاں گیس نکالا ہی نہیں البتہ
گلاس یعنی کانچ کی کان ضرور ہو سکتی ہے چنانچہ اس نے ڈرافٹ پر
گیس میموریل کو گلاس میموریل لکھ دیا یعنی G کے آگے L لگا دیا
اب اتنی بدتمیزی تو کون برداشت کر سکتا تھا۔ شوق صاحب نے
بڑی متانت و شرمندگی سے بینک کلرک کو سمجھایا کہ بھیا نہ تو یہ
ONGC والوں کا گیس میموریل ہے نہ کسی کانچ کی کان والے کا
گلاس میموریل ہے یہ تو کسی مشنری کے نام پر نامزد ایک ادارہ

نام ہے ۔ بڑی دقت کے بعد شوق صاحب نے ہی کو آگے
بڑھ کر خود کو اور ہمیں رسوا ہونے سے بچا لیا ۔ بہرکیف ہم ٹیک
لوک کی اس غلطی کو بھی فالِ نیک سمجھتے ہیں ۔

شوقی صاحب ذرا ادھر دھیان دیں اور زور لگائیں تو
لیس کے ساتھ کانچ کا ٹکل آنا بعید از قیاس نہیں کچھ بھی ہو ہمارے
زیرِ مال عرف علی بابا کا بھی توڑ نہیں ۔ یہ اچھے خازن ہی نہیں
اچھے غزل گو شاعر بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انھیں خوش
گلوی کے توڑ سے بھی نوازا ہے مگر جب یہ خوش گلوی یعنی اس
ترنم کے توڑ ے کو منقبت یعنی خشوع و خضوع میں بھی استعمال
فرماتے ہیں تو اکبر الہ آبادی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے

انھیں شوقِ عبادت بھی ہے اور گانے کی عادت بھی
نکلتی ہیں دعائیں ان کے منہ سے ٹھمریاں ہو کر

دوپہر کو ہم کھانے کی ٹیبل مدعوئین کا جائزہ لے رہے
تھے کہ کیپٹن کیتکی آئے اور فرمایا ۔ کوئی صاحب آپ کو باہر یاد کر
رہے ہیں ۔ سوچا ہو سکتا ہے الہ آباد کی کوئی حسینہ آٹوگراف
لینا چاہتی ہو ۔ باہر آئے تو سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ۔
ڈاکٹر مساانڈرس (واضح ہو یہ انگریزی نام ہے کسی الٹے سیدھے
لفظ کا اسپیلنگ مسٹیک نہیں) کھڑے تھے ۔

آپ جوزف اکور ہندی کے رائٹر ہیں ۔

"جی نہیں البتہ میری دو کتابیں ہندی رسم الخط میں ضرور
چھپی ہیں

ہمارے ہندی رائٹرز الیسی کانفرنسیں کیوں نہیں کراتے ۔

"کراتے ہوں گے ۔ ہو سکتا ہے NCC کی لٹریچر کمیٹی میں
کوئی دخینیت سنگھ نہ ہو "

آپ کے خیال میں ان اردو شعرا میں کتنوں کو دوام حاصل ہوگا
بڑا پیچیدہ سوال تھا کیونکہ ان کا رنگ زلیست میں نہ لوچ
ہے نہ گداز روی ۔ پھر یہ مسیحی شعرا نہ جن کی زلفیں شانوں
پر لہراتی ہیں نہ جن کے بال گدی تک بڑھے ہوئے ہیں دوامی
صورت کیسے حاصل کر سکتے ہیں بہرحال سوال کا جواب تو دینا
ہی تھا ۔

دیکھئے اس سوال کا جواب تو ہم روزِ قیامت میں دے

سکتے ہیں پھر ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ قربان صاحب نے مسیحی اردو
شعرا کی کتنی جلدیں چھپوائی ہیں فی الحال تو آپ ان شعرا حضرات
کی درازیٔ عمر کی دعا مانگئے ۔ کہتے ہوئے ہم اپنے آپ کو مختصر
کر کے کھانے کی میز پر آبیٹھے ۔

آئیے جب شعرا حضرات بدست خود دہانِ خود میں مصروف
ہیں ہم کچھ دوستوں کا تعارف کرا دیں ۔ سب سے پہلے ہمارے میزبان
پادری کیو جے زیدی صاحب سے ۔

گندمی رنگ مگر گندم نما جو فروش نہیں ۔ سڈول جسم آنکھوں
میں روایت شکنی کی غیر معمولی چمک ۔ صرا النزا وی کی طرز (C.I.S.R.S
اللہ جانے کیا بلا ہے) کے منتظم ہیں ۔ روایت سے بغاوت کی
منزا بھگت رہے ہیں ۔ میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر کے
مصداق الہ آباد میں کانفرنس کے انعقاد کا بیڑا اٹھا لیا مگر
راہ رو میں بمشکل تمام گھر کے افراد ہی جمع کر پائے ۔ پھر
All India Criminal کو AIIUWA
under ground women association
بھی نہیں ورنہ اہلِ ذوق سیکڑوں و النزیل جاتے ۔ بہرحال
زیدی صاحب کے لئے اکبر الہ آبادی کا ایک شعر حاضر ہے حسبِ حال
شرح کر لیجئے ۔

چراغ روشنی میں اور ضیا میں فرق اتنا ہے
اسے کشتی نہیں ملتی اسے ساحل نہیں ملتا

آپ سے ملئے ۔ آپ ہیں جناب ایم ایم خلیب بیگ اجمیری
تو چلے مرے آپا کی منزل میں قدم گرزیدہ گرزیدہ ۔ کہنہ مشق
کہنہ سال یعنی ہر اعتبار سے کہنہ کہنہ ۔ راجستھان کے مسیحی قوالوں
کے لئے ہدیہ تبرک ، اچھا کہتے ہیں مگر پڑھتے اس طرح ہیں گویا
اخبار پڑھ رہے ہوں ۔ آزوز امرتسری کی طرح بیگ صاحب کا تخلص
بھی ہماری سمجھ میں نہیں آیا ۔ واللہ علم بیگ صاحب اللہ
میگ لمبے مولا میگ اے والے میگ ہیں یا جیا بھارت کے
لوگش والے میگ ہیں ۔ بہرکیف میگ اور میگھ میں شبہ کی
گنجائش نکل سکتی ہے مگر اس حقیقت سے انحراف نہیں کیا
جاسکتا کہ میگ صاحب سوروئیلزم آرٹ میں کافی مہارت
رکھتے ہیں ۔ مسیحی اردو شعرا کتاب کے دو صفحات کے ریویو

میں ڈیڑھ صفحے کتاب کے سرورق کے نذر کرکے ایسے ایسے رازہائے
سربستہ کا انکشاف کیا کہ ہم نے الماری سے کتاب نکال کر گھنٹوں
تک اس کے سرورق کو ہی الٹا سیدھا کرکے دیکھتے رہے اور اپنی کور
ذوقی پر رونے لگے کہ ہمیں نہ گانے تنقید آئی نہ کہاس۔
بہرحال AICUHHA میں راجستھان کی صحت مند نمائندگی
کر رہے ہیں مبارک ہو۔
آپ سے ملیے۔ آپ ہیں جناب ای پیڈرآز صاحب آف دہلی
ملیرکٹ موجھیں۔ عمر تقریباً ساٹھ کے آس پاس مگر سرگرم
اتنے کہ نوجوان سے نوجوان۔ شراب اور جہیز کی لعنت پر عملی ط
کے خالق۔ انتظامیہ امور میں جتنا عمل رکھتے ہیں اتنا ہی ذہن
بھی۔ بلاشبہ مجلس عاملہ کے سنگ مار ہیں آپ کی موجودگی میں
بڑی سی حرف دخیر کے منہ میں اپنا سر دے سکتے ہیں AICUVA
کے واحد رکن ہیں ہر سال دہلی کے ممبروں سے اکواکے لیئے
دو ڈھائی سو روپیہ جمع کرتے ہیں اس کارکردگی کی اہمیت کا اگر
آپ کو اندازہ لگانا ہو۔ تو اپنے حلقۂ احباب سے دس دس روپے
کی چین رسید میں ہی کاٹ کر لگا لیجیا۔ بجٹ کی بحث پر آپ کی
موشگافیاں دیکھ کر ہم دنگ رہ گئے اور اکبر الہ آبادی کے یہ
اشعار یاد آگئے۔

بابو کہنے لگے بجٹ پر لڑو
ملک کو دیکھ اپنے حق پہ لڑو
کہہ دیا ہم نے اے میرا آج
ہو مبارک تمہیں یہ کام یہ کاج

ان سے ملیے آپ ہیں حیرت بدایونی اور عاجز بدایونی
دونوں بھائی ہیں۔ ہم مذاق، ہم وضع، ہم مکتب خیال
تاہم جڑواں نہیں۔ کالی ٹوپی، کالی شیروانی، سفید چوڑی دار
پاجامے میں بالکل ایک دوسرے کی کاربن کاپی نظر آتے ہیں۔
صحت تلفظ میں وہ احتیاط کہ حلق کی ق حلق اور بلغم کی غین چھاتی
ہی سے نکلے۔ سکہ بند روایتی شاعر ایسے کہ وہ باندار شاعر کہ
جاہلیت کے شب خون بھی برسائے جائیں تو یہ حضرات سر کیا جھکے
بہارو پھول برساؤ مرا محبوب آیا ہے
شکیل بدایونی کی وراثت کے حق دار وارث، غیر مسیحی شعراء

میں ہے وہ ان دونوں کو یکجا اردو شعرا کی نمائندگی کے لئے
پیش کیا جاسکتا ہے۔
مجلس عاملہ کی میٹنگ کی صدارت ہمیشہ انجمن کے صد
ڈاکٹر طالب شاد آبادی ہی کرتے ہیں۔ پچھلے کئی سالوں سے ا
وخطاب سے کنی کاٹ رہے تھے۔ پچھ ہمارا بھی یہ خیال ہے
ان کا نام نامی کسی سابقے لاحقے کا محتاج نہیں۔ کئی نام اپنی
ہی میں بڑے پیارے لگتے ہیں جیسے ابرہ نگاہ، بیجو کین تر
طالب شاد آبادی بھی ان سے کم دلکش نہیں مگر جب علامہ رشد
صاحب گرج کر بولے۔ آپ صدر ہیں تو کیا۔ آپ کو مجلس
کی کثرت رائے کا احترام کرنا ہی پڑے گا۔ ہم سمجھ گئے ا
نا ممکن ہے انھیں باقاعدہ فریم کر لیا گیا ہے۔ لہٰذا اگر م
میں لپیٹ کر آفتاب سخن کا خطاب (جو کسی طرح ابوال
یا بابائے اردو سے کم نہیں) انھیں جڑ دیا گیا۔
خطاب کے سلسلے میں شا کا کہنا ہے کہ خطاب اوسط
کے انسان کو مشہور بنا دیتے ہیں۔ برتر کو پریشان کر دیتے
کمتر ان کی بے حرمتی کرتے ہیں۔ یقیناً یہ خطاب طالب
کی پریشانی میں اضافہ بھی کرے گا۔
دوپہر کے بعد اجلاس کی ادبی نشست کو ہم نے اپنی د
میں تاریک کیا اور بیگم کو لے کر سنگم دکھانے نکل پڑے مد
ہیرو دستوں کی لسپاندگی کا علم بہار ارکشا والا جب پانچ کا
میل کی مسافت کے بعد شہر کے ایک دورافتادہ کونے پر
تو بیگم نے اپنی بزرگ نینوں سے آس پاس کی ٹانگوں کا
کچھ تذبذب کے عالم میں پوچھا۔
وہ کہاں چلا جا رہا ہے سنگم۔
ہم نے ڈرتے ہوئے کہا۔ وہ دیکھو وہ سنگم ہے
گنگا اور جمنا کا ملاپ ہوتا ہے۔ یہ ہو عدیلوں کا ملاپ
اس سے پہلے کہ ہم کچھ اور کہتے۔ بیگم برس پڑیں۔
تو تم مجھے ایک ہزار میل دور ندیاں دکھانے لا
گھر کے پاس سابرمتی ندی نہیں پہنچی۔ ستیاناس
وہ سنگم ہوگا کہ نہیں ہوا لے فلم سنگم کو دیکھنے آئی
مقاطعہ میں بدل گیا۔ اب ہم ہیں اور اکبر الہ آبادی کا

یہ تمہارے ہی دم سے ہے بزمِ طرب ابھی جاؤ نہ تم نہ کرو یہ غضب
کوئی بیٹھ کے لطف اٹھائے گا کیا کہ جو رونقِ بزم تمہیں نہ رہے

شام کو مشاعرہ تھا۔ کیپٹن کیفی چونکہ منتظر صاحب سے پہلے ہی راز و نیاز کی باتیں کر آئے تھے لہٰذا موڈ میں تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ان کی نظر قربان صاحب پر پڑی اور قربان صاحب کو قربان گاہ پر چڑھانے کا خیال ان کے ذہن میں داخل ہوا۔

ویل مسٹر قربان صاحب اردو کے مسیحی شعراء۔ آپ کو یوپی اکاڈمی سے انعام ملا ہے اگر ہم لوگوں کا ذکرِ خیر نہ ہوتا تو آپ کو یہ انعام نہیں ملتا۔ لاؤ ہمارا حصہ۔ ادھر ہما صاحب بھی آگئے۔ شوق صاحب نے بھی وقت کی اہمیت کو بھانپ کر قربان صاحب کو محاصرہ میں لے لیا قربان صاحب بھی سمجھ گئے کہ اردو شعراء حاتم طائی کی قبر پر لات مارنے میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ مبادا ان میں سے کوئی ہماری کمر ہی پر لات مار دے اور بلا پس و پیش تیس توڑے نکال کر دے دیئے منتظر صاحب دور کھڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ انھیں بھی خوش نصیبی پر بہار اکاڈمی سے انعام مل چکا ہے۔ لہٰذا گھبرائے ہوئے آئے اور از خود تیس توڑے مزید عنایت کر دیئے۔ طالب صاحب اس منظر ہوش ربا کی تاب نہ لا کر چپ چاپ باہر نکل گئے۔ جبراً وصول کئے ہوئے یہ توڑے کچھ ہمیں بھی ناگوار گزرے اور ہم نے انھیں ازراہِ ... بھٹی میں جھونک دئے اور اس کی رسید قربان صاحب کی بنیان میں رکھ دی۔

مشاعرے کی صدارت ڈاکٹر طالب صاحب کو اور نظامت ہما صاحب کو کرنی تھی۔ ہما صاحب کا حلیہ تو ہم پہلے ہی پیش کر چکے ہیں مگر اس دفعہ وہ نسخۂ حمیدیہ کی منہ بولتی تصویر بنے ہوئے تھے۔ ... کہ کنہیا لال کے لہنگے دس گز کے ہوتے ہیں کیونکہ وہ ... پر بیٹھ ... ہیں مگر دس گز کا پاجامہ آج دیکھنے کو ملا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اردو شاعری کی معشوق کی کمر اور ناڑہ باندھنے کے پیمانے سربستہ کا ... کرنا چاہتے ہوں۔ بہرحال وہ شاعر ہی کیا جس کا کلام آزار ... اور آزار بند آزار نظر نہ ہو۔ لہٰذا ہما صاحب کا آزار بند بھی ... تک لٹکا ہوا سامعین کے لئے آزار نظر بنا ہوا تھا۔ حسن ... دیکھئے کہ مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ کے مصداق جب ہما صاحب ... شاعر کو دعوتِ کلام دینے مائک پر آنے لگے تو ناڑہ گھٹنے تلے آکر ٹوٹ گیا۔ اب ہما صاحب پیشہ ور ناظم مشاعرہ بھی نہیں کہ ایسے نازک حالات کو سنبھال سکیں چنانچہ اپنے دونوں ہاتھوں سے وہ جب حالات کے بجائے پاجامے کو سنبھالے مائک پر آنے لگے تو ہم گھبرا گئے کہ آج ہما صاحب مائک کا نیا پرلوگ کرنے والے ہیں اور جب آپ اپنا دہنِ مبارک ہی مائک کے قریب لائے تو ہمیں اطمینان نصیب ہوا۔ بہرکیف منظر دیدنی تھا۔ آگے کی ستر پوشی کو تو قدرت نے ہاتھوں کے علاوہ اور بھی اسباب و علل پیدا کر رکھے ہیں مگر پیچھے کا حال خدا کے بعد طالب صاحب ہی دیکھ سکتے تھے اور جب ہما صاحب کی چڈی طالب صاحب کو نظر آنے لگی تو انھیں اس بات کا پہلی دفعہ علم ہوا کہ صدرِ محترم کے فرائض کس قدر وسیع و عریض ہوتے ہیں۔ بہرکیف کسی نہ کسی جگر کے بجائے پاجامے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر ہما صاحب نے اپنی عزتِ سادات کو بچا لیا۔

مشاعرہ کامیاب رہا۔ ہال میں سامعین کا یہ حال تھا کہ آپ تل بھی دھر سکتے تھے اور تل چلنے کی جگہ بھی۔

مشاعرے ہم نے پڑھے بھی ہیں اور سنے بھی ہیں یقیناً آپ نے بھی پڑھے اور سنے ہوں گے۔

شاعروں کی نازک مزاجیوں سے بھی سابقہ پڑا ہوگا۔ ایسے سنہ نشیں شعراء کو بھی دیکھا ہوگا جو پان کھا کر پان کی طشتری آگے بڑھانا اپنی توہین سمجھتے ہیں کچھ ان ترنم نواز شاعروں کو بھی دیکھا جو بطور خاص مائک پر آکر پانی کا گلاس طلب فرماتے ہیں۔ مگر سبحان اللہ ہمارا خون سیروں بڑھ گیا جب ہم نے یونس جالندھری جیسے منکسر المزاج اور مجبور جالندھری جیسے فعال شاعر کو زیدی صاحب کو باقاعدہ سامعین کو چائے اور پانی پلاتے دیکھا اور بلاشبہ یہ دونوں شاعر ہی ہماری دانست میں مشاعرے کے کامیاب ترین شاعر تھے۔

آخر میں اکبر الہ آبادی کے ان اشعار سے سرگزشت پرگشتہ کا خاتمہ بالخیر کرتا ہوں۔

کہتا ہوں میں ہندو و مسلماں سے یہی
اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ
موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

غزل

ناصر زیدی
راولپنڈی (پاکستان)

کسی کے لب پہ تیرا نام کیوں ہو؟
مری رُہ داد الفت عام کیوں ہو؟

شکستوں پر شکستیں کھا رہا ہوں
جنونِ عشق میرا خام کیوں ہو؟

مسافر ہوں سفر ہے کام میرا
مجھے راہِ طلب میں شام کیوں ہو؟

لب و رخسار چومیں گی نگاہیں
کوئی جلوہ فروزِ بام کیوں ہو!

جو لکھ لکھ کر مٹایا جا رہا ہے،
وہ اے ناصرؔ مرا ہی نام کیوں ہو؟

غزل

منظور کشمیری
خانیار ۔ سری نگر

ساقی ہمارے لب تک اب تک نہ جام آیا
پر میکدہ جو آیا غیروں کے کام آیا

جب جب ستم کی اس نے ٹھانی ہے اپنے من میں
ان کی زباں پہ آخر میرا ہی نام آیا

یاروں کے وقتِ بد میں ہم کام آئے اکثر
ہم پر پڑی مصیبت کوئی نہ کام آیا

دن تو گزر گیا ہے فرقت میں پھرتے پھرتے
یہ شام کیا ہے آئی غم کا پیام آیا

بھولا ہوا نہ اس کو منظورؔ پھر کہو تم
بھولا ہوا سحر کا جو وقتِ شام آیا

الحاج الحافظ ڈاکٹر المحمود دیوان صاحب
دیوانؔ ۔ لندن

ایک دن موسیٰ گئے تھے طور تک
آئیے سوچیں ذرا اب دور تک

جانے والے عرش تک پہنچے مگر
حضرت موسیٰ گئے بس طور تک

حسن میں ہمسر کوئی ان کا نہیں
ماند پڑ جاتی ہے، زاہد، حور تک

بات بڑھ کر بولنا اچھا نہیں
آپ کم بولیں ذرا مقدور تک

مبتلائے غم ہمیشہ ہم رہے
آپ کو غم تھا فقط عاشور تک

میکشی کی تہمتیں دیوانؔ پر
وہ میاں کھاتے نہیں انگور تک

دھوم ہے دیوانؔ کے اشعار کی
اب غزل جاتی ہے کوسوں دور تک

کیا آپ گلے کی تکلیفوں میں اکثر مبتلا رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے سخت پریشان ہیں، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ایسی پریشان کن بیماری سے گلا کاٹ دینے سے ہی چھٹکارا مل سکتا ہے۔ ذرا ٹھہریئے! خالص دیسی ادویات سے تیار کیا ہوا "ٹونسلیکس" ایک بار، صرف ایک بار استعمال کر کے تو دیکھئے، پھر آپ کو گلے کے غدود بڑھ جانے، گلے کی سرسراہٹ، خراش، گلے کے ورم، زخم اور دوسرے تمام امراض کی شکایت نہیں رہے گی۔ اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا مریض ہو، جس کے گلے کے غدود (ٹانسلائٹس) کا آپریشن ہونا ہے تو اُسے اس دوا کے بارے میں ضرور بتایئے گا کیوں کہ پھر اُسے آپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چھوٹے بچے جو کھٹی میٹھی چیزیں کھا کر گلا خراب کر لیتے ہیں، اُن کے لئے بھی یہ بہت کام کی دوا ہے۔ ہر گھر میں اس کا رہنا بہت ہی ضروری ہے۔

—— شرع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیبارٹریز، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

Phone: 275602 Regd-No D- (DN) 353
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 MAY 1985
Regd with the Registrar of Newspaper at R. No. 644 57

خرید کر پڑھئے :

مانگ کر پڑھئے :

یا پھر

چوری کر کے پڑھئے

یہ ہے ہی اتنا خوب صورت،

اتنا دل کش،

اتنا مکمل کہ اسے کسی طرح بھی

حاصل کریں کیوں کہ

یہ فیض کی شخصیت اور فن پر ایک

شان دار ادبی دستاویز ہے۔ اِس میں شامل ہیں:

قیمت : پندرہ روپے

★ خلوت اور جلوت کے بھید کھولنے والے ذاتی نقوش۔

★ نادر و نایاب تصویریں۔

★ سدا بہار، ہزار رنگ و منتخب کلام۔

★ فیض کی شخصیت کے وہ ڈھکے چھپے گوشے جن پر سے پہلی بار پردہ اُٹھایا گیا ہے۔

★ ہندوستان، پاکستان، رُوس اور انگلستان کے دانش وروں کی مشترکہ کاوشوں کا گلدستہ۔

ساری اُردو دنیا میں شبستان کے "فیض نمبر" کا چرچا ہے

اس سے پہلے کہ اسٹاک ختم ہو جائے آج ہی اپنے قریبی نیوز ایجنٹ سے طلب کیجئے یا براہِ راست ہم سے منگوائیے۔

شبستان اُردو ڈائجسٹ آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

4 JUL 1985
Dr. Zakir Husain Library
Jamia Nagar
J. M. I. New Delhi
جلد — ۱۶
شمارہ — ۶
جون ۱۹۸۵

A leading role

At Shriram, the focus is always on good performance, whether in the factory, field, office—or auditorium. Artistic talent is promoted as systematically as work talent.

Employees of Shriram Fertilisers & Chemicals, at Kota and elsewhere, are given every opportunity to develop their talents—in music, dance, drama—and perform at their best.

Our Shriram Kala Mandir at Kota is equipped with the latest lighting and acoustics technology. And our Shriram Ramlila is a brilliant spectacle which attracts thousands from all over Kota and the neighbouring areas.

Shriram Fertilisers & Chemicals
(Prop DCM LIMITED)

رجسٹرڈ نمبر A (DN) ۳۵۲ ٹیلیفون نمبر

رجسٹرار آف نیوز پیپر آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۶۴۴/۵۷

ماہنامہ

شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

قیمت سالانہ
چوبیس روپے

فی پرچہ
ڈھائی روپے

شمارہ نمبر ۶	جون ۱۹۸۵ء	جلد نمبر ۴۶

مہکتی باتیں، چہکتے جملے

- محبت میں مصائب اس لئے آتے ہیں کہ ہر شخص محبت کا دعویٰ نہ کر سکے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ
- مرد عورتوں سے زیادہ عقلمند ہوتے ہونگے مگر یہ بات حقیقت ہے کہ کیا کبھی آپ نے کوئی ایسی عورت دیکھی ہے جس نے محض جسمانی خوبصورتی سے متاثر ہو کر کسی ان پڑھ، احمق اور غریب مرد سے شادی کی ہو!
- پاکستان میں آج کل جو لطیفہ مقبولِ عام ہو رہا ہے وہ کچھ اس طرح ہے۔ ایک روز اسلام آباد میں صدر ضیاء الحق سیر کو نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ دوسرے ممالک کے سفارت خانوں کے آگے بڑی لمبی قطاریں لگی ہیں۔ انہوں نے دریافت کروایا تو پتہ چلا کہ دوسرے ممالک جانے کیلئے ویزا حاصل کر رہے ہیں۔

متفکر جنرل صاحب بھی چپ چاپ ایک لائن میں لگ گئے تاکہ کچھ پتہ لگا سکیں کہ لوگ اتنی تعداد میں ملک چھوڑ کر کیوں جا رہے ہیں لیکن جلدی ان کو پہچان لیا گیا۔ لوگوں نے ان سے پوچھا کہ آپ کیوں قطار میں لگے ہیں۔ صدر نے کہا میں ویزا لے رہا ہوں دوسرے ملک جانے کا۔ یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام قطاریں ختم ہو گئیں صرف صدر رہ گئے۔ پریس نے ردعمل کا پتہ لگانے کے لئے انہوں نے ایک سے پوچھا کہ آپ لوگوں نے کیوں ویزا لینے کا خیال چھوڑ دیا تو برجستہ جواب ملا ـــــ جب آپ ہی باہر جا رہے ہیں تو پھر ہم لوگ باہر جا کر کیا کریں گے۔

- امریکہ کی فلم صنعت کا مرکز ہالی ووڈ ہے وہاں کی ایک اداکارہ سے کسی دعوت کے بعد اس کی سہیلی نے دریافت کیا کہ پارٹی میں کون کون تھا؟ اداکارہ نے کہا بتانا کیا ہے کوئی غیر نہیں البتہ میرے پہلے خاوند سے دو لڑکیاں، میرے دوسرے خاوند کی تیسری بیوی، میرا تیسرا خاوند اپنی نئی بیوی سمیت اور میرا اپنا موجودہ خاوند تیسری دوست کے ساتھ۔ اور بھی دو چار لوگ تھے، بس
- نرس نے شوہر کو یہ خبر سنائی کہ اس کی بیوی کے جڑواں بچے ہوئے ہیں۔ شوہر نے سرد آہ بھر کر کہا "میں جانتا تھا یہی ہوگا۔ وہ تو ہمیشہ کی فضول خرچ ہے"

ادارہ پبلشر سرور تونسوی نے خواجہ پریس چتلی قبر جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ نمبر ۲ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔
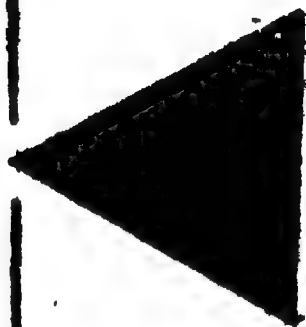
دوسرا بچہ تین سال بعد
کوئی بھی طریقہ اپنایئے
نرودھ
کاپرٹی
کھانے کی گولی
davp 84/613
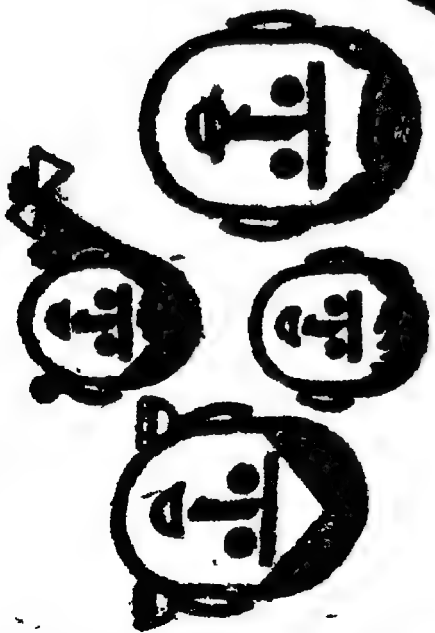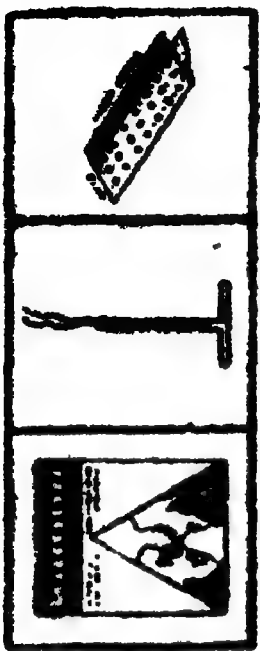
بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد

ہوس لقمہ تر پاکستان کے ایک مشہور دانش ور اپنے مکتوبِ گرامی میں تحریر فرماتے ہیں۔

"محترم سرور بھائی۔ تسلیم۔ ہندوستان میں اردو دانشوروں کو جس کثرت سے اعزازات اور انعامات سے نوازا جا رہا ہے ان کی اطلاعات اخبارات میں نظر سے گزرتی رہتی ہیں۔ اور ہم پاکستانی دانشوران اردو کو دلی مسرت ہوتی ہے کہ ہمارے پڑوسی ملک میں جہاں کہ اردو کی کوئی سرکاری حیثیت نہیں ہے اردو دانشوروں کو ان کی تصانیف پر مختلف ادارے انعامات دیتے ہیں۔ اور اردو ادیبوں، شاعروں، نقادوں، اور صحافیوں کو خاصے ایوارڈ دیئے جاتے ہیں در تو اور سرکاری طور پر بھی انہیں ایوارڈ اور اعزاز دیئے جاتے ہیں۔

آپ پچھلے پچیس سالوں سے اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔ آپ کے ماہنامہ "شانِ ہند" نے تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں اردو شاعروں کی جو تاریخ ترتیب دی ہے وہ آئندہ اردو شاعری کے فنکاروں کی رہبری کرے گی۔ آپ کے اداریے ہندوستان کے اردو دانشوروں کی حقیقی زندگی کے راز افشا کریں گے۔ اور آپ جس بے باکی اور سچائی کے ساتھ ملکی سیاست اردو اور خود اردو والوں کی، اردو کے نام پر لقمہ تر حاصل کرنے کی بدترین مثالوں کو پیش کرتے ہیں اس سے صحافت کا پیشہ اختیار کرنے والوں کو نشانِ راہ مل سکتا ہے کہ کسی صحافی کے لئے بے باک اور بلند ہونا کتنا ضروری ہے اور حق و انصاف کا ساتھ دینے کے لئے سچائی کا سہارا لینا کس قدر ضروری ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ پاکستان میں "شانِ ہند" کے ذریعے ہی ہندوستان کے اردو سے متعلق مسائل اور وہاں کے اردو دانشوروں کی پوسٹ مارٹم کی صحیح اطلاع ملتی ہے۔ اور جب بھی "شانِ ہند" موصول ہوتا ہے تو اردو دوستوں میں اس وقت تک گردش کرتا رہتا ہے جب تک کہ مجلہ کا شمارہ ختم نہیں ہو جاتا۔

مگر حیرت ہے کہ آپ کو کسی سرکاری یا غیر سرکاری ادارے نے اب تک کسی ایوارڈ سے نہیں نوازا۔ کیا آپ کے ہندوستان میں بھی ہمارے پاکستان کی طرح ایسے ایوارڈ محض سفارشوں اور اندھا بانٹے ریوڑیاں والی مثل کے رہینِ منت ہیں۔؟

یہ خط اگرچہ ذاتی نوعیت کا ہے مگر اس کی اشاعت اس لئے ضروری سمجھی گئی کہ اس قسم کے استفسار کئی دوسرے حضرات نے بھی بارہا کیئے ہیں۔ ایسے استفسار کرنے والے کچھ حضرات تو واقعی ہمدردی اور اپنائیت کا جذبہ لئے ہوتے ہیں۔ اور زیادہ تر اصحاب محض "پرسشِ" کرنے کی غرض سے بڑے معصومانہ انداز میں اپنا مقصد پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہٰذا یہی مناسب سمجھا گیا کہ اس سلسلے میں تفصیلی جواب انہی کالموں میں دیا جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کے نام پر جو انعامات اور ایوارڈ ہندوستان میں سرکاری یا نیم سرکاری اداروں کی طرف سے دیئے جاتے ہیں وہ محض اس وجہ سے دیئے جاتے ہیں کہ اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے لہٰذا ایسے ایوارڈ ننانوے فی صد مسلمانوں کو دیئے جاتے ہیں اور کسی غیر مسلم کو بھی یہ اعزاز دیا جاتا ہے جب انتہائی مجبوری ہو۔ چونکہ انعام یا ایوارڈ کا فیصلہ کرنے والے حضرات نہ تو خدا کا خوف رکھتے ہیں اور نہ انہیں عوامی مخالفت کا ڈر ہوتا ہے لہٰذا وہ من مانی کرتے ہوئے اپنے مفاد کے پیشِ نظر ایسے فیصلے کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک سیاسی لیڈر کو کانگریس امیدوار کے خلاف الیکشن لڑنے کے لئے ایک صاحب نے مالی امداد دی اور یہ سیاسی لیڈر ایک ایسی کمیٹی کے ممبر ہیں جو ایوارڈ کا فیصلہ کرتی ہے۔ چنانچہ اس الیکشن ہارے ہوئے ممبر نے اپنے محسن کو ایوارڈ دلانے کی کوشش کی اور کئی حقداروں کے مقابلہ میں انہوں نے ایک نااہل کو ایوارڈ دلوایا۔

فکرِ تونسوی اس وقت تک کیا برصغیر ہند و پاک میں طنز و مزاح میں اپنا جواب نہیں رکھتے مگر انہیں ہمیشہ نظر انداز کیا گیا "شانِ ہند"

لکھا ہے جس میں اتر پردیش اردو اکادمی کا یہ دوغلا پن قابلِ مطالعہ ہے۔ اب جب ہر طرف سے اتر پردیش اردو اکادمی کو ہدفِ لعنت بنایا گیا تو نازش صاحب کو انتقال کے بعد خصوصی ایوارڈ کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ جب کہ نازش صاحب کی زندگی میں ہی اکادمی اُن پر مقدمہ کر کے اُن کی تصنیف پر دیا گیا انعام واپس لینا چاہتی تھی کیونکہ نازش صاحب نے کسی دوسری اکادمی کا انعام بھی اپنی اسی تصنیف پر حاصل کر لیا تھا۔

ہندوستان ہو یا پاکستان اردو کے نام پر جو ایوارڈ یا انعامات دیئے جاتے ہیں انہیں حاصل کرنے والوں کو نہ معلوم کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ بہت کم ادارے ایسے ہیں جو ازخود ہر قسم کے دباؤ اور سفارشوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صحیح فیصلہ کرتے ہیں جیسا کہ حال ہی میں دلی اردو اکادمی نے جناب شوکت علی فہمی مسلم کو صحافت کا ایوارڈ دے کر ثابت کیا ہے کہ اگر کسی انعامی کمیٹی کے ممبران حق دانش سے کام لیں تو یقینی طور پر صحیح فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ رہا یہ کہ ایڈیٹر شان اب تک کبھی ایسے ایوارڈ یا انعام سے محروم کیوں ہے۔ تو اس سلسلے میں اول وجہ تو یہ ہے کہ اُس کی خدمات ایسی ہیں ہی نہیں کہ انہیں اس قابل سمجھا جائے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ایڈیٹر شانِ ہند زہرِ ہلاہل کو قند کہنے کا عادی نہیں۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ جو حضرات ایسے ایوارڈ یا انعامات کا فیصلہ کرنے والے ہیں اُن کی نسبت شانِ ہند میں کسی نہ کسی وجہ سے اُن کی اصلیت کی پول کھولی جا چکی ہے لہٰذا وہ کس طرح گوارا کر سکتے ہیں کہ مدیر شانِ ہند کو کوئی ایوارڈ یا انعام دے کر اپنے آپ کو فرجا خبردار کہلوا سکیں۔

ہم اپنے پاکستانی دوست کے ممنون ہیں کہ انھوں نے شانِ ہند کی خدمات کو سراہا ہے۔ اُن کی اطلاع کے لیے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ حال ہی میں پاکستان سے جناب محسن بھوپالی ہندوستان تشریف لائے تھے اپنے مختصر قیام میں ہر مشاعرہ اور نشست میں خوب خوب داد لی۔

جاہل کو اگر جہل پہ انعام دیا جائے
اس حادثۂ وقت کو کیا نام دیا جائے

نذرِ اقبال

آتش بہاولپوری

علامہ اقبال مرحوم کی مشہور نظم "بلوچ" باپ کی نصیحت بیٹے کو" کے چند اشعار پر تضمین ملاحظہ ہوں۔

ہمراہ لیے جوشِ عمل عزمِ جواں چل
بچتے رہے نہ نیک کام بطرزِ دگراں چل
یہ بھی نہ تحقیق ہو کہ یہاں ہیں کہ وہاں ہیں
جس سمت میں چاہے صفتِ سیلِ رواں چل
وادی یہ ہماری ہے یہ صحرا بھی ہمارا

غیرت ہی سے ہے شوکتِ شاہانہ جلو میں
غیرت ہی سے دنیا میں سرافراز ہیں قومیں
غیرت ہی سے محفوظ سفینے ہوئے رو میں
غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

جس قوم کے افراد میں ہے جذبۂ تعمیر
ملتی ہے زمانے میں اُسے عظمت و توقیر
افراد کا کردار ہے اک بولتی تصویر
افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

ہر چند بڑی چیز ہے آزادی کی نعمت
لیکن نہ فراموش ہو دل سے یہ حقیقت
انساں کو سرفرازی ہے ایماں کی بدولت
دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

جولیس نفیس دہلوی کا تازہ ترین مجموعۂ کلام
آوازِ دل
شائع ہو گیا ہے۔ قیمت ۱۵ روپے مجلد
اپنی لائبریری میں اس مقبول مجموعۂ کلام کا اضافہ آپ کے باذوق ہونے کی دلیل ہے۔
دفتر شانِ ہند، فلیٹ ۳۰ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۳

طرحی مشاعرہ بزمِ سخن کویت کا انعامی فیصلہ

بزمِ سخن کویت نے گذشتہ سال جوش اور ساحر ایوارڈ دینے کے سلسلہ میں طرحی مصارع دیئے تھے اور اعلان کیا تھا کہ جن شعرائے کرام کی طرحی غزلیں اولین قرار دی جائیں گی اُنہیں پانچ صد امریکی ڈالر انعام دیا جائے گا۔ لہٰذا اس سلسلے میں حسبِ ذیل شعرائے کرام کی طرحی غزلوں کو اولین قرار دیا گیا ہے

(۱) مصرعِ طرح ؎ دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا۔

۱۔ جناب قمرؔ مرادآبادی
۲۔ جناب آبدؔ سرہندی
۳۔ جناب نعیمؔ اختر بھوپالی

(۲) مصرعِ طرح ؎ ہیچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی

۱۔ جناب نازؔ مانک پوری
۲۔ جناب آبدؔ سرہندی
۳۔ جناب بسیمؔ میرٹھی

جناب پروفیسر فرید قریشی سحرؔ اکبرآبادی جنرل سکریٹری بزمِ سخن کویت تحریر فرماتے ہیں کہ "جن غزلوں کا انتخاب برائے ایوارڈ جوش و ساحر کیا گیا ہے وہ اس خط کے ساتھ بذریعہ رجسٹری روانہ کی جا رہی ہیں تاکہ آپ ماہنامہ شانِ ہند میں اس کی اشاعت کر دیں۔ انعامات کی تقسیم کے سلسلے میں ہم جناب فخرالدین چکی والا کے ساتھ پروگرام ترتیب دیں گے اور آپ کو باقاعدہ مطلع کریں گے

دستخط
فخرالدین چکی والا
سرپرست کویت بزمِ سخن

دستخط
پروفیسر فرید قریشی سحرؔ اکبرآبادی
جنرل سکریٹری کویت بزمِ سخن
۲۶ فروری ۱۹۸۵ء

شبستان کا فیض احمد فیض نمبر

ماہنامہ شبستان [illegible] میں شبستان" ایک منفرد مقام رکھتا ہے [illegible]

کا فیض نمبر شائع ہوا ہے۔ جناب ادریس دہلوی نے فیض نمبر کی ترتیب و تدوین جس اعلیٰ انداز میں فرمائی ہے اُس کی داد تو ہر قاری دے رہا ہے۔ اس کے علاوہ شبستان کا فیض نمبر اعلیٰ طباعت کا ایک ایسا نادر نمونہ ہے کہ جسے اگر محکمہ ڈی۔ اے۔ وی۔ پی یا اکثر اُن اکادمیوں کے وہ ارباب متعلقہ جو کتابوں اور رسائل و جرائد کی اچھی طباعت پر ایوارڈ دینے کا فیصلہ کرتے ہیں ایک نظر دیکھ لیں تو انہیں یقینی ندامت ہوگی کہ وہ کیسی کیسی کتابوں اور رسائل و جرائد کو اعلیٰ طباعت و کتابت پر ایوارڈ دے کر مذاق کا موضوع بنتے ہیں۔

"شبستان کا فیض نمبر" ایک ایسا دلکش اور جاذبِ نظر ادبی تحفہ ہے جسے آپ اپنے سخن فہم احباب کو فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ ساڑھے تین سو صفحات پر پھیلے ہوئے اس فیض نمبر کی کس کس خوبی کا تذکرہ کیا جائے۔ بس یہ خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اب تک فیض صاحب پر ایسا جامع اور بہتر خصوصی نمبر شائع نہیں ہوا تھا۔ اس قابلِ قدر اور یادگاری فیض نمبر کی قیمت صرف پندرہ روپیہ ہے۔ جو یقیناً کم ہے یہ دیدہ زیب فیض نمبر شبستان۔ دفاتر شبستان آصف علی روڈ نئی دہلی ۲ کے علاوہ دفتر شانِ ہند سے بھی دستیاب ہو سکتا ہے۔

ساجدہ مرزا

ساجدہ مرزا فلمی نام سجا آپ نے اکثر فلموں میں اداکاری اور موسیقی میں جو شہرت پائی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں پچھلے سال پاکستان میں ساجدہ مرزا المعروف سجاتا نے اپنے فن کا جو مظاہرہ کیا تھا اسے اہلِ پاکستان اب تک بھول نہیں سکے۔ پاکستان کے اکثر رسائل اور اخبارات نے ساجدہ مرزا کے مطالعۂ فن کے سلسلے میں خصوصی شمارے شائع کئے۔

ساجدہ مرزا کو اُردو شاعری سے خصوصی رابطہ رہا ہے اور اب وہ شاعرہ کی حیثیت سے دُنیائے شاعری میں اپنا سکہ بٹھا رہی ہیں۔ کئی کئی ہند مشاعروں میں ساجدہ مرزا نے جو نمایاں کامیابی حاصل کی ہے

اس کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ ترنم، کلام اور حسن کی یہ تثلیث اردو مشاعروں میں بہت جلد ایسا مقام حاصل کرلے گی کہ بہت سی بے چینگم، بداخلاق اور ناپسندیدہ شہرت کی شاعرات میدان سے باہر ہوجائیں گی۔ ایسے مشاعرے جن کے منتظمین واقعی اپنے مشاعروں کو کامیاب ہوتے ہم کنار دیکھنا چاہتے ہیں وہ ساجدہ مرزا ہمدمی سے رابطہ قائم کریں۔ ساجدہ مرزا کو دفتر شانِ ہند کی معرفت خطوط لکھے جاسکتے ہیں جو بہ حفاظت اُن تک پہنچادیے جائیں گے۔

جن وانی

دلی دُوردرشن نے "جن وانی" نام سے ایک سلسلۂ پروگرام جاری کیا ہے جس میں ہر ماہ کسی نہ کسی مرکزی وزیر کو اپنے محکمے کی خامیوں کے بارے میں عوام کے سوالات کا جواب دو بدو دینا ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ جناب راؤ بریندر سنگھ سے شروع ہوا۔ راؤ صاحب نے اپنے محکمے سے متعلق خامیوں کے جوابات اچھے انداز میں دیئے۔ اور اُن کے بعد سردار بوٹا سنگھ نے بھی بڑی توجہ اور تحمل سے معترضین کے اعتراضات کے جوابات خوش اسلوبی سے دیئے۔ مگر اس سلسلے میں ریلوے وزیر جناب بنسی لال صاحب نے کافی حد تک مایوس کیا۔ حالانکہ معترضین کے سوالات مناسب ہی اہم موضوعات پر تھے۔ مگر وزیر متعلقہ کے جوابات نہ محض نامکمل تھے بلکہ حماقت کی حد تک مضحکہ خیز بھی تھے۔ ہر سوال کا جواب ہمارے پاس روپیہ نہیں۔ صرف بے بسی کا مظاہرہ تھا بلکہ حکومت ہند کی بے بسی کا بھی اعلان کر رہا ہے جب کہ ہمارے وزیر اعظم کو ہندوستان کو اکیسویں صدی میں نہایت تزک و احتشام کے ساتھ داخل کرنا چاہتے ہیں۔ ہم بنسی لال صاحب سے گذارش کریں گے کہ ذرا وہ کبھی ریل گاڑی میں سیکنڈ کلاس کے ڈبہ میں خفیہ طور پر سفر کرکے تو دیکھیں تو انہیں پتہ چل سکے گا کہ انہوں نے عوام کے لئے کیا کیا راحتیں اور آرام مہیا کر رکھے ہیں۔

دُوردرشن کو چاہیئے کہ وہ اتنے ہی معترضین کو مدعو کیا کریں جو آدھ گھنٹے کے پروگرام میں بہتر طور پر اپنے سوالات اور ضمنی سوالات کا جواب تسلی بخش پاسکیں۔

دیوراج ہوش گاندھی کا انتقال

جے پور کے جناب دیوراج ہوش گاندھی کا پچھلے دنوں ہارٹ فیل ہوجانے کے باعث انتقال ہوگیا۔ ہوش صاحب محکمۂ ٹیلی فون میں چیف اکاؤنٹنٹ تھے اور آپ نے اپنے عرصۂ ملازمت میں عوام کی جو خدمت کی اُسے اہلِ جے پور کبھی فراموش نہ کرسکیں گے۔ ایک معمولی سے بیوپاری سے لے کر وزیر تک ہوش گاندھی صاحب کی جو قدر و منزلت تھی اُس سے پتہ چلتا تھا کہ اگر کوئی شخص عوام کی خدمت اپنا نصب العین قرار دے لے تو اُسے مقبولیت عام و خاص حاصل تو ہوگی ہی وہ اپنی عاقبت بھی سنوار لیتا ہے۔ ہوش صاحب نے اپنی شرافت، خلوص اور اخلاق کے جو سکے اپنے جاننے والوں اور اہلِ جے پور کے دلوں پر بٹھاتے تھے وہ مدتوں اپنا نقش مٹنے نہ دیں گے۔

ہوش صاحب جہاں ایک اچھے انسان تھے اتنے ہی اچھے شاعر تھے اُن کی شاعری بھی مقصدی تھی اور شرافت و اخلاق کا درس لئے ہوئے تھی۔ ہمیں دلی افسوس ہے کہ ہوش گاندھی جیسے مخلص بے ریا اور حقیقی دوست ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے۔ خدا انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

ڈاکٹر خلیق انجم کو پرویز شاہدی ایوارڈ

مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے سالِ رواں کا پرویز شاہدی ایوارڈ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری جناب ڈاکٹر خلیق انجم کو دیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے انجمن ترقی اردو کے لئے جو تاریخ ساز کام کیا ہے اُس کی تعریف اُن کے دشمن بھی کرتے ہیں۔ ادھر گذشتہ چوتھائی صدی میں جن ادیبوں اور محققوں نے اپنے وقیع کام سے اردو ادب میں نمایاں حیثیت حاصل کی ہے، اُن میں بھی ڈاکٹر خلیق انجم کا نام سرِفہرست ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم کا حالیہ ادبی کارنامہ جس کی وجہ سے اُن کا شمار ماہرینِ غالب میں ہونے لگا ہے۔ چار جلدوں میں "غالب کے خطوط کی تدوین" ہے۔

پرویز شاہدی ایوارڈ دس ہزار روپیہ نقد اور توصیفی سند پر مشتمل ہے۔ ہم اس عزت افزائی پر ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

مولانا سلیمان ندوی سیمینار

پچھلے دنوں انجمن ترقی اردو (ہند)

گوشۂ عقیل صدیقی

شاگردِ سیماب

ڈاکٹر زینت اللہ جاوید

آبد سیمابی سرہندی کی شاعری

آبد ایک روایتی شاعر ہیں جن میں ایک اچھے شاعر کی بیشتر خوبیاں موجود ہیں ان کا شعور فنِ ماضی کے سرمایۂ ادب اور قدیم ادبا اقدار کا تربیت یافتہ ہے اسی لئے وہ اس دورِ علامات و تجرید میں پاسِ فن رکھنے کے لئے "چراغِ فکر" کو باندازِ کہن روشن رکھنا ضروری سمجھتے ہیں اس بات کا اظہار انھوں نے اپنے اس شعر میں کیا ہے جو ان کے مجموعۂ کلام "چراغِ فکر" میں بطور سرنامہ درج ہے۔

دریں دورِ علامات و تجرید پاسِ فن دارم
چراغِ فکر را روشن بہ انداز کہن دارم

چراغِ فکر کو باندازِ کہن روشن رکھنے کا یہ انداز انھیں ماضی سے پیوستہ کر دیتا ہے اور ان کی یہ وابستگی ان کے مزاج اور ان کے شعور کا نتیجہ ہے۔ ان کی فارسی دانی اور اساتذہ کے مطالعۂ کلام نے ان کے رنگِ سخن کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ جس طرز کو اساتذہ اور اسلاف نے برتا تھا اسی کو آبد نے منزلِ مقصود سمجھا یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں قدیم روایات سے بغاوت اور ادبی گمرہی نہیں ملتی بلکہ قدیم روش کو اپناتے ہوئے اپنے تجربات، احتراعات اور جگر کاوی کی بدولت انھوں نے غزل کو دولتِ بزمِ سخن بنائے رکھا۔ اگرچہ انھوں نے نظمیں اور رباعیات بھی کہی ہیں لیکن غزل آبد کی محبوب صنفِ سخن، ان کے جذبات کی ترجمان اور ان کے ضمیر کی آواز ہے۔ اس آواز کو ایک مخصوص لہجہ اور ایک مخصوص آہنگ دینے میں ان کے شعورِ زبان و بیان کو بہت بڑا دخل ہے۔ فارسی روایت کے اثرات سے ترزادا میں ایک رچی ہوئی کیفیت پائی جاتی ہے۔ تزئینِ ظاہر کے ساتھ حسنِ معنی کا نکھار ان کے شعر کی جان ہے گویا شعرِ آبد ایک ایسا پھول ہے جس میں رنگ اور خوشبو کا ایک حسین امتزاج ہے۔

بعض اوقات ان کی غزلوں کے قافیے روایتی پابندیوں اور مشاعرے کی مجبوریوں کا بھی پتہ دیتے ہیں لیکن ان کی قادر بیانی کے پس منظر میں آبد کی انفرادی دلکشی ہمیشہ شریکِ غالب نظر آتی ہے قدیم اردو غزل کی اسی خصوصیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے آبد نے ایک غزل میں ایسی زمین انتخاب کی ہے جس میں ردیف فعل ہے۔ پھر یہ کوشش کی ہے کہ اس فعل کے ساتھ مختلف لفظوں کے ملانے سے جتنے محاورات بنتے ہیں ان سب کو باندھ دیا ہے غزل کی ردیف میں ہے "پڑے"۔ آبد نے حسبِ ذیل محاورے کہے ہیں۔ کل پڑنا۔ شور و شر پڑنا۔ عقل پر پتھر پڑنا۔ راہ میں پڑنا۔ پلے پڑنا۔ سابقہ پڑنا۔ مثلاً ایک شعر ہے ؎

جب اٹھا جذبات میں طوفان بپا کر کے گیا
دل کے ہاتھوں آدمی کی عقل پر پتھر پڑے

عروضی نقطۂ نظر سے ان کی غزلوں میں چھوٹی بحروں اور دھواں انگیز زمینوں کو خاص اہمیت ہے۔ بیشتر غزلوں کے مقطعے سوانح حیاتی اشارات کے حامل اور خود اعتباری کے گواہ ہیں جن کی مدد سے شاعر کی انفرادیت، خود اعتقادی، حقیقت نگاری، خود اعتباری کا پتہ چلتا ہے اور ان کی زندگی کے بعض گوشے بے نقاب ہو جاتے ہیں۔

گنگا رام آبد سیمابی سرہندی سنہ ۱۹۱۵ء میں موضع نکسن پور تحصیل سرہند ضلع پٹیالہ کے ایک متوسط درجہ کے خاندان میں آنکھ کھولی۔ زندگی کا کچھ حصہ سرکاری ملازمت میں بھی گزرا لیکن اب ایک عرصہ سے سرہند شریف میں قیام پذیر ہیں۔ والد محترم کا اسم گرامی لالہ دیوی دیال ہے۔ آبد کو طالب علمی ہی کے زمانہ سے سیاست میں دلچسپی رہی جس کے باعث انھیں زنداں کی مشقت بھی اٹھانی پڑی موزونیِ طبع قدرت کی دین تھی۔ بچپن ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا جسے معراجِ کمال پر پہنچانے کے لئے کسی قابل اُستاد کی ضرورت تھی۔ آبد کی نظر دنیائے شعر و ادب کے مشہور اُستاد حضرت سیماب اکبر آبادی پر پڑی۔ ۱۹۳۷ء میں وہ اپنے اُستاد محترم کے دامنِ فیض سے وابستہ ہو گئے۔ اس بات کا اشارہ انھوں نے اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے ؎

کیا کم ہے یہ شرف کہ بہ فیضِ سخن آبر
رکھتے ہیں ربط شاعرِ ہندوستاں سے ہم

استاد کی ضرورت و اہمیت پر آبر نے اس طرح روشنی ڈالی ہے ؎

سخن گوئی کا جوہر جذبۂ فطرت سہی لیکن
کہاں کامل کوئی بے منتِ استاد ہوتا ہے

حضرت سیماب اکبرآبادی نے اپنے شاگرد میں سخن گوئی کا جوہر کامل دیکھ کر بہت جلد انھیں اصلاح سے بے نیاز کر دیا۔ لفظ سیمابی اسی رشتے کی مناسبت سے اختیار کیا گیا ہے۔

نظریۂ ادب

آبر سیمابی ادب کو زندگی کا آئینہ تصور کرتے ہیں یعنی فن کار کو دنیا میں ہونے والے تغیرات کا ترجمان۔ ان کے خیال میں کوئی فن کار عصری حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک اچھا فن کار وہی ہو سکتا ہے جس کا احساس بیدار ہو۔ جن فنکاروں کے یہاں افکار پر جاب سفر بند ہو جاتا ہے اس کی وجہ ان کا ماحول سے بے گانگی بتاتے ہیں۔ فن کار کے لئے اپنے ماحول سے وابستگی ضروری ہے۔ لیکن فن کار کی پرواز کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔ نگاہِ فن کی رسائی آسمان تک ہے اور تخلیقی عمل کے دوران فن کار کی نگاہِ بے خودی ایسے ایسے مقامات کی سیر کراتی ہے جس کا علم خود فنکار کو بھی نہیں ہوتا۔ مندرجہ ذیل اشعار تخلیقی عمل، فن اور فنکار کے متعلق آبر کے نظریۂ شعر و ادب کی ترجمانی کرتے ہیں۔

زمیں اوپر ہے نیچے آسماں ہے — نگاہِ بے خودی جانے کہاں ہے
ابھی اس خاکداں کی بات ہی کیا — فلک تک بھی نگاہِ فن گئی ہے
ترجمانِ صورتِ حالات کا ہر شخص نہیں — جن کا احساس ہے بیدار وہی ہوتے ہیں
اثرِ تبدیلیِ حالات کا پڑتا ہے دنیا پر — کوئی فنکار رہ سکتا نہیں محروم ان سے
جو نہیں زندگی کا آئینہ — وہ ادب بھی ہے کیا ادب کوئی

شاعر کا موضوع اس کی شخصیت اور شعور کا نتیجہ ہوتا ہے۔ آبر کا ادبی مذاق ہر مسئلہ کو تغزل کے انداز میں بیان کرنے کا عادی رہا ہے لیکن ان کے یہاں غزل کا تصور "سخن از زنان گفتن" نہیں۔ اسی تعلق سے ولی دکنی کا یہ شعر حرف بحرف صادق آتا ہے ؎

ولی شعر میرا سراپا ہے درد — خط و خال کی بات ہے خال خال

آبر کی شاعری عشقِ مجازی کی آئینہ دار نہیں اسی لئے ان کے یہاں ظاہری حسن کا بیان، عشق و محبت کی بے باک مصوری اور ہو بہو عکاسی نظر نہیں آتی بلکہ بیشتر مضامین متصوفانہ ہیں۔ تمام واردات، جذبات کا تعلق عشقِ حقیقی سے وابستہ ہے۔ عرفانِ ذات، معرفتِ نفس، وحدت الوجود، بے ثباتیِ دنیا، صبر و قناعت اور عشرتِ دنیا جیسے مضامین پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ متصوفانہ اشعار میں ان کی اپنی شخصیت کا پرتو بھی جھلکتا ہے جس کے باعث شعروں میں خلوص و صداقت کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ انھوں نے جو کچھ کہا ہے ڈوب کر کہا ہے اور غزل کے مزاج کو ٹھیس بھی نہیں پہنچنے دی۔ وہ عشقِ حقیقی کی تمام کیفیتوں سے آشنا ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ مادی دنیا سے لاتعلق بھی نہیں ہوتے۔ ان کے یہاں دنیا اور انسان کے پیچیدہ مسائل پر غور و خوض کرنے کا شعور بھی موجود ہے۔ ان کے نظریۂ ادب سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ادب کو زندگی کا آئینہ تصور کرتے ہیں، اسی صورت میں بھلا وہ زندگی میں ہونے والے تغیرات سے کیسے محفوظ رہ سکتے تھے۔ وہ عارضی طور پر دنیاوی علائق سے جدا ہو کر دنیائے تصوف میں گم ہو جاتے ہیں
لیکن وہاں سے لوٹ کر وہ اپنے ساتھ زندگی گزارنے کا ایک لائحۂ عمل ساتھ لاتے ہیں اور عملی دنیا میں اعلیٰ قدروں کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔

متصوفانہ اندازِ فکر

آبر کی زندگی صوفیانہ زندگی ہے۔ زندگی کا مادی پہلو بھی ان کے پیشِ نظر نہیں بلکہ وہ مادی زندگی بھی ان کے نزدیک اہم ہے۔ تصوف اور روحانیت تک پہنچنے کا ایک اہم وسیلہ ہے اسی لئے آبر نے اپنی شاعری میں تصوف اور اس کے مسائل کو پیش کرنے کی عظیم روایت کو برقرار رکھا ہے۔ وہ بادۂ تصوف سے سرشار ہیں۔ اسی تصوف نے ان کی شاعری کو حیات و کائنات کے مسائل سے آشنا کیا ہے جس کے باعث ان کی شاعری میں موضوعات کا تنوع اور خیال کی رنگا رنگی پیدا ہو گئی ہے اور ایک فلسفیانہ مزاج کا ظہور ہوا ہے۔ آبر نے زندگی اور اس کے متعلقات کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ جو فنکار روحانیت کو معراجِ زندگی سمجھتا ہو اس کے یہاں عشقِ حقیقی کا پیدا ہونا یقینی ہے یہی سبب ہے کہ آبر کو عشقِ مجازی سے کوئی خاص سروکار نہیں رہا۔ وہ حسنِ مطلق کے دیوانے ہیں۔ ان کے عشق کا مرکز واجب الوجود کی ذات بنا رہتا ہے۔

۱۔ ماہنامہ شاعر ... حضرت سیماب اکبرآبادی

کہاں ہے بعد مجھ میں اور تجھ میں
حجاب ماسوا ہی درمیاں ہے

عرفانِ حقیقت پر مرکز ہوں تجلی کا
آغوش میں قطرے کے دریا نظر آتا؟

انتہائے خود فراموشی کا حاصل کیا کہوں
اپنی صورت میں تیری صورت نظر آئی مجھے

تیرے جلووں میں کھو کر رہ گیا ہوں
سراپا حسن ہو کر رہ گیا ہوں

مطالعۂ فطرت

جب عشق کی بدولت ہوش کو دیوانہ کر کے دل سے نظر کا کام لینے کی صفت انسان میں پیدا ہو جاتی ہے تو اس کی نظر ایسے ایسے رازہائے سربستہ فاش کر دیتی ہے کہ عقل انگشت بدنداں ہو کر رہ جاتی ہے ایسے انسان کے لئے کائنات کا ہر ورق صفت کردگار ہوتا ہے وہ فطرت کو خدا کا پرتو تصور کرتا ہے اور اس کے ذریعہ عرفانِ الٰہی حاصل کرتا ہے۔ اس کے لئے فطرت عارفانہ رموز کا ایک ذریعہ بن جاتی ہے۔ آبدؔ نے فطرت کا مطالعہ ایک عارف کی نظر سے کیا ہے اسی لئے ان کی شاعری میں ایک ایسا انسان ابھرتا ہے جو اپنے وجدان کے طلسم کے باعث کائنات کی ہر شے میں خدا کا جلوہ دیکھتا ہے اسے شمس و قمر۔ صبح کی پہلی کرن، کلیوں کے چٹکنے اور ستاروں کی تب و تاب میں بھی وہی حسن شاہد معنی نظر آتا ہے۔ تاریک راتوں میں تاروں کی تابناکی اسی حسن پنہاں کی ضیا بخشی کا صدقہ معلوم ہوتی ہے وہی حسن شبنم کو آب و تاب اور چمن کو بہار دیتا ہے اور کسی نہ کسی بہانے مائل جلوہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کی بے زبانی بھی زبان ہوتی ہے لیکن اس کو سمجھنے کے لئے عارفانہ نظر اور سراپا گوش ہونا ضروری ہے۔

سراپا گوش ہے جو بھی ہے بزم دوست میں لیکن
سکوت حسن سے کبھی کچھ نہ کچھ ارشاد ہوتا ہے

جلوہ گر ہونا پڑا شمس و قمر کے بھیس میں
حسن کیا چھپتا نگاہ پردہ در کے سامنے

وہ کلی چٹکی وہ پھوٹی صبح کی پہلی کرن
مائل جلوہ ہوا وہ حسن پنہاں دیکھیے

کسی کے حسن پنہاں کی ضیا بخشی کا صدقہ ہے
شب تیرہ میں تاروں کی درخشانی نہیں جاتی

شبنم کو آب و تاب چمن کو بہار دی
سحر جمال یار نے دنیا نکھار دی

عقل و جنوں

زندگی کے حقائق کو اگر عقل و خرد کی نظر سے دیکھا جائے تو بہت سے ایسے معاملات قدرے بخیر ہم عزیز رکھتے ہیں ایک کتابی بیان احوال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں اس لئے بھی کہ شۂ لطیف کو تا حال کثافت میں تبدیل نہیں کیا جا سکا دل کی تسلیم شدہ حقیقتیں عقل و خرد کے لئے بے معنی ہیں۔ اس کے باوجود اگر دل عقل و خرد کی نہ مانے تو یہ اس کے دیوانے پن کے سوا کچھ اور نہیں۔ دل جو عشق کی کیفیات محسوس کرتا ہے بھلا اس تک عقل کی رسائی کہاں؟ عقل چند شہود و زیاں میں گرفتار رہتی ہے ایک الجھن کو ختم کر کے سو الجھنیں اور پیدا کر دیتی ہے اسی لئے عشق میں عقل کی جنوں کے مقابلہ میں ہمیشہ ہی سے مذمت کی گئی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جن کا جذبۂ عشق صادق اور جن کی طلب پختہ ارادوں کی حامل ہوتی ہے ان کے سامنے تو ان کا حقیقی رہنما جنون ہی ہوتا ہے جو عاشق سوختہ کو آمادۂ سفر کر کے دشوار مرحلے گزار دیتا ہے۔ اس کے برعکس عقل سفر عشق میں طالب محبوب کو ہر گام پر روکتی اور ٹوکتی رہتی ہے۔ اور راہِ سفر میں ہزاروں الجھنیں پیدا کر کے عازم سفر کو ناامید اور مایوس کر دیتی ہے لیکن جو انسان ہوش کو دیوانہ کرتا اور دل سے نظر کا کام لینا جانتا ہے اس کی پرواز محدود نہیں رہتی بلکہ وہ عرش بریں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا اسی لئے عشق و محبت میں وحشت اور جنوں کو اولیت حاصل رہی ہے۔ آبدؔ نے عقل و خرد کی مذمت میں کئی اشعار کہے ہیں اور اسرار کی گرہیں کھولنے کے لئے ناخن وحشت کو ترجیح دی ہے

خرد گم گشتۂ تحقیق پہلے بھی تھی اب بھی ہے
مگر ممکن نہیں پردہ اٹھے راز پنہاں سے

کھلے چشم بصیرت خاک اپنی
غلام دیدۂ بینا ہوئے ہیں

انتہائے عقل ہے وہم و گماں
عقل کیا اور عقل کی پرواز کیا

دماغ و دل میں جب سے ٹھن گئی ہے
حقیقت بھی معمہ بن گئی ہے

ناخن وحشت نے گرہیں کھول دیں اسرار کی
عقل حیراں ہے جنون معتبر کے سامنے

...فۂ حیات و ممات

الجھا ہے آفرینش ہی سے یہ کائنات انسان کے لئے ایک معمہ رہی ہے ...
...ن سوالات نے اس کے دل و دماغ کو پریشان کر رکھا ہے
...ئنات خود بخود وجود میں آگئی یا اس کا کوئی خالق بھی ہے؟
...بذات خود کیا ہے؟ موت کے بعد کیا ہوگا؟ انسان کا وجود
...لئے ہے؟ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ سائنسدان اور
...وں نے اپنی اپنی استعداد کے مطابق جوابات تلاش کئے۔
رہنماؤں نے انسانی شخصیت کے روحانی ارتقاء اور اس
...صدِ حیات پر روشنی ڈالی۔ لیکن رازِ ہستی کبھی کھل کر بے
... نہ ہوسکا۔ زندگی اور موت انسان کے سامنے سب سے اہم
...ہا۔ کسی نے زندگی کو ایک دلربا سنہرا خواب بتایا تو کسی نے
... ایک حلقۂ دامِ خیالی تصور کیا۔ کسی کو ...ت زندگی کا
...زنا آیا تو کسی نے اسے سفرِ زندگی کا ایک درمیانی وقفہ
...کیا۔ غرض اس بارے میں مختلف خیالات و عقائد
...ے آئے لیکن کوئی ایسا مشترک نظریہ وجود میں نہیں آیا جو
...سان کے لیے قابلِ قبول ہو۔ بعض نے تو زندگی کو زندگی
...ے کے علاوہ اس قابل ہی نہیں سمجھا کہ اس پر غور و خوض
...یے۔ لیکن ایک حقیقت جو مشترک ہے اور سب کے
...میں کانٹا بن کر چبھتی رہتی ہے وہ موت ہے۔ ہر انسان
ضرور جانتا ہے کہ ایک روز اسے اس جہان سے اٹھ جانا
...لیکن اس کے بعد کیا ہوگا اس کا کوئی جواب نہیں۔ ایک
... انسان دنیا کی محبت کو دل میں جگہ نہیں دیتا بلکہ خالق
...ت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور خدا کے سہارے اس کے
...ر آلامِ زندگی کا کوئی نقش باقی نہیں رہتا۔ وہ اس کا افادہ
...کی ہر شے سے عبرت حاصل کرتا ہے اور اس کی روشنی میں
...زندگی گزارنے کا لائحہ عمل تیار کرتا ہے۔ اس کے لیے راز
...کوئی بہت بڑا معمہ نہیں بشرطیکہ اسے مذہبی عقیدے کی نظر
...دیکھا جائے۔ عقل اس معاملہ میں درماندہ و عاجز ہے۔
...کے خیال میں عقل اسرارِ ہستی و عدم کو بے نقاب نہیں کر سکتی
...لئے خردمندوں کا تلاشِ حقائق میں رہنا ان کا دلباد
...نظر آتا ہے اس لئے کہ عقل کی عقدہ کشائی وہم و گمان
سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ؎

اگر معمہ پیدا از خرد ہے کھلے اسرار ہستی و عدم کیا
انتہا ہے عقل ہے وہم و گمان عقل کیا اور عقل کی پرواز کیا
تلاشِ حقائق میں مصروف ہیں خردمند بھی ہیں کیا

آیڈ نے ہستی و عدم کو جس طرح سمجھا ہے اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے
کہ یہ ایک موجۂ تخلیق ہے جو مدوجزر کے باعث نشیب و فراز سے
گزرتی ہے۔ جب تخلیق عمل فراز پر ہو تو اسے ہم زندگی کا نام دیتے
ہیں اور نشیب میں ہو تو اسے موت کہا جاتا ہے۔ ہر لمحہ کائنات
میں تخلیقی عمل جاری و ساری ہے موت کی یہی ایک گردش شامِ عدم
کو صبحِ ازل سے ملا دیتی ہے اور زندگی کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا
یہ ایک نہ ختم ہونے والا تسلسل ہے البتہ دنیاوی زندگی کا دور
نہایت مختصر اور بے اعتبار ہے۔

اس جہان کی کیا حقیقت ہے بشر کے سامنے
ہو اگر انجامِ ہستی کا نظر کے سامنے
مدوجزر موجۂ تخلیق سے
دورِ ہستی و عدم کچھ بھی نہیں
عکس ہے تخیلاتِ احساس کا
درحقیقت کیف و کم کچھ بھی نہیں
شامِ عدم کو صبحِ ازل سے ملا دیا
جو لہر زندگی تھا اجل نے مٹا دیا

غرض کہ ان کا فلسفۂ حیات ایک مذہبی انسان کا
نقطۂ نظر ہے جس کی بدولت ان پر ؎

گرہ حقیقتِ ہستی کی کھل گئی ہوگی
وگرنہ — اہلِ شعور پہ ذکرِ حباب کیا ہے

مراجعت پسندی

ظاہری طور پر تو انسان کو چہار دیواری میں قید کیا جا سکتا ہے لیکن اس
کی روحانی آزادی اس کے تخیل کی رنگینی اور اس کے ماضی کی
یادیں اسے خلوت میں بھی انجمن کا لطف دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے
کہ ایسے قیدی کو اسیری میں بھی غمِ زندان نہیں ہوتا بلکہ وہ یادِ
چمن ہی سے اپنا دل بہلا لیتا ہے اور کہتا ہے روزنِ زندان
سے گلشن کا نظارہ کر کے اسیری میں بھی فصلِ بہاراں سے
...

آتا ہے اور چاروں طرف بہاریں رقص کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں جس کے نتیجہ میں وہ رہائی کا بھی آرزومند نہیں ہوتا بلکہ اس قدر مانوسِ زنداں ہو جاتا ہے کہ اگر اسے رہا کر بھی دیا جائے تو اس کے قدم سوئے گلستاں جلدی نہیں اٹھتے اور اسے اسیری کی لذت ستانے لگتی ہے

آبد کے یہاں ماضی کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنے کا رجحان بہت قوی نظر آتا ہے۔ اس کا انسان اسیرِ قفس ہوتا ہے تو چمن کی یادوں کو سینے سے لگائے ہوتا ہے اور جب رہا ہوتا ہے تو اسے اسیری کی لذت ستانے لگتی ہے۔ ماضی کو یاد کرنے کے لئے ایک گوشۂ تنہائی بھی ضروری ہے اس لئے وہ گوشۂ قفس ہی میں زندگی گذار دینے کے لئے تیار نظر آتا ہے۔ ایسے حالات سے ایک طرح کا سمجھوتہ بھی کہا جا سکتا ہے جس کی رو سے ایک مجبور انسان نفسیاتی پریشانیوں اور سعیٔ لاحاصل کی رنجشوں سے چھٹکارا ضرور پا جاتا ہے لیکن اپنی گردن میں غلامی کا طوق اس کا مقدر بن جاتا ہے۔ آبد کے یہاں اسیری میں دیوارِ قفس سے سر ٹکرا کر مر جانے یا دیوارِ زنداں توڑ کر فرار ہونے کا رجحان نظر نہیں آتا۔ بلکہ وہ جبر سے بھی اختیار کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ اگر ان میں آزاد ہونے کی طاقت نہیں تو مجبوری میں گھٹ گھٹ کر دم توڑ دینے کا ارادہ بھی نہیں بلکہ میعادِ قید ختم کرنے کے لئے وہ حال کی تلخیوں پر ماضی کی خوشگوار یادوں کا نقاب چڑھا دیتے ہیں۔ آبد کے حسبِ ذیل اشعار سے صبر و قناعت اور ماضی پرستی کی تعیین ہویدا ہے ؎

اسیری میں بھی لذت پا رہا ہوں فصلِ بہاراں سے
نظر آتا ہے گلشن روزنِ دیوارِ زنداں سے

بہاریں رقص کرتی ہیں نظر میں
قفس آئینہ دارِ گلستاں ہے

بہل جاتا ہے دل یادِ چمن سے
اسیری میں غمِ زنداں نہیں ہے

کر دیا مانوسِ زنداں قیدِ بے میعاد نے
اُف یہ دل کہ آرزوئے رہائی [illegible]
اگر اٹھیں قدم سوئے گلستاں کس طرح اٹھیں

آبد کے یہ رجحانات بھی تصوف ہی کی دین ہیں۔ ان کے لئے قفس اور چمن، آزادی اور اسیری سب برابر ہیں اس لئے کہ ؎

فصلِ خزاں ہی کچھ ہے نہ فصلِ بہار ہے
دنیا تمام شعبدۂ اعتبار ہے

صبر و قناعت

آبد کا مسلک تسلیم و رضا کا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ انسان کو زندگی میں جو کچھ ملتا ہے وہ خدا ہی کی جانب سے ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی دی ہوئی ہر شئے عزیز ہونی چاہئے اور کمی و بیشی کی کوئی شکایت لب پر نہیں آنا چاہئے۔ سب سے بڑی تو صبر و قرار ہی ہے جسے یہ نصیب ہو جائے اس کے لئے پھر کم زیادہ کے برابر ہو جاتا ہے اور دستِ طلب دراز کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ انسانی روح تو اسی حالت میں سرگرداں اور پریشاں رہتی ہے جب انسان اپنی آرزوؤں اور ضرورتوں کو بڑھا کر ان کے حصول کے لئے جائز و ناجائز اسباب و وسائل کو اختیار کرتا ہے۔ اور ناکامیابی کی صورت میں مایوس اور رنجیدہ ہو کر اپنی محرومیوں پر خون کے آنسو بہاتا ہے۔ دل کا اطمینان تو اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ انسان کا دل صبر و رضا کی لذت سے آشنا ہو جائے۔ چونکہ آبد ہر شئے کو خدا ہی کی ذات سے منسوب کرتے ہیں اس لئے ان کے یہاں غم و نشاط کی تخصیص نہیں اور اس بارے میں وہ ایک طرح کی آسودگی محسوس کرتے ہیں۔ آبد کی یہ فکر تصوف کی تابع ہے اور ناسازگار حالات میں بھی وہ صبر و قناعت کی بدولت زندگی کی تلخیوں اور سختیوں کو بخوشی قبول کر لیتے ہیں۔ یہی تصوف ان کے دنیا کے خلاف حصار کا کام انجام دیتا ہے ؎

غم و نشاط کی تخصیص تو ضرور نہیں
ملا ہے تیرے کرم ہی سے جو ملا ہے مجھے

کمالِ صبر کا حاصل نہ پوچھو
نظر آنے لگا ہے کم زیادہ

دستِ طلب دراز کرے بھی تو کیوں کرے
جس کو خدا نے دولتِ صبر و قرار دی

دل آشنائے لذتِ صبر و رضا نہیں
کیوں کر بشر کی روح کو آسودگی ملے

سفرِ زندگی

آبد صبر و قناعت کے عادی ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا نظریۂ حیات منفی اور مجہول ہے
ن کے یہاں زندگی سے فراریت کا رجحان ملتا ہے۔ ان کے جذبہ
ماس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ان کے یہاں زندگی پیہم سفر کا نام
اور وہ کسی منزل پر قیام کرنا نہیں چاہتے ؎
پیہم سفر کا نام ہے   رہروِ ہستی کہیں منزل بنا کر
وہ زندگی کو گہوارۂ عافیت تصور نہیں کرتے بلکہ ایک رزم گاہ
ایک دارالامتحان سمجھتے ہیں جو باوجود مختصر ہونے کے ہر گام پر انسا
زم و حوصلہ کا امتحان لیتی ہے اور اس کے عقل و شعور کو پرکھتی
ہے ؎

نگاہوں میں گذر جاتی ہے اکثر   حیاتِ مختصر بھی امتحاں ہے

جو اس راز سے واقف ہوتے ہیں وہ اس امتحان سے گزرنے
لئے ہر مشکل سے مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔ اور مسلسل سرگرم عمل
بر زندگی کے مراحل طے کرنے کے لئے سربکف آمادۂ سفر ہو
تے ہیں ؎

سہل کر دی اشتیاقِ منزلِ مقصود نے
جادۂ ہستی میں پیش آئی جو دشواری کہیں

آبد کے یہاں خواب دیکھنا بھی کوئی برا نہیں۔ وہ انسانی
ندگی میں خواب و خیال کو بھی اہمیت دیتے ہیں اگرچہ زندگی
رف خواب و خیال ہی کا نام نہیں لیکن عمل کا وجود بھی عزم و ارادے
بغیر ممکن نہیں۔ جس انسان کے یہاں نہ کوئی خیال ہے نہ کوئی
ارادہ، وہ ایک زنگ آلود شخصیت کا مالک تو ہو سکتا ہے کسی
انداز متحرک شخصیت کا نہیں ؎

گوہر مقصود حاصل ہو چکا
جستجو ہی میں جو دم کچھ بھی نہیں

خیالوں میں اگر روحِ عمل بھی پھونک دی جائے
حقیقت سے بدل جاتے ہیں خواب آہستہ آہستہ

ہوسِ منزل پہنچنے کی اگر دل میں لگن
حوصلہ افزا یقیناً سعی لاحاصل بھی ہے

مصائبِ زندگی میں سربکف انسان کبھی کسی مشکل سے خوفزدہ
اور اپنے مقصدِ حیات سے مایوس نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہے کہ یہ جنگ

ہستی درحقیقت جذبات کی گرمی ہی سے ہے۔ اسی لئے دل کو ہمیشہ امید و
ارمان سے بھرا ہونا چاہیئے ؎

ہنگامۂ ہستی ہے جذبات کی گرمی سے
کیا دل ہے وہ جس میں امید نہ ارماں ہے

آبد کی شاعری میں امید و ارماں، گرمیٔ جذبات، خوابوں کو
حقیقت میں بدلنے کے لئے عزم و ارادہ، اشتیاقِ منزل، جد و جہد اور
عمل کی تلقین ایک صحت مند رجحان کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس اعتبار
سے ان کا فلسفۂ زندگی نہایت جاندار اور توانا ہے اور ان کے اس
انسان کی شخصیت کے دوسرے پہلو کو روشن کرتا ہے جو اپنی کمزوری کے
باعث درِ زنداں توڑنے سے معذور ہے اور رہا ہونے کے بعد بھی
جس کے قدم سوئے گلستاں اٹھنے سے قاصر ہیں۔

سماجی شعور

آبد اقدارِ ماضی کے پرستار ہیں اسی لئے جدید
تہذیب اور نئی قدریں انھیں پسند نہیں۔ وہ سماجی
رجحانوں کو پرانی قدروں کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور جب انھیں اپنے
معیار پر پورا اترتے ہوئے نہیں دیکھتے تو ان اسباب پر روشنی ڈالتے
ہیں جن کے باعث جدید سماج روبہ زوال ہے۔ وہ جدید معاشرے
پر کڑی تنقید کرتے ہیں اور قعرِ پستی سے نکال کر ارتقاء کی جانب
راستہ دکھاتے ہیں۔ نیا سماج جس طرح مادہ پرستی کی دوڑ میں اپنی
پرانی اقدار اور مذہبی و اخلاقی قدروں سے دور ہو گیا ہے وہ انھیں
بے چین کر دیتا ہے۔ جدید انسان نے اپنے دل میں خواہشات کا ایک
حشر برپا کر رکھا ہے جس کے باعث اسے تسکینِ دل حاصل نہیں
ایک طرف سائنس کی ترقی روز افزوں ہے تو دوسری طرف انسان
فرو دستہ بھی کمتر ہے ایک طرف مساوات اور برابری کے دعوے
ہیں تو دوسری طرف عوام پر جینا بارِ گراں ہے۔ سماج اخلاقی پستی
میں اس قدر گر چکا ہے کہ اب اصلاح کی بات کرنا بھی ممکن نہیں
اسی لئے آبد ایک نئی دنیا کے خواہشمند ہیں ؎

نہ کر اصلاح کی باتیں قیامت کی گراوٹ ہے
نئی دنیا بسا دے تو اگر میرا کہا مانے

زندگی تسکین کیوں کر پائے گی
دل میں حشرِ احتیاج اچھا نہیں

صنعتی تہذیب کا حسن کرشمہ الاماں
آدمی سے ہے گراں فولاد تیرے شہر میں

تہذیب کے افق پہ تجلی کہاں سے ہے
اخلاق ڈوبتا ہوا تارا ہے ان دنوں

لیکن معاشرہ از خود اچھا یا برا نہیں ہوتا بلکہ افراد مجموعی طور پر اپنی معاشرتی زندگی اچھی یا بری بناتے ہیں۔ اگر انسان ذہنی طور پر زندگی کے متعلق غلط رویے یا رجحان رکھتا ہو تو اس کی ظاہری شخصیت، سیاسی اور عمرانی تعلقات بھی بے راہ روی کا شکار ہوں گے جس کے نتیجہ میں انسان مجموعی طور پر معاشرتی زندگی کو کامیاب نہیں بنا پاتا۔ آفاقی قوتوں کے بجائے اس کا ایمان تخریبی عناصر پر زیادہ ہوتا ہے۔ اسے اپنے مآل کی خبر نہیں ہوتی وہ مختلف اشتہاروں کا لبادہ اوڑھ کر مختلف گروہوں میں بٹ جاتا ہے اپنی غرض پوری کرنے کے لئے توہینِ آدمیت بھی کر گزرتا ہے اور اپنے ہر فعل کو شعور و ہوش کی بیداری تصور کرتا ہے۔ عمرانی بحوالہ تزئینِ بزمِ جہاں میں وہ اس قدر ڈوب جاتا ہے کہ پھر خدمتِ خلق اور انسان دوستی کا خیال تک اس کے دل میں نہیں آتا۔ دورِ جدید میں انسان کس قدر خود پرستی اور بد اخلاقی میں مبتلا ہے آبد نے اپنے شعروں میں اس کا اظہار برملا کیا ہے اور اس تاریکی کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس پُرتصنع زندگی کی تابناکی کے پس پردہ انسان کے باطن میں مسلط ہے ؎

کیا کوئی سمجھے کہ دورِ حال کا
آدمی بے ربط سی تحریر ہے

کیا رنگِ زمانہ ہے کیا گردشِ دوراں ہے
انسان کے سائے سے انسان گریزاں ہے

تزئینِ بزمِ زیست میں گم ہو کے رہ گیا
انساں کو کچھ خبر نہیں اپنے مآل کی

کسی کی اصلیت کا لے سکے کیا جائزہ کوئی
بشر نے اوڑھ رکھا ہے لبادہ اشتہاروں کا

دکھاوے کے لئے ہنستی ہے دنیا
تہ دل سے بشر شاداں نہیں ہے

اپنی منزل سے بہت دور ہے انسان ابھی
کارگر اس نے ارادہ [illegible]

مذہبی شعور

مذہب دنیا میں انسان کے لئے سکونِ دل خاطر آیا لیکن انسانوں نے گنجائشِ تفریق ٹھہرا لیا اور مذاہب کے نام پر قتل و خونِ انسانیت کا وہ بازار گرم ہوا کہ شیطانیت بھی مات کھا گئی۔ مذاہب کے ٹھیکیداروں نے اپنی اغراض پوری کرنے کے لئے خدا کا نام لے کر دست و گریباں ہونے میں کوئی برائی محسوس نہیں کی اور اہلِ سیاست نے اس سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ آبد نے اس بات کو محسوس کیا ہے۔ ان کے سینے میں ایک ایسا ہمدرد دل ہے جو انسان کو صرف انسان کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے اور اس میں کسی تفریق کو تسلیم نہیں کرتا۔ ان کا خیال ہے کہ مذہبی فرائض کی ادائیگی بھی اب دل بہلاوے کی چیز ہو کر رہ گئی ہے۔ مسجدوں میں تڑپ ہے نہ دعاؤں میں اثر۔ آبد مذہب اور اس کی اہمیت کو تسلیم تو کرتے ہیں لیکن مذہب میں سیاست اور مذہب کے نام پر تجارت انھیں پسند نہیں اس لئے انھوں نے اپنے اشعار میں قتلِ انسانیت پر اظہارِ افسوس کیا ہے اور محفلِ یاراں میں تفرقہ ڈالنے والوں پر کڑی تنقید کی ہے ؎

تکفیرِ غیر، جذبۂ انسانیت کا قتل
کیا کچھ نہیں ہوا ہے مذاہب کے نام پر

رواداری نظر آنے لگی خوابِ پریشاں کیا
تیرے بندے ہوئے آپس میں دست و گریباں کیا

گنجائشِ تفریق ہے دنیا میں ابھی اور
خلاقِ جہاں بیچ سیاست کے دھن اور

جی بہل جائے گا آبد ورنہ
حاصلِ سجدہ و دعا معلوم

جا ملیں کیوں سوئے معابد کنجِ خلوت چھوڑ کر
ہر جگہ بیوپار ہوتا ہے خدا کے نام کا

سیاسی شعور

آبد نے اپنی غزلوں میں ایسے اشعار بھی کہے ہیں جو اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ سماج میں انتشار اور ذہنی پریشانی کی ایک وجہ سیاسی شعور کی کمی بھی ہے جس کی عدم موجودگی سے ہم زاغ و عندلیب میں امتیاز سے قاصر ہیں۔ گو ایسے اشعار میں آبد غزل کی ایمائیت اور رمز

کی جھلکیاں ہیں [illegible] ان کے یہاں [illegible] کی پابندی
ہے۔ جہاں ان میں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ محبوب کا دامن پکڑیں، اس
کی زلف و رخسار سے کھیلیں تو وہ خواب و خیال میں ایک نیا
آباد کر لیتا ہے جہاں وہ اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کی تکمیل
میں کسی چیز کو مانع نہیں پاتا اور ہجر میں بھی لذت وصل سے
فیض یاب ہوتا ہے ؎

کیا کہیں کیوں کر گزارا دورِ پر آشوب ہجر
ہم تصور میں رہے ان سے بہم اپنی جگہ

غم فراق بھی راس آ گیا طبیعت کو
ترے وصال کا پُر کیف خواب کیا ہے

بہ رنگ موجِ صبا مشک بار گزری ہے
خیال سے بھی جو زلف نگار گزری ہے

کس طرح محرک تعلق بن پڑے
خواب میں بھی کوئی دامن گیر ہے

آبر کے تصور حسن و عشق سے جس محبوب کا پیکر ابھرتا ہے وہ ایسا نہیں ہے جس کے زلف و رخسار سے کھیلا جائے، یا اس کے ظاہری خط و خال کی تعریف کی جائے۔ وہ تو ایک ماورائی ذات ہے جسے صرف خواب و خیال اور تصور ہی میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ آبر نے اپنے شعروں میں حسن مجازی کی عکاسی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ایسا بھیس ہے جو اردو غزل کی روایت نے انھیں بدلنے پر مجبور کیا ہے۔ وہ چاہے عشق میں جو بھی بھیس بدلیں ان کا طرز عشق چھپ نہیں سکتا اس بات کا خود انھیں اقرار ہے ؎

لوگ تو لوگ ہیں پہچان گئیں دیواریں
ہم گئے ان کی طرح بھیس بدل کر کتنے

وہ حسن مجازی کا طواف کرتے بھی ہیں تو اس لئے کہ شاید اس پردے میں وہ اپنے محبوب حقیقی کو دیکھ لیں۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ آبر کو جستجو ئے حسن یوں ہی نہیں ہے بلکہ اس کے پس پردہ وہ محبوب حقیقی کا جلوہ دیکھتے ہیں اور قبلہ کو قریب میں بدل کر اس کی آواز کو قریب سے سننا چاہتے ہیں ؎

چشم بینا کو نہیں جستجو ئے حسن یوں ہی
ماسوا جلوۂ مستور کا پردا ہے مجھے

آواز دیجئے کبھی آ کر قریب سے
ہم دور کی صداؤں سے مایوس ہو گئے

آبر نے حسن و عشق کا جو تصور پیش کیا اور حسن و عشق کی مختلف واردات و کیفیات کو جس طرح شعر کے پیرائے میں ادا کیا ہے اس سے ان کی شاعری میں صرف غزل کا ڈھانچہ ہی تیار نہیں ہوتا ہے بلکہ غزل کی روح بھی دکھائی دیتی ہے اس طرح ان کی شاعری کی روایت اپنے آپ کو رونما کرتی ہے۔

شعورِ غم

آبر کا شعورِ غم بہت توانا اور جاندار ہے۔ وہ غم کو زندگی کا محرک اور ایک ایسا تازیانہ تصور کرتے ہیں جس کے باعث دلِ ناداں خواب غفلت سے جاگ پڑتا ہے اور مسائل زندگی و رازِ حیات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے یہ اور بات ہے کہ انسان کا دل خوگر دۂ مسرت ہوتا ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غم ایک پائندہ حقیقت ہے۔ انسانی زندگی کا ایک جزو لاینفک، اسی لئے اس کی خلش جاوداں ہوتی ہے۔ اس کے برعکس عیش و عشرت کے لمحے گریزپا اور ان کی چمک دمک عارضی ہوتی ہے خوشیاں تو لبوں کو چھو کر فوراً واپس چلی جاتی ہے لیکن غم حیات کا نشتر دل میں ہمیشہ کے لئے اتر جاتا ہے۔ بزم جہاں میں حیات و ممات کا رقص جاری ہے۔ اب ایسے ماحول میں خوش رہنا یا ملول رہنا انسانی طبیعت پر منحصر ہے کہ وہ کس حالت کو اپناتا ہے۔ جو غم کی [illegible] کو جان لیتے ہیں وہ غم حیات کو مسرت پر ترجیح دیتے ہیں اور رنج و غم پہ یہاں خوشیوں اور مسرتوں کو نثار کر دیتے ہیں [illegible] بے اعتبار ہوتی ہیں اور انسانی ذات کی اوپری سطح پر [illegible] کرتی ہیں جب کہ غم روح کی گہرائیوں میں اتر کر انسان کو ایک فلسفیانہ نقطۂ نظر اور زندگی گزارنے کا ایک شعور عطا کرتا ہے۔

آبر کا ایذا پسند دل غم کی لذت سے آشنا اور اس کی عظمت کا قائل ہے۔ ان کے یہاں سنجیدہ تفکر اسی غم کی بدولت آیا ہے۔ وہ ایسی مسرت کے آب حیات کو پسند نہیں کرتے

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ

رجسٹرڈ ہیڈ آفس : نمبر ۸، محمد علی روڈ بمبئی ۳ ۔۔۔۴

دہلی برانچ :- دریا گنج، نئی دہلی

اعلان بسلسلہ حج ۱۹۸۵ء

ہم بہ مسرت اعلان کرتے ہیں کہ سال گزشتہ کی طرح امسال بھی بفضلہ تعالیٰ حج کمیٹی نے حجاج کرام کی سہولت کے لیے زر مبادلہ (فارین ایکسچینج) جاری کرنے کی خدمت انجام دینے کے لیے

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ کو منتخب کیا ہے

جن حجاج کرام کی درخواست حج کمیٹی نے منظور کر دی ہے ان حضرات سے گزارش ہے کہ وہ ہندوستانی رقم مبلغ =/14280 روپے (جو کہ سعودی ریال چار ہزار کے برابر ہے) کا ڈرافٹ ہماری کسی بھی برانچ یا کوئی بھی شیڈولڈ بینک سے حاصل کریں جو

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ اکاؤنٹ

حاجی کا نام ۔۔۔۔۔۔۔ کے حق میں ہو اور دہلی یا بمبئی پر جاری کیا گیا ہو

نوٹ :- دہلی سے بذریعہ ہوائی جہاز

جانے والے زائرین حج سے گزارش ہے کہ وہ برائے سہولت اپنے ڈرافٹ

صرف

دہلی پر ہی جاری کروائیں

سمجھتے اُس کی تنخواہ تین تین پیسے کر کے آتے ۔ اللہ ہی نذر لیا ہے
پیسہ ان سب کا رکھوالا ہے ۔ جنگل میں پھیلے ہوئے کھیتوں کی فصلیں
پیڑوں پر اُگنے والے سبز دانوں کون دیکھتا ہے ۔ جہاں تک راما کا
ہے وہ تو بہت ہی تیز ہے وہ کبھی بھی میری ناک نہیں کٹانے گی ۔
ہی دل میں کہتا ہوا بابو آگے بڑھا ۔ اور دروازہ کی طرف چلدیا ۔
راما کی ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی جیسے سن کر بابو نے مڑ کر راما کی
نمی بھری نظروں سے دیکھا اور کہا " اب تم میرا دھیان چھوڑ کر
میں من لگاؤ " یہ کہتے ہوئے بالکل اسی طرح بابو تیز تیز قدموں
راما کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ۔ اور راما چارپائی پر بیٹھی گھٹ گھٹ
روتی رہی ۔ کیونکہ اگر وہ اونچی آواز میں روتی تو سوئے ہوئے بچے اٹھ بیٹھتے
مجبوری تھی کہ وہ کھل کر رو بھی نہیں سکتی تھی ۔
دن نکلے جب بچے سو کر اُٹھے اور انہوں نے اپنے باپو کو پوچھا تو ماں
بناوٹی مسکان کے ساتھ جواب دیا " بیٹا وہ سرکاری کام پر کمانے چلے
ہیں وہاں سے خوب سارا روپیہ کما کر لائیں گے بہت دنوں کے بعد
ئیں گے ۔ " یہ سن کر بچے مطمئن اور خوش ہو گئے اپنے خوشی مستقبل کے
حسین دیکھنے لگے ۔ جب کبھی بچوں کو اپنے باپ کی یاد ستاتی اور
دیکھنے کو جی کرتا تو وہ ماں سے اُس کے آنے کی بابت پوچھتے جواب ملتا "
ابھی بہت دن کہاں ہوئے ہیں ؟ " یہ سنتے ہی بچے خاموش ہو جاتے ،
طرح راما بچوں کی دیکھ بھال کرتی رہی اور کھیتی بھی سنبھالتی رہی ۔ بابو دن بھر
دکان بھیک مانگنے لگا ۔ شام کو اسٹیشن پر جاکر سو جایا کرتا اور
بھی رات بتانے جا سوتے تھے ۔ بابو ان کوڑھیوں سے گھبراتا تھا مگر
دھیرے یہ گھن دور ہوتی گئی کیوں کہ وہ خود بھی تو انہیں کی طرح تھا
یہی لوگ اُس کی برادری تھی یہی اُس کا سماج تھا ۔ وہ انہیں دیکھتا ۔
دن بھر کے مانگے تانگے پیسوں سے طرح طرح کی چیزیں خرید لاتے
مزے لیتے لیکن بابو کچھ پڑھا لکھا بھی تھا ۔ اُس نے ان کی نقل نہیں کی
پیٹ بھرنے کے لئے مناسب اخراجات کرتا ۔ اور مہینے بھر میں
بچا راما کو منی آرڈر کر دیتا ۔ منی آرڈر کوپن پر لکھوا دیتا کہ میں بالکل ٹھیک
کام کر رہا ہوں ۔ اچھی نوکری مل گئی ہے تم بچوں کو سنبھال کر رکھنا ۔ بابو
طرف سے اس طرح ہر ماہ پہنچنے والے منی آرڈر اور سندیسوں سے
والوں کو بھی یقین ہو گیا کہ بابو کہیں کام کر رہا ہے اس طرح سے گو
اپنے بچوں کی خیر خبر تو نہیں ملتی تھی مگر اُس کی خیر خبر بچوں کو ضرور مل جاتی
تھی جو سبھی کو باعث راحت ہوتی تھی ۔
بابو کے گھر سے جانے کے ٹھیک نو ماہ بعد راما کو بھگوان نے آخری
پیار کا پھل دے دیا اور وہ اب تین بیٹوں کی ماں بن گئی ۔ عورتوں میں طرح
طرح کی باتیں ہونے لگیں ؟ نو ماہ کی مدت اور ہر ماہ منی آرڈروں کا آنا ہی
سب کا منہ بند کرنے کو کافی تھا ۔ اور راما کی شرافت نیک چلنی اور خوش اخلاقی
اُس کے آڑے آئی اور وہ بدنام ہونے سے بچی رہی ۔ ایک دن راما نے منی آرڈر
کی واپسی رسید کے پتہ پر بذریعہ خط بابو کو تیسرے بیٹے کی خوشخبری بھی بھیجی مگر کوئی
جواب نہیں آیا اس بیچاری کو کیا پتہ کہ منی آرڈروں پر لکھا ہوا پتہ فرضی ہوتا تھا
جب کوئی جواب نہیں آیا تو وہ حقیقت کو بھانپ گئی اور خاموش ہو کر بیٹھ گئی
کیسی مجبوری تھی کہ جس کے ساتھ زندگی کا ایک خوشگوار حصہ گزرا تھا اُس
کا منہ دیکھنا تو در کنار اُس کے قول سخن تک کو محتاج ہو گئی تھی ،
اسی طرح سات سال بیت گئے ۔ راما نے بڑے لڑکے نرائن کو آٹھواں
درجے تک پڑھا کر کپڑے سینے کی ٹریننگ دلادی ، اور سرکاری لون پر سلائی
کی مشین لے کر ایک دکان کھلوا دی ۔ دھیرے دھیرے نرائن کی آمدنی
اچھی خاصی ہونے لگی ۔ اور گھر کی حالت سدھر گئی ۔ سب خوش و خرم ہو گئے اور کسی
نے اپنی لڑکی کا رشتہ بھی اُس کے ساتھ طے کر دیا ۔ جب نئے رشتہ داروں
نے نرائن کے باپ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو راما نے کہہ دیا کہ وہ باہر گئے
ہیں ۔ اور ابھی چھٹی نہیں ملی ہے شادی کے موقع پر گھر آسکیں گے منی آرڈر
کی رسیدیں دکھا کر اُس نے اپنی بات کی پختگی کر لی اس طرح سب
مطمئن ہو گئے اور پھر کسی نے کچھ نہیں کہا ۔
اب بچے سیانے ہو گئے تھے راما نے اپنے بچوں کو بابو کی بابت سب
کچھ بتا دیا تھا ۔ شادی کے دن قریب آ گئے اب کی بار منی آرڈر نہیں آیا
پورا ڈیڑھ مہینہ ہو گیا راما کا ماتھا ٹھنکا اور وہ اُداس رہنے لگی ۔ مگر
اپنی دلی حالت کسی پر ظاہر نہیں کی اور وہ ربڑ کی گیند کی طرح سب غم
دُکھ بروداشت کرتی رہی ۔ ایک دن شادی کا سامان لینے وہ شہر گئی ،
اسٹیشن سے شہر تک کا راستہ بہت لمبا نہیں تھا ۔ اس لئے وہ پیدل ہی
چل دی ۔ راستے میں کھوکھوں کے پاس گندے نالے کے کنارے ایک
لاش پڑی تھی جس کی ٹانگ پر ایک کتا لپٹا ہوا تھا ۔ جس نے لاش
کی ٹانگ کا کچھ ماس بھی نوچ لیا تھا ۔ کئی لوگ دیکھتے اور نفرت سے منہ پھیر
کر چل جاتے کوئی کہتا " کوئی بھکاری مر گیا ہے مگر میونسپلٹی والوں کی
بے پرواہی تو دیکھو کہ اسے کو یہاں سے ہٹایا تک نہیں ماس ٹنگ ہے

نیز نانک کلاتھ ہاؤس وغیرہ وغیرہ بے شمار نام آپ کو ملیں گے اگر ہم نے گوردھن گلی میں آدھا واڑا بنا دیا اور اسی طرح اور چیزوں میں ملاوٹ کر دی تو کیا اُن ناموں کی بے حرمتی نہ ہوئی جن کے نام سے اُن کو منسوب کیا گیا ہے۔ عوام مذہبی جذبات کے تحت اُسے خریدیں گے۔ یوں ہم عوام کے جذبات کو ٹھیس لگاتے ہیں اور فریب دیتے ہیں۔ دوسرے ممالک میں صرف ہسپتال یا تعلیمی ادارے کے نام مذہبی پیشواؤں کے نام پر رکھے جاتے ہیں جو عین مناسب ہے کیونکہ وہ تجارتی ادارے نہیں۔

۴۔ کاسٹ سسٹم:۔ یہ ایک خاص اور سب سے غریب اور پسماندہ انسانی طبقہ کے لئے نفرت کا اظہار ہے۔ آزادی کال میں بوئے ہوئے یہ کانٹے اس روشنی کے دور میں بھی ہمارے دامن کو اُلجھائے ہوئے ہیں۔ اس سے نجات پانے کی کوشش میں ہم ناکام رہے۔ یہ صرف اس برِّ صغیر کے اس خطے میں ہی پائے جاتے ہیں۔ ہم اپنے دلوں کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتے ہیں کہ دوسرے ملکوں میں کلاس سسٹم ہے۔ لیکن یہ کلاس سسٹم عالمگیر ہے یعنی امیر و غریب سب جگہ ہیں۔ ہمارے ملک میں کلاس سسٹم کے علاوہ کاسٹ سسٹم ایک زائد برائی ہے۔ جو اور کہیں نہیں اور کلاس سسٹم سے زیادہ بھیانک ہے۔ ہزاروں صدیوں کی مظلوم یہ پسماندہ قوم آج بھی قابلِ نفرت ہے۔ صرف خدائے کریم ہی اس داغ کو اپنے کرم سے دھو سکتا ہے۔

۵۔ ڈپلیکیشن:۔ نقالی میں ہم اُستاد زماں ہیں اس آرٹ میں کوئی ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مارکیٹ ہر قسم کے نقلی مال سے بھری پڑی ہے۔ جعلی بڑی چھوٹی انڈسٹری کہلاتی ہے، ایسی بھی نقالی ہوتی ہے یہ پرانی دنیا کے صرف اسی خطے میں پائی جاتی ہے۔ آپ کا اس میں کہاں تک ہاتھ ہے؟ اگر نہیں تو کیا آپ اس سلسلے میں کوئی امداد بہم پہنچا سکتے ہیں؟

چلتے چلتے ایک اور داغ پر نظر پڑی۔ اس کے ساتھ نیک اور پاک رشتے کو ملا کر ہم نے ان دونوں رشتوں کے لئے ایک ایسی ذلیل ترین گالی کو منتخب کر لیا ہے جو بالکل غیر فطری اور انسانیت سوز ہے۔ ان دونوں کے لئے بدترین گالی ہماری نوکِ زبان پر رہتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی اور کلاس ون آفیسر تک کو اس قباحت میں مبتلا دیکھا۔ ایک تانگے والے سے لے کر اعلیٰ تعلیم یافتہ اس گالی کو نہایت بے باکی سے استعمال کرتا ہے اور کوئی شرم محسوس نہیں کرتا۔

حالانکہ اس سے وہ کوئی غصّے کا کسی سے اظہار نہیں کرتا صرف عا[دتاً]
ایسا کہتا ہے۔ یہ گویا اُن کا تکیہ کلام ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ وہ اس [پر]
فخر محسوس کرتا ہے۔ گویا گندی گالی دینا محبت کا اظہار ہے۔ تعلیم ا[س]
کی ہر شے کو جلا دیتی ہے۔ جس میں زبان بھی شامل ہے۔ لیکن ا[س]
تانگے والے اور قلی اور تعلیم یافتہ میں کوئی فرق نہیں۔ مگر اس کی ز[بان]
میں کوئی خوبصورتی نہ پیدا ہوئی۔ اس بات پر ایک بہت تعلیم یافتہ
اور دو کتابوں کے مصنف دوست کہنے لگے کہ آپ کو معلوم ہے کہ [...]
اقبال ایسی فحش زبان کا استعمال نہایت بے باکی سے کرتے [...]
میں نے عرض کیا کہ اگر یہ بات ہے تو میں اُن کی ایسی زبان کے سبب [...]
نہایت بے باکی سے اُسی زمرے میں شامل کرتا ہوں۔ اگر کوئی بیت [الخلا]
میں استعمال ہونے والے برتن میں پانی پی سکتا ہے تو اُسے [...]
کہیں گے۔ کافی گستاخی کر چکا۔ لیکن سچ تو سچ ہے۔ وقت آگیا ہے [کہ]
ہم ان خوش فہمیوں کے حصار سے باہر نکلیں کہ ہم مہذب لوگ [ہیں]
جب تک ہم اس آخری لعنت سے نجات نہ پالیں خود کو مہذب [کہنا]
محض خوش فہمی ہے۔

گناہ عالمگیر درد ہوگیا ہے۔ ہر قسم کے بُرے کام دوسرے مما[لک میں]
بھی ہوتے ہیں۔ یہ بدکاریاں فردِ واحد یا چند افراد پر اثر انداز ہوتی [ہیں]
لیکن یہ پانچ بدنما داغ بلکہ چھ ہماری مادرِ وطن ہندوستان کے
چہرے پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ اور ان کا اثر تمام ملک پر ہوتا ہے۔ ک[یا]
ہیں آج وہ انسانیت کے علمبردار اور محبت کے پرستار؟ کیا ان [...]
سے بسے ہوئے بے خبر عوام کے مذہبی تعصب کو جگا کر آپس میں لڑ[انے]
کے سوا اُن کے پروگرام میں اور کوئی حساب بھی ہے؟ مذہب جیسی
ودیعت شے کے غلط استعمال کے سوا انہوں نے محبت کے بیج
کا کام بھی کیا؟ اگر خدا محبت ہے تو مذہب اس محبت کا مظہر[...]
آج ضرورت ہے مادرِ وطن کو ان جگت گروؤں، ملاؤں، پاد[ریوں]
اور گرنتھیوں کی کہ وہ اپنے جھونپڑوں۔ مسجدوں، گرجوں اور [...]
تختوں سے باہر نکلیں۔ اور ایک زبان ہو کر اپنی مادرِ وطن کے [چہرے]
سے ان بدنما داغوں کو دھو ڈالیں۔ اُن کی آوازیں مذہب ستا[...]
میں نہیں گلی کوچوں اور بازاروں میں گونجیں۔ اُن کی آج تک
کارگزاریوں کا صرف ایک ہی نتیجہ نکلا ہے کہ ہماری موجودہ نسل [...]
جیسی اعلیٰ شے سے متنفر ہو گئی۔ آؤ اپنی عاقبت سنوار لو۔ زرا ندا[...]

[illegible] جاتے جنت کے دروازے نہ کھلو۔ کیونکہ مذہب ایک حد کا حامل
[illegible] عوام محض اسی زبان کو سمجھتے ہیں۔ یہ فرشتوں کی زبان اور انسان
[illegible] وجہ فرشتوں سے بلند ہے کیونکہ وہ شبیہ اللہ ہے۔

کہاں ہیں میرے ملک کے بے باک صحافی اور حساس
[illegible]ہر؟ گل و بلبل کے نالے اور زلفِ یار کے پیچ و خم سے باہر نکل آنے
[illegible] ہی وقت ہے۔ اپنی تانک جھانکی کی سوچوں سے باہر آنے کا وقت ہے
[illegible]یے نہاں خانوں سے باہر آؤ اور دیکھو کہ ان پانچ بلکہ چھ برائیوں
[illegible] تمہارے ہرے بھرے گلشن کو پامال کر دیا ہے۔ تمہارے نغمے
[illegible]ی کوچوں اور رہ گزروں پر گونجیں۔ کہاں ہیں وہ مجاہد اور رفاہ
[illegible]م کے کارگزار اور مصلح؟ اپنی کمیٹی کی میٹنگوں سے باہر آؤ۔ یہ وقت
[illegible]رکار ہے۔ کہاں ہیں میرے ملک کے وہ نوجوان جن کے مضبوط
[illegible]ازو اور سینے طوفانوں کو چیلنج کرتے ہیں۔ آؤ شیر قالین نہیں بلکہ
شیر نیستاں بنو اور ان تند و تیز جھڑوں سے مادر وطن کو آزاد
[illegible]رو سے

سوچ کو ظلمتوں سے باہر
نسل انسانی پر التفات بھی کر
تیرے ماضی کے سُن لیے قصّے
عہدِ حاضر کی کوئی بات بھی کر

مثل مشہور ہے کہ بہترین اور سچا دوست وہ ہے جو آپ کی کمزوریاں
اور برائیاں آپ پر ظاہر کرے تاکہ وہ ناعاقبت اندیش دوست جو آپ کی
بے جا توصیف کر کے غلط فہمیوں اور خوش فہمیوں میں مبتلا کر دے۔
ایسا دوست خطرناک ہے۔ اگر ایک جراح یا سرجن پھوڑے کو
[illegible] دے بلکہ پلاسٹر لگا دے تو وہ بے وقوف سرجن ہے۔ اصلی
سرجن نشتر چیرا لگائے گا تاکہ گندہ مواد باہر نکل جائے تاکہ اندر ہی
اندر سارے جسم میں زہر پھیلا دے۔ ظاہر ہے کہ جراحی سے مریض
تکلیف ہوتی ہے۔ خواہ وہ سرجن کو گالیاں دے لیکن سرجن اس
کی بہبودی کی خاطر اپنے فرض نشتر زنی سے کوتاہی نہ کرے گا۔ اس
لیے خوش فہمیوں کے حصار سے باہر نکلیں اور اس آئینے میں اپنی
صورت دیکھیں۔

جوابی خط لکھا کیجیے تاکہ آپ کو جواب فوراً مل سکے جواب
[illegible]

غزل

ڈاکٹر تفتہ
کوروکشیتر یونیورسٹی

سوز آشنا و مائل آہ و فغاں رہے
ہم بھی رباب عشق پہ نغمہ فشاں رہے
ہم بھی تپتے ہیں ہجر کی آتش میں روز و شب
ہم پر بھی اہل ہجر بہت مہرباں رہے
اے دوست جب ہمارے دل و روح ایک ہیں
جسموں کا پھر یہ فاصلہ کیوں درمیاں رہے؟
راہِ وفا میں گرم سفر ہو تو اس طرح
دل میں ترے نہ خدشۂ سود و زیاں رہے
ہاں اور ظلم اور ستم اور آ فتیں
باقی کوئی بھی جور نہ اے آسماں رہے
بجھنے نہ پائے روشنی ہندیا کے دیپ کی
یہ لَو خدا کرے کہ ہمیشہ جواں رہے
تجھ کو تو قید کر دیا خاکی مکان میں
اور آپ خوب ہے کہ تو لامکاں رہے!
جتنے بھی دل میں ولولے تھے رُو بہ رُو حسن
آنسو کبھی ہوئے تو کبھی بن کر دھواں رہے
اڑنے لگے تو اڑ گئے مثل نسیم ہم
ٹھہرے تو بن کے ہو بہو کوہِ گراں رہے
اپنا سراغ ہم کو بھی تفتہ نہ مل سکا
اپنی نظر سے ہر طرح ہم بھی نہاں رہے

ناقابلِ فراموش
سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست کی واقعی ناقابلِ فراموش
دستاویز جس کے متعلق متفقہ فیصلہ ہے کہ جس اردو داں نے
یہ کتاب نہ پڑھی اُس نے اردو ہی نہیں پڑھی قیمت مجلد
رنگین ساٹھ روپے علاوہ محصول ڈاک
دفتر شانِ ہند۔ انصاری مارکیٹ نیلیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۰۰۰۰۲

ہو الہادی ۔ ترجمہ پیش خدمت ہے

اَلقرآنُ المنظوم

(مرتبہ :۔ کبیر کوثر م)

- قرآن پاک کا اُردو ، ہندی ، انگریزی میں منظوم ترجمہ
- قرآن مجید کے ترجموں کی تاریخ ساز ، اولین پیشکش
- قرآن شریف کے متن کے ساتھ ساتھ اُردو ، ہندی میں لفظاً بہ لفظاً کبیر کوثر کا منظوم تر
- قرآن کلیم کا متن اور عبداللہ یوسف علی کا انگریزی ترجمہ جسے حکومتِ سعودی عرب کی سندِ منظوری حاصل ہے
- ہندوستان کے عُلمائے کرام جناب ابوالحسن ، منت اللہ صاحب امیر شریعت بہار اڑیسہ ، قاضی القضات مولانا نظام الدین مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم وغیرہ کی اسنادِ پسندیدگی سے مز
- فوٹو آفسیٹ پر دو رنگی طباعت ۔ رنگین سر ورق

ھدیہ :۔ دس روپے فی پارہ علاوہ محصول ڈاک ۔ یا حسب حیثیت

کبیر کوثر کی دلکش ، نظر افروز ، سہل المفہوم معانی جمیلہ کا

نادر و نایاب نمونہ

پہلا پارہ یکم جون ۱۹۸۵ء سے دستیاب

تقسیم کار

ماہنامہ شانِ ہند ، فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ ۔ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اور دھرتی کانپ اٹھی

محمد حسین شمس ایڈوکیٹ
(کشن گنج)

(پانچویں قسط)

بڑے تزک و احتشام کے ساتھ دعوت کا انتظام ہوا۔ مسلمانوں کے پسند کی ساری چیزیں کشن لال نے اپنی خاص نگرانی میں بنوائیں۔ کشن لال ہندو ضرور تھے مگر کھانے پینے کے معاملے میں مسلمانوں سے کم فضول خرچ نہ تھے۔ آخر اُن کے یہاں دعوت صرف مسلمان دوستوں کی تھی۔ گوپال گنج کے بھی تین چار احباب اس بے تکلف دعوت میں شریک تھے۔ ان مسلمانوں کے ساتھ صرف ایک ہندو کو بھی خصوصی دعوت دی گئی تھی اور وہ تھا منوہر

بیٹھک میں بڑی چہل پہل تھی گوپال گنج کے کئی احباب آ چکے تھے۔ گاؤں کے بھی دو تین معزز حضرات تشریف فرما تھے۔ ایک طرف منوہر بیٹھا ہوا کشن لال کے بڑے لڑکے شنکر سے خوش گپیاں کر رہا تھا۔ نندن اپنے پتا شنکر کی گود میں بیٹھ کر محفل کی ساری چیزوں کے بارے میں سوال پر سوال کئے جا رہا تھا ـــــ اتنے پیٹرومکس کیوں جل رہے ہیں۔ ان کی روشنی سفید کیوں ہے۔ انڈے کی طرح گول گول کیا چیز پیٹرومکس کے اندر ہے۔ اتنے لوگ آج کیوں آ رہے ہیں۔ آپ داڑھی کیوں نہیں رکھتے۔ میری ماں نے بنارسی ساڑی کیوں پہنی ہے میرا بُوا بھی ساڑی کیوں نہیں پہنتی۔

باپو جی میرا بُوا تمہاری کون لگتی ہے؟

"میری بہن"

"اور منو کاکا کی"

"انہیں سے پوچھو"

"نہیں تم بولو"

"بس اب چپ بھی رہو" گھنٹے بھر سے بڑبڑ بک رہا ہے

"منوہر نے کہا۔ نندن صبح کو آیا تو میں نے سمجھا بڑا شرمیلا ہے"

"شنکر نے کہا۔ "مت پوچھو دماغ کھا جاتا ہے یہ"

"نندن نے پوچھا۔ آج دادا مجھے گود کیوں نہیں لیتے"

"اب تو تم بڑے ہو گئے"

نندن گود سے فوراً اُتر آیا اور اپنے پتا جی کے بغل میں کھڑا ہو کر کہا "تم سے بھی بڑا ہوں کیوں بابا؟"

"تب اور کیا اب تو تم کام کرنے کے لائق ہو گئے نندن ۔۔۔۔۔ ایک بات سنو تو بیٹا اندر جا کر چپ چاپ دو پان اپنی ماں سے بنوا لاؤ جاؤ میرے منے" شنکر نے پچکارتے ہوئے کہا۔

"میری ماں کو تم کیا کہہ کر پکارتے ہو بابا" اور پھر آپ ہی نقل اُتارتے ہوئے بول اٹھا۔ "اے ادھر آ جا جی، سنو او نندن کی تم کہاں مر گئیں ۔۔۔۔۔" اور منوہر کھل کھلا کر ہنس دیا۔ "شنکر جو میں کہتا ہوں نندن" شنکر نے جھنجھلا کر کہا۔ "اب خاموش بھی رہ۔ ذرا جلدی جا اور دو گلوریاں بنوا لا۔ دیکھ تیرے منو کاکا کب سے یہاں بیٹھے ہیں اور تو سنتا ہی نہیں۔"

"ماں سے پان نہ بنواؤں گا"

"کیوں؟"

"ایک دفعہ اس نے منو کاکا کے پان میں مرچ ڈال دی تھی کاکا رونے لگے تھے"

"منوہر نے کہا ہاں نندن اپنی ماں سے مت بنوانا"

"میرا بُوا سے کہوں گا وہ بڑی اچھی ہیں"

"منوہر نے پوچھا، نندن تمہیں تمہاری ماں زیادہ پیار کرتی ہیں یا میرا بُوا"

"میرا بُوا مجھے مارتی نہیں"

"شنکر نے کہا۔ اب جاؤ بھی"

"نندن کے جانے پر منوہر نے پوچھا "میرا کی بات کہیں پکی ہوئی؟"

"پتا جی بڑی تلاش کر رہے ہیں مگر طبیعت کے موافق کوئی لڑکا ملتا ہی نہیں آج وہ میرے ایک ساتھی کے بارے میں پوچھ رہے تھے"

"وہی منظور پور والا"

"ہاں"

"تمہارے خیال میں وہ لڑکا کیسا رہے گا؟"

"ہے تو بہت شریف مگر یہ معلوم نہیں کہ اس کی مالی حالت کیسی ہے۔"

"پتاجی کی خواہش ہے کہ وہ خود تمہارے ساتھ چل کے اُسے دیکھ آئیں۔"

"مگر قباحت یہ ہے کہ تمہارے پتاجی کو دولت مند لڑکا چاہیے۔"

"اور شریف بھی۔"

"فرض کرو ان دونوں میں سے وہ ایک سے محروم ہو، اس وقت تمہارے پتاجی شرافت اور دولت میں سے کسے پسند کریں گے۔"

"بھئی میری مانو اگر پوچھو تو اس معاملے میں پتاجی سے اختلاف رکھتا ہوں اگر کوئی لڑکا شریف اور تعلیم یافتہ ہو تو دولت وہ خود پیدا کر لے گا ورنہ اکثر لڑکے باپ دادا کی گاڑھی کمائی چشم زدن میں پھونک دیتے ہیں۔"

"میں بھی تو یہی کہتا ہوں مگر تمہارے پتاجی ہیں کہ کسی طرح قائل نہیں ہوتے۔"

"میں انہیں سمجھاؤں گا۔"

"اور میرے بھیا کو بھی سمجھاؤ۔"

"کیا کہتے ہو،" شنکر نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

"نہ جانے انہیں تم لوگوں سے چڑ کیوں ہے حالانکہ تمہاری منگیتر [illegible] پتاجی نے تلاش کی تھی۔"

"تمہارے بھیا کو آخر ہم لوگوں سے چڑ کیوں ہے۔"

"بھگوان جانے یہ تو تم انہیں سے دریافت کرو۔"

"تم کچھ کہنا چاہتے ہو منوہر [illegible]" اور اس نے مشکوک نظروں سے منوہر کو دیکھا۔

"کہنا تو بہت کچھ تھا مگر ڈرتا ہوں شاید تم میری بات کا برا مان جاؤ۔"

"بے جھجک کہو۔"

"اپنے علاقے ہی میں کوشش کیوں نہیں کی جاتی۔"

اس کے ایک جملے نے شنکر کے سامنے ایک داستان کھول کر رکھ دی۔ شنکر کے ذہن میں ہزاروں خیالات یکے بعد دیگرے پیدا ہونے لگے ہر خیال نے ایک دائرہ بنایا جس کا مرکز خود منوہر تھا مگر۔۔۔۔

"مگر پتاجی ———"

"انہیں تم خود راضی کر سکتے ہو۔"

"وہ ایک ناستک کو شاید اپنی لڑکی دینا پسند نہ کریں۔"

"یہ کیا ضروری ہے کہ میرا کی شادی جس کے ساتھ ہو وہ زندگی بھر ناستک بن کے رہ جائے۔"

"مگر جان بوجھ کر مکھی نگلی نہیں جاتی۔"

"تو تمہارے خیال کے مطابق ناستک انسان نہیں۔"

"جو دھرم سے بغاوت کرے وہ سماج اور دیش کا کھلا دشمن ہے۔"

"تو کیا تم ناستکوں کو اس لئے ملک اور سماج کا دشمن سمجھتے ہو کہ وہ ہندو مسلمان، شودر اور برہمن، حبشی اور انگریز سب کو انسان سمجھتے ہیں۔ کیا وہ اس لئے برے ہیں کہ وہ ان مذہبی لڑائیوں کو وحشت اور بربریت سے تعبیر کرتے ہیں یا وہ اس لئے لائق ملامت ہیں کہ وہ ہر انسان کو انسان بننے کی تلقین کرتے ہیں۔ مذہب ایک افیون ہے شنکر، جسے مولوی اور پنڈت لوگوں کو کھلا کھلا کر مدہوش اور متوالا کر دیتے ہیں اور پھر ان سے وہ وہ کام لیتے ہیں کہ راون اور کنس کا دل بھی لرز اٹھے،" منوہر کے لہجے میں نفرت اور غصے کے ملے جلے تاثرات تھے۔

"نہیں اس لئے نہیں بلکہ اس لئے کہ بھگوان کے وجود کے تم لوگ قائل نہیں۔"

"یہی تو ایک لفظ ہے جس کی ایجاد بڑی مشکل سے ہوئی۔ اسی ایک لفظ کے لئے بے شمار کتابیں لکھی گئیں، ہزاروں من گھڑت کہانیاں تصنیف کی گئیں اور حقیقت پر غور کرو تو بھگوان کا وجود سرے سے ہے ہی نہیں۔"

"تو کیا آسمان زمین آپ ہی آپ پیدا ہو گئے۔"

"اور بھگوان کیسے پیدا ہو گیا۔"

"تم بھگوان کا از خود پیدا ہو جانا تسلیم نہیں کرتے اور ان ساری مادی چیزوں کے وجود کو آپ ہی آپ مان لیتے ہو کیسی الٹی بات ہے۔"

"اور ٹھیک اس کے برعکس تم اس کائنات کا آپ ہی آپ وجود میں آنا تمہیں منظور نہیں مگر بھگوان آپ ہی آپ پیدا ہو گیا یہ تمہیں منظور ہے۔"

"میں پوچھتا ہوں کیا دنیا کے سارے سائنٹسٹ مل کر ایک معمولی گھاس کی پتی بنا سکتے ہیں۔"

"اور کیا بھگوان اپنے سارے دیوی دیوتاؤں کی امداد سے ایک معمولی ٹوتھ پن بنا سکتا ہے۔"

"اس کی قدرت سے باہر نہیں۔"

"مگر تم اس کے خلاف ہے"
"تم ناستکوں سے کون منہ لگے"
"منہ لگنے کی بات نہیں سوال یہ ہے کہ ہم لوگوں کو کیسی زندگی گزارنی
یا ہیئے۔ نفرت کی یا پریم کی؟ ہر مذہب سے شانتی اور پریم کی تلقین
ی مگر مذہب کے ماننے والے ہمیشہ ایک دوسرے کے جان کے پیاسے
بنے رہے۔ ہندو مسلمان کو ملیش کہتا ہے۔ مسلمان ہندو کو کافر۔ دونوں
نے ایک دوسرے پر جنت حرام کر دی ہے۔ محبت کا تعلق دل سے ہے
رف زبانی دعویٰ فضول سی چیز ہے مذہب کو مان کر بھلا دل نفرت
سے پاک نہیں ہو سکتا، محبت دل میں اُس وقت پیدا نہیں ہو سکتی
ب تک مذہب کے تخیل سے دل پاک نہ ہو۔ اور ہم ناستک کہتے
ہیں۔ ساری دُنیا کے انسان ایک ہیں ہمیں انسانیت کا پرچار کرنا
چاہیئے"

اتنے میں دروازے پر ایک شخص آ گئی۔ اُس سے میاں حسین بخش
اترے۔ کشن لال نے بڑھ کر اُن کا خیر مقدم کیا۔ ان کے آنے سے
مجلس میں ایک رونق آ گئی۔ گوپال کلو کے دوستوں سے ہنس ہنس کر
مصافحہ کیا سب کی خیریت پوچھی جیس فہمی نے غالب کا شعر پڑھا ؎

اُن کے آنے سے جو آ جاتی ہے مُنہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

کب سے ہم لوگ آپ کے منتظر بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوا ابھی تک
آپ آرائش حسن سے فارغ ہی نہیں ہوئے" کشن لال نے برجستہ
چٹکی لی ؎

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

فہمی نے گوپال کا دامن دیکھ "اگر آگے سے پھٹا ہو تب تو یہ
قصوروار اور اگر پیچھے سے ......" اس پر ایک زناٹے کا قہقہہ پڑا محفل
گونج اٹھی شنکر اور منوہر اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنی جگہ جا رہے تھے کہ
حسین بخش نے کہا۔ ارے صاحبزادو تم لوگ بچوں کی نقل میں کہاں
آ رہے ہو" کشن لال نے کہا "تم لوگ دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھو ضرورت
ہوئی تو میں بلا لوں گا"

یہ دونوں اُلٹے پاؤں واپس آ کر ایک کمرے میں جا کر بیٹھ گئے
اور پھر ادھر اُدھر کی باتوں میں مشغول ہو گئے۔

غزل ٭ نکہت شاہجہانپوری ایم۔ اے۔ بی ٹی

زندگی ہو گئی ہے بے نور انھیں کیا معلوم
دل غموں سے ہے بہت چور انھیں کیا معلوم

کچھ تو تقدیر نے بھی ہم کو سہارا نہ دیا
اور کچھ ہم بھی تھے مجبور انھیں کیا معلوم

وہ سماں جب لب ساحل ہی سفینہ ڈوبا
وہ تھے ساحل سے بہت دور انھیں کیا معلوم

آشیاں خار سے شعلوں سے بنا اور قفس
اس جہاں کا یہ دستور انھیں کیا معلوم

اب وہ آئے جو مرے پاس تو کیا آئے ہیں
داستان دل رنجور انھیں کیا معلوم

جس کو پہچان نہ پاتا ہے زمانہ نکہت
مٹ گئے ہم ہو گئے مشہور انھیں کیا معلوم

غزل ٭ (راشور بھنور سنگھ بھنور راجستھانی)

یہی ہے رات بھر کی مختصر روداد مے خانہ
نظر ساقی پہ تھی ہم کو نہ تھا گردش میں پیمانہ

کسی کی زیست کیسے بن گئی پُر درد افسانہ
اسے سمجھے گا دیوانہ نہیں سمجھے گا فرزانہ

مے اُلفت کو پی کر روح خوش ہے دل بھی ہے مسرور
بڑھی ہے دست ساقی کے سبب توقیر میخانہ

یہ وہ شئے ہے کہ آسانی سے حاصل ہو نہیں سکتی
یہ ملتی کس کو ہے رندوں کو طفیل ناز رندانہ

بہار آئی ہے کہہ دے اُن سے کوئی اے بھنور اتنا
شکستہ دل لئے پھرتا ہے در در تیرا دیوانہ

کیا آپ گلے کی تکلیفوں میں اکثر مبتلا رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے سخت پریشان ہیں، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ایسی پریشان کن بیماری سے گلا کاٹ دینے سے ہی چھٹکارا مل سکتا ہے۔ ذرا ٹھہریئے! خالص دیسی ادویات سے تیار کیا ہوا "ٹونسلیکس" ایک بار، صرف ایک بار استعمال کر کے تو دیکھئے، پھر آپ کو گلے کے غدود بڑھ جانے، گلے کی سرسراہٹ، خراش، گلے کے ورم، زخم اور دوسرے تمام امراض کی شکایت نہیں رہے گی۔ اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا مریض ہو، جس کے گلے کے غدود (ٹانسلائٹس) کا آپریشن ہونا ہے تو اُسے اس دوا کے بارے میں ضرور بتایئے گا کیوں کہ پھر اُسے آپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چھوٹے بچے جو کھٹی میٹھی چیزیں کھا کر گلا خراب کر لیتے ہیں، اُن کے لئے بھی یہ بہت کام کی دوا ہے۔ ہر گھر میں اس کا رہنا بہت ہی ضروری ہے۔

——— شرع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیبارٹریز، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

Phone: 275602

Regd-No D-(DN) 353

THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002

JUNE 1985

Regd with the Registrar of Newspaper at R. No. 644 57

خرید کر پڑھئے :
مانگ کر پڑھئے :
یا پھر
چوری کر کے پڑھئے

یہ ہے ہی اتنا خوب صورت ،

اتنا دل کش ،

اتنا مکمل کہ اسے کسی طرح بھی

حاصل کریں کیوں کہ

یہ فیض کی شخصیت اور فن پر ایک

شان دار ادبی دستاویز ہے ۔ اس میں شامل ہیں :

قیمت : پندرہ روپے

- ★ خلوت اور جلوت کے بھید کھولنے والے ذاتی نقوش ۔
- ★ نادر و نایاب تصویریں ۔
- ★ سدا بہار ، ہزار رنگ و منتخب کلام ۔
- ★ فیض کی شخصیت کے وہ ڈھکے چھپے گوشے جن پر سے پہلی بار پردہ اٹھایا گیا ہے ۔
- ★ ہندوستان ، پاکستان ، روس اور انگلستان کے دانش وروں کی مشترکہ کاوشوں کا گلدستہ ۔

ساری اردو دنیا میں شبستان کے "فیض نمبر" کا چرچا ہے

اس سے پہلے کہ اسٹاک ختم ہو جائے آج ہی اپنے قریبی نیوز ایجنٹ سے طلب کیجئے یا براہ راست ہم سے منگوائیے ۔

بھارتی ریلوے آپ کی جائداد ہے بلا ٹکٹ سفر کرنے سے ریلوے کو جو نقصان ہوتا ہے وہ کروڑوں روپے ہے جبکہ اس نقصان کی رقم سے ریلوے آپکو سفر کی بہترین سہولتیں مہیا کر سکتی ہے تاکہ آپ زیادہ آرام سے سفر کر سکیں، بہتر سروس مہیا کی جا سکے جو چیزیں خراب ہو گئی ہیں، ان کو بدلا جا سکے۔

اب یہ آپ کا کام ہے کہ آپ اس لعنت کو ختم کرنے میں ہماری مدد کریں۔
.....کیونکہ آخر کار اس سے آپ ہی کو فائدہ پہنچے گا۔

ناردرن ریلوے

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۰۰۲ | رجسٹرار آف نیوز پیپر فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۵۷/۳۴۴۴ | رجسٹرڈ نمبر ڈی DN) ۲۵۳

ہند و پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
فیاض گوالیاری

ماہنامہ

شان ہند نئی دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

فی پرچہ ۔ ۲/۵۰ روپے
زر سالانہ ۔ ۲۴/- روپے

جلد ۶ ۴ | جولائی سنہ ۱۹۸۵ء | شمارہ ۷

بلبل چہ گفت ؟ گل چہ شنید ؟ و صبا چہ کرد ؟

مجاہدِ اردو ـــــ رام لعل

کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے مگر یہ حقیقت جھٹلائی نہیں جا سکتی کہ اردو پر جب بھی برا وقت پڑا ہے تو اس کے تحفظ اور بچاؤ کے لئے پنجابی ہندو ہی آگے آئے ہیں۔ بے شک اردو کو مسلمان اپنی زبان سمجھیں (حالانکہ یہ مسلمانوں کی زبان ہے ہی نہیں) اور اردو کے نام پر حکومت کے عطا کردہ لقمۂ بے ضرر کو شیر مادر سمجھ کر ڈکار جائیں۔ مگر جب جب اردو پر برا وقت پڑا مسلمانوں نے اخبارات میں بیان چھپوانے یا تقاریر کرنے تک ہی اکتفا کیا مگر کوئی عملی قدم اٹھانے سے احتراز کیا کیونکہ ایسا کرنے سے انھیں مالی اور سیاسی طور پر نقصان کا خدشہ تھا۔ پچھلے دنوں جناب واسدیو سنگھ وزیر خوراک حکومت اترپردیش نے اردو اور اردو اکاڈمی کے بارے میں نہایت نازیبا کلمات کہے تو ان کے خلاف سب سے پہلے جناب رام لعل صاحب نے اترپردیش اردو اکاڈمی کی نائب صدارت کے عہدہ سے استعفیٰ دے کر عملی احتجاج کا اظہار فرمایا اور رام لعل صاحب کے تیاگ پتر نے اکاڈمی کے دیگر عہدہ داران انتظامیہ کے لئے یہ ضروری کر دیا کہ وہ بھی اپنے اپنے تیاگ پتر دے دیں۔ وگرنہ ان کے لئے عوام کے سامنے آنا مشکل ہو جاتا ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان اجتماعی تیاگ پتروں کے تحت الشعور میں بعض ممبران کے ایک پتر میں کئی نشانے تھے۔ حتیٰ کہ عملی طور پر انتظامیہ کی مقررہ میعاد ختم ہو چکی ہے یا ایک آدھ ماہ میں ختم ہونے والی ہے اس لئے کیوں نہ مفت کرم داشتن کے مصداق جھوٹی گنگا

پرنٹر پبلشر سرور تونسوی نے خواجہ پریس چتلی قبر جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر دفتر شان ہند فلیٹ نمبر ۹ الفلاح مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا ۔

میں ایک انگلی ہی ڈبولی جائے۔ اور دوسرے یہ کہ یہ ستیاگ پتر منظور تو ہونگے ہی نہیں کیوں نہ دوسری انگلی پر خون لگا کر شہیدوں میں نام لکھوا لیا جائے۔ اور تیسرے یہ کہ عنقریب نئی انتظامیہ کمیٹی کے انتخاب کے وقت ستیاگ پتر دینے والوں کی قربانی کا خیال رکھتے ہوئے متعلقہ وزیر شاید پھر انھیں ممبر منتخب کر دیں۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اُتر پردیش کے وزیر اعلےٰ جناب تیواری صاحب نے کافی دنوں کے بعد اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کے پریزیڈنٹ بیگم صاحبہ کو مجبور فرما کر تمام ستیاگ پتر واپس کر دیئے اور وعدہ فرمایا کہ وہ کانگریس کے مینی فیسٹو کے مطابق یوپی میں اُردو کے لئے سب کچھ کریں گے مگر وہ آرڈیننس کے بارے میں ہائی کورٹ میں داخل شدہ اپیل کے فیصلہ کا انتظار فرما رہے ہیں۔

ہمیں اُتر پردیش کے وزیر اعلےٰ جناب تیواری صاحب سے پوری پوری اُمید ہے کہ وہ اپنے وعدے کا پاس رکھیں گے مگر کیا کیا جائے۔ جب جناب شوناتھ پرتاپ سنگھ صاحب ایسے مردِ آہن اپنا وعدہ تو وہ مرد کی ایک بات پر قائم نہ رہ سکے۔ تو جناب تیواری صاحب کے فرمان پر عوام کو یقین کرتے ہوئے جھجک سی آرہی ہے۔

بہرکیف اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کی پریزیڈنٹ صاحبہ نے ایک سرکلر جاری فرمایا ہے جس میں تمام مستعفی ہونے والے حضرات کو ڈپلومیسی انداز میں اپنا اپنا استعفیٰ واپس لینے کی اپیل کی ہے۔ اور یو۔ پی کے وزیر اعلےٰ سے ہوئی بات چیت اور ان کے وعدے وعید کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ معاف کیا جائے اگر ہم یہ کہنے کی گستاخی کریں کہ بیگم صاحبہ ہمیشہ حکومت پرست رہی ہیں اور ان میں یہ دل گردہ ہے ہی نہیں کہ حکومت کے خلاف کسی طرح بھی کوئی قدم اٹھائیں۔ ان کی بلا سے اُردو یو پی کی دوسری زبان بنے یا سرے سے ہی اُردو کو دیس نکالا دے دیا جائے۔ استعفیٰ کی رسم میں انھوں نے حصہ لینا تھا سو لے لیا مگر یہ اُن کے بس کی بات نہیں کہ وہ وزیر اعلےٰ سے کہتیں کہ جب تک اُردو اُتر پردیش کی دوسری زبان قرار نہ دی جائے میں استعفیٰ واپس نہیں لوں گی۔

لہٰذا یہ قرعہ بھی بنام رام لعل ہی نکلا اور انھوں نے صاف الفاظ میں اعلان فرما دیا کہ جب تک اُتر پردیش میں اُردو زبان کو دوسری زبان تسلیم نہیں کیا جاتا وہ اپنا استعفیٰ واپس نہیں لیں گے۔ خدا کا احسان ہے کہ یہ سعادت بھی ایک پنجابی ہندو کو نصیب ہوئی جس پر جناب رام لعل صاحب ہزاروں مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اب اُتر پردیش کے عوام کو بالخصوص جناب رام لعل صاحب کا ساتھ دینا چاہیئے اور ہر وہ ادارہ جو سرکاری یا نیم سرکاری طور پر اُردو کے مفاد کے لئے قائم کیا گیا ہے اس کے عہدہ داران کو اپنے اپنے ستیاگ پتر اس شرط کے ساتھ بھیج دینے چاہئیں کہ جب تک اُردو کو اُتر پردیش میں دوسری زبان قرار نہیں دیا جائے گا۔ تب تک ہم ان عہدوں پر کام نہیں کریں گے اگر استعفیٰ دینے والے حضرات کی جگہ حکومت دوسرے کارکنان کو مقرر کرتی ہے تو ان کا سماجی بائیکاٹ کیا جائے اور انھیں غدارانِ اُردو قرار دیا جائے۔

اخبارات میں بیانات شائع کرانے یا تقاریر کے ساتھ ساتھ ہم سب کو گھر گھر جا کر بچوں کے والدین سے کہنا چاہئے کہ وہ اپنے بچوں کو سکولوں میں اُردو پڑھانے کے لئے سکولوں کے منتظمین سے تقاضا کریں۔ کیونکہ جب تک اُردو پڑھنے والوں میں اضافہ نہیں کیا جائے گا تب تک ہمارے مطالبہ میں زور پیدا نہیں ہوتا۔ اُتر پردیش کا کوئی اسکول ایسا نہیں ہونا چاہئے جس میں اُردو پڑھنے والے بچے نہ ہوں حیرت تو اس بات پر ہے کہ اُردو کے سب دانشور خصوصاً مسلمان اپنے بچوں کو اونچے درجے کے سکولوں میں تعلیم دلاتے ہیں اور ایسے سکولوں میں اُردو پڑھائی ہی نہیں جاتی۔ انجمن ترقی اُردو ہند۔ اُردو اکاڈمیز کے عہدہ داران۔ ترقی اُردو بورڈ اور دوسرے اُردو کی ترقی و تحفظ کے دعوے دار اداروں کے کارکن سب ہی اپنے بچوں کو ایسے سکولوں میں داخلہ دلاتے ہیں جہاں اُردو پڑھائی ہی نہیں جاتی۔

ہم سب کو یہ عہد کر لینا چاہئے کہ ہر خط پر پتے اُردو میں لکھیں گے جب ہزاروں خطوط پر پتے اُردو میں ہوں گے تو محکمہ ڈاک کو ایسا

انتظام کرنا ہوگا کہ وہ سارٹنگ سٹاف میں اُردو پڑھے ہوئے ملازمین کو رکھے۔ ہر سرکاری دفتر میں جو بھی درخواست پیش کی جائے وہ اُردو میں لکھی ہوتی چاہئے۔ ریلوے منسٹر سے مطالبہ کیا جائے کہ ہر اسٹیشن پر اُردو میں بھی اس کا نام ہو۔ بسوں پر بھی بس جہاں سے جہاں تک کے لئے ہو وہ اُردو میں بھی لکھا ہوا ہونا چاہئے۔ سڑکوں اور گلیوں کے ناموں کے بورڈوں پر اُردو میں بھی نام ہونا چاہئے۔ یہ بہت کچھ ہو سکتا ہے بشرطیکہ ہم اپنے آپ اس کا حلف لیں کہ اُردو کو زندہ رکھنے کے لئے ہم ایسا کریں گے۔ اُردو کے لئے آنسو بہانے سے یا قومی آواز میں جناب واسدیو سنگھ کے خلاف مراسلات شائع کرانے سے کچھ نہیں ہوگا۔

ہم ایک بار پھر رام لعل صاحب کو مبارکباد پیش کرتے ہیں جنھوں نے اُردو کے بچاؤ کے لئے اُترپردیش کے اُردو دانش وروں کے لئے ایک لمحۂ فکریہ اور ایک سوالیہ نشان ؟ ان کے سامنے پیش کیا ہے۔

"قومی آواز" سے مخلصانہ شکوہ

"قومی آواز" ایک ایسا روزنامہ ہے جس کو اُردو صحافت کی آبرو کہا جاسکتا ہے۔ مگر ۲۲ جولائی ۱۹۸۵ء کی اشاعت میں "ایوانِ غالب میں مرحوم یوسف دہلوی کو خراجِ عقیدت" کے عنوان سے کسی گمنام لکھنے والے کا شائع شدہ مضمون پڑھ کر یہ سوچنے پر مجبور ہونا پڑا کہ "قومی آواز" اس آبرو کو گنوانے کی فکر میں ہے۔ اول تو یہ مضمون بغیر لکھنے والے کے نام سے شائع کرنا ہی ایک کھلی شرارت ہے جو قومی آواز ایسے باوقار اخبار کو زیب نہیں دیتا۔ دوسرے اگر کسی صاحب کو اُردو اکادمی اور شمع گروپ کے خلاف یہ سب کچھ لکھنا ہی تھا اور "قومی آواز" کو اسے شائع کئے بغیر صحافتی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوئے بغیر نہ رہا جاسکتا تھا تو اسے مراسلات کے کالم میں لکھنے والے کے نام اور پتے کے ساتھ شائع کرنا چاہئے تھا تاکہ یہ سب کچھ لکھنے والے کی ذاتِ شریف کا حدود اربعہ ناپا جاسکتا کہ وہ خود کتنے پانی میں ہیں۔ تیسرے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ سب کچھ قومی آواز نے بطور خبر شائع کیا ہے اور خبریں تو نیوز ایڈیٹر ہی ترتیب دیتے ہیں اور وہ بغیر کسی لکھنے والے کے نام کے ہی چھپتی ہیں۔ اور اگر یہ مضمون بطور خبر ادارہ قومی آواز کی طرف سے لکھا گیا ہے تو ہمیں افسوس ہے کہ قومی آواز سے اس غیر صحافی پن کی اُمید نہیں کی جاسکتی کہ وہ ۲۰ جولائی کی اشاعت میں مرحوم یوسف دہلوی کے بارے میں ایک بہترین مضمون شائع کرتا ہے اُس سے ایک دن پہلے دلی کی ادبی ثقافتی ڈائری میں جناب رئیس مرزا نے مرحوم یوسف دہلوی کے بارے میں ۲۰ جولائی کے ماتمی جلسہ کی اطلاع اچھے انداز میں شائع کرائی۔ اور پھر وہی قومی آواز ۲۲ جولائی کی اشاعت میں اس رطب و یابس کو نمایاں طور پر شائع کرتا ہے جسے پڑھنے کے بعد ہر قاری یہ سوچنے پر مجبور رہا کہ قومی آواز اُردو کی روایتی صحافت پر آرہا ہے۔

اُردو داں طبقے کو اُردو اکادمی دلی کو سراہنا چاہئے تھا کہ اس نے ملک کے ایک ایسے صحافی کے انتقال پر ماتمی جلسہ (اور ایسا فقید المثال ماتمی جلسہ کیا کہ جس کی نظیر ایوانِ غالب کی تاریخ میں نہیں ملتی) کیا جس نے اُردو کو مقبول بنانے میں وہ کارنامہ انجام دیا ہے کہ اگر ملک کے وہ سب ادارے جو اُردو کے تحفظ اور ترقی کے لئے قائم ہیں مل کر بھی کوشش کریں تو ایسا کارنامہ انجام نہیں دے سکتے جس شمع سازی کا قومی آواز میں خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے اسی ادبی معموں کے باعث دنیا بھر میں اس زمرہ میں دیانت داری اور ایمانداری کا وہ معیار قائم کیا گیا ہے کہ جس کی قسم کھائی جاسکتی ہے انہی ادبی معموں کے باعث لاکھوں ہندی جاننے والوں نے اُردو لکھنا پڑھنا سیکھا۔ تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں اُردو عملی طور پر ختم ہوگئی تھی۔ یہ شمع ادبی معموں کا ہی احسان ہے کہ ہندوستان میں لاکھوں ہندوؤں، عیسائیوں سکھوں اور مسلمانوں نے اُردو لکھنا پڑھنا سیکھا تاکہ شمع ادبی معموں میں حصہ لے سکیں قومی آواز بے شک اپنے آپ کو مسلمانوں کا اخبار سمجھتا ہے مگر

ایسے ہزار ہا ہندو سکھ بھی پڑھتے ہیں اگر شمع ادبی معنی میں نہ ہوتے تو آج ہندوستان میں اردو رسائل و اخبارات پڑھنے والوں میں یقیناً کافی کمی ہوتی۔ اگر قومی آواز کے نزدیک شمع ادبی معنی میں ایک برائی ہیں تو وہ شمع ادبی معنوں کے اشتہارات کیوں شائع کرتا ہے اور اپنے پڑھنے والوں کے ساتھ ایسی برائی کو شائع کر کے غداری کا مرتکب بنتا ہے۔ "شمع" اردو کا ایک ایسا فلمی۔ علمی۔ ادبی ماہنامہ ہے جو روئے زمین پر جہاں بھی کوئی اردو لکھا پڑھا فرد موجود ہے وہاں دستیاب ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ برصغیر ہند و پاک میں کوئی ایسا فلمی اور ادبی ماہنامہ نہیں جو اس کی گرد کو بھی پہنچ سکے۔ کسی کو بھی یہ حق ہے کہ وہ شمع کو ہلکے پھلکے ادب کا کاروباری ماہنامہ کہہ سکے مگر ایسا کہنے والے کو ایسی رائے کا اظہار کرنے کا اہل ہونا ضروری ہے تاکہ اپنے نام تک کو صیغہ راز میں رکھ کر محض اپنی کم ظرفی اور احساس کمتری پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جائے دنیا کا نظام معاشرت صرف اور صرف کاروبار پر انحصار رکھتا ہے۔ قومی آواز بھی ایک کاروباری ادارہ ہے سرکاری اشتہارات اور جملہ صوبائی حکومتوں کے اشتہارات نیز ملک کے سرکردہ کاروباری اداروں کے اشتہارات کا حصول اس کے لئے بہت ہی آسان ہے کیونکہ یہ حکمران پارٹی کا اخبار ہے اور اگر ایک ایسا شخص جسے نہ تو حکومت کی سرپرستی حاصل ہو اور نہ ہی اس نے کسی غیر کاروباری انداز کو اپنایا ہو اور محض اپنی خداداد قابلیت، ایمانداری، دیانت داری اور انتھک محنت سے اپنے کاروبار کو قابل رشک بلندیوں پر لے گیا ہو تو وہ یقیناً قابل تقلید ہستی ہے اور ایسی شخصیت کی تعریف نہ کرنا محنت۔ ایمانداری اور دیانت داری کی توہین کرنا ہے حافظ صاحب نے اگر دواخانہ جاری کیا تو آج اسی شمع لیبارٹریز کو یہ فخر حاصل ہے کہ جس مریض کو یونانی اور آیورویدک اصلی اجزا سے بنی ہوئی ادویات درکار ہوتی ہیں وہ اس دواخانہ پر بلا خوف بھروسہ کر سکتا ہے۔

"آئینہ" اس لئے بند نہیں کیا گیا تھا کہ اس میں نفع کے امکانات بالکل نہیں تھے۔ بلکہ آپ کے چہیتے ڈاکٹر ظ۔ انصاری صاحب کی ریشہ دوانیوں کے باعث بند کرنا پڑا۔ اگر آئینہ جاری رہتا تو آج اس کے مقابلہ کا ہفت روزہ دنیائے اردو میں نہیں ہوتا مگر اسے آپ ایسے بد طینتوں کی نظر لگ گئی۔

"شمع" ہندی کا ایسا فلمی اور ادبی ماہنامہ ہے کہ جس کا کوئی بھی دوسرا ہندی فلمی ادبی ماہنامہ مقابلہ نہیں کر سکتا "بانو" خواتین کا ایسا صاف ستھرا مہذب اور با اخلاق ماہنامہ ہے کہ برصغیر ہند و پاک میں ایسا نسوانی ماہنامہ نہیں ہے "کھلونا" بچوں کا رسالہ کہا جاتا ہے۔ وہ آپ کو بھی انسانیت سکھا سکتا ہے۔ اگر اس ماتمی جلسہ میں عوام کا ہجوم محض فلمی اداکار سنیل دت صاحب اور شتروگھن سنہا کے باعث تھا تو اس میں کیا برائی تھی۔ امریکن پریذیڈنٹ فلم سے آئے۔ ہمارے تاملناڈو اور آندھرا کے وزرائے اعلیٰ فلم سے آئے۔ آج تین فلمی اداکار عوام کے منتخب نمائندے بن کر پارلیمنٹ میں آئے ہیں۔ فلم تو اب ہمارے بچوں کی نسلوں میں سرایت کر چکی ہے۔ آپ اپنے گھر میں اپنی بہن، ماں، بیٹی (اگر خدا نے آپ کو ان نعمتوں سے نوازا ہے) سے پوچھئے تو آپ کو پتہ چل سکے گا کہ فلم اب ہماری سوسائٹی میں کہاں تک داخل ہو چکی ہے۔ فلمی شخصیتوں کو کسی ایسے صحافی کو خراج عقیدت پیش کرنے پر پابندی ہے جو ان کے نزدیک قابل احترام ہو۔ مانا کہ عوام کا ہجوم ان فلمی شخصیتوں کے باعث تھا مگر کیا جناب [illegible] جناب انصاری جناب گیڈ گل، جناب غلام نبی آزاد، جناب خورشید عالم جناب جگ پرویش چندرا اور جناب گورنر صاحب میزبانہ بھی ان فلمی اداکاروں کو دیکھنے آئے تھے۔ اگر دعوت نامے زیادہ تقسیم کئے گئے اور ایوان غالب میں چھ صد اشخاص سے زائد بیٹھنے کی جگہ نہیں ہے تو بھی مضمون نگار کے پیٹ میں درد ہونے کی کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی عام طور پر جلسوں میں مدعوئین چالیس فیصد سے بھی کم آتے ہیں اور ماتمی جلسوں میں تو یہ تعداد اور بھی کم ہوتی ہے اس لئے اگر زیادہ دعوت نامے جاری کئے گئے تو کون سی آفت برپا ہو گئی اور یہ تو حافظ یوسف دہلوی مرحوم پر خدا کی رحمت تھی کہ ان کے ماتمی جلسہ میں بھی عوام کا ویسا ہی ہجوم نظر آتا جیسا کہ ان کے ہاں بیاہ شادیاں اور دوسری سماجی تقریبات میں ہوا کرتا تھا۔ باقی ص ۸ پر

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزرے

سرورتونسوی

الحاج حافظ محمد یوسف دہلوی صاحب ۴ مارچ ۱۹۸۵ء کو اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ حافظ صاحب سے متعلق کئی مضامین لکھے گئے ہیں اور ہر مضمون نگار نے حافظ صاحب کے کسی نہ کسی انداز حیات پر روشنی ڈالی ہے۔ راقم الحروف کا حافظ صاحب موصوف کے ساتھ نیاز مندانہ، عقیدت مندانہ اور دوستانہ تعلق مدتوں رہا جس کی وجہ سے حافظ صاحب کے متعدد اندازِ حیات کا میں نے بغور مطالعہ کیا۔ حافظ صاحب کی زندگی ایک کھلی کتاب تھی اور بلا شبہ ان کی ذات ایک ایسی انجمن تھی جو رنگا رنگ خوبیاں اپنے اندر سموئے ہوئی تھی اور یہ دعوے ہے کہ حافظ صاحب کے نقشِ قدم پر چلنے والا ہر شخص کامیابی کی منزل کو یقیناً پا سکتا ہے۔

"بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزرے" میں حافظ محمد یوسف دہلوی مرحوم سے متعلق کچھ یادوں کو بالاقساط پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں انشاء اللہ آپ ان یادوں کے ذریعہ حافظ صاحب کی قابل تقلید زندگی کے ایسے واقعات مطالعہ فرمائیں گے جن سے آپ بھی اپنی زندگی کی راہ ہموار کرنے میں آسانی محسوس کریں گے۔ (سرورتونسوی)

۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد ایک مہاجر کی حیثیت سے دلی آیا تو دیوان دو یا ساگر چو پڑہ کے یہاں ایک ہفتہ مقیم رہنے کے بعد بازار سیتا رام کی ایک گلی میں ایک جلے ہوئے مکان کے قدرے محفوظ حصہ میں رہائش اختیار کی۔ ان دنوں دلی کے مسلمان شرنارتھیوں کو نہ تو اپنے مکانات کرایہ پر دیتے تھے اور نہ ہی پاکستان ہجرت کر نیوالے مسلمانوں کے خالی مکانات میں شرنارتھیوں کو بسنے دیتے تھے بلکہ مسلمانوں نے ہجرت کرنیوالوں کے مکانات پر کافی مدت تک قبضہ کر رکھا تھا تاکہ کوئی شرنارتھی ان میں مقیم نہ ہو جائے۔ سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست کے ہاں میرا ہر روز جانا ہوتا اور انہیں اس سلسلے میں واقعی تشویش تھی کہ مجھے رہائش کے لئے ابھی تک کوئی مکان نہیں مل سکا لہٰذا سردار صاحب نے مفتی عبد القدیر صاحب سے تاکیداً فرمایا کہ سرور کو مکان دلانے میں وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں۔ مفتی عبد القدیر صاحب نے سردار صاحب کو بتایا کہ پہلے تک حسین خاں ہی شمع کے مالک و ایڈیٹر حافظ محمد یوسف دہلوی نے متعدد شرنارتھیوں کو پہاڑ گنج حبش خاں سے ہجرت کر نیوالے مسلمانوں کے خالی مکانات کی نشاندہی کی اور شرنارتھی ان خالی مکانات میں بسائے گئے ہیں اور تو اور حافظ صاحب نے اپنے دفتر میں کچھ شرنارتھی خاندانوں کو بسا رکھا ہے اور دفتر کے نیچے والی دو کانیں بھی شرنارتھیوں کو دلوا دی ہیں لہٰذا اگر آپ حافظ صاحب سے رجوع کریں تو شاید سرور کے لئے وہ کسی مکان کا انتظام کر دیں۔ سردار دیوان سنگھ صاحب نے کچھ دیر تک سوچا اپنی پرُ معنی بڑی بڑی سرخ آنکھوں کو سامنے کی دیوار پر جمایا اور سر کے ایک بال کو کافی دیر تک مسلتے رہے اور پھر اس زور سے کھینچا کہ بال ان کے ہاتھ میں تھا۔ یہ عکس اس بات کا مظہر تھا کہ سردار صاحب نے کوئی نتیجہ اخذ کر لیا ہے۔ فون کا چونگا اٹھایا اور میر مشتاق احمد جو ان دنوں سپیشل مجسٹریٹ تھے کا نمبر ملایا اور علیک سلیک کے بعد عندیہ یوں بیان کیا کہ میرے ایک دوست پاکستان سے شرنارتھی بن کر آئے ہیں ان کے لئے رہائش کا انتظام ضروری کرنا ہے سنا ہے کہ حافظ محمد یوسف صاحب شمع والے اس سلسلے میں مدد کر سکتے ہیں میری واقفیت حافظ صاحب سے نہیں ہے لہٰذا آپ ان سے کہہ دیں میں ہر طرح سے ذمہ دار رہوں گا۔ میر مشتاق احمد صاحب نے فون پر سردار صاحب سے کہا کہ سرور کو صبح میرے دفتر میں بھجوا

دیکھئے اگر میرے پاس وقت ہوا تو میں خود ساتھ چلوں گا ورنہ کسی کو ان کے ساتھ حافظ صاحب کے پاس بھجوا دوں گا۔ اور انہیں خط لکھ دوں گا۔

دوسرے دن میں صبح نو بجے ہی میر صاحب کے ہاں حاضر ہوا۔ اُن دنوں انتظامی معاملات میں میر مشتاق احمد کو پل بھر بھی فرصت نہ ملتی تھی۔ تین بجے تک ان کا انتظار کرتا رہا تشریف لائے اور فرمانے لگے دس منٹ بعد آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ آنے جانے والوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ چنانچہ یہ دس منٹ شام کے پانچ بجے ہوئے۔ تب ہم پھاٹک حبش خاں گئے۔ (شمع ان دنوں بند تھا۔ جناب [illegible] کراچی ان دنوں جیسے ہی صدر کا دفتر شمع کے دفتر میں ہی جاتے ہوئے تھے۔ دفتر کے نیچے سے پتہ چل گیا کہ کوئی [illegible] پھاٹک حبش خاں کا ہر بچہ و شرنا یعنی اب تک حافظ صاحب کو یوسف جی ہی کہتا ہے) حافظ صاحب کا مکان دفتر سے بالکل قریب ہی تھا۔ میر صاحب ان دنوں ہر وقت ریوالور لگائے رہتے تھے۔ کارتوسوں کی پیٹی ان کے سینے پر خوب زیب دیتی تھی اور یہ ایک ہی اتنا تھا کہ میر صاحب سپیشل مجسٹریٹ ہیں لہذا کافی اشخاص میر صاحب کے اردگرد جمع ہو گئے جو آتا ان سے علیک سلیک کر کے مصافحہ کرتا۔ ابھی ہم دفتر کے نیچے ہی کھڑے تھے کہ اتنے میں حافظ صاحب بھی تشریف لے آئے۔ میر صاحب سے علیک سلیک کرنے کے بعد ہم دونوں کو اوپر دفتر میں لے گئے۔ میر صاحب نے حرفِ مطلب حافظ صاحب سے بیان کیا اور حافظ صاحب نے بڑے افسوس کے ساتھ کہا کہ جناب مہاجرین کا سلسلہ اگست سے شروع ہے اور آپ اب نومبر میں تشریف لائے ہیں مکان تو کیا غسل خانہ تک نہیں خالی ملنا محال ہے۔

حافظ صاحب کا نام اور شمع رسالہ کو میں گزشتہ سات آٹھ سال سے جانتا تھا اور ملتان سے شانِ ہند بھی شمع کے تبادلہ کی غرض سے حافظ صاحب کو بھجوایا کرتا تھا۔ مگر بالمشافہ ملاقات حافظ صاحب سے میر صاحب کی وساطت سے ہوئی۔ حافظ صاحب نے فرمایا سرور صاحب آپ مجھ سے ملتے رہئے گا اگر کہیں بھی گنجائش نظر آئی تو میں ضرور کوشش کروں گا۔

سردار صاحب کی مہربانی اور ذاتی دلچسپی کے باعث جناب منشی عبدالقدیر صاحب نے چاندنی محل میں ایک بوسیدہ مکان پچاس روپیہ کرایہ میں دلوا دیا تو میں نے جلد سے جلد کنور مہندر سنگھ سحر جو ان دنوں دلی کے سٹی مجسٹریٹ تھے (خدا انہیں عمر خضر فرمائے) کی مہربانی سے ڈیکلریشن داخل کر کے چاندنی محل سے [شانِ] ہند کی ہفتہ وار اشاعت شروع کر دی۔ ہفت روزہ شانِ ہند بالکل ریاست کے انداز پر جاری کیا گیا۔ مرحوم جناب [illegible] کا یہ احسان میں تا عمر نہیں بھول سکوں گا کہ انہوں نے میرے محکمہ ڈاک سے متعلقہ وزیر کو حکم دیا کہ سرور کا روپیہ ملتان ڈاک ہیڈ آفس سے فوراً [illegible] دہلی کے ڈاکخانہ میں ٹرانسفر [illegible] لہذا روپیہ مل ہی چکا تھا چنانچہ شانِ ہند کو کر و فر سے جاری [illegible] اچھے رائٹرز کو معاوضہ دیا جاتا تھا مگر بہ نسبت خاک را بہ عالم ریاست تو ریاست ہی تھا اور شانِ ہند [illegible] شانِ ہند کے چار شمارے چھپ چکے تو میں یہ چاروں شمارے [لے کر] حافظ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے شماروں کو اُدھر سے دیکھا اور فرمایا کہ ایسے پرچے کے لئے پچاس ہزار سالانہ خسارہ کے لئے تیار رہئے اور اس کے بعد شاید یہ اخراجات نکال سکے۔ اور اگر دو سال اسی انداز میں پرچہ چلے تو تیسرے سال فائدہ رہے گا۔ پھر سوچ کر کہنے لگے کہ سردار نے آپ کو ہفت روزہ کی اشاعت سے منع نہیں کیا۔ بہتر تھا ماہنامہ شائع کرتے۔ عرض کیا کہ ملتان میں بھی شانِ ہند ہفت[روزہ] تھا اور وہاں اس سے اچھی خاصی آمدنی تھی۔ کیونکہ میونسپل کمیٹی، ڈسٹرکٹ آفس، سول سپلائز کے علاوہ عدالتی سمنوں کے اشتہار بھی مل جاتے تھے۔ اسی خیال سے اسے اب بھی ہفتہ وار جاری کیا گیا۔ حافظ صاحب فرمانے لگے بھئی سردار صاحب تو اس راستے کے پرانے راہرو ہیں کیا انہوں نے آپ کو نہیں بتایا کہ دہلی میں اشتہارات کا ملنا مشکل ہے یہاں تو مشتہرین اشاعت دیکھتے ہیں اور پھر رسالے سائز کے لئے پانچ روپیہ فی ہزار اور اس سے دو گنے سائز کے اخبارات کے لئے دس روپیہ فی ہزار فی صفحہ دیتے ہیں۔ میرے خیال میں تو آپ اب بھی سردار صاحب سے مشورہ کر کے اسے ماہنامہ بنا دیجئے مگر مرحوم مُرلی دھر شاد نے دلی کلاتھ ملز کا اشتہار چھ ماہ کے لئے دے دیا۔ اور اسی طرح کچھ جیسے تیسے اشتہارات اِدھر اُدھر سے اکٹھے کر لئے جاتے۔ کچھ دنوں بعد

شمع" کے نشاۃِ ثانیہ کا دور شروع ہوگیا اور مہینہ میں ایک آدھ بار حافظ صاحب سے ملاقات ہو جاتی اور انھوں نے ہر بار یہی مشورہ دیا کہ شانِ ہند کو ماہنامہ بنا دیجئے۔ کچھ ماہ تک اشتہارات کا سلسلہ چلتا رہا اور کچھ ایجنٹ حضرات نے بھی بلوں کی ادائیگی کر دی (زیادہ تر نے ایک پائی تک ادا نہ کی) اور شانِ ہند آب و تاب کے ساتھ ہفت روزہ شائع ہوتا رہا۔ دن میں شو اور اخبار ہفتہ وار دن رات محنت کرنا پڑتی۔ رات کے بارہ بارہ بجے تک خطوط لکھنا جب کہ مکان میں بجلی نہیں نتیجہ یہ ہوا کہ صحت جواب دے گئی اور بستر پر دراز ہونا پڑا۔ سردار دیوان سنگھ مفتون کے ہاں جب دو تین دن کی غیر حاضری ہوئی تو انھوں نے اپنا چپراسی بھجوایا تا کہ معلوم ہو سکے کہ میں دلی سے باہر ہوں یا کیا وجہ ہے کہ ان کے ہاں حسبِ معمول حاضر نہیں ہوا۔ چپراسی اوپر آیا اور مجھے نیم بے ہوشی کی حالت میں پاکر فوراً سردار صاحب کے ہاں واپس جاکر بتایا کہ سرور صاحب تو بہت بیمار ہیں۔ میں نے دیکھا تو سردار صاحب ہانپتے ہوئے میرے غریب خانہ پر تشریف لے آئے اور فوراً اپنے چپراسی کو بھیج کر ڈاکٹر کو بلوایا اور دوا دلوائی۔ مجھے نام تو یاد نہیں آرہا مگر ایک ہندو صاحب کسی مذہبی رسالے کے ایڈیٹر تھے انھیں کسی معاملے میں ایک ایسے افسرِ اعلیٰ سے کام تھا جو میرا عزیز تھا لہٰذا ان ایڈیٹر صاحب نے کسی ذریعہ سے پتہ چلا لیا کہ افسر مذکور میرے رشتہ دار ہیں اور ان صاحب نے مجھ تک پہنچنے کا ذریعہ دریافت کیا کہ ایک تو حافظ محمد یوسف آف شمع کی بات سرور تونسوی کبھی نہیں ٹال سکتا اور دوسرے سردار دیوان سنگھ مفتون کی۔ یہ صاحب پہلے سردار دیوان سنگھ مفتون کے ہاں پہنچے تو انھوں نے دھتکار دیا کہ میں سرور سے ہرگز نہیں کہوں گا کہ وہ ایسی سفارش کرے۔ اب یہ صاحب حافظ صاحب کے ہاں گئے گرمی کا موسم اور دوپہر کو لنچ ٹائم میں حافظ صاحب ان کے ساتھ ہولیے نہ معلوم میرا غریب خانہ انھوں نے کیسے تلاش کیا ہوگا۔ گلی سے آواز آئی تو میری بیوی نے پہلی منزل سے نیچے جھانکا اور مجھے اطلاع دی کہ دو ایسے صاحب نیچے کھڑے ہیں جو ہمارے ہاں کبھی نہیں آئے۔ میں نے کہا ان کا نام تو پوچھئے۔ میری بیوی نے دریافت کیا کہ آپ کا نام کیا ہے "یوسف" یہ آواز میں نے کمرے میں پڑے پڑے خود بھی سنی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ "شمع" والے حافظ محمد یوسف اس تپتی دوپہر میں میرے غریب خانے پر تشریف لا سکتے ہیں۔ لہٰذا میں نے یہی سمجھا کوئی صاحب یا تو کتابیں خریدنے آئے ہوں گے یا شانِ ہند میں اپنا کلام شائع کرانے والے کوئی شاعر ہوں گے لہٰذا میں نے بیوی سے کہا کہ بُلا لیجئے۔ ایک منٹ بعد دیکھا تو شمع والے حافظ صاحب میرے سامنے کھڑے تھے جو بڑی بے تکلفی سے میری چارپائی پر ہی بیٹھ گئے میری بیوی کرسی لائی جس پر انھوں نے دوسرے صاحب کو بٹھایا اور خود میرے پاس ہی بیٹھے رہے۔ فرمانے لگے کب سے بیمار ہو بتایا کہ دو ہفتے ہوگئے ہیں۔ کہنے لگے اطلاع تک نہیں دی۔ دفتر کا کمرہ نیچے تھا میں نے عرض کیا کہ یہاں آپ لوگوں کو تکلیف ہو رہی ہے نیچے دفتر میں چلتے ہیں فرمانے لگے ہرگز نہیں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ میں تمہارے کس کام آسکتا ہوں میں نے مجسم نیازمندی سے شکریہ ادا کیا۔ فرمانے لگے ان صاحب سے ملئے اس کے بعد انھوں نے اپنے ساتھی کا تعارف کرایا اور یہ بھی بتایا کہ انھیں فلاں صاحب سے یہ کام ہے اور یہ کام آپ ہی کرا سکتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اگر یہ صاحب آپ کے خاص آدمی ہیں تو میں یہ خدمت ہر طرح سے انجام دوں گا فرمانے لگے نہیں۔ میں نے انھیں آج ہی دیکھا ہے انھوں نے کہا کہ سرور تونسوی آپ کی بات کو ٹال نہیں سکتے لہٰذا ان کے اسی اعتقاد پر میں ان کے ساتھ ہو لیا چونکہ ان کا کام کوئی ناجائز نہیں ہے اس لئے اسے ضرور کرا دیجئے۔ اگر میری تھوڑی سی کوشش سے ان کا کام ہو جائے تو اچھا ہی ہے میں نے بیوی سے لیٹر ہیڈ منگوا کر متعلقہ صاحب کو لکھ دیا کہ یہ صاحب حافظ محمد یوسف دہلوی ایڈیٹر شمع کی سفارش لائے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ بالکل سچا ہے لہٰذا انھیں مایوس نہ کیجئے۔ میں علیل ہوں اس لیے خود حاضر نہ ہو سکا۔ حافظ صاحب ان صاحب کو اپنے ہمراہ موٹر میں افسر مذکور کے دفتر لے گئے اور افسر مذکور نے حافظ صاحب سے کہا کہ سرور تو خیر میرا بھائی ہے مگر میں یہ کام اس لئے کر دوں گا کہ مجھے آپ سے مل کر دلی خوشی ہوئی آپ اتنے بڑے اور اچھے رسالہ کے مالک اور اس قدر سادگی لہٰذا آپ کا خود تشریف لانا اس امر کی ضمانت ہے

سے بھی غنڈہ گردی کی بنا پر برطرف کر دیا گیا۔ جب ہزار منت سماجت
سے ریلوے میں ملازم ہو گیا اور وہاں پانچ برس تک پلیٹ فارم پر
جھاڑو دیتا رہا۔ مگر ایک دن وہ تھکا ہارا دیر سے پہنچا اور دو تین دن کی چھٹی
کے نام کی یادداشت میں وہیں تک جیل کی ہوا کھانے چلا گیا۔ وہاں بھی
اس کی ڈیوٹی جھاڑو سے گرد و غبار سمیٹنا ہی ٹھہری۔ بچپن میں بھی اس
کا پسندیدہ کھیل گھر میں جھاڑو سے دھول کی ننھی منی ڈھیریاں بنانا
تھا۔ اسی بنا پر اس کی ماں نے اس کی کئی مرتبہ مرمت بھی کی تھی مگر یہ
لت اس سے نہ چھوٹی تھی۔ یہ شوق اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ جیل سے
چھوٹنے کے بعد وہ کئی کوٹھیوں میں دو دو چار چار ماہ تک جھاڑو پونچھ
کا سلیقے سے کام کرتا رہا۔ اور وہیں کسی ایک کوٹھی میں اس کی اپنے
بنگالن کی ماں سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اور تب ایک رات وہ اسے
ساتھ بھگا کر لے گیا اور پھر اس کے ساتھ دو بول پڑھوا لئے۔ وہ اپنے
اس کارنامے کا ذکر چنیا بیگم سے بیٹھ کر اکثر کیا کرتا تھا اور یہ قصہ
دہرا کر اس کا چہرہ فخر سے تمتما اٹھتا تھا۔ شادی کے
بعد کچھ مدت اس نے دل لگا کر کوٹھیوں میں کام کیا۔ لیکن شومئ
قسمت اس پر چوری کا الزام تھوپ دیا گیا اور اسے ایک بار پھر جیل
کی یاترا کرنا پڑی۔ ایک برس کی سزا کاٹنے کے بعد اس نے
کوٹھیوں میں جھاڑو دینے کے کام سے تو بالکل استعفیٰ کر لیا اور انہیں
کے بیٹے پر کام شروع کر دیا۔ روکھی سوکھی کھا کر گزارا کرتے ہوئے
کئی سال گزر گئے اور پھر دمے کے مرض نے ایک دن بیٹے میں سے
نکل کر اس کا گلا دبوچ لیا۔ اس کی آنکھیں ابل کر باہر آ گئیں۔
بڑی مشکل سے جان بچی مگر جو کراہ دمے نے دی تھی اس روز
ماری پھر کبھی نہ چھوڑی۔ رات جگے کی بیماری تھوڑی تھوڑی
تو اسے برسوں سے تھی مگر کام کا بوجھ اسے بیکار بنائے رکھتا تھا
اب اکیلے میدان صاف پا کر وہ بھی اس پر حاوی ہو گئی۔
مگر آج نجانے کیوں اسے کچھ ایسا لگا کہ اس کے بیتے
یادوں کی دھول سی بن کر آنگن میں پھیلتے جا رہے ہیں
اور وہ جھاڑو سے اس دھول کی ڈھیریاں سی بناتا جا رہا
ہے۔ اور پھر ہر ڈھیری چار پائی میں گم ہوتی جا رہی ہے جس میں اس
کا بیوی کا اور بچے علیحدہ علیحدہ تنکوں کی طرح بکھرے پڑے
ہیں۔ وہ انہیں سمیٹنا چاہتا ہے لیکن بیچ میں ایک گھنونا جوہڑ

آ جاتا ہے۔ اچانک اس کا پاؤں پھسلتا ہے اور وہ غڑاپ
سے اس میں جا گرتا ہے۔ غوطے کھا رہا ہے۔ ہاتھ پاؤں سے ہاتھ
پاؤں مار رہا ہے۔ لیکن اسے کسی تنکے تک کا سہارا نہیں مل
رہا ہے اور مل بھی کیسے سکتا ہے کیونکہ اس کا اپنا وجود بھی
ایک تنکا اور اتنا ہی تو ہے اور تنکا بھلا تنکے کو کیونکر سہارا
دے سکتا ہے۔ جب اُسے لگا کہ وہ جوہڑ سے نکل آیا ہے لیکن
اب دھول سے اس کا دم رکنے لگا ہے۔ حلق میں سے جو دھول
اس کے نرخرے میں جمع ہونے لگی ہے اور وہاں سے نکلنے کا
نام نہیں لے رہی بلکہ وہاں اس کی تہ لمحہ بہ لمحہ موٹی ہوتی جا
رہی ہے۔ اچانک اس نے دیکھا کہ دھول کے غبار نے اس
کے منہ اور نتھنوں سے باہر آ کر ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لینا
شروع کر دیا ہے اور سب کچھ اس کے میلے پن میں غیر محسوس
طور پر لپٹتا چلا جا رہا ہے۔ یوں لگ رہا ہے کہ چہرے دھندلا
گئے ہیں۔ رمضانی شاہ کے گھر کے پر گھر والے لوگ تھوڑے
فاصلے سے بھی اسے صاف دکھائی نہیں دے رہے۔ حتیٰ کہ
بازاروں، گلیوں، چوراہوں پر ہر جگہ باریک دھول تیزی سے پھیلنے
لگی ہے۔ لوگ بار بار ولائتی صابن سے اپنے چہرے خوب جگمگ
بنا کر دھو رہے ہیں۔ کپڑوں کو بار بار جھاڑ رہے ہیں تاکہ دھول سے
خود کو نجات دلا سکیں مگر دھول پھر پھر کر ان کی آنکھوں، کانوں
اور نتھنوں میں بے تحاشا گھستی چلی جا رہی ہے اور وہاں پھیل سا
بن کر جمنے لگی ہے۔ یہ دیکھ کر وہ نجانے کیوں مسکرا دیتا ہے۔ اب
وہ ایک بڑی سی دکان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ہے جہاں پر
رکھے ٹیلیویژن سیٹ پر دھول کے اس عذاب کے خلاف
سائنٹفک تدابیر اختیار کرنے کے طریقے وقفوں وقفوں سے نشر ہونے
لگے ہیں۔ اتنے میں ایک سائیکل سوار اخباروں کا پلندہ آگے
ہینڈل پر رکھے اس کے پاس سے چلاتا ہوا گزر گیا ہے۔ آج کی
تازہ خبر! کلکتہ کی تازہ خبر! دھول نے حملہ کر دیا! دھول نے حملہ کر دیا!
اسمبلی کا ہنگامی اجلاس طلب کر لیا گیا ہے۔ اب حالت یہاں تک
پہنچ گئی کہ رمضانی نے آنکھوں میں سرمہ اور چہرے پر سرخی پوڈر لگانا
بھی چھوڑ دیا ہے مگر ان کے چہرے دھول کی موٹی تہ سے اٹ گئے ہیں
اور وہ اپنے اصلی رنگ روپ سے بہت دور اپنے رشتہ داروں

گونوں کو پوچھتی رہتی تھیں۔ تب ایک جگہ اس نے ایک ہجوم
دیکھا جس میں موجود کوئی شخص بھی کھل کر بات کرنے کے قابل ہی
نہ رہا تھا اور اگر کوئی ہمت کر کے ذرا کی ذرا منہ کھولتا تو دھول
کے نوکیلے ریزے اس کی زبان پر چھالے ڈال دیتے اور اسے
ابکائیاں سی آنے لگتیں۔ لوگ ایک دوسرے سے بات کرتے ڈرنے لگے
تھے سب کچھ دھندلا دھندلا سا انہیں شروع ہی سے نظر آنے لگا تھا مگر
اب تو یوں لگتا تھا جیسے دھول ان کی آنکھوں میں پوری طرح سے گھس گئی ہے
وہ نہ بول سکتے ہیں، نہ دیکھ سکتے ہیں ہاں البتہ محسوس ضرور کر سکتے
ہیں۔ رفتہ رفتہ حالت اس انتہا کو پہنچ گئی کہ اس نے دیکھا کہ ہر
شخص نے اپنے منہ اور ناک پر رومال باندھ لیا ہے اور آنکھوں
پر موٹے شیشے والی عینکیں چڑھالی ہیں۔ لیکن کریچ کریچ کرتی دھول
جانے کس طرف سے راستہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان سب کی آنکھوں
اور نتھنوں میں بیٹھے کے کر اسے زہر ڈسولین کی طرح گھستی چلی جا رہی ہے
میں روڈ کے قریب واقع سبزہ زار کے فٹ پاتھ پر سے گزرتے ہوئے
اس نے دیکھا کہ درختوں کی ساری سرسبزی اب تقریباً ختم ہو چکی ہے
ان پر دھول کا ایسا غبار کالی ڈل کی طرح بری طرح چھا گیا تھا یہاں
تک کہ ہر سانس لینے والی اور بے جان چیز کا رنگ مٹیالا نظر آنے
لگ گیا تھا۔ سب لوگوں کے چہروں پر اب زرد سا اڑنے لگا
تھا اور پہچان والے نقش نقوش غائب ہونے لگے تھے۔ حتیٰ کہ فٹ
پاتھ کے کنارے گھروں کا روں اور چھپکلیوں میں تمیز کرنا بھی
ناممکن ہو گیا۔ پانی کا استعمال تو بے تحاشا بڑھ گیا تھا۔ اس
لئے لاؤڈ اسپیکر پر بار بار اعلان ہو رہا تھا "خواتین حضرات!
پانی کا استعمال کم کریں کیونکہ پانی کا ذخیرہ خطرناک حد تک کم ہو چکا ہے اور اگر
پانی کا استعمال موجودہ رفتار سے جاری رہا تو آئندہ دو دنوں کے
اندر اندر پانی کی راشننگ کر دی جائے گی" پھر اس نے دیکھا کہ
لوگ سراسیمگی کی حالت میں شہر کو خالی کر کے دریا کی طرف جا رہے ہیں
بازار اور گلیاں دن دہاڑے سائیں سائیں کرنے لگی ہیں۔ وہ بھی سب کے
دیکھا دیکھی بے اختیار ہنس پڑا۔ لوگوں نے اس کے چمکیلے دانت دیکھ کر نفرت سے
مارے منہ دوسری طرف کر لیے مگر وہ پرواہ کیے بغیر ان کے پیچھے پیچھے چلتا دریا کے
کنارے تک پہنچ گیا۔ جہاں ہر طرف خیمے لگ چکے تھے یوں لگ رہا تھا کہ رات
یکایک رات میں دریا نے کروٹ لے کے اپنے اندر کا سارا فساد شہر کی صورت میں

دھول کی تہوں کو ابل ابل کر دھونے لگے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دریا کا پانی
تیزی سے گدلا ہونے لگا۔ پانی میں کیچڑ کی آمیزش بڑھتی چلی گئی اور پھر چاروں
طرف ایک ہنگامہ سا مچ گئی۔ عورتیں رونے پیٹنے لگیں۔ بچے سہم کر ان کے
سینوں میں دبک گئے۔ کیونکہ دریا کا پانی خشک ہو چکا تھا اور وہاں پر
دھول کی موٹی موٹی تہیں یوں ابھری ہوئی صاف نظر آ رہی تھیں جیسے کسی نے
پھاوڑے کی مدد سے بڑی بڑی ڈھیریاں بنا دی ہوں۔ فضا میں نمی کی مقدار
تیزی سے گھٹ رہی تھی اور خبروں سے پتہ چلتا تھا کہ پہاڑوں پر برف باری
کی جگہ دھول کے گالے گرنے لگے ہیں اور پہاڑ کیچڑ کے ڈھیر بنتے جا رہے
ہیں۔ سورج بھی مٹی کی گول ٹکیا دکھائی دینے لگا تھا اور مسجدوں
میں اذانیں، مندروں میں گھنٹیاں، گوردواروں میں سنکھ اور گرجوں میں
گھڑیاں مسلسل بجنا شروع ہو گئے۔ کھانے پینے کی ہر شے پر بھی دھول
کا ورق تیزی سے لپٹنے لگا، لوگ مٹی مٹی ہونے لگے۔ یہاں تک کہ
ہر چھوٹے بڑے، امیر، غریب کے چہرے مکمل طور پر ایک جیسے ہو گئے اور سیاہ
اور سفید کی تمیز مٹ گئی تھی۔ وہ یہ سب کچھ دیکھ کر نڈھال ہو گیا۔ ایسے میں
اچانک ایک طرف سے دھول کا سیاہ بادل بھنبھناتا اٹھا۔ لوگ سہم
گئے اور خوف سے تھر تھر کانپنے لگے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دھول کے سیاہ
بادل میں روشنی کی دو لکیریں یکبارگی نمودار ہو گئیں اور اس کے پیچھے
پھاڑ دینے والی گرج کا تڑاکا گونجنے لگا۔ اور پھر یکایک آسمان پھٹ
گیا۔ لوگ ہاتھ اٹھا اٹھا کے آسمان کی طرف منہ کھول کھول کر چلانے لگے کہ اس
بار پانی کے قطروں کے بجائے دھول کی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی
اور ہوتی ہی چلی گئی۔

تب اس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں جھاڑو ہے اور وہ زور زور
سے گھر کے آنگن میں جھاڑو دیے جا رہا ہے۔ اس کی بیوی بکھرے بال لئے کپڑے
پہنے سیڑھی پر بیٹھی ہاتھوں میں شیشہ لٹکائے، آنکھوں میں سرمہ بھر بھر کر
لگا رہی ہے اور پھر یکبارگی اس کی طرف قہر بھری نظروں سے دیکھتے
ہوئے کہتی ہے "جھاڑو آہستہ دے، کیسی دھول اڑ رہی ہے"
وہ ٹھٹھک کر ہاتھ روک لیتا ہے اور پھر اس کی طرف حقارت سے
دیکھتے ہوئے زمین پر تھوکتا ہے۔ دوسری بار پھر تھوکتا ہے اور پہلے
سے بھی زیادہ زور زور سے دھول اڑانے لگتا ہے اس کا اپنا آپ بھی

سارے عالم پر

مرزا غالب ــــ حیات اور شاعری

بعض لوگ اسم با مسمٰی ہوتے ہیں۔ مگر دنیا میں ایسے لوگوں کو صرف انگلیوں ہی پر گنا جا سکتا ہے چنانچہ غالب کا شمار بھی ایسی شخصیات میں ہوتا ہے۔

غالب نے غالب ہو کر دکھایا اور لوگوں کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ اس عظیم شاعر کو ہمیشہ اچھے القابات سے یاد کریں یہی وجہ ہے کہ پروفیسر صدیقی کو کہنا پڑا کہ مسلمانوں نے برصغیر کو صرف دو چیزیں دیں ایک غالب اور دوسری تاج محل قسمت کا مذاق دیکھئے اردو زبان کا یہ عظیم غزل گو ایک ایسے دور میں اس دنیا میں آیا جب سلطنت ہند مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل رہی تھی۔ غم نہ صرف اس بات کا تھا کہ عہد مغلیہ اپنے زوال پر تھی بلکہ دکھ اس چیز کا بھی کہ اس وقت مسلمانوں کی ثقافت تعلیم، تہذیب و تمدن سسک رہی تھی کہیں کہیں شمع علم و ادب سحر کے ساتھ روشن تھی مگر پروانۂ علم اس کے نزدیک آنے کو تیار نہ تھے۔

ایسے دور میں کون خیال کر سکتا تھا کہ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہونے والا بچہ ایک دن اردو ادب میں ایک ایسا مقام حاصل کرے گا جس کی نظیر تاریخ پیش کرنے سے قاصر رہے گی تاریخی اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ترکی نسل سے تھے ان کے دادا اسلاف زادہ رستم خان مرزا کی پیدائش سے پچاس ساٹھ سال پہلے سمرقند سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور پھر ہمیشہ کے لئے یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

ان کے والد ماجد جناب مرزا عبداللہ بیگ خاں پہلے لکھنؤ اور اس کے بعد کافی عرصہ تک حیدرآباد میں ملازم رہے مگر آپ کی تعلیم و تربیت آگرہ میں آپ کے نانا خواجہ حسین کی ان کی نگرانی میں ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے والد اس دنیا سے اس وقت رحلت کر گئے تھے جب غالب پانچ سال کے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ نے ان پر اپنا دست شفقت رکھا مگر شاید قدرت کو یہ بات پسند نہ آئی اور قسمت نے ان کا بھی زیادہ دیر ساتھ نہ رہنے دیا اور چار پانچ سال کے بعد نصر اللہ بیگ بھی انتقال کر گئے۔

ان کی وفات کے بعد غالب اپنے نانا کے زیر سایہ آگئے جن کا خاندان آگرہ کے رئیس گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔ چنانچہ مرزا کی پرورش بڑے ناز و نعم سے ہوئی۔ دنیا کی تمام آسائشیں آپ کو مہیا تھیں اور ہر قسم کی مکمل آزادی تھی۔ لیکن اس عیش و عشرت کے ساتھ ساتھ غالب کے نانا نے ان کی تعلیم و تربیت کا بھی خیال رکھا۔ اور غالب کو اس دور کے عظیم اساتذہ سے اپنی علمی پیاس بجھانے کی سعادت نصیب ہوئی۔ ان کے اساتذہ میں نظیر اکبر آبادی بھی تھے۔ جو اردو ادب میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اکبر آبادی کے اشعار غزل گوئی ادب میں ایک خاص اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔

غالب کو فارسی سے بھی فطرتی لگاؤ تھا۔ اس دور میں آگرہ میں فارسی کے مشہور و معروف عالم مولوی معظم تھے۔ مرزا میں فارسی زبان اور ادب کا شوق شاید آپ ہی کا مرہون منت تھا۔ فارسی زبان سے شغف کا اندازہ اس بات سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ غالب نے گیارہ برس کی عمر میں فارسی شعر کہنے شروع کر دیئے تھے۔ اور فارسی شعراء کا کلام پڑھنے اور سمجھنے لگے تھے۔ کسی طرح یہ صحیح طور پر نہیں بتایا جا سکتا کہ مرزا دہلی کب آئے۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ پانچ چھ برس کی عمر سے ہی آپ کا دہلی آنا جانا تھا۔ آپ کے کچھ خطوط اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ پندرہ سولہ برس کی عمر میں آپ مستقل طور پر دہلی تشریف لائے۔ آگرہ سے دہلی کی طرف ہجرت غالب کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے اگر آپ نقل مکانی نہ کرتے تو شاید آج ہم آپ کے نام سے واقف نہ ہوتے اور غالب میں وہ خصوصیات نہ ہوتیں۔ جن کی بدولت ان کا نام ادب میں لافانی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

آگرہ سے دہلی روانگی کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ آگرہ میں شاعروں

اعری کو سمجھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی اور لوگوں کو ویسے بھی شاعری
ی کوئی خاص شغف نہ تھا یا شاید یہ وجہ ہو کہ ابتدا میں آپ کا کلام بہت
ہ تھا اور آپ فارسی کے مشہور شاعر بیدل کی طرز پر اشعار کہتے تھے
لئے آپ کے عجیب و غریب اشعار اکثر سخن فہموں کی سمجھ سے بالاتر

شاعر اگر کسی کو اپنی غزل یا اشعار سناتا ہے تو صرف اس لئے کہ
اسے داد دیں۔ مگر جب داد کی جگہ اعتراضات ملیں تو وہ بڑا ہو جاتا
اور پیچ و تاب کھانے لگتا ہے چنانچہ غالب بھی ان لوگوں کے
تراضات سے چڑ گئے۔ ان ہی معترضین سے چڑ کر آپ نے اکثر یہ
یہ رباعی کہی تھی۔

مشکل ہے ز بس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخن وران کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

تیسری وجہ جو شاید غالب کو دہلی لانے میں آمادہ کرتی نظر آتی ہے
یہ ہو سکتی ہے کہ اس زمانے میں دہلی کا ماحول ادبی لحاظ سے بہت
سازگار تھا۔ بڑے بڑے سخن فہم حضرات دہلی ہی میں سکونت پذیر تھے۔
ان میں شعراء میں شاہ نصیر، ابراہیم ذوق، مومن، علماء میں شاہ عبدالعزیز
شاہ اسماعیل، شاہ عبدالقادر، حضرت سید احمد بریلوی، مولانا فضل
حق خیرآبادی حکماء میں حکیم محمود خاں، حکیم احسن خاں، حکیم رضا خاں اور
نقادوں میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ موجود تھے۔
خوش قسمتی سے مرزا غالب کو مولانا فضل حق اور نواب شیفتہ جیسے
صاحبان علم و فن کی دوستی اور قربت کی نعمت حاصل ہو گئی۔ ان بزرگوں
نے ان کے کلام کی خوبیوں اور خامیوں سے انہیں آگاہ کیا۔ یہی وجہ تھی کہ
آپ قلیل عرصہ میں شاعرانہ عظمت کے آسمان پر ستارے کی مانند چمکنے لگے
دہلی آنے کے بعد غالب کے کلام میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ اس
کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ آپ نے یہاں آکر ہندوستان کے فارسی شعراء
کے کلام کا مطالعہ کیا۔ یوں تو غالب کی شہرت کی اصل وجہ اردو کلام
ہے جو ادب میں اپنا علیحدہ و منفرد مقام لئے ہوئے ہے لیکن پھر بھی
ان کے کلام میں ـــ بیدل اور عرفی اور نظیری کا عکس کہیں کہیں ملتا ہے۔
غالب جنگ آزادی کے بعد صرف دس برس مزید اس دنیا کو دیکھ سکے۔
آخر فروری ۱۸۶۹ء کو ۷۳ برس کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے
اور حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ میں مدفون ہیں۔

سر سید کو پرانے شعراء سے اس بات پر اختلاف تھا کہ وہ لالچی
اور خود غرض ہوتے ہیں۔ مگر غالب پر یہ الزام لگانا ان کے ساتھ نا
انصافی ہو گی۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے ذاتی مصلحتوں کی بناء
پر اپنے ممدوحین کی شان میں قصیدے لکھے لیکن ان کی قصیدہ گوئی
بھی اپنے اندر ایک خاص شان لئے ہوئے ہے آپ نے بہادر شاہ کی
مدح میں بھی ایک قصیدہ لکھا جس کی وجہ سے غالب کو بہت پریشانی اٹھانی
پڑی۔ آپ اس بات سے تنگ آگئے اور ایک قصیدہ لکھ کر دربار میں
بادشاہ کے سامنے پیش کیا کہ مجھے ہر ماہ تنخواہ دی جائے۔ مگر درخواست
کے انداز میں بھی اپنے بانکپن اور اپنی ظرافت کو برقرار رکھے ہیں۔

شاعر نغز گو و خوش گفتار ۔۔۔ رزم کی داستان اگر
ہے زباں میری تیغ جوہردار ۔۔۔ بزم کا التزام گر کیجئے
ہے قلم میرا ابر گوہر بار ۔۔۔ ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد

قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار

کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال ۔۔۔ کچھ بنایا [illegible] نہیں ہے اب کی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ ۔۔۔ بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

آگ تاپے کہاں تلک انسان ۔۔۔ دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی ۔۔۔ ربنا وقنا عذاب النار

اب اصل وجہ بیان کرتے ہیں۔

میری تنخواہ جو مقرر ہے ۔۔۔ اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک ۔۔۔ خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بہ قید حیات ۔۔۔ اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بس کہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض ۔۔۔ اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا ۔۔۔ ہو گیا ہے شریک ساہوکار

اپنی مجبوریوں کا ذکر کرنے کے بعد بادشاہ کے سامنے اپنی
درخواست پیش کرتے ہیں۔ مگر کن الفاظ میں!

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا ۔۔۔ آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار
میری تنخواہ کیجئے [illegible] ماہ بماہ ۔۔۔ تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام ۔۔۔ شاعری سے نہیں مجھے سروکار

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بنک لمیٹڈ

رجسٹرڈ آفس ۷۸، محمد علی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

دہلی آفس ۲۶۵۵ نیتاجی سبھاش مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
فون نمبر ۲۶۸۲۶۶ ــــ ۲۶۴۳۷۰

✡ ــــ ہمارے یہاں شرح سود تمام نیشنلائزڈ اور شیڈولڈ کمرشیل بنکوں کے مقابلہ ایک فی صد زیادہ ہے۔

✡ ہندوستان کا پہلا کوآپریٹو بنک جس کو زرِ مبادلہ میں کاروبار کیلئے لائسنس جاری کیا گیا۔

✡ ــــ ہمارے بنک میں اوقاف کی جمع شدہ رقم کی آمدنی دفعہ ۱۳ (۳۵) (الف ۲) (iii) انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنٰی ہے۔

اس کے علاوہ

✡ ہم آپ کی تمام و آسائش کی ضروریات مہیا کرنے کیلئے آسان قسطوں پر قرضہ فراہم کرتے ہیں ایک فیصدی کا فرق بہت بڑا فرق ہے۔ یہ آپ کی رقم میں ہزاروں روپیوں کا اضافہ کرتا ہے۔ آپ بھی اس کا فائدہ اٹھائیں

شمیم کاظم	حسینی۔ ایس۔ ڈاکٹر	زین بی رنگون والا
اسسٹنٹ جنرل منیجر۔ شمالی ہند	(چیرمین)	(مینیجنگ ڈائرکٹر)

طنزیہ

میری تعریف کرو

رام لعل نابھوی

یہ بات اُس وقت کی ہے۔ جب ہم بچے تھے۔ ویسے بچے تو ہم اب بھی ہیں لیکن اُس وقت تو ہم حقیقتاً بچے تھے کہ ہمارے کانوں میں ایک بھنک پڑی "تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا" جیسے اور باتیں سن کر ان سنی کر دیتے تھے۔ یہ بات بھی اسی طرح ان سنی کر دی۔ اسکول پہنچے۔ ہر صبح باقاعدگی سے وہاں حاضر ہو جاتے۔ ساتھی طلبا کے ساتھ ترنم سے اور لہک لہک کر ایک نظم ہر صبح پڑھتے جس کا پہلا مصرع یہی ہوتا تھا۔ لیکن جانئے ہمیں اس وقت کسی نے خدا کا مطلب [illegible] بتایا اور نہ یہ فلسفہ [illegible] کہ خدا کی تعریف کیوں کی جائے۔ ایک روز کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ہمارے تجسس نے زور پکڑا اور ہم اپنے استاد سے پوچھ بیٹھے کہ خدا کون ہے۔ کہاں رہتا ہے۔ کیا کرتا ہے اور اس کی تعریف کیوں کی جائے۔ جو بھی جواب استاد سے اس وقت ملا۔ اس سے ہمیں بخوبی اندازہ ہو گیا کہ ہمارے استاد خدا کو جانتے تک نہیں تھے۔ شاید ان کی کبھی ملاقات ہوئی تھی۔ جو کچھ انھیں پتہ تھا وہ سن کر یا پڑھ کر ہی انھوں نے حاصل کیا تھا اور وہی انھوں نے ہمیں بتا دیا۔ ہم نے معاملہ کی چھان بین کی اور بڑے بڑے ملاؤں، پنڈتوں کے پاس پہنچے تب پتہ لگا کہ یہ بات آسمانی صحیفوں میں لکھی گئی ہے کہ خدا کی تعریف کی جائے یعنی خدا نے خود ہی اپنی تعریف کرانے کا سلسلہ چلایا۔ [illegible] ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ بہت لوگوں نے تو اپنی پوری زندگی خود خدا کی تعریف کرنے اور لوگوں سے تعریف کرانے میں گزار دی۔ انھوں نے اور کوئی کام ہی نہیں کیا۔

بڑے بڑے بادشاہ تخت پر بیٹھتے۔ لوگ انھیں ظل اللہ کہتے۔ صفت خداوندی بتاتے اور تعریف کے پل باندھتے۔ بادشاہ اپنی تعریف سن کر خوش ہوتے اور انعام دیتے۔ چنانچہ بادشاہ کی بڑھ چڑھ کر تعریف ہوتی اور جو شخص تعریف کرنے میں سب سے بازی لے جاتا وہ بادشاہ کے نزدیک ہو جاتا۔ شعرا قصیدے لکھنے لگے۔ ہر شاعر سب سے عمدہ قصیدہ کہتا یا سب سے زیادہ بادشاہ کی تعریف کرتا وہ سب سے زیادہ انعام پاتا۔ دوسرے شعرا حسد کرنے لگ جاتے۔ اشعار میں خامیاں ڈھونڈتے اور بادشاہ کو بتاتے شاعروں کی آپس میں چھیڑ چھاڑ اور چشمکیں شروع ہو گئیں۔ معرکے ہونے لگے۔ استادوں کی حمایت میں شاگرد میدان میں کود پڑتے جلسے ہوتے۔ جلوس نکلتے۔ انشا و عظیم، انشا و خالق، انشا و قتیل، انشا و مرزا غنیم، جرأت و انشا۔ ناسخ و آتش۔ سودا اور مرزا جان جاناں۔ سودا اور مرزا فاخر، سودا اور میر ضاحک۔ سودا اور [illegible] سودا اور مکین۔ سودا اور لقا۔ انیس و دبیر نصیر و ذوق۔ غالب اور ذوق وغیرہ کے ادبی معرکے کیا تھے۔ یہی نہ کہ اپنی تعریف کی جاتی۔ مخالف کو گرانے کی کوشش کی جاتی۔ چونکہ یہ لوگ صحیح معنوں میں شاعر ہوتے تھے اور زبان و بیان پر پوری گرفت ہوتی تھی اس لئے جب بھی کوئی عمدہ شعر اپنے مخالف کا سنتے تو خوب تعریف کرتے تھے۔ مصنف "آب حیات" رقم طراز ہیں کہ سید انشا نے ایک مشاعرہ میں ۵ اشعار کی ایک غزل پڑھی۔ اس کا ایک شعر تھا۔

"لگا کے برف میں ساقی صراحی مے لا
جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا"

اس مشاعرہ میں جرأت اور مصحفی تک سب موجود تھے مگر سب نے غزلیں اپنے ہاتھ سے رکھ دیں کہ اب پڑھنا لاحاصل ہے ادب میں دلچسپی بڑھی تو ہم نے دیکھا کہ بہت جگہ شعرا نے اپنی کتاب خدا کی حمد سے شروع کی اور اس کے بعد اپنی تعریف پر اتر آئے۔ بہت جگہ یہ عالم دیکھا کہ خدا کا نام ہی نہیں یا اسے پس پشت ڈال دیا۔ جب ہماری نظر میر تقی میر کے اس شعر پر پہنچی۔ ؎ ساری دنیا پر ہوں میں چھایا ہوا۔ مستند ہے میرا فرمایا ہوا تو ہمارے کان کھڑے ہو گئے اور سچ مانئے۔ یہ کان آج تک اپنی صحیح جگہ پر نہیں لوٹے۔ ہم نے تو سنا تھا کہ اپنی تعریف آپ ہی

نہیں کہلاتی اور یہاں دوسری بات ہی نہیں تھی۔ چنانچہ ہم بھاگ کر استاد کے پاس پہنچے۔ انھوں نے وضاحت فرمائی کہ اسے تعلّی کہتے ہیں اور شعراء اور ادباء کو اس کی اجازت ہے۔ ہم نے سوال کیا کہ یہ اجازت انھیں کس نے دی۔ اس کا جواب جو استاد نے دیا وہ بھی ان کا سنا سنایا تھا۔ آج کل ہم مختلف شعراء کے دیوان کھنگالنے میں لگے ہوئے ہیں تاکہ یہ دیکھیں کہ انھوں نے خدا کی تعریف میں کتنا کچھ کہا ہے۔ دوسروں کی تعریف میں کتنا لکھا ہے اور اپنی تعریف میں کتنا۔ ابھی تک تو جو کچھ ہمارے مطالعہ میں گذرا ہے اس کے مطابق تعلّی کا پلڑا بھاری ہے۔

اپنے آپ کو مشاعروں، مناظروں، سمناروں، جلسوں اور ادبی محفلوں کی دنیا میں لے چلیں۔ یہ بات پہلے ہی مشاعروں کی ہے۔ اس میں ایسے شعراء تھے جو جدید شاعری کے متوالے تھے اور قدیم شاعری کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ ایسے بھی تھے جو قدامت پسند تھے اور جدید شاعری کے مخالف ان میں وہ بھی تھے جو قدیم اور جدید دونوں رنگوں کے امتزاج سے اپنے اشعار میں ندرت پیدا کرتے تھے۔ مشاعرہ شروع میں ہم نے دیکھا کہ بعض بہت عمدہ اشعار پر خموشی رہتی اور بعض ناقص شعروں پر واہ وا۔ پھر کہئے۔ کیا شعر ہے۔ یہ آپ ہی کا حصہ ہے کے نعرے بلند ہوتے۔ اب جو بند کیا تو معلوم ہوا کہ جیسے دنگل میں پہلوان اپنے حریف کو ادبیج سے شکست دیتے ہیں اسی طرح کچھ شاعر اپنے مداح اپنے ساتھ لاتے ہیں جو یہاں وہاں۔ ادھر۔ اُدھر محض اس لئے بیٹھے ہیں کہ اپنے شاعر کی تحسین و آفریں کریں۔ ماہرین حیران رہ جاتے ہیں۔ لیکن کچھ بھی نہیں سکتے۔

آج کل تعریف کرانے کے لئے پانچ حربے زیادہ مستعمل ہیں۔

۱۔ مشاعرہ بازی
۲۔ رسمِ اجرا
۳۔ جشن بازی
۴۔ رسالوں کے نمبر یا گوشے۔
۵۔ خاکہ نگاری۔

مشاعرہ بازی ایک فن ہے۔ کوئی نیا پرانا شاعر یا ادیب ایک انجمن بنا لیتا ہے۔ اچھا لیٹر۔ عمدہ لفافے لاتا ہے سارا دن کے نام پر سرکاری اداروں سے رقمیں لیتا ہے۔ اشتہارات اکٹھے کرتا ہے اور پھر ایک سووینیر شائع کرتا ہے۔ اس میں اپنی تعریف اپنے دوستوں کی تعریف میں مضمون چھپواتا ہے۔ اور دوستوں میں ان کا ذکر زیادہ ہوتا ہے جو خود مشاعرہ باز ہیں اور امداد باہمی کے اصول پر اپنا کاروبار کرتے ہیں۔ نہایت عمدہ کاغذ پر فوٹو چھپتی ہیں۔ ناظم مشاعرہ اگر چاہے تو کسی معمولی شاعر کو کامیاب کرا دے اور چاہے تو مستند شاعر کو ہوٹ کرا دے اس لئے شعرا حضرات ناظم مشاعرہ کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھتے رہتے ہیں۔

رسم اجرا کسی شاعر یا ادیب کی کسی کتاب کی رونمائی ہوتی ہے۔ اس میں مصنف بہت محنت سے شاعر اور ادیب اکٹھے کرکے لاتا ہے اور ان کا کام صرف تعریف کرنا ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ کام مشاعرہ بازوں، شعبدہ بازوں اور گروہ بازوں کو دے دیا جاتا ہے۔

جشن بازی ایک نیا مرض ہے۔ یہ بدعت اب عام ہوتی جا رہی ہے۔

کچھ رسالوں اور پرچوں نے شعراء و ادباء کے ضخیم نمبر نکالنے شروع کئے ہیں۔ اسی طرح بہت رسالے اور پرچے گوشے نکالتے ہیں۔ ان میں ایسے مضامین بھی ہوتے ہیں جو متعلقہ شاعر یا ادیب نے خود ہی لکھ کر دے دئے ہوتے ہیں اور کسی اور کے نام سے چھپ جاتے ہیں۔ غرض ان کی یہی یہی ہوتی ہے کہ میری تعریف کرو۔

اگر کوئی شاعر یا ادیب صحیح معنوں میں تعریف کا حقدار ہے تو اس کا ذکر ہونا ضروری ہے اور فکر بھی۔ اس سے دوسروں کو انسپریشن ملتی ہے۔

خاکہ نگاری بہت مشکل فن ہے۔ علماء نے اپنے دوستوں کے خاکے لکھے ہیں۔ ان کی خوبیاں اور نقائص بتائی ہیں۔ ہر شاعر اور ادیب اپنی تعریف چاہتا ہے۔ اگر نہیں تو ذکر چاہتا ہے۔ فکر جاننا ہے۔ چنانچہ ایسے شاعروں اور ادیبوں کو اگر کسی ایسے خاکہ نگار کا پتہ چل جاتا ہے جو بھرک میں [illegible] لکھتا ہو تو وہ اس کی طرف لپکتے ہیں پہلے اس کی تعریف کرتے ہیں۔ اس کا ذکر کرتے ہیں تاکہ خاکہ نگار ان کا خاکہ لکھے ان کی خوبیوں کا قصہ مختصر یوں کہ ہر شخص ہر اس حربہ کو استعمال کرنے کے چکر میں ہے کہ اس کی تعریف ہو یعنی میری تعریف کرو۔ ہو سکے تو ابھی [illegible] وقت۔ ساتھ کا کیا حق ہے کہ آئے نہ آئے۔

غزل

شکیل شفائی۔ متھرا

اجل بخیر حسابوں کے سلسلے توڑے
بجانے کس نے حبابوں کے سلسلے توڑے

ہے اپنے آپ میں سیراب پیاس کا احساس
کہ بہ فطرت سرابوں کے سلسلے توڑے

جواب دینے کا ہوگا سوال کب پیدا
اگر سوال، جوابوں کے سلسلے توڑے

چمن میں پھول بہت تھے، خزاں کو کیا سوجھی
کہ اب کے صرف گلابوں کے سلسلے توڑے

یقین جانیے کھنڈ کا وہ معتبر ہوگا
اگر حسین خوابوں کے سلسلے توڑے

قلم تھا ہاتھ میں، لکھ لی کتاب لوگوں نے
کہ جب خدا نے کتابوں کے سلسلے توڑے

شکیل گر ملی فرصت کریں گے کار ثواب
ابھی کریم عذابوں کے سلسلے توڑے

غزل

محشر افقاتی
بانسواڑہ راجستھان

حوادثِ جہاں میں کہاں تک آزمائیں گے
ہمارے آگے ایک دن یہ اپنا سر جھکائیں گے

انھیں یہ ضد کہ وہ ہمارے خون سے نہائیں گے
ہمیں یہ شوق ہم انھیں جان و دل لٹائیں گے

حسین خد و خال پر جنھیں بہت غرور ہے
ملا جو وقت ہم انھیں بھی آئینہ دکھائیں گے

روایتوں کی بیڑیاں پڑی ہیں جن کے پاؤں پر
جدید رہ گزار تک وہ لوگ کیسے آئیں گے

وہیں تلک ہے دل ہی جہاں تک آنکھ ہے کھلی
نہ ہوں گے ہم تو پھر کسی کو یاد بھی نہ آئیں گے

یقین تو ہے کہ مل سکے گی دادِ ضبطِ شوق کی
غزل کی طرح داستانِ دردِ دل سنائیں گے

چھپا لو محشر حزیں تو زخمہائے آرزو
بہار آئے گی تو گل ضرور مسکرائیں گے

منکسر المزاجی

بقیہ: مرزا غالب : جب انسان شہرت کی بلندیوں پر پہنچتا ہے تو وہ عموماً اپنے آپ کو یکتا سمجھتا ہے لیکن آپ میں یہ بات قطعی نہ تھی آپ نے اپنے سے پہلے شعراء کے کلام کی خصوصیت کو تسلیم کیا۔ جن سے آپ خود فیض یاب ہوئے

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب   کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا
غالب اپنا یہ عقیدہ بقول ناسخ   آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

ابیات بحضور سرورِ کائنات

احمد فراز

مرے رسول کہ نسبت تجھے اجالوں سے — میں تیرا ذکر کروں صبح کے حوالوں سے

نہ میری نعت کی محتاج ذات ہے تیری — نہ تیری مدح ہے ممکن مرے خیالوں سے

تو روشنی کا پیمبر ہے اور مری تاریخ — بھری پڑی ہے شبِ ظلم کی مثالوں سے

ترا پیام محبت تھا اور میرے یہاں — دل و دماغ ہیں پُر نفرتوں کے جالوں سے

یہ افتخار ہے تیرا کہ میرے عرش مقام — تو ہمکلام رہا ہے زمین والوں سے

مگر یہ مفتی و واعظ یہ محتسب یہ فقیہہ — جو معتبر ہیں فقط مصلحت کی چالوں سے

خدا کے نام کو بیچیں مگر خدا نہ کرے — اثر پذیر ہوں خلقِ خدا کے نالوں سے

ہے ترش رُو مری باتوں سے صاحبِ منبر — خطیبِ شہر ہے برہم مرے سوالوں سے

نہ میری آنکھ میں کاجل نہ مشکبو ہے لباس — کہ میرے دل کا ہے رشتہ خراب حالوں سے

میرے ضمیر نے قابیل کو نہیں بخشا — میں کیسے صلح کروں قتل کرنے والوں سے

وہ سادہ دل ہیں کہ تشنہ دہن جو رکھتے ہیں — امید آب لگا زہر کے پیالوں سے

میں بے بساط سا شاعر ہوں پر کرم تیرا — کہ باشرف ہوں قبا و کلاہ والوں سے

نہ کر خدا کے لئے التفات رہنے دے — مری حیات میں کچھ حادثات رہنے دے

فریب دینا رقیبوں کو زیب دیتا ہے — رفیق بن کے نہ کر مجھ سے گھات رہنے دے

عجب نہیں کہ یہ کھنڈرات منہ سے بول اٹھیں — نہ چھیڑ گزرے ہوئے واقعات رہنے دے

مری حیات کی رنگینیوں کو تو لے جا! — اور اپنے رنج و الم میرے ساتھ رہنے دے

ابھی وجود و عدم کا شعور پیدا کر — ہنوز مرحلۂ جسم و ذات رہنے دے

تری حیات کا کھل جائے گا بھرم شاہد
نہ کہہ کسی سے کبھی دل کی بات رہنے دے

چکبست کی شاعری

مس بدرِ جہاں علی گڑھ

پنڈت برج نرائن چکبست ۱۹ر جنوری ۱۸۸۲ء کو محلہ راٹھ حویلی فیض آباد میں پیدا ہوئے چکبست کے آباء و اجداد نے پندرھویں صدی میں اپنے وطن کشمیر کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ چکبست کی عمر صرف پانچ برس تھی کہ والد کا انتقال ہو گیا مجبوراً ان کی والدہ اپنے بھائی پنڈت لالتا پرشاد کے یہاں قیام پذیر ہوئیں۔ جو لکھنؤ میں ملازمت کرتے تھے۔ اور کشمیری محلہ میں جن کا قیام تھا۔ چکبست کی ابتدائی تعلیم اردو فارسی سے ہوئی۔ ۱۸۹۵ء میں کا[illegible] اسکول میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۷ء میں مڈل پاس کیا۔ اس کے بعد گورنمنٹ جوبلی کالجیٹ سے ۱۹۰۰ء میں ہائی اسکول کیا۔ کیننگ کالج سے ۱۹۰۲ء میں ایف اے اور ۱۹۰۵ء میں بی اے اور ۱۹۰۷ء میں ایل ایل بی کیا۔ شہنشاہ حسین رضوی ایڈوکیٹ کے ساتھ ٹریننگ لینا شروع کی۔ اور انھیں کے ساتھ وکالت کرنی شروع کر دی۔

چکبست کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا جو کبھی قوم کے نوحہ کی شکل۔ کبھی احباب کے مرثیہ کی شکل میں۔ کبھی غزل اور نظم کی صورت میں رفتہ رفتہ چلا آتا گیا۔ چکبست نے بہت ہی سنجیدہ و متین طبیعت پائی تھی لیکن ذرا ان کی شوخ مزاجی کی بھی ایک جھلک دیکھئے۔ اپنے ہم پیشہ وکیلوں کی حالت زار کیسے نکر بیان کرتے ہیں۔

مرتے دم جب ملک الموت مقابل آیا
دل ناشاد یہ سمجھا کہ مؤکل آیا

وکیل صاحب کے دفتر کا بھی تو نقشہ ملاحظہ ہو:-

کرسی سے عیاں لرزش یک پائی ہے
میز ایسی ہے گویا کہ پڑی پائی ہے
قانون کا غم ہے نہ مؤکل کا گزر
آفس بھی عجب گوشۂ تنہائی ہے

۱۲ر فروری ۱۹۲۶ء کو ایک مقدمہ کی پیروی کے سلسلہ میں رائے بریلی گئے۔ مقدمہ کی بحث کی۔ واپس لکھنؤ آتے ہوئے ٹرین میں ہی فالج کا حملہ ہوا۔ جو دوست ساتھ تھے۔ انھوں نے اسٹیشن پہ ہی اتار لیا۔ ڈاکٹر آئے مگر

دل کی نبضیں چھوٹ گئیں اور چارہ گر دیکھا کئے۔

سات بجے شام کو رائے بریلی اسٹیشن پر ہی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ بڑے بھائی کو اطلاع کی گئی۔ تب رات کو گیارہ بجے موٹر سے ان کی لاش لکھنؤ لائی گئی۔ شہر میں کہرام مچ گیا۔ کچہریاں بند ہو گئیں۔ لوگوں نے قطعات کہے۔ وفات کی تاریخیں نکالیں۔ محشر لکھنوی نے انھیں کے مصرعہ سے تاریخ وفات نکالی ہے۔

کیسی بے وقت اجل آ گئی محشر افسوس
روح رخصت ہوئی ایک لفظ کہا اور نہ سنا
ان کے ہی مصرعہ سے تاریخ ہے ہمراہِ عزا
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

تلوک چند محروم یوں مرثیہ کناں ہوتے ہیں۔

خموش اگرچہ ہوا وہ فدائے حب وطن
ہوا میں گونجتے ہیں نالہائے حب وطن
نہ کیوں مناظرِ حسرت دکھائے حب وطن
کہ ماتمی ہے سوادِ فضائے حب وطن
وطن کو تیری ضرورت تھی آہ اے چکبست
چلا ہے ملک عدم کی تو راہ اے چکبست

سخنوری کا تری سب سے ہے جدا آئین
سخن کو رنگِ حقیقت سے کر دیا رنگین
اگرہیں شعر فصاحت میں تری لعبت چیں
تو شانِ تیغ میں کوہ گراں سے ہیں سنگیں
جو فیض ازل اس کی قدر کی تو نے
سنوار لیا تجھ سے نظم اردو نے

قادرِ کرنا حرکیکیں یہی ایمان رہا
یہی مسلک، یہی مذہب، یہی ایمان رہا

آبرو کیا ہے، تماشائے وفا میں مرتا
ہم کو دین کیا ہے، کسی کامل کی پرستش کرتا

شاعر کو اپنے وطن کی ہر ہر شے سے پیار ہے۔ ان کا ذکر کرنے کے بعد وہ ماضی کا قصہ دل نشیں چھیڑ دیتا ہے۔

اس خاکِ دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری
چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری
چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری
شمعِ ادب نہ تھی جب یونان کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیٔ کہن میں

شاعر گوتم، سرمد، اکبر، داتا ان سب کے کارنامے بیان کرتا ہے لیکن شاعر ایک بات سے بڑا غمگین ہو جاتا ہے کہ اپنے وطن میں سب کچھ ماضی جیسا ہے۔ مگر ایک اہم شے کا فقدان ہو گیا ہے۔ اور وہ ہے حبِ وطن۔

ویسی ہی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں
کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کے بادلوں میں
پستی سی آ گئی ہے پر دل کے حوصلوں میں
گل شمعِ انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حبِ وطن نہیں ہے خاکِ وطن وہی ہے

حبِ وطن کی عدم موجودگی کے باعث ہر شعبۂ زندگی زوال آمادہ ہے۔

ع علم و کمالِ ایماں برباد ہو رہے ہیں

لیکن اہلِ وطن کی لاپرواہی اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ اس حالت کو بدلنے کے لئے قطعاً کوشاں نہیں بالکل غافل ہے۔

ع عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اس لئے شاعر صورِ حبِ قومی سے لوگوں کو جگانا چاہتا ہے۔

اے صورِ حبِ قومی اس خواب سے جگا دے
بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے

مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے
اٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ میں دکھا دے
حبِ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

آخری بند شاعر کی آرزو اپنے درجۂ کمال کو پہونچ جاتی ہے۔

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا
آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشکِ مہر ذرہ اس منزلِ کہن کا
تلتا ہے برگِ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا
گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کا
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کا

پھول مالا کے عنوان سے جو نظم آپ نے لکھی ہے اس کے بارے میں جگر بریلوی یوں رقمطراز ہیں۔

یہ نظم اس قابل ہے کہ ہر ہندوستانی گھر میں تعویذ بنا کر رکھی جائے۔ اور اس کا مطالعہ ہر بچے پر فرض قرار دے دیا جائے۔

چکبست عورتوں کی تعلیم کے دل سے خواہاں تھے۔ اکتوبر ۱۹۱۱ء میں چکبست نے ایک رسالہ صبحِ امید کے نام سے نکالنا شروع کیا تھا۔ صبحِ امید کے اداریوں میں عورتوں کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان کالج کے ایوان سے مل (MILL) کے فلسفہ کی ہوا میں اڑتے ہوئے نکلتے ہیں۔ اور بعض ہربرٹ اسپنسر کا دامن پکڑ آتے ہیں یہ آزادی و اصلاح کے فرشتے جلسوں اور کانفرنسوں میں معصوم اور بیکس عورتوں کی تصویر الفاظ کی رنگ آمیزی سے اس طرح کھینچتے ہیں کہ دیکھنے والے اور سننے والے مسکرا مسکرا کر تالیاں بجانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مگر روزمرہ کا تجربہ بتلاتا ہے کہ ان حامیانِ آزادی کی زبان سے کتنا ہی امرت کیوں نہ ٹپکے مگر ان کے دلوں میں بدگمانی کے زہر میں بجھے ہوئے تیر و نشتر پوشیدہ ہیں۔ انہیں عورتوں کی ذات میں اعتبار نہیں۔ فارسی شاعر کے مقولہ میں ان کا عقیدہ باقی ہے کہ:

اسپ، زن و شمشیر، وفادار کہ دید

اور وہ ابھی تک عورت کو نسلِ انسانی جزو ادنیٰ سمجھتے ہیں۔

عورتوں کو نمائش کا کھلونا بنا کر پردے سے باہر نکالنا رواج میں داخل ہو گیا ہے۔ لیکن وہ درد مند اور الفاظ دل ابھی پیدا نہیں ہوئے جن میں عورت کی پاک اور روحانی ذات کی سچی وقعت گھر کر سکے۔ ان کی آنکھوں پر خود غرضی اور تعصب کی نقاب پڑی ہوئی ہے۔ جن کو ان معصوم فرشتوں کی پیشانی کے آئینہ میں دنیا کی نیکی اور حسن کا عکس نظر آنا چاہئے۔

اسی طرح لڑکیوں سے یوں مخاطب ہوتے ہیں۔

روشِ خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز
داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز
نقل یورپ کی مناسب ہے مگر یاد رہے
خاک میں غیرتِ قومی نہ ملانا ہرگز
رخ سے پردہ کو اٹھایا تو بہت خوب کیا
پردۂ شرم کو دل سے نہ اٹھانا ہرگز

آگے جب چل کر ان کا مقصد حیات یا ماں کے فرائض کی یاد دہانی کراتے ہیں۔

اپنے بچوں کی خبر قوم کے مردوں کو نہیں
یہ ہیں معصوم انہیں بھول نہ جانا ہرگز
پرورش قوم کی دامن میں تمہارے ہوگی
یاد اس فرض کی دل سے نہ بھلانا ہرگز
ان کی تعلیم کا مکتب ہے تمہارا زانو
پاس مردوں کے نہیں ان کا ٹھکانا ہرگز
ہم تمہیں بھول گئے اس کی سزا پاتے ہیں
تم ذرا اپنے تئیں بھول نہ جانا ہرگز

٭ بیوۂ اصلاح ٭ ان کی ایک مشہور نظم ہے جو ایک کشمیری بیوہ کی شادی کے موقع پر لکھی گئی تھی کس جوش کے ساتھ نظم شروع ہوتی ہے۔

مرحبا جرأتِ اصلاح دکھانے والو
قوم کے بارِ امانت کے اٹھانے والو
دل کی اجڑی ہوئی نگری کے بسانے والو
مادرِ ہند کی بگڑی کے بنانے والو

کیسے طوفان میں دیا ہے یہ سہارا تم نے
خوب ڈوبی ہوئی کشتی کو ابھارا تم نے

٭ سہاگ کے بعد بیوگی خزاں بہار کے بعد خزاں نہیں تو کیا ہے خزاں کے بعد جب دوبارہ بہار آجائے پھول کھل اٹھیں تو کیا منظر ہوتا ہے شاعر کتنی خوبصورت تشبیہوں کے پردہ میں ا[پنا] مدعا بیان کر رہا ہے۔

کل جسے عین لطافت میں خزاں نے لوٹا
آج اس باغ کا شاداب ہے بوٹا بوٹا
بیڑیاں کٹ کے گریں قفل اسیری ٹوٹا
چاند معصوم کی قسمت کا گہن سے چھوٹا
تم بھی خود شاد ہوئے قوم کو بھی شاد کیا
دل کے ویران شوالے کو پھر آباد کیا

بیوہ کی شادی کی ہمت افزائی کن خوبصورت الفاظ میں بیا[ن] کرتے ہیں۔

آج اس ملک میں بیوہ بیاہی جاتی ہے
خاک میں رسمِ دیرینہ ملی جاتی ہے
رحم کا راج ہے سنگ دلی جاتی ہے
یاں کلی دل کی محبت سے کھلی جاتی ہے
مرد قوموں کو سبق یوں ہی سکھا دیتے ہیں
دل میں جو ٹھانتے ہیں کر کے دکھا دیتے ہیں
آنکھ پیرانِ طریقت یہ تماشہ دیکھیں
بانئ شرع کا اٹھتا ہوا پردہ دیکھیں
جوشِ اصلاح کا بہتا ہوا دریا دیکھیں
پار ہوتے ہوئے مظلوم کا بیڑا دیکھیں
دیکھ لیں دھرم کی اس قوم میں خو باقی ہے
ان رگوں میں ابھی رشیوں کا لہو باقی ہے

٭ لاڈلے کے عنوان سے جو نظم چکبست نے لکھی ہے۔ وہ علاو[ہ] لطافت و پاکیزگی کی ایک عمدہ مثال ہے۔

تو وہ مخلوق ہے بے خلقت میں نہیں جن کی گناہ
[دل] ہے قالب میں ترے روح محبت میں پناہ
تیرہ صورت سے عیاں ہوتی ہے انسان کی چاہ
[illegible]

نقش ہے دل پہ مرے یونہی صورت تیری
خوب دنیا کے شوالے میں ہے صورت تیری

اگلے بند میں شام کا کیا دلکش نقشہ کھینچا ہے۔

دیکھئے جنگل میں کوئی شام کو تیری رفتار
بے پیئے جیسے کسی کو ہو ہوا ان کا خمار
مست کر دیتی ہے شاید تجھے قدرت کی بہار
وہ اترتی ہوئی دھوپ اور وہ سبزہ کا نکھار
ایک ایک گام پہ شوخی سے مچلنا تیرا
کھا کے جنگل کی ہوا جھوم کے چلنا تیرا

لہلہاتی ہوئی کھیتی کو گائے کے بچوں کے لہو اور پسینہ کی بہار کہنا کیا شاعرانہ تخیل ہے۔

تیرے بچوں نے کیا اپنے تئیں ہم پہ نثار
اپنی گردن پہ لیا پرورش قوم کا بار
نظر آتی ہے جو ہر فصل میں کھیتی تیار
ہے یہ سب اُن کے لہو اور پسینہ کی بہار
ان کو منظور نہ ہوتا جو مٹانا اپنا
ہند کی خاک اگلتی نہ خزانہ اپنا

ان کی مشہور نظم ہے اور منظر نگاری کا لاجواب نمونہ ہے۔

سنا جو کرتے تھے وہ باغ پر فضا ہے یہی
اگر بہار ہیں جنت تو راستہ ہے یہی
لباس پہنے ہیں گل سنگ و خشت سبزہ کا
بجائے خاک اڑاتا ہے رنگ سبزہ کا
کمی کبھی نہیں شادابیوں کے ساماں میں
ٹھہر گئی ہے بہار اس گلستاں میں
طلسم حسن کا بیچ میں یہ گلدستہ
کھڑے ہیں کوہ و شجر پہلوؤں میں صف بستہ
یہاں جو آ کے مسافر مقام کرتے ہیں
یہ سنتری انھیں پہلے سلام کرتے ہیں
نگاہ کو دور سے بھاتی ہے جو نظر آتا
سپید ناگ چلا جا رہا ہے بل کھاتا

"راماین کا ایک سین" ایک بہت ہی خوبصورت نظم ہے۔ محمد حسین ادیب لکھتے ہیں۔

"چکبست کا سب سے روشن اور قابل یادگار کارنامہ راماین کا ایک سین ہے زبان کی صفائی، بیان کی رنگینی تشبیہ و استعارے کی لطافت و شیرینی درد و غم کے جذبات کی فراوانی کے لحاظ سے یہ نظم میر انیس کے بہترین مرثیوں سے ٹکراتی ہے۔ یہاں شاعر نے ہیرو بھی ایک عظیم الشان ہستی کو منتخب کیا ہے۔ جس کے ساتھ کروڑوں بندگان خدا کی مذہبی عقیدت و ارادت وابستہ ہے۔ یہ پوری مسدس حد درجہ پُر درد و موثر ہے مذہبی لگاوٹ کی وجہ سے ادب و اخلاق پر بھی اس کا زبردست اثر پڑتا ہے۔ فرزند کی اطاعت گزاری و فرمانبرداری، ماں کی دردمندی و بیقراری کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ جذبات نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے اگرچہ واقعہ انفرادی و مقامی ہے مگر شاعر نے اسے عمومی رنگ میں پیش کیا ہے۔ جس سے ہر مصیبت زدہ شخص تسکین و تسلی حاصل کر سکتا ہے۔ کاش چکبست رامائن کی پوری داستان کو تفصیل سے نہیں تو اختصار کے ساتھ نظم اردو کے قالب میں ڈھال دیتے تو ان کا یہ ایک غیر فانی کارنامہ ہوتا۔ تلسی داس کی طرح ان کے سر پر بھی شہرت و مقبولیت کا زرنگار تاج ہمیشہ جگمگاتا رہتا ہے۔

اس نظم کے بارے میں جگر بریلوی یوں رقمطراز ہیں۔

رامائن کے اکثر واقعات چکبست سے پیشتر بھی شاعروں نے نظم کئے ہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ جس خوبی سے چکبست نے یہ سین نظم کیا ہے۔

اس میں تصنیف کی شان پیدا ہونے کے علاوہ آپ کی شاعری کے تمام جوہر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہے ہیں۔ سوز و گداز کا وہ عالم ہے کہ ہر مصرعہ پر ایک ہوک سی اٹھتی ہے

اول تو جذبات نگاری یوں ہی بنہایت دشوار امر ہے۔ پھر یہ موقع تو ایسے لطیف جذبات سے مالا مال ہے۔ جن کا قلم کرنا تو در کنار سمجھنا بھی آسان نہیں۔ یہی اکیلی نظم مصنف کے کمال شہادت کی دلیل کافی ہے۔

جب رام اپنے والد سے اجازت حاصل کر کے ماں کی زیارت کے لئے گھر میں آتے ہیں تو اس وقت ماں کی کیا کیفیت ہے۔

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال
خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال
سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے صورت ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں تصویر سنگ ہے

سکتہ سا اس لفظ "سا" نے مغموم کی پوری تصویر ایک جنبش قلم کھینچ کر رکھ دی ہے۔ بیت میں تصویر جنگ سکتہ کا ایک بت پیش کر رہا ہے۔ اگلے بند میں ماں کے جذبات کی یوں تصویر کشی کرتے ہیں۔

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ
نور نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ
لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ
چہرہ کا رنگ حالت دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

ڈاکٹر افضال احمد لکھتے ہیں۔
چکبست عورت کے صحیح جذبات جس طرح پیش کرتے ہیں۔ اس کو پڑھ کر میر انیس کا کلام یاد آجاتا ہے۔ عورت کی نفسیاتی کمزوری ہوتی ہے۔ وہ انتہائے غم کی حالت میں طنز و تعریض سے کام لیتی ہے۔ رام کی ماں کوشلیا بھی بھرت کی ماں کیکئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یوں گویا ہوتی ہے۔

دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سفید
اندھا کئے ہوئے ہے زر و مال کی امید
انجام کیا ہو کوئی نہیں جانتا یہ بھید
سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثال بید
لکھی ہے کیا حیات ابد ان کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کے واسطے

رام چندر جی ماں کو سمجھاتے ہیں

اسباب ظاہری میں نہ ان پر کرو نظر
کیا جانے کیا ہے پردۂ قدرت میں جلوہ گر
خاص اس کی مصلحت کوئی پہچانتا نہیں
منظور کیا اسے ہے کوئی جانتا نہیں

لیکن رام کے سمجھانے کا ماں پر کیا اثر ہوتا ہے ملاحظہ فرمائیے

یہ گفتگو ذرا نہ ہوئی ماں پہ کارگر
ہنس کر بطور یاس سے لڑکے پہ کی نظر
چہرہ پہ یوں ہنسی کا نمایاں ہوا اثر
جس طرح چاندنی کا ہو شمشان میں گزر
پنہاں جو بے کسی تھی وہ چہرہ پہ چھا گئی
جو دل کی مردنی تھی نگاہوں میں آگئی

پھر یہ کہا کہ میں نے سنی سب یہ داستاں
لاکھوں برس کی عمر ہو دیتے ہوئے ماں کو گیاں
لیکن جو میرے دل کو ہے در پیش امتحاں
سیکھے ہو اس کا علم نہیں تم کو بے گماں
اس درد کا شریک تمہارا جگر نہیں
کچھ مامتا کی آنچ کی تم کو خبر نہیں

آخر رام وہ زوردار دلیل پیش کرتے ہیں۔

کہتے ہیں جس کو دھرم وہ دنیا کا ہے چراغ
ہٹ جاؤں اس روش سے تو کل میں لگے گا داغ
بے آبرو یہ بنس نہ ہو یہ ہراس ہے
جس گود میں پلا ہوں مجھے اس کا پاس ہے

یہ دلیل وزنی تھی ماں پہ کارگر ہو گئی مگر کتنے درد بھرے لفظوں میں اجازت دے رہی ہے کیا حسرت و یاس سے کیسی بے بسی ہے، کیا لطیف ناراضگی کا پہلو بھی موجود ہے۔

ان آنسوؤں کی قدر نہیں کچھ ابھی نہیں
باتوں سے جو بجھے ۔۔ دل آگ لگی نہیں
لیکن تمہیں ہو رنج یہ میری خوشی نہیں
جاؤ سدا رہو خوش رہو میں دکھی نہیں

دنیا میں بے حیائی سے زندہ رہوں گی میں
پالا ہے میں نے تم کو تو دکھ بھی سہوں گی میں

بقول ڈاکٹر افضال ا

ان کے کلام کا دردو اثر، الفاظ کی رنگینی اور اشعار میں جوش خروش ان کو اردو ادب میں ایک خاص مقام پر لا کھڑا کر دیتے ہیں ان کے زمانہ کی حالت کا اگر مکمل اور واضح طور پر جائزہ لیا ہو تو ان کی شاعری اس کا آئینہ ہوگی ۔ اس لئے چکبست اپنے دور کے صف اول کے شعراء میں بھی ممتاز نظر آتے ہیں ۔

لالہ سری رام مصنف "خمخانۂ جاوید" کو چکبست ایک خط میں لکھتے ہیں ۔

"میرا عقیدہ یہ ہے کہ محض نئے خیالات کو توڑ موڑ کر نظم کر دینا ہی شاعری نہیں ہے ۔ میری دانست میں خیالات کی تازگی کے ساتھ زبان و بیان میں شاعرانہ لطافت اور الفاظ میں تاثیر کا جوہر ہونا ضروری ہے"

چکبست کے کلام کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ شاعری کے متعلق چکبست کا جو خیال ہے ان کی شاعری اس خیال کا آئینہ ہے ۔

سید محمد حسین ادیب لکھتے ہیں ۔

چکبست نے اپنی شاعری کے دامن کو پست خیالات مبتذل مضامین، محاورہ بندی، عام بول چال کی زبان سے ملوث نہیں کیا ان کی زبان پر لکھنؤ کی ٹکسال کی مہر ہے کلام میں شعریت　　　لطافت، پاکیزگی صحت صفائی اور روانی کے جوہر موجود ہیں تشبیہات و استعارات کی شگفتگی اور دلآویزی مسلم ہے خیالات نئے ضرور ہیں لیکن انداز بیان میں قدیم شاعری کی رنگینی و لطافت ملحوظ رکھی گئی ہے الغرض چکبست نے جدید شراب کو قدیم ابریق میں پیش کیا ہے اردو شاعری میں چکبست کس مقام کے مالک ہیں ۔

بقول سید محمد حسین ادیب

اگر چکبست کے اس حصہ شاعری سے قطع نظر کر لیا جائے جس میں انہوں نے قدیم مشائخ رذس کی پیروی کی ہے تو ان کا بقیہ کلام میتھو آرنلڈ کے معیار پر پورا اترتا ہے اگرچہ چکبست کو میر و مرزا آتش و ناسخ غالب و مومن جیسے باکمالوں کے پہلو میں جگہ نہیں مل سکتی تاہم جدید شاعروں کے زمرہ میں جہاں آج تک بجز اقبال کے اور کوئی شاعر قدیم اساتذہ سخن کا ہم پلہ پیدا نہیں ہو سکا ۔ چکبست ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں ۔ شاعری کے آفتاب و ماہتاب نہ سہی لیکن ایک درخشاں ستارے ضرور ہیں ۔

بقیہ : اپنے دل گیر پیاروں سے شرمندہ ہوں

کیا خبر تھی کہ اے شہرک زادگاں
کل بھی غاصب کے ہم تخت بردار تھے
ایک آمر کی دستار کے واسطے
جیسے بربط لوری راگ میں گو رہے
جیسے صفاک گورے ستے ویتنام میں
ہم نے دیکھے ہیں جمہور کے قافلے
سیڑھیوں پر بھی بیڑیاں خون کی
کل تمہارے لیے پیار سینوں میں تھا

ہم علامت ہنر کے شب تار کی
آج بھی پاس داری ہے دربار کی
سب کی شہ رگ پہ ہے نوک تلوار کی
دشتوں کے چاہنے عام ان کے بھی تھے
حق پرستوں پہ الزام ان کے بھی تھے
ان کے ہاتھوں میں پرچم بغاوت کے تھے؟
کہہ رہی ہیں کہ منظر قیامت کے ہیں
اب جو خط اٹھے ہیں وہ نفرت کے ہیں

اپنے دل گیر پیاروں سے شرمندہ ہوں

احمد فراز

میں نے اب تک تمہارے قصیدے لکھے　　اور آج اپنے نغموں سے شرمندہ ہوں
اپنے شعروں کی حرمت سے ہوں منفعل　　اپنے فن کے تقاضوں سے شرمندہ ہوں
اپنے دل گیر پیاروں سے شرمندہ ہوں

جب کبھی مری غم زدہ خاک پر　　سایۂ غیر یا دستِ دشمن پڑا
جب کبھی قاتل مقابل صف آرا ہوئے　　سرحدوں پر مری جب کبھی رن پڑا
میرا خونِ جگر تھا کہ حرفِ ہنر　　نذر میں نے کیا مجھ سے جو بن پڑا
آنسوؤں سے تمہیں الوداعیں کہیں　　رزم گاہوں نے جب بھی پکارا تمہیں
تم ظفر مند تو خیر کیا لوٹتے　　ہار نے بھی نہ جی سے اتارا تمہیں
تم نے جاں کے عوض آبرو بیچ دی　　ہم نے پھر بھی کیا ہے گوارا تمہیں
سینہ چاکانِ مشرق بھی اپنے ہی تھے　　جن کا خوں منہ پہ ملنے کو تم آئے تھے
مامتاؤں کی تقدیس کو لوٹنے　　یا بغاوت کچلنے کو تم آئے تھے
اس کا انجام جو کچھ بھی ہوا سو ہوا　　شب گئی خواب ہائے پریشاں گئے
کس جلال و رعونت سے وارد ہوئے　　کس خجالت سے تم سوئے زنداں گئے
تیغ در دست و کف در دہاں آئے تھے　　طوق در گردن و پا بہ جولاں گئے
پھر بھی میں نے تمہیں بے خطا ہی کہا　　خلقتِ شہر کی دل دہی کے لئے
گو مرے شعر زخموں کے مرہم نہ تھے　　پھر بھی اک سعیِ چارہ گری کے لئے
اپنی بے آسرا خاک کے واسطے　　اپنے بے آس لوگوں کے جی کے لئے
یاد ہوں گے تمہیں پھر وہ ایام بھی　　تم اسیری سے جب لوٹ کر آئے تھے
ہم دریدہ جگر راستوں میں کھڑے　　اپنے دل اپنی آنکھوں میں بھر لائے تھے
اپنی تحقیر کی تلخیاں بھول کر　　تم پہ توقیر کے پھول برسائے تھے
میں نے اب تک تمہارے قصیدے لکھے　　اور آج اپنے نغموں سے شرمندہ ہوں
اپنے شعروں کی حرمت سے ہوں منفعل　　اپنے فن کے تقاضوں سے شرمندہ ہوں
اپنے دل گیر پیاروں سے شرمندہ ہوں

جن کے جبڑوں کو اپنوں کا خوں لگ گیا　　ظلم کی سب حدیں پھاندنے آ گئے ہیں
مرگِ بنگال کے بعد بولان میں　　شہریوں کے گلے کاٹنے آ گئے ہیں
آج سرحد سے پنجاب و مہران تک　　تم نے مقتل سجائے ہیں کیوں غازیو
اتنی غارت گری کس کے ایما پہ ہے　　کس کے آگے ہو تم سرنگوں غازیو

Phone: 275602 Regd-No D- (ON) 353
THE SHAN E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 JLUY 1985
Regd with the Registrar of Newspaper at R No 644 57

خرید کر پڑھئے :

مانگ کر پڑھئے

یا پھر

چوری کر کے پڑھئے

شبستان

فیض نمبر

15/-

Dr. Zakir Husain Library Jamia Nagar

یہ ہے ہی اتنا خوب صورت،

اتنا دل کش،

اتنا مکمل کہ اسے کسی طرح بھی

حاصل کریں کیوں کہ

یہ فیض کی شخصیت اور فن پر ایک

شاندار ادبی دستاویز ہے۔ اِس میں شامل ہیں :

قیمت : پندرہ روپے

★ خلوت اور جلوت کے [illegible] کھولنے والے ذاتی نقوش۔

★ نادر و نایاب تصویریں۔

★ سدابہار، ہزار رنگ و منتخب کلام۔

★ فیض کی شخصیت کے وہ ڈھکے چھپے گوشے جن پر سے پہلی بار پردہ اُٹھایا گیا ہے۔

★ ہندوستان، پاکستان، رُوس اور انگلستان کے دانش وروں کی مشترکہ کاوشوں کا گلدستہ۔

ساری اُردو دنیا میں شبستان کے "فیض نمبر" کا چرچا ہے

اس سے پہلے کہ اسٹاک ختم ہو جائے آج ہی اپنے قریبی نیوز ایجنٹ سے طلب کیجئے یا براہِ راست ہم سے منگوائیے۔

شبستان اردو ڈائجسٹ، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شانِ ہند
دہلی
سرور تونسوی

غلط قسم کے
لوگوں کے
ہتھے
نہ چڑھیئے...
ریل ٹکٹیں
دلالوں سے ہوشیار!
پبلک ریلیشنز،
ناردرن ریلوے

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ | رجسٹرار آف نیوز پیپرز انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۲۲۴۳/۵۷ | رجسٹرڈ نمبر ڈی (ڈی این) ۱۸۸

ہندو پرست ہوں نہ مسلمان پرست ہوں
من پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ہر ذرہ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
فیاض گوالیاری

ماہنامہ

شان ہند نئی دہلی

جشنِ جمہوریت ایڈیشن

ایڈیٹر
سرور تونسوی

فی پرچہ: تین روپے
زر سالانہ: ۲۴/- روپے

جلد نمبر ۳۶ | اگست ۱۹۸۵ء | شمارہ نمبر ۸

جان قربان کرینگے وطن کیلئے

دل میں ہیں ولولے عزم بھی ہے جواں، اور ہمت بھی ہے ہمسفر دوستو
لاکھ خطرات ہوں شوق کی راہ میں ہم گزر جائیں گے بے خطر دوستو
جان قرباں کریں گے وطن کے لئے، ہم ہیں عاشق وطن کے فدائی ہیں
ہم کو پروا نہیں کچھ بھی انجام کی، ہم ہیں انجام سے بے خبر دوستو
آنے دیں گے نہ لغزش کبھی عزم میں، سوئے منزل بڑھیں گے بعد شوق ہم
ہم نہ گھبرائیں گے آفتوں سے کبھی، ہے یہی اپنا عزمِ سفر دوستو
آشیانے کی بنیاد مضبوط ہے، اس کو نقصان پہنچے یہ ممکن نہیں
آئیں طوفان گو سینکڑوں سخت تر، لاکھ منڈلائیں برق و شرر دوستو
کام ہیں سب ادھورے وطن کے ابھی، جوشِ عزم و عمل کے سہارے بڑھو
شک نہیں اس میں یہ امتحاں ہے کڑا، آزمائش ہے یہ سخت تر دوستو
امتیازات کافور ہو جائیں گے، ہم نہ نفرت کریں گے کسی سے کبھی
یہ یقیں بلکہ عین الیقیں ہے ہمیں، ہند ہوگا محبت کا گھر دوستو
یہ صداقت کے سچے پرستار ہیں، ان کے دل میں ہے اخلاص و وفا کا لہو
ہیں محبت کی تصویر اہلِ وطن، پیکرِ صدق ہیں سر بسر دوستو
ہم نہ چھوڑیں گے راہِ وفا کو کبھی، ہم نہ گمراہ ہوں گے کسی طور سے
ہم ہیں منفیِ زمانہ سے بھی آشنا، ہم ہیں حالات سے باخبر دوستو
پھر سے روشن کریں گے چراغِ وفا، ہر طرف نور راحت کا پھیلائیں گے
گلشنِ ہند میں لہلہائیں گے پھر مہر و الفت کے گلہائے تر دوستو

روشن پٹیالوی

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے ۳۸ سال

۱۵ اگست ہمیں یاد دلاتا ہے

کہ

ہم ایک ایسے آزاد مُلک کے باشندے ہیں جو دُنیا بھر میں اپنی
کچھ روایات کے لئے مشہور ہے۔

آئیے آج ۱۵ اگست ۱۹۸۵ء کو ہم پھر اس عہد کو دہرائیں کہ
ہم اپنے مُلک کی آزادی کو برقرار رکھیں گے اور کسی طور بھی مُلک کا
سر نیچا نہیں ہونے دیں گے

اور اپنے محبوب وزیر اعظم جناب راجیو گاندھی کے ہر ترقی پسند پروگرام کو کامیاب
بنانے میں ہی اپنی مُلک کی بہتری سمجھتے ہیں۔

ہندوستان زندہ باد اور ہماری آزادی پائندہ باد

نارنگ انٹرپرائیز

ایل۔ ۳ ۔ کناٹ سرکس۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

بُلبُل چہ گُفت؟ گُل چہ شُنید؟ و صبا چہ کرد؟

دِلی اُردو اکاڈمی

چوروں کا مال لاٹھیوں کے گز پر عمل پیرا

دلی کی آبادی ساٹھ لاکھ ہے جس میں خدا کے فضل سے اُردو کے شاعروں کی تعداد چھ سو سے زائد ہے اسی طرح کُل
ستان میں ایک اندازے کے مطابق اُردو شعرا کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے اور مُلک بھر سے ہر روز راجدھانی میں
کھ افراد آتے ہیں جن میں قریباً پچاس ساٹھ اُردو کے شاعر ہوتے ہیں۔

حال ہی میں دلی اُردو اکاڈمی نے دو مہمان شعرا جناب پورن سنگھ ہُنر (امرتسر) اور جناب مُضطرب نظامی (لکھنؤ
از میں غالب اکیڈمی میں ایک تقریب منعقد کی۔ جس میں ان مہمان شعرا کے بارے میں تقریریں کی گئیں۔ ان شاعروں سے
ام سنا گیا اور گانے والوں نے بھی ان ہی شعرا کا کلام پیش کیا۔ ظاہر ہے کہ اس تقریب پر دلی اُردو اکاڈمی کا کچھ
ہزار روپیہ صرف ہوا ہوگا۔ اور یہ دونوں شعراء بہ حیثیت مہمانِ خصوصی مدعو کئے گئے۔

جناب ہُنر امرتسری اور مُضطرب نظامی کے ہم پایہ شعرائے کرام کی تعداد مُلک بھر میں ہزارہا ہوگی۔ کیا اُن کا یہ مطالبہ
ب نہیں کہ جب وہ دہلی آئیں تو ان کے اعزاز میں بھی اُردو اکاڈمی ایسی ہی اعزازی تقاریب کا اہتمام کرے۔
وہ کون سی وجوہات تھیں کہ جن سے اُردو اکاڈمی نے یہ باور کر لیا کہ اگر ان مہمان شعرا کی عزت افزائی نہیں کی
ل تو اُردو کی نیا جمنا میں ڈوب جائے گی۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ جناب پورن سنگھ ہُنر کے بارے میں ماہنامہ
ہند میں تفصیلی طور پر (اشاعت دسمبر ۱۹۶۷ء میں)
پورن سنگھ ہُنر کی کہانی خطوط کی زبانی" عنوان سے ڈاکٹر منوہر سہائے انور کا چھ صفحات پر مشتمل ایک مضمون شائع کیا گیا۔ کچھ
اقتباس آپ بھی پڑھیئے۔ یہ خطوط ہُنر صاحب نے ڈاکٹر انور کے نام لکھے۔

۲۱ فروری ۱۹۵۹ء
جالندھر ریڈیو میں ۲۶ مارچ کو آل انڈیا مشاعرہ ہو رہا ہے۔ مجھے ایک تو یہ غزل جو بھیج رہا ہوں پڑھنی ہے۔ دوسرے ایک
اور ایک مطلع اس زمین میں چاہیئے ...... میں بے بال ہوں۔ صرف آپ ہی مجھے پرواز بخش رہے ہیں تو اُڑتا ہوں۔
ہُنر صاحب: یہ بھی معلوم نہیں کہ اصل محاورہ بے بال و پر ہے (ایڈیٹر)

جون ۱۹۵۹ء
میں تو حضور آپ ہی کے سہارے اور رحم و کرم پہ زندگی بسر کر رہا ہوں۔ آپ کے بغیر تو میری اپنی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے

مئی ۱۹۵۹ء
میں نے وفا صاحب کو زمانہ طالب علمی میں دو چار غزلیں دکھائی تھیں ...... مولانا تاجور کو میں نے کبھی اپنا
نہیں دکھایا۔ آپ کو تو میں صاف لکھتا ہوں کہ ۱۹۲۱ء سے آپ ہی کو کلام دکھاتا رہا ہوں جو کچھ میں لکھتا ہوں آپ

اسے بہت بلند کر کے مجھے بھیج دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ میرا کلام موزوں بھی نہیں ہوتا۔ پھر بھی آپ اپنا قیمتی وقت صرف کر کے مجھے نوازتے ہیں۔

۳۰ر نومبر ۱۹۶۰ء

• میں ماہ اکتوبر میں سرینگر کے ریڈیو مشاعرہ میں .... شامل ہوا تھا .... میرے بعد صرف ایک ہی شاعر نے کلام پڑھا۔ ۲۱۔ شعرائے کرام شامل تھے۔ علی گڑھ، کانپور، گورکھپور، لکھنؤ، دہلی۔ لیکن آپ کے نیازمند کو وہ داد ملی کہ توقع سے بڑھ کر تھی۔ شری کرشن موہن سے پوچھئے۔ یہ سب آپ کی توجہات بے کراں کا نتیجہ ہے۔ سرینگر کے اخبارات نے صرف میری ہی غزل کی تعریف کی ہے۔

۱۰ر جنوری ۱۹۶۱ء

• مجھے اسکول سے ریٹائر ہوئے ایک سال ہو گیا۔ خیال تھا کہ میں شعر و شاعری کو اپنا مشغلہ بنا کر روٹی کماتا رہوں گا مگر آپ نے میری روٹی بند کر دی۔ اور مجھے اُن ٹیوں سے محروم کر دیا جو کبھی کبھی آپ مجھے سہولت دیا کرتے تھے۔ ایک تازہ غزل بھیج رہا ہوں مہربانی کرم اسے دیکھ کر مجھے ۲۰ر جنوری تک واپس کر دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی کرم نما۔ یہ مجھے ریڈیائی مشاعرہ کے لئے ضروری چاہئے۔ یہ میری عزت کا سوال ہے اور روزی کا بھی۔ میں تو آپ کے قدموں کی بدولت روٹی کما رہا ہوں۔

نمونے کے طور پر بہنر صاحب کے چند خطوط بنام ڈاکٹر منوہر سہائے انور کے اقتباسات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بہنر صاحب کس پایہ کے شاعر ہیں۔ بہنر صاحب نے حضرت جوش ملسیانی پر جھوٹے اور رکیک حملے کئے جن کے جواب میں حضرت جوش ملسیانی کو قلم اٹھانا پڑا اور انھوں نے دلائل اور بہنر صاحب کے خطوط سے یہ ثابت کیا کہ بہنر صاحب نہ صرف جھوٹے ہیں بلکہ شاعر بھی نہیں ہیں۔ انور صاحب، جوش ملسیانی صاحب، نسیم قریشی اور جناب برہم ناتھ دت نے بہنر صاحب کی شاعری کے حدود اربعہ کا جو نقشہ اپنے خطوط میں کھینچا ہے وہ من و عن "شانِ ہند" میں شائع ہوا اور ان خطوط نے وہ شہرت پائی کہ ان تمام خطوط کو ایک پمفلٹ کی شکل میں "قولِ فیصل" نام سے چھاپ کر منداس صاحب امرتسری نے شائع کیا یہ پمفلٹ اب بھی دفتر شانِ ہند میں موجود ہے۔ اور تو اور ایک دیوانی مقدمہ پریم بشیری چوہدری برہم ناتھ دت ناقد بنام بھنڈاری صاحب ایڈیٹر جانثار امرتسر میں فاضل جج نے اپنے فیصلہ میں بہنر صاحب کو جھوٹا گواہ قرار دیا۔ فیصلہ کی مصدقہ نقل کا ترجمہ شانِ ہند میں ۱۹۷۰ء میں شائع کیا گیا۔ پورن سنگھ بہنر اس عمر میں بھی املائی کئی غلطیاں کرتے ہیں۔ ہم چیلنج کرتے ہیں کہ اگر ان سے دس سطر کی عبارت لکھوائی جائے تو اُس میں املا کی غلطیاں یقیناً ہوں گی۔ ایک ایسے شاعر جسے ملک کے ..... قابل ترین شعرا اور مستند اساتذہ جناب منوہر سہائے انور جناب جوش ملسیانی۔ جناب برہم ناتھ دت قاصر نے جاہلِ مطلق قرار دیا ہے اُسے دلی اردو اکاڈمی مہمان شاعر بنا کر اس کے اعزاز میں ایک جلسہ کرتی ہے جو انتہائی افسوسناک ہے۔

دوسرے مہمان شاعر جناب مضطرب نظامی (لکھنؤ) ہیں۔ لکھنؤ میں مضطرب نظامی سے کہیں بہتر اور نامور شاعر موجود ہیں مگر ان بیچاروں کی رسائی دلی اردو اکاڈمی کی بزمِ کمیٹی کے ممبران تک نہیں ہے۔ مضطرب نظامی صاحب کا مجموعہ کلام "حرفِ شیریں" اردو بازار میں ایک ادارہ کے ہاں نظر پڑا تو سرسری طور پر ورق گردانی کرتے ہوئے ان کا حسبِ ذیل شعر نظر پڑا ؎

یوں کاروانِ وقت میں چلنا پڑا مجھے　　بہکے قدم کسی کے سنبھلنا پڑا مجھے

ایڈیٹر شانِ ہند بے شک پنجابی نژاد ہے مگر اسے اتنا ضرور معلوم ہے کہ کاروان کے ساتھ چلا جاتا ہے کاروان میں چلنا شاید لکھنؤ میں بولا جاتا ہوگا۔ یہ تو نقاد ہی بتا سکتے ہیں کہ "کاروانِ وقت" کی ترکیب بھی صحیح ہے یا نہیں۔ اور پھر کاروان کے ساتھ چلتے ہوئے قدم بہکتے نہیں ہاں ٹھوکر لگ سکتی ہے دیکھئے جناب گوہر مراد آبادی نے کس ادا کے ساتھ سنبھلنا پڑا مجھے، کو نگینے کی طرح شعر میں جڑا ہے فرماتے ہیں ؎

یوں بھی برپا ہوئی آگ میں جانا پڑا مجھے ٹھوکر لگی کسی کے سنبھلنا پڑا مجھے

بھٹو صاحب اور مشرف نظامی کو جہان شعرا بنا کر ان کے اعزاز میں اُردو اکاڈمی دہلی کا جلسہ کرنا اور ہزار روپیہ برباد کر دینا یقیناً اُردو کے ساتھ ظلم ہے۔ اگر دہلی انتظامیہ نے دہلی اُردو اکاڈمی کی گرانٹ دس لاکھ سے تیس لاکھ کر دی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ چوروں کا مال اور الٹیوں کے گوں کے مصداق اس رقم کو یوں ضائع کیا جائے۔ ہم دہلی انتظامیہ کے سربراہوں تک یہ استدعا احتجاجی انداز میں پہنچا رہے ہیں کہ دہلی اُردو اکاڈمی کو اس قسم کی فضول خرچیوں سے روکا جائے اور یہ روپیہ جس مقصد کے لئے دیا گیا ہے اسے اُسی کاز کے لئے خرچ کیا جائے۔

جناب ہری دیو جوشی وزیرِ اعلیٰ راجستھان توجہ فرمائیں

راجستھان اُردو اکاڈمی کی بنیاد کسی ایسی ساعت بد میں رکھی گئی تھی کہ اسے ترقی کی راہ پر چلنا نصیب ہی نہیں ہوتا۔ خود اُردو والے ہی کسی بھی ایسے اُردو پرست کی کوششوں کو بارآور نہیں ہونے دیتے جو ہر ممکن طریق سے راجستھان اُردو اکاڈمی کو بہتر انداز میں اُردو کی بقاء حیات کی راہ پر لگانا چاہتا ہو۔

اس اُردو اکاڈمی کو ہمیشہ ایسے ممبرانِ انتظامیہ سے واسطہ رہا جو اُردو کی نسبت اپنی ذات کو اُجاگر کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ خدا خدا کر کے جناب ڈاکٹر محمد علی زیدی کو راجستھان اُردو اکاڈمی کا چیئرمین مقرر کیا گیا تھا مگر ان لوگوں نے انہیں بھی کروٹ بھی چین نہ لینے دیا۔ اور آخر کار یہ اکاڈمی بھی سیاست کی بھینٹ چڑھا دی گئی اور ایک سرکاری افسر کو اس کی دیکھ ریکھ کے لئے مقرر کر دیا گیا جس کا دفتر راجستھان لٹریچر میں ہے اور اکاڈمی اُردو سے نابلد سٹاف کے آغوش میں سسکیاں لے رہی ہے۔

محترم جوشی جی۔ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ ہمارے محبوب وزیرِ اعظم جناب راجیو گاندھی اُردو سے متعلق اداروں کو اُردو کی ترقی کے لئے رواں دواں دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے الیکشن مینی فیسٹو میں اُردو سے متعلق جو وعدے کئے ہیں انہیں وہ ہر حال میں پورا کرنا چاہتے ہیں۔ اور آپ اس سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ راجستھان میں اُردو بولنے اور اُردو پڑھنے والوں کی تعداد اتنی بڑی ہے کہ جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پھر نہ معلوم آپ نے راجستھان کی اُردو اکاڈمی کو کس وجہ سے قعرِ مذلت میں پھینک رکھا ہے۔

محترم جوشی صاحب آپ سے راجستھان کا کوئی بھی راز پوشیدہ نہیں ہے اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس وقت سارے راجستھان میں جناب ڈاکٹر محمد علی زیدی سے بہتر کوئی شخصیت ایسی نہیں ہے جو راجستھان اُردو اکاڈمی کو بہتر انداز میں کامیابی کی راہوں سے ہمکنار کر سکے۔ سیاسی جوڑ توڑ تو ہوتے ہی رہتے ہیں مگر ... اور ... کی دوہری غلامی میں رہا ہے اس لئے راجستھان کے عوام ابھی غلامانہ ذہنیت کو خیرباد نہیں کہہ سکے اس لئے کسی بھی اچھا کام کرنے والے شخص کو پست اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والے لوگ اُبھرنے اور کام کرنے کا موقع نہیں دیتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جناب ڈاکٹر محمد علی زیدی کے بارے میں بھی ایسے خود غرض۔ مطلب پرست اور اُردو دشمن لوگ ردِ عمل دیا ... کا سہارا لیتے رہتے ہیں۔

جو کچھ بھی ہو۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ راجستھان اُردو اکاڈمی بھی ملک کی دوسری اُردو اکاڈمیوں کی طرح اُردو کے لئے بہتر خدمات انجام دے تو آپ کو ڈاکٹر محمد علی زیدی کو اکاڈمی کا چیئرمین مقرر کر دینا چاہئے اور اکاڈمی کی انتظامیہ کمیٹی میں ایسے اُردو پرست اصحاب کو رکھیئے۔ جو واقعی اُردو سے محبت کرتے ہوں۔ اور اکاڈمی کا سکریٹری کوئی اُردو داں غیر مسلم ہو۔

اُمید ہے کہ آپ اُردو اکاڈمی راجستھان کے مستقبل سنوارنے پر فوری توجہ دیں گے۔

فن و شخصیت بمبئی کا ساحر لدھیانوی نمبر پہلی فرصت میں طلب فرمائیے۔
لدھیانوی کا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام بھی اس میں دیا گیا ہے۔ بہت کم تعداد میں رہ گیا ہے۔ قیمت اسی روپے

ہر ہندوستانی کو

دل کی گہرائیوں اور

نیک خواہشات کے ساتھ

ہندوستان کی آزادی کی ۳۸ ویں

سالگرہ کی مبارک باد

اور

دعا ہے کہ ہمارے وزیر اعظم

جناب راجیو گاندھی کو

عمرِ خضر عطا ہو ۔ اور

ہندوستان کو دن دونی رات چوگنی ترقی حاصل ہو

موہن گولڈ واٹر

ڈالی گنج ۔ لکھنؤ (یوپی)

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

۱۹۵۵ء اور اس کے بعد ہندوستان میں معموں کی وبا اس شدت سے پھیلی کہ اکثر شہروں اور قصبوں سے سینکڑوں
معمہ ساز عوام کی جیبوں پر مہذب ڈاکہ ڈالنے میں سرگرم ہوگئے۔ معموں کے باعث عوام بری طرح لٹ رہے تھے مگر راتوں رات
بنے والے کے سنہری سپنوں میں مست اور بے خود عوام اپنے ہاتھوں اور اپنی خوشی سے لٹنے میں راحت محسوس کر رہے تھے اور اکثر معمہ
داد عیش دے رہے تھے۔ یہ سب معمے "شمع معموں" کی کامیابی اور عالمگیر شہرت کو دیکھتے ہوئے جاری ہوئے، مگر نقال
سازوں نے شمع معموں کی تو نقل کر لی مگر شمع معموں کی ایمانداری اور دیانت داری کو انھوں نے پاس تک نہ پھٹکنے دیا۔ اس کا
قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ بعد معموں کا یہ سیلاب خشک سوتوں میں بدل گیا اور باقی رہے صرف شمع معمے جو اپنی ایماندارانہ ا
دیانت دارانہ روایات کے مطابق خدا کے فضل سے اب تک زندہ و سلامت ہیں۔ اور انشاء اللہ زندہ رہیں گے

ان دنوں "شانِ ہند" معموں کا محاسبہ کرنے میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا تھا لہٰذا اکثر معمہ ساز اپنی بد دیا
کی پردہ پوشی کے لیے شانِ ہند میں اپنے معموں کا اشتہار چھپوا کر اپنے لیے راہ بنانے تلاش کرنے کی کوشش کرتے
اور اس انعام خداوندی کا یہ عالم تھا کہ شانِ ہند میں ہر ماہ تقریباً پینتالیس معمہ سازوں کے اشتہارات شائع ہو
تھے۔ ان دنوں انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے جنرل سکریٹری قاضی عبد الغفار شانِ ہند کا شمارہ دیکھ کر کہتے
سرور صاحب شانِ ہند تو معموں کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔

دلی کے کچھ معمہ سازوں نے شانِ ہند میں "شمع معموں" کے خلاف لکھوانے کے کئی جتن کیے، مگر مجھ ایسا خدا
ڈرنے والا کسی دیانت دار ادارے کے خلاف لکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لہٰذا ان معمہ سازوں نے میرے اور
حافظ محمد یوسف دہلوی کے درمیان اختلافات پیدا کرنے کی کمینہ سازشیں بھی کیں۔ میں تو خیر حافظ صاحب کے نیاز مند
تھا لہٰذا مجھے حافظ صاحب سے بدظن کرنا ان معمہ سازوں کے بس کی بات نہ تھی بے شک یار لوگوں نے مرغ و ماہی ا
کا کھایا، پارٹیوں میں متعدد بار مدعو کیا مگر یہ لوگ اپنی مطلب براری نہ کر سکے اور ادھر حافظ صاحب کا خیال تھا کہ یہ لوگ
انھیں مجھ سے بدظن کرتے وہ اتنا ہی زیادہ مجھ پر بھروسہ کرتے تھے۔ جو لوگ میری اور حافظ صاحب کی بےغرض دو
اور ایک دوسرے پر بھروسے اور یقین کے بارے میں چہ میگوئیاں کرتے رہتے ہیں انھیں اس کا علم ہی نہ تھا کہ حافظ
نے مجھے سالہا سال تک جانچا اور پرکھا تب کہیں جا کر یقین و اعتماد کی یہ حدیں قائم ہو سکیں۔ اور نارائن داس اور حافظ
یک جان دو قالب تھے۔ لالہ نارائن داس کے انتقال کے بعد حافظ صاحب ایک ایسی کمی محسوس کرتے تھے جو ان کے
خاصی پریشان کن تھی۔ ایک دفعہ بمبئی میں سمندر کے کنارے سیر کرتے ہوئے حافظ صاحب اپنے آپ ہی کہہ اٹھے کہ سر
صاحب تم نے کسی حد تک لالہ جی کی کمی کو پورا کیا ہے۔

"شمع معموں" کا پہلا انعام ناجائز طور پر حاصل کرنے کے لیے کئی حضرات نے بڑے بڑے پروگرام بنا کر عدالتی چارہ جوئی
سہارا لیا اور پریشان کرنے کی غرض سے حافظ صاحب کے علاوہ عزیزان یونس، ادریس اور الیاس صاحبان کے نام بھی
سمن جاری کرا دیے جاتے تھے۔ ایسے مقدمات کی پیروی مولانا حلیم اختر صاحب کرتے تھے مگر جب ۱۹۶۸ء میں جیالہ کی

عدالت میں ایک وکیل نے ایسا ہی مقدمہ دائر کیا اور حافظ صاحب نے اس مقدمہ کی پیروی [illegible]
[illegible] سے متعلق مقدمہ کی پیروی کا اولین موقعہ تھا لہٰذا مولانا حلیم اختر صاحب بھی میرے ساتھ چلے گئے۔ اس مقدمہ کو جس شاندار انداز میں نپٹایا گیا اُس سے حافظ صاحب کے دل میں میرے لئے اور بھی اعتماد پیدا ہوا۔ اور مولانا حلیم اختر صاحب کے انتقال کے بعد ایسے مقدمات کی پیروی کلی طور پر میرے سپرد کر دی گئی۔ چونکہ سب مقدمات جھوٹ کی بنیاد پر محض بلیک میل کرنے کی غرض سے دائر کئے جاتے تھے لہٰذا حافظ صاحب کا فرمان تھا کہ خواہ مقدمہ پر لاکھوں روپے لگ جائیں مگر بلیک میل کے آگے ہرگز نہ جھکا جائے۔ جس کا قدرتی نتیجہ یہی ہوا کہ تمام مقدمات خارج ہوتے رہے۔ اس سلسلہ میں ان میں ایک کا مقدمہ بڑا ہی دلچسپ تھا۔ مدعی کا کہنا تھا کہ شمع نے ایمانداری کی ایک مثال ہے مگر جب ایک حلف نامہ ایک حل کے لئے ہے تو جس معمہ کی فیس دو روپے ہوتی ہے اس میں ایک حلف نامہ کیوں نہیں لیا جاتا۔ جب کہ ہر حلف نامہ کے لئے اقرار نامہ ضروری ہے۔ ایک حلف نامہ ایک حل کی فیس ہے۔ اس مقدمہ نے بڑے دلچسپ موڑ لئے اور آخر کار مدعی نے عدالت میں شمع معموں کی ایمانداری کا اقرار کرتے ہوئے مقدمہ کو ختم کرنے کی استدعا کی۔ حافظ صاحب نے شمع معموں کی ایمانداری اور دیانت داری کو ایمان کی حد تک جان سے بھی عزیز رکھا اور خدا کے فضل سے اُن کے صاحبزادگان بھی اس ضمن میں یعنی دیانت داری اور ایمانداری میں یوسف صاحب مرحوم کے نقشِ قدم پر اس طرح چل رہے ہیں کہ جیسے حکم الٰہی کی تعمیل کر رہے ہوں

معمہ سازی اور معمہ کا کام عام طور پر بددیانتی کا دھندا سمجھا جاتا ہے مگر حافظ صاحب نے شمع معموں کو اس حد تک ایسا وسیلہ بنایا کہ ہزار ہا حضرات نے اُردو پڑھنا لکھنا سیکھا تاکہ وہ شمع معموں میں حصہ لے سکیں اور ایمانداری اور دیانت داری کی اس روشن شمع سے مستفید ہو سکیں۔ راجدھانی میں لاکھوں لوگ ملک اور بیرونِ ملک سے ہر روز آتے ہیں ان میں سے چند حضرات ایسے بھی ہوتے ہیں جو دلی کی مشہور دیکھنے والی جگہوں میں دفاتر شمع اور شمع معموں کے انتظام و انصرام کو دیکھنا چاہتے ہیں لہٰذا حافظ صاحب بعض اوقات ایسے حضرات کو خود دفتر اور شمع معموں کے شعبے کے انتظام اور طریق کار سے واقف کراتے تھے۔ اور یہ بیرونی حضرات دفاتر شمع کو دیکھنے کے بعد از خود اندازہ لگانے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتے تھے کہ حافظ صاحب نے شمع کو یہ انداز بخشنے میں کس قدر محنت و کاوش سے کام لیا ہوگا کہ جس سے اس کی روشنی تمام رُوئے زمین پر بکھر رہی ہے۔

غزل

شاہد رتلامی

جو اشک پلکوں پہ اپنی سجائے بیٹھا ہے
سیاہ رات کو دُلہن بنائے بیٹھا ہے

مہک رہی ہے فضا زخمِ دل کے پھولوں سے
یہ کون دشت کو گلشن بنائے بیٹھا ہے

عبث ہے کوشش راہِ فرار ماضی سے
کہ ذہن و دل پہ سکہ جمائے بیٹھا ہے

اکیلا میں ہی نہیں تیری دید کا طالب
زمانہ راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھا ہے

یہ آرزو ہے تو پھر پوچھ بسنے والے سے
فریب کتنے زمانے کے کھائے بیٹھا ہے

زمانہ اس پہ اُٹھاتا ہے اُنگلیاں کیونکر
جو تیری یاد میں خود کو بھلائے بیٹھا ہے

یہ کس نے چھیڑ دیا ذکرِ کربلا شاہد
یزید وقت بھی گردن جھکائے بیٹھا ہے

دریا پرکاش ستور ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس [illegible] جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر دفتر
شمع ہند انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

گوشۂ عقیل صدیقی

میکش اجمیری

آل انڈیا مشاعرہ اودے پور

"کاروانِ ادب" اودے پور کی جانب سے ہر سال کُل ہند مشاعرہ کا انعقاد ہوتا ہے ۔ امسال یہ مشاعرہ ۲۰ جولائی ۱۹۸۵ء کی شب کو منعقد ہوا ۔ بہادر جانثار راجپوتوں کی [illegible] ٹریننگ اسکول کے وسیع ہال کو منتظمین نے بڑے سلیقے سے برقی قمقموں سے آراستہ کیا ہے ۔ مشاعرے کی ٹی ۔ وی فلم ترتیب دینے کو ٹی ۔ وی یونٹ ۔ پریس رپورٹرس اور کیمرہ مینوں نے مشاعرے کے ڈائس کو حلقے میں لے رکھا ہے ۔ میں اور تمام مدعو شعراء و شاعرات کو ڈائس پر حسبِ مراتب پُرجوش خیرمقدم کے ساتھ بٹھلا دیا گیا ہے ۔ "کاروانِ ادب" اودے پور کے روحِ رواں اقبال ساگر صاحب بھی ڈائس پر رونق افروز مشاہیر شعراء حضرات و شاعرات کا تعارف حسبِ ترتیب کرایا ہے جن میں حضرت ثقلین حیدر، ڈاکٹر ساغر اعظمی، راحت اندوری، گلشن [illegible]، محترمہ شاہدہ صبا، محترمہ ترنم کانپوری، جناب ارمان وارثی، نظر ایٹوی، جوشی رائے پوری، نیلو نیلم صاحبہ اور راقم الحروف کے نام شامل ہیں ۔ صحیح وقت پر ۹ بجے شب شروع ہونے کے لئے یہ مشاعرہ ہمیشہ یاد رہے گا ۔ اقبال ساگر صاحب نے مشاعرہ کی صدارت کے لئے جناب اے ۔ کے چودھری صاحب کا نام تجویز کیا ہے جس کا تالیوں کے ساتھ خیرمقدم کیا گیا ہے ۔ چودھری صاحب نے افتتاحی تقریر کے بعد مسندِ صدارت سنبھال لی ہے اور ساگر صاحب نے مشاعرے کی باگ ڈور آل انڈیا مشاعروں کے مشہور اناؤنسر ثقلین حیدر صاحب کے ہاتھوں میں سونپ اپنی جگہ سنبھالی ہے ۔ لیجئے ثقلین صاحب اپنی تمام تر دلکشیوں اور حاضر دماغی کے ساتھ قومی ایکتا پر مختصر تقریر کے بعد مشاعرے کی کامیاب شروعات کے لئے جناب جمیل قریشی کو زحمتِ سخن دے رہے ہیں ۔ جمیل صاحب اپنے اشعار کو اچھے انداز کے ساتھ سامعین تک نہیں پہنچا سکے لہٰذا انہیں جلد ہی مائک سے الگ ہونا پڑا ہے ۔ آپ بھی جمیل صاحب کے دو اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔ ؎

اپنی شادابی کو کل روئیں گے پھولوں کے بدن
وقت کو روکو کہ یہ ان کی تازگی لے جائے گا
وقت کی اس تیز آندھی کا کوئی جھونکا جمیل
کیا خبر کس کس کے گھر کی روشنی لے جائے گا

اب ثقلین صاحب نے ایک لطیفہ چسپاں کرتے ہوئے مدھیہ پردیش کی مشہور شاعرہ شاہدہ صبا صاحبہ کو مائک سپرد کیا ہے ۔ صبا صاحبہ تمام نسوانی روایات کے ساتھ دلنشیں ترنم میں سامعین پر اپنے کلام کا جادو جگا رہی ہیں ؎

رازِ دل اپنا زمانے کو بتاتے کیوں ہو
میری تصویر زمانے کو دکھاتے کیوں ہو

واہ واہ [illegible] ہے اور صبا صاحبہ یوں فرما رہی ہیں ؎

جس کو پینے کا سلیقہ نہ ہو نشے کا شعور
ایسے کم ظرفوں کو محفل میں بلاتے کیوں ہو

ڈائس کے لوگ شعر کا مصرعِ اوّل بے وزن اور غیر شاعرانہ ہونے کی کانا پھوسی کر رہے ہیں ۔ وسیع ہال میں مختلف سامعین کی بھرپور بھیڑ اس حقیقت سے ناآشنا داد دینے میں مگن ہیں ۔ اور صبا صاحبہ نے نزاکت کو بھانپتے ہوئے مقطع پڑھ دیا ہے ۔ مگر سامعین کی پُرزور فرمائش نے انہیں دوسری غزل سنانے پر مجبور کر دیا ہے ۔ دوسری غزل کے دو اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

کسی کے دل سے کسی کی نظر سے گزرے ہیں
خبر نہیں ہمیں جانے کدھر سے گزرے ہیں
فلک کے چاند سے [illegible] تلاش کرو
بڑے حسین مسافر کدھر سے گزرے ہیں

ثقلین صاحب نے دوسری غزل کے دوسرے شعر پر ختم
بریلوں یہ شعر سنا کر سامعین کو متاثر کیا ۔

یہ مہرو ماہ و لیلیں ہیں ہر انسان کے لئے
کہ آسمان بچا تھا کس سفر کے لئے

اور لیجئے اب مشاعرے کے بانی اودے پور کے مقامی
شاعر جناب اقبال ساگر صاحب کو ثقلین صاحب نے پُراثر
انداز سے سامعین کے سامنے کھڑا کیا ہے ۔ اقبال ساگر
صاحب نے مختصر کلام پڑھ کر سامعین سے داد و تحسین وصول
کی ۔ ایک شعر آپ بھی ذہن نشین کرتے چلیں : ؎

وہ سب خوش تھے کہ ذرا دیر تو رہنے دو ابھی
ہم کو کچھ بیٹھنے دے داد کی بوچھاروں سے

اور لیجئے اب ثقلین صاحب نے لطیفوں اور اشعار کی چاشنی
سے سامعین کو قہقہہ زار بناتے ہوئے گیتوں کے مشہور شاعر
ارمان وارثی صاحب کو زحمتِ سخن دی ہے ۔
بے اثر کلام سنانے کے بعد ارمان صاحب نے درمیانی
ترنم میں ایک گیت سنایا ہے جس پر قدرے داد ملی ہے ۔
گیت کا موضوع بنجارا ہے جس پر کافی گانے اور نوٹوں کے
گیت سامعین سن چکے ہیں ۔ لہٰذا ارمان صاحب کو زیادہ
نہیں سراہا گیا ۔ اور لیجئے اب ثقلین صاحب نے رائے پور
سے تشریف لائی ہوئی ایک غیر معروف شاعرہ محترمہ نیلو
نیلم کو اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کرنے کا مژدہ دیا ہے ۔
نیلم صاحبہ نیلی رنگ کی زری ساڑھی میں ملبوس ترنم میں چھوٹی
چھوٹی غزلیں سنا رہی ہیں : ؎

مسکراتے دیے کا کہنا ہے — روشنی تیرگی کا گہنا ہے

نتیجہ سامعین کلام سے زیادہ حسین لباس کی داد دے رہے
ہیں ۔ اور نیلم صاحبہ فرما رہی ہیں : ؎

رنجشوں کا سبب کیا ہے — جب ہمیں ساتھ ساتھ رہنا ہے

نیلم صاحبہ ترنم میں شانتی صبا صاحبہ سے بھی دو قدم آگے
بڑھ گئی ہیں ۔ [illegible] کے مشہور شاعر [illegible] کا شعر ہے ؎
[illegible] — جب ہمیں ساتھ ساتھ رہنا ہے
[illegible]

ہیں ۔ اور نیلم صاحبہ نے دوسری غزل چھیڑی ہے ؎

ہم کو جو سامنا نہیں ہوتا — آدمی کام کا نہیں ہوتا
جب میرے روبرو وہ ہوتے ہیں — مجھ کو اپنا پتہ نہیں ہوتا

داد کے شور میں نیلم صاحبہ بیٹھیں تو ثقلین صاحب نے کچھ
اشعار و لطائف سے سامعین کی "آہ" "واہ" لوٹتے ہوئے
راقم الحروف کو دعوتِ سخن دی ہے ۔ میں چند مختلف اشعار اور
دو غزلیں سنا کر اپنی جگہ لوٹ آیا ہوں ۔ میرے اشعار جمیل
قریشی صاحب نے منتخب کئے آپ بھی ملاحظہ فرمالیں : ؎

میرے اشکوں نے فقط تیرا بھرم رکھا تھا
ورنہ کیا تجھ میں سوا دیدۂ نم رکھا تھا
ہم نے اردو کی حفاظت کے لئے اے میکش
اپنے ہی خون میں لبریز قلم رکھا تھا

ثقلین صاحب نے میرے اشعار کا بھی پوسٹ مارٹم
لطائف سے کرتے ہوئے اب رائے پور سے تشریف لائے
طنز و مزاح کے کوئی زیادہ شاعر کم جوشی صاحب کو مائک سپرد
کیا ہے ۔ جوشی جی نے بنا جوش دکھائے ہندی کی غالباً
کویتائیں سنائی ہیں جن پر بہت کم سامعین نے داد دی ہے
اور وہ اپنی جگہ لوٹ آئے ہیں ۔ لیجئے اب ثقلین صاحب نے
نہایت مناسب تعارف کے بعد گلشن بھارتی صاحب کو سامعین
کے انقلابی جذبات کو ابھارنے کی دعوت دی ہے ۔ گلشن صاحب
نے حسبِ دستور دلکش لباس اور اپنے پڑھنے کے قیامت
خیز انداز کے ساتھ مائک پر اپنے کلام کی شروعات قطعات
کے ساتھ کرنے کے بعد حالاتِ حاضرہ کی بے عنوانی پر نظم پڑھی
جس نے سامعین پر ناقابلِ فراموش اثرات چھوڑے ۔ ایک
اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمالیں : ؎

درس گاہوں میں چلو حشر کا منظر ہے یہاں
اک نئی صبح کا عنوان مقدر ہے جہاں
ڈگریاں ہیں جو فریموں میں سجائے رکھو
موت یا ہوں کہ جو پھیلائی ہے پھیلائے رہو
"جشنِ جمہور بہرحال منانا ہوگا"

گلشن صاحب اپنی جگہ آ گئے ہیں اور ثقلین صاحب نے

ہے اور پھر لحن داؤدی میں قطعہ سنانے کے بعد غزل ارشاد فرما رہے ہیں ؎

ایسی نہیں ہے بات کہ قد اپنے گھٹ گئے
چادر کو اپنی دیکھ کے ہم خود سمٹ گئے
جب ہاتھ میں قلم تھا تو الفاظ ہی نہ تھے
اب لفظ مل گئے تو میرے ہاتھ کٹ گئے
صندل کا میں درخت نہیں تھا تو کس لئے
جتنے تھے غم کے ناگ مجھی سے لپٹ گئے
اب ہم کو شفقتوں کی گھنی چھاؤں کیا ملے
جتنے تھے سایہ دار شجر سارے کٹ گئے

آہ۔ واہ کے شور میں ساغر صاحب بیٹھ گئے تو سامعین نے کہرام برپا کر دیا اور ساغر صاحب کو دوبارہ مائک سنبھالنا پڑا ہے اور دوسری غزل بھی اسی لحن داؤدی میں چھیڑ دی ہے ؎

پاؤں میں ہیں زنجیریں اور زباں پہ تالے ہیں
آج ہم نہ جانے کیا ان سے کہنے والے ہیں
مفلسی کی دھوپ اس کا گھر جلا کے چھوڑے گی
جس نے اپنے آنگن کے پیڑ بیچ ڈالے ہیں
ان کی لوریاں ان کو اب سنا نہ پائیں گی
یہ اداس بچے تو وقت کے حوالے ہیں
جس نے کل ہزاروں کی قسمتیں خریدی تھیں
آج اس حویلی کے دام لگنے والے ہیں
جس کے واسطے اپنا گھر جلا رہا تھا میں
سن رہا ہوں وہ میرا گھر جلانے والے ہیں

غزل کے ہر شعر پر ساغر صاحب نے بھرپور داد وصول کی ہے اور سامعین نے سخن فہمی کا ثبوت دیتے ہوئے ہر ہر شعر کو بڑے دل کے ساتھ سنا ہے۔ اس پر بھی ساغر صاحب کو نہیں بخشا گیا ہے اور گیت کی فرمائش کی گئی ہے۔ لیجئے ساغر صاحب نے گیت چھیڑا ہے۔

سر دھن کی چھیڑ سے قیمت مانگ رہا ہے دھنوان
کہاں سے نکلی گنگا کا بھگوان

گیت نے بھی داد وصول کا وہی رخ اختیار کیا ہے

سا لہجہ کلام و غزلیات نے کیا تھا اور گیت ختم کر کے ساغر صاحب اپنے مقام پر بیٹھے تو ثقلین صاحب نے نہایت دلکش انداز میں ہر ہر شعر پر کمینٹری کرتے ہوئے اشعار سے آہ اور لطائف سے واہ کے شور کو جنم دیا ہے۔ اور لیجئے مشاعرے کے اس پہلے دور کے آخری شاعر راحت اندوری صاحب کو تعریفوں کے پلوں کے ساتھ ثقلین صاحب نے مائک سپرد کیا ہے۔ راحت کی ذات مشاعروں کی دنیا میں تعارف کی محتاج نہیں۔ تالیوں کے ختم نہ ہونے والے شور میں راحت صاحب نے مائک سنبھالا ہے اور اپنے مخصوص انداز میں غزل شروع کی ہے ؎

یہ مانا اک چاند سورج کے برابر کون ہے
روشنی کم ہو تو یہ دیکھوں کہ گھر پر کون ہے

تحت میں پڑھنے کا جو منفرد انداز جو راحت صاحب کا ہے، وہ شاید ہی ہند و پاک میں کسی شاعر کو میسر ہوا ہو۔ پھر اس پر زندگی کے عکاس اشعار، سامعین تڑپ تڑپ کر ہر شعر پر داد دے رہے ہیں اور راحت صاحب مختلف غزلوں کے کامیاب اشعار کامیابی کے ساتھ ڈرامائی انداز میں پیش کر رہے ہیں ؎

کبھی دماغ۔ کبھی دل۔ کبھی نظر میں رہو
یہ سب تمہارے ہی گھر ہیں کسی بھی گھر میں رہو
جلا نہ لو کہیں ہمدردیوں میں اپنا وجود
گلی میں آگ لگی ہو تو اپنے گھر میں رہو

داد اپنے عروج پر ہے اور مشاعرہ کو کامیابی کی بلندیوں پر پہنچاتے ہوئے راحت صاحب نہایت جذباتی انداز میں پڑھ رہے ہیں ؎

دلوں میں آگ لبوں پر گلاب رکھتے ہیں
سب اپنے چہروں پہ دوہری نقاب رکھتے ہیں
ہمیں چراغ سمجھ کر بجھا نہ پاؤ گے
ہم اپنے گھر میں کئی آفتاب رکھتے ہیں
یہ میکدہ ہے وہ مسجد ہے وہ ہے بت خانہ
کہیں بھی جاؤ فرشتے حساب رکھتے ہیں

بننے کی ضرورت نہیں کہ داد کا کیا عالم ہوگا۔ لوگ کرسیوں
سے اُچھل اُچھل کر داد کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اور راحت
صاحب اسی خود اعتمادی سے اشعار کی بوچھار کر رہے ہیں ؎

ابھی تو صرف پرندے شکار کرنا ہے
یہ پھر بتائیں گے کس کو شکار کرنا ہے
یہ تیری پیٹھ ہے اے میرے بے خبر دشمن
مگر مجھے ترے سینے پہ وار کرنا ہے
ہم اپنے شہر میں محفوظ بھی ہیں خوش بھی ہیں
یہ سچ نہیں ہے مگر اعتبار کرنا ہے
ہمارا شوق ہے دار و رسن کی پیمائش
تمہارا کام کبوتر شکار کرنا ہے

کس کس شعر کی داد دی جائے۔ سبھی اشعار قلم
بند کر رہا ہوں ؎

ہوں لاکھ ظلم مگر بد دعا نہیں دیں گے
زمین ماں ہے زمیں کو دغا نہیں دیں گے
روایتوں کی صفیں توڑ کر رہو ورنہ
جو تم سے آگے ہیں وہ راستہ نہیں دیں گے

راحت صاحب کے اشعار کا سلسلہ جاری ہے اور
اب یہ شعر پڑھنے سے پہلے وہ تمہید فرما رہے ہیں کہ میں
بھی پہلے بے حد پیتا تھا اب چھوڑ چکا ہوں ؎

شراب پی کے بڑے تجربے ہوئے ہیں ہمیں
شریف لوگوں کو ہم مشورہ نہیں دیں گے
ہم اپنے دل سے تجھیں چاہنے لگے ہیں مگر
ہزار چاہیں گے لیکن پتہ نہیں دیں گے

اس سے پہلے کہ سامعین فرمائش کریں۔ اور ان کی آوازیں
بلند کریں۔ راحت صاحب مائک ہی نہیں ڈائس بھی چھوڑ
چکے ہیں اور ثقلین صاحب نے موقع غنیمت جان کر پہلے
دور کے خاتمہ کا اعلان کیا ہے۔ رات کا ۱ بج رہا ہے
قریب ۲ بجے شب واپس دوسرا دور شروع ہوا جو ۵ بجے
تک چلا جس میں پہلے دور کے تمام کامیاب شعراء و شاعرات
کو سنا گیا۔

۵ بجے صبح ثقلین صاحب نے مشاعرے کے ملتوی ہونے
کا اعلان کیا اور کہا کہ اردو کے مشاعرے کبھی ختم نہیں ہوتے
ملتوی ہوتے ہیں۔ لہٰذا مشاعرہ ملتوی کیا جاتا ہے اور
اسی کے ساتھ میں بھی آپ سے رخصت لے رہا ہوں۔

غزل

کاوش قادری نظامی

آنکھوں سے جس کے خون ٹپکتا دکھائی دے
وہ شخص گفتگو سے مسیحا دکھائی دے

پردہ دکھائی دے نہ مگر جلوہ دکھائی دے
آؤ جو تم تو نور برستا دکھائی دے

ہرگز یقیں نہ کیجئے لوگوں کی بات کا
کیجئے وہی جو آپ کو اچھا دکھائی دے

اے دوست کیا یہی ہے مقام فنائے ذات
دیکھوں تجھے تو میرا سراپا دکھائی دے

سرمستیٔ حیات کا یہ فیض ہے کہ اب
وہ بھیڑ میں بھی جائے تو تنہا دکھائی دے

چھوڑا ہے زندگی نے یہ لاکر مجھے کہاں
منزل کا کچھ نشاں ہے نہ رستہ دکھائی دے

کاوش کروں تو کیسے کروں زندگی سے پیار
جب جامۂ حیات ہی میلا دکھائی دے

۱۵ اگست

ہماری آزادی کا یادگاری دن ہے

آؤ

ہم سب مل کر عہد کریں کہ ہم سب ایک ہیں اور

ہمارا

ہندوستان ہم سب کا ہے اور اس کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔ ہندوستان کا ہر باشندہ اپنے وطنِ آزاد کی آزادی کو برقرار رکھنے کا ذمہ دار ہے۔

لہٰذا

ہم سب بلا تفریقِ مذہب و ملت بھائی بھائی بن کر رہیں

اور

اپنے ملکِ عزیز کی آزادی کی حفاظت کریں

اسی میں ہم سب کا بھلا ہے۔ یاد رکھئے کہ جو شخص اپنے ملک کا وفادار نہیں ہوتا اسے کہیں بھی پناہ نہیں ہے اور ملک کا غدار دین۔ دُنیا اور خدا کی نظروں میں قابلِ نفرت ہے۔

ہوٹل راج دوت نئی دہلی

ڈاکٹر اودے بسرن ارسن جلاری

برتھ ڈے

"میں ابھی ابھی تمہیں منع کر کے گیا ہوں کہ یہاں مت آؤ مگر تم پھر آگئے۔ بھاگو یہاں سے" گیٹ کیپر نے بیرا کالونی کے لڑکوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا "بے وجہ پکار کیا کر رہا ہے [illegible] سرے سے مار رہے ہو جا کھڑے ہوئے کیوں نہیں یہ بھی ان کا جشن ہو گا۔ تو پاس سے کیوں نہیں دیکھنے دیتا" ایک لڑکے نے دوسرے سے کہا۔

"ہم لوگ غریب ہیں اس لئے وہ ہمیں بھگا دیتا ہے ہمارے وہاں کھڑے ہونے سے سیٹھ جی کی بے عزتی ہوتی ہے دیکھو رئیسوں کے بچوں کو نہیں بھگا رہا ہے وہ بھی تو وہیں کھڑے ہیں" دوسرے لڑکے نے کہا۔ چوکیدار گیٹ چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ اسی بیچ ایک سیاہ رنگ کی کار کوٹھاری جی کے دروازے پر آکر رکی اور ایک تندرست حسینہ اس سے باہر نکلی تھوڑی ہی دیر میں ایک جیپ بھی آکر کار کے پیچھے کھڑی ہو گئی اور اس میں سے کئی سپاہی مع رائفلوں کے اترے اور اس خاتون کے پیچھے ادب سے کھڑے ہو گئے جو اس امر کی نشان دہی تھی یہ خاتون یا تو کسی افسر کی بیوی ہے یا خود کوئی اعلیٰ افسر ہے۔ تمام مدعوئین کی نگاہیں اس خاتون پر مرکوز تھیں اور وہ تھی کہ اس شاہی سجاوٹ کا جائزہ لے رہی تھی۔ سیکڑوں راڈیں ہزاروں بلب [illegible] کوٹھی جگمگا رہی تھی۔ چاروں طرف قناتوں سے گھرے لان میں شامیانے کے نیچے [illegible] کرسیاں پڑی تھیں۔ جن پر زیادہ مہمان بیٹھ چکے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر فلمی نغمے فضا میں بکھیر رہا تھا [illegible] ادھر ادھر ایسے گھوم رہے تھے جیسے طوفان میں پانی کی لہریں چنچل ہو جاتی ہیں انگریزی پوشاکوں میں بچے تتلیوں کی طرح پھدک رہے تھے کسی کام سے کوٹھاری جی باہر آئے ان کی نظر گیٹ پر کھڑی کار پر گئی تو وہ استقبال کو دوڑے "آئیے آئیے میم۔ ڈی ایم صاحبہ آپ کا سواگت ہے" یہ سن کر آس پاس کھڑے لوگ ایک طرف کو سمٹ گئے وہ اندر گئیں تو [illegible] سپاہی ادب سے کھڑے ہو گئے وہ کرسی پر بیٹھیں تو سب مہمان اپنی اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔

[illegible] ایک بڑی میز پر سجا کیک تھا تو بیرے پلیٹیں لئے پیچھے قرینے سے میزوں پر لگا رہے تھے۔

"کیا کوٹھاری جی ہر سال اسی طرح جنم دن مناتے ہیں؟" ایس ڈی ایم صاحبہ نے قریب بیٹھی عورت سے پوچھا "میں پہلی بار آئی ہوں پچھلے سال کا مجھے پتہ نہیں" یہ سن کر وہ چپ ہو گئیں اور عالم تصور میں کھو گئیں ان کے تصورات کا سلسلہ ایک ملازم لڑکے کے ہاتھوں برتنوں کے ٹوٹنے کی جھنکار نے توڑا تو انہوں نے دیکھا کہ کوٹھاری جی لپک کر اس گرے ہوئے لڑکے کے پاس پہنچے۔ برتنوں کے ٹوٹنے سے ہونے والے نقصان کو شاید وہ برداشت نہ کر سکے اور دھڑا دھڑ ملازم لڑکے کو پیٹنے لگے۔ "اندھا ہے دیکھ کر نہیں چل سکتا اتنی روشنی میں بھی ٹھوکر کھا گیا۔" کوٹھاری جی چیختے ہوئے نہ جانے کیا کیا کہہ رہے تھے مگر ملازم لڑکا چپ چاپ کھڑا تھا اس کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ برتنوں کے نقصان نے کوٹھاری جی کو اس احساس سے بے نیاز کر دیا تھا کہ ان کی یہ حرکت نہ صرف افسوسناک ہے بلکہ گھٹیا بھی ہے اور ان کی اس حرکت سے مہمانوں نے بھی بُرا اثر لیا ہے اور مہمانوں کے چہروں سے ان کی [illegible] جھلک رہی تھی۔ ایس ڈی ایم صاحبہ کرسی سے اٹھیں اور اس لڑکے کے پاس جا کر اس کا منہ پونچھا اور اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور کہا "بیٹے تمہارا نام کیا ہے"

"بھگت" لڑکے نے ڈرتے اور کانپتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہارے ماں باپ کیا کرتے ہیں؟"

"مر گئے جی"

"کتنے [illegible] ہو؟"

"دو"

"دوسرا بھائی تم سے بڑا ہے؟"

"جی مگر آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میرا بھائی مجھ سے بڑا ہے؟" انگلی سے خون پونچھتے ہوئے لڑکے نے جواب دیا

"تمہارے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں سے اندازہ لگایا کہ تم نے دھوئے ہوئے اسی کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ ڈھیلا پائجامہ پہنے ہی

دیش کے لئے کیا کیا ہے وہ سب جانتے ہیں۔

"منشی جی آپ کے خیالات جمہوریت میں تو پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتے یہ تو کوئی ڈکٹیٹر ہی کر سکتا ہے۔

"کرنے والے ہر حالت میں سب کچھ کر جاتے ہیں"

ایس ڈی۔ ایم صاحب

"منشی جی آپ کیا کرتے ہیں"

میں ایک ریٹائرڈ اسکول ماسٹر ہوں۔ ایس ڈی ایم صاحب نے کچھ سوچا اور جو کچھ انہوں نے اپنی پلیٹ میں چھوڑ دیا تھا اسے کھانا شروع کر دیا۔ جن کی پیروی دوسرے مہمانوں نے بھی کی۔

منشی جی اپنی اس کامیابی پر دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے کہ انہوں نے کئی لوگوں کو ایک سیدھی راہ تو سمجھائی۔ سب مہمان اپنے اپنے گھر چلے گئے مگر ایس ڈی ایم صاحب کا قیام رات کو وہیں رہا۔

دن نکلا تو کوشا رہ جی ان سے ملنے آئے تو کہنے لگیں سیٹھ جی کھانا اور سجاوٹ قابل تعریف تھے کتنا خرچ ہو گیا ہوگا"

"تقریباً پانچ چھ ہزار روپے"

"کتنے مہمان پہنچے"

"پانچ سو کے قریب تھے"

ایس۔ ڈی۔ ایم صاحب فرمانے لگیں اگر مہمانوں نے اس تقریب میں دو گھنٹے بھی صرف کئے تو ایک ہزار گھنٹے یعنی چھتیس دن بیکار گئے جن کی آپ کے نزدیک کوئی قیمت نہیں ہے۔ اور ملک کے لحاظ سے یہ بہت بڑا نقصان ہے اگر یہ لوگ اپنے اپنے گھر رہتے تو کچھ نہ کچھ ضرور کرتے جو قوم کی تعمیر میں معاون ہوتا آپ نے ایک ہزار کام کے گھنٹوں کا خون کیا۔

رات گئے تک زور زور سے لاؤڈ اسپیکر سے پڑوسیوں کی نیند حرام کی محلے میں نہ جانے کتنے بیمار ہوں گے اور انہیں نیند تک نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ اور انہوں نے دل ہی دل میں آپ کو برا بھلا کہا ہوگا۔

آپ کی حیثیت کو دھیان میں رکھتے ہوئے سبھی مہمانوں نے کچھ نہ کچھ تحفے بھی دیئے ہوں گے جو ان کی جیب پر ناجائز بوجھ تھا اور اور آپ پر اس کا کوئی اثر ہی نہیں ہوا ہوگا۔ اس بجلی کی کمی کے زمانے میں آپ نے کافی بجلی بے کار گنوائی اگر یہ بجلی کسی کسان یا کسی کارخانے کو دی گئی ہوتی تو کتنی مفید رہتی۔ ان تمام باتوں کو سوچتے ہوئے تو آپ ملک کے دشمن ہوئے۔ پانچ چھ ہزار روپے یوں ہی خرچ کر دئے مگر آپ نے اپنے گھر پر تو آکر کے ایک قیمتی ملک بھی دی۔ پنڈت موتی لال جی جب جواہر لال جی کا برتھ ڈے مناتے تھے تو ان کے وزن کے برابر اناج تول کر غریبوں میں بانٹ دیتے تھے"

"ایس ڈی ایم صاحب۔ آپ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں میں دل سے آپ کی اس قیمتی رائے کی قدر کرتا ہوں اور اگلے سال جب آپ جنم دن کی تقریب پر یہاں تشریف لائیں گی تو یہ تقریب کسی دوسری ہی طرح منایا جا رہا ہوگا جس کو دیکھ کر آپ یقیناً خوش ہوں گی۔

غزل

کے۔ کے۔ سنگھ میکش

اب نہ دل کو سکوں ہے نہ آرام ہے
یہ وفاؤں کا جاں سوز انعام ہے

اُن کے رُخسار و گیسو ہیں پیشِ نظر
کیا نئی صُبح ہے کیا نئی شام ہے

حُسن نے سب کو بخشا ہے جوشِ جنوں
عشق تو بے سبب یارو بدنام ہے

کیوں بہکنے کا الزام دیتے ہیں وہ
رُوپ جن کا چھلکتا ہوا جام ہے

پھر کسی پر تبسم کی بجلی گری
ہر طرف اے میکش ایک کہرام ہے

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹیو بنک لمیٹڈ

رجسٹرڈ آفس ۷۸ محمد علی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

دہلی آفس نمبر ۳۶۵۵ نیتاجی سبھاش مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

فون نمبر: ۲۶۸۲۶۶ - ۲۶۴۳۷۲

- ہمارے یہاں شرح سود تمام نیشنلائزڈ اور شیڈولڈ کمرشیل بنکوں کے مقابلہ ایک فیصد زیادہ ہے
- ہندوستان کا پہلا کوآپریٹو بنک جس کو زرمبادلہ میں کاروبار کے لئے لائسنس جاری کیا گیا۔
- ہمارے بنک میں اوقاف کی جمع شدہ رقم کی آمدنی دفعہ ۱۲ (۵) (الف) (iii) انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔

اس کے علاوہ

- ہم آپ کے تمام آرام و آسائش کی ضروریات مہیا کرنے کے لئے آسان قسطوں پر قرض فراہم کرتے ہیں ایک فیصدی کا فرق بہت بڑا فرق ہے یہ آپ کی رقم میں ہزاروں روپیہ کا اضافہ کرتا ہے۔ آپ بھی اس کا فائدہ اٹھائیں۔

زین جی رنگون والا	حسینی ایس، ڈاکٹر	شمیم کاظم
(منیجنگ ڈائرکٹر)	(چیئرمین)	(اسسٹنٹ جنرل منیجر، شمالی ہند)

کون سنگسار ہوا

اقبال متین

لوگوں نے مجھے بتایا کہ خان گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ان بتلانے والوں میں سب سے اونچی آواز میں جو بول رہا تھا وہ گٹار بجانے والا جاڈوس تھا جس کا اصلی نام جان ڈیوس تھا۔ لیکن لوگ اس کو جاڈوس ہی پکارتے تھے۔

اینگلو انڈینس کی چھوٹی سی کالونی میں تقاریب کے موقع پر ڈیوس گٹار بجاتا تھا۔

چاندنی راتوں میں قلعہ کی فصیل سے باہر ندی کے پل پر نوجوانوں کی جو بھی ٹولی نظر آتی اس میں خان صاحب اور ڈیوس دونوں ہی کی شمولیت ضروری ہوتی اور ڈیوس کے گٹار پر خان جھوم جھوم جاتا ڈیوس نے انجیل مقدس کی یہ عبارت سنائی جو اسے ازبر تھی اور لوگ خاموشی سے سننے لگے "قانا میں ایک شادی ہوئی اور یسوع کی ماں وہاں تھی اور یسوع اور اس کے شاگردوں کی بھی اس شادی میں دعوت تھی۔ شراب کے کئی دور ہو گئے تو یسوع کی ماں نے اس سے کہا کہ ان کے پاس شراب نہیں رہی۔ یسوع نے اس سے کہا اے عورت تجھے مجھ سے کیا کام ہے؟ — ابھی میرا وقت نہیں آیا۔ اس کی ماں نے خادموں سے کہا۔ جو کچھ یہ تم سے کہے وہ کرو۔ وہاں یہودیوں کی طہارت کے دستور کے مطابق پتھر کے چھ مٹکے رکھے تھے اور ان میں دو دو تین تین من کی گنجائش تھی۔ یسوع نے ان سے کہا مٹکوں میں پانی بھر دو۔ پس انہوں نے ان کو لبالب بھر دیا۔ پھر اس نے ان سے کہا اب نکال کر میر مجلس کے پاس لے جاؤ۔ پس وہ لے گئے۔ جب میر مجلس نے وہ پانی چکھا تو وہ شراب بن گیا۔

ڈیوس نے یہ کہہ کر لوگوں کی طرف دیکھا۔

سب کے سب اسی کا منہ تک رہے تھے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ڈیوس کسی اور نئی بات کا انکشاف کرنے والا ہے۔ لیکن اس نے ٹھنڈی سانس لی جو زیادہ ہی تھی اور کہنے لگا۔

یوحنا رسول کی معرفت لکھی گئی انجیل مقدس کی قسم خداوند یسوع خان کی مدد کرے گا۔"

میری طرح شاید سبھی لوگ جانتے تھے کہ خان کو کیوں گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ اسی لئے کسی نے کچھ نہ پوچھا اور ان میں کتنے ہی تھے جنہیں یہ بات معلوم ہوئی تھی۔ لیکن اس پر کسی نے بھی کچھ نہ پوچھا۔

وہ ڈیوس مجھ سے بہت قریب ہو گیا۔ کہنے لگا سردار رنجیت سنگھ سے خان نے کہا تھا۔

"تمہاری رات اجالوں سے منور ہو گی اور تمہارے قہقہے سناٹوں کا سینہ شق کریں گے اور تمہاری شادی کی تقریب میں مجھے جیتے جی ایک بوند شراب کی کمی محسوس نہ ہو گی۔ لیکن میں وہ گوشت نہیں کھاؤں گا جس سے تم تقریب میں تواضع کرو گے۔ میرے لئے ذبح کئے ہوئے دنبے کے گوشت کا علیحدہ انتظام کرنا ہو گا۔"

اور سردار رنجیت سنگھ نے قصائی تک آ کر خود ہی گوشت خریدا تھا اور اس نے کسی دوسرے سردار پر بھروسہ تک نہ کیا تھا کہ خان کے آگے کہیں جھٹکے کا گوشت نہ پیش کر دے اور سردار رنجیت سنگھ نے یقیناً خان کے لئے اپنی نگرانی میں گوشت پکوایا ہو گا —— اور اس کا منتظر ہو گا۔ لیکن اب خان وہاں نہیں جا سکتا اس لئے کہ وہ گرفتار ہو گیا ہے۔

اس ضلع کے "خشک" DRY قرار دیئے جانے سے پہلے خان کی وجاہت کے ساتھ ساتھ اس کی وردی کا بانکپن بھی نہ صرف سارے صوبے میں مشہور رہتا بلکہ جوار میں بھی اسی کی بات ہوتی تھی۔

خاکی رنگ کی کلف چڑھی وردی زیب تن کئے جب خان بستی میں نکلتا تو آس پاس کے لوگ وردی کی کھڑکھڑاہٹ سے خان کی آمد کا پتہ چلا لیتے۔ چمڑے کا بیلٹ جس سے خان کی کمر کسی رہتی تھی خان نے بڑے اہتمام سے دھرمولیہ روڈ کس میں تیتن پر سلوایا

تھا۔ وہ ایرانی نژاد اور وہسکی کے ٹپ کنٹ کے سہارے سینے پر لگے ہوئے ترچھے بلٹ میں وہ اس طرح رکھ لیتا جیسے تمغے سجا رکھے ہوں۔ یہ بلٹ بھی چمڑے کا تھا جس کو خان نے اپنی نگرانی میں دھرم ولیدر ورکس ہی میں بنوایا تھا۔ کمر کی بلٹ میں سوڈے کے شیشے لگے رہتے۔ کمر کی بلٹ اور سینے کی بلٹ جہاں ایک دوسرے سے ملتے تھے وہاں ایک چھوٹا سا چمڑے کا بکس ٹنگا رہتا جس میں ابلے ہوئے دس بارہ انڈے رکھے جاتے تھے۔ کسی اسنو کی خالی شیشی میں پسا ہوا نمک اور کالی مرچ بھرے رہتے۔ خان اس طرح ضلع کا چلتا پھرتا میخانہ تھا۔

چاندنی راتوں میں فصیل کے باہر ندی کے پل پر جب ڈیوس کا گٹار اس کے ساتھیوں کو مسحور کر دیتا تو خان کو اپنے مال کے اچھے دام وصول ہو جاتے۔

جو بھی اس سے کہتا ساقیا کہ وہ اس کی طرف بڑھتا۔ سینے کے بلٹ سے ایک بوتل کم ہو جاتا اور خان سب کا ڈھکن چٹکی کر کھول دیتا۔ پھر کمر سے گلاس نکال کر آدھا پیگ یا پورا آرڈر کے مطابق گلاس میں ڈال دیتا۔ پھر بلٹ کی ہک سے سوڈے کی کپی نکال کر اس طرح سوڈا کھولتا کہ گٹار کے سروں میں سوڈا بوتل کے کھلنے کی آواز مل کر [illegible]۔ ہاتھ بڑھا کر جب کوئی رند گلاس اس کے ہاتھ سے لے لیتا تو خان کی انگلیاں ابلے ہوئے انڈے کو بڑی پھرتی سے چھلکے سے جدا کر دیتیں اور پل کے نیچے ندی کے شفاف پانی میں چاند کے عکس سے دور سفید چھلکے تیرنے لگتے۔

پل کے کنارے پر بعض نوجوان ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے ناچنے لگتے۔ یہ اٹالین سا ناچ صرف ان کے دلوں کی امنگ اور خان کے میخانے کے اثر کی غمازی کرتا۔ جب ان کے پاس شراب ختم ہونے لگتی یا یوں کہئے کہ یہ چلتا پھرتا میخانہ خالی ہونے لگتا تو خان آخری پیگ ڈیوس کی طرف بطور داد بڑھاتا۔۔ یہ گویا اس کے فن کی قدردانی ہوتی۔

لیکن جب یہ ضلع "خشک" (DRY) قرار دیا گیا تو ندی کے پل پر سجنے والی محفلیں جیسے یک لخت اجڑ گئیں۔

خان کے لئے بڑی مشکل یہ آپڑی تھی — وہ شے جو اس کی شخصیت کے ساتھ وابستہ ہو گئی تھی۔ وہ [illegible] اس کی انفرادیت بن گیا تھا۔ وہی یکلخت اسے ترک کر دینا پڑا تھا۔

دلچسپ خان کے کاروبار میں مے فروشی کا بھی ایک حصہ تھا لیکن اس کو اپنے اس کاروبار کے ترک کرنے سے زیادہ اس بات کا افسوس تھا کہ اس کی وردی کے تمغے چھین گئے تھے اور اب بغیر اس سامان کے اس کی وردی میں کوئی دلکشی نہیں رہتی تھی۔ وہ دو دن تک گھر سے نہ نکلا۔ لوگ بے چین تھے کہ خان کو دیکھیں۔ دو ایک جو قریبی دوست تھے وہ اس کے گھر پر پہنچے لیکن اس کی بیوی نے اندر ہی سے جواب دے دیا کہ خان گھر میں نہیں ہے۔ نامراد واپس ہوئے تو انھوں نے دوسروں کو بتلایا کہ خان گھر پر رہ کر بھی ملنے سے گریز کر رہا ہے۔ تیسرا دن بھی یوں ہی گزر گیا اور خان بستی میں نظر نہ آیا۔

دودھ گھر کی سرسوتی بائی کو سب سے زیادہ فکر لاحق تھی۔ روزانہ پاؤ بھر دودھ اور اتنا ہی دہی صبح سویرے وہ بائی کی دوکان پر کھڑا کھڑا غٹار جاتا تھا۔ تین دن سے اس کے نہ آنے کی وجہ سے بائی جی کو نقصان ہو رہا تھا۔

ڈیوس سب سے زیادہ بے کل تھا۔ چاندنی راتیں قریب آچکی تھیں۔ ایک رات گزرتی تو دوسری رات زیادہ چاندنی اپنے جلو میں لے کر چلی آتی۔ دمکتا ہوا چاند ہر شب ندی کے پانی میں نہانے کے لئے اترتا اور اس کا مکھڑا زیادہ ہی نکھر آتا۔ خان کے دوستوں کی ٹولی دو ایک بار سرِ شام فصیل کے باہر ندی کے پل پر گئی لیکن جلد ہی لوٹ آئی کیونکہ ڈیوس نے اپنا گٹار بھی ساتھ نہیں رکھا تھا۔

ڈیوس نے دل ہی دل میں سوچا — میں جاؤں گا تو خان ضرور مجھ سے ملے گا۔

اور رات گئے عام راستے سے ہٹ کر وہ چکر کاٹتا ہوا خان کے گھر پہنچا کیونکہ درمیان میں دو ایک دوسرے دوستوں کے گھر بھی پڑتے تھے اور ڈیوس چاہتا تھا کہ وہ تنہا خان سے ملے۔

خان کی بیوی نے جب ڈیوس کا نام سنا تو اس کو باہر ہی روک کر وہ دروازے تک چلی آئی۔ اس نے بتایا کہ خان ابھی ابھی گھر سے نکلا ہے۔ وہسکی کا بوتل بھی اس کے ساتھ ہے۔ اس نے بہت منع کیا۔ لیکن خان نہیں مانا۔ وہ ڈر رہی ہے کہ خان گرفتار نہ ہو جائے۔

ڈیوس لمحہ بھر خاموش رہا — پھر اس نے کہا۔

خداوند یسوع اس کی مدد کرے گا۔ خدا کا بیٹا جس نے جنم کے اندھے کو آنکھیں عطا کیں۔

اور ڈیوس سوار ہو گیا۔ اس نے بستی کا چکر کاٹ کر فصیل کے باہر کھیم کی اور سے ندی کا رخ کیا۔ اس کو خیال گزرا کہ خان یقیناً پل پر ہوگا اور تنہا بیٹھا ہوا شراب سے جی بہلا رہا ہوگا۔

ڈیوس لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا جب پل پر نمودار ہوا تو خان نے دااسا لباس وردی پوشی کر کے اس کو پہچان لیا۔ ایک ثانیے کے لئے خوف کی بے دہ خان کے دل سے ہو کر گزر گئیں۔ لیکن اس نے ندی کے پانی میں پتھر پھینک کر چاند کے عکس کو درہم برہم کر دیا اور ڈیوس کو یہ جتانے کی کوشش کی کہ وہ اس وقت بھی نہیں ڈرا تھا جب کہ اس نے ڈیوس کو نہیں پہچانا تھا۔

خان نے گلاس بھر کر ڈیوس کی طرف بڑھایا

لیکن ڈیوس نے ہاتھ بڑھانے میں بہت دیر کی۔

"ڈرتے ہو؟" خان نے پوچھا۔

"ہاں ڈرتا ہوں ——— اس لئے کہ تم اگر اسی راستے پر چلتے رہے تو ملنے جلنے والے تم سے کٹ جائیں گے۔ تمہارے دوست تمہیں پہچان کر بھی نہیں پہچانیں گے۔ اور —— اور اس طرح ہم ایک دوسرے کو کھو دیں گے۔"

"کیا تم ابھی ابھی انجیل پڑھ کر آ رہے ہو؟ تم انجیل مقدس کی تبلیغ بھی اسی ڈھب سے کرتے ہو جیسے اس وقت مجھ سے کلام کر رہے ہو ——" خان یہ کہہ کر ڈیوس کو تیز نظروں سے دیکھنے لگا۔

ڈیوس نے ایک ہی گھونٹ میں سارا گلاس خالی کر دیا۔ "شراب کی قسم میرے بیٹے کا یہ قسمہ نہ ہوا اگر میں تمہیں اس راستے سے ہٹا دوں۔"

"کیا کہتے ہو۔" خان بپھر گیا۔

"یسوع کا کوئی پیرو ایسی بات نہیں کرتا جو میں نے کی ہے۔"

خان "لیکن جو کا نہیں ہے۔ اور یہ بات تم نے اس لئے کی کہ تمہارے کوئی بیٹا نہیں ہے۔"

"اور جو ہوتا تو بھی میں یہی بات کرتا۔" ڈیوس نے کہا۔

"لیکن میں کل تک برا نہ تھا۔ آج کیوں اتنا برا ہو گیا ہوں اور تم مجھے دوستوں سے کنارہ کرنے سے ڈراتے ہو۔"

"تم برے نہیں ہو —— میں نے کب کہا کہ تم برے ہو گئے ہو۔ لیکن تمہیں یہ زمین چھوڑ دینی ہوگی۔ جس کی مٹی سے تم بنے ہو۔ یا پھر یہ راستہ چھوڑ دینا ہوگا جس پر تم چل رہے ہو اور جو اس زمین پر دور تک نہیں جا سکتا۔"

"میں سوچ رہا ہوں۔" خان نے کہا "کہ یہ زمین چھوڑ دوں گا۔"

"لیکن یہ وردی نہیں چھوڑو گے جو تم آج بھی پہنے ہوئے ہو اور جس میں آج بھی وہسکی اور رم کی بوتلیں تم نے لگا رکھی ہیں۔"

"یہ تو میں سوچ رہا ہوں۔ یہ وردی میری اصلی روپ ہے۔ میں اپنے اس لبادے کو چھوڑ کر خود کو ننگا محسوس کرتا ہوں اور بستی میں نکلتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔"

"کہاں جاؤ گے۔"

"میرا ایک بھائی ہے۔ بہت قریب کے ضلع میں۔ جہاں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔"

"اور ہم تمہارے کوئی نہیں ہیں —— یہ ندی —— ندی میں نہاتا ہوا چاند تمہارا نہیں ہے۔" وہ قبیلے جو اس وقت تمہارے قریب نہیں ہیں لیکن کل تمہارا پیچھا کرنے والے ہیں کیا وہ بھی تمہارے نہیں ہیں۔ میرا گناہ رجیسے میں نے تمہاری روپوشی کے بعد چھپا رکھا نہیں ہے وہ بھی تمہارا نہیں ہے۔ تم یہ زمین آسانی سے چھوڑ سکو گے؟ —— تم سمجھتے ہو کہ جب تم جانے لگو گے تو یہ زمین تمہارے پیر نہیں پکڑے گی۔ شراب کی خواہش کس کو نہیں ہے۔ کیا میں اس کا رسیا نہیں ہوں!"

خان کچھ کہے بغیر انڈا چھیلنے لگا۔ اس نے انڈا اپنے منہ میں ڈال کر گلاس کو شراب سے بھر دیا اور ڈیوس کی طرف بڑھا دیا۔ ڈیوس نے اب کی بار تمہید و تنبیہ سے کام نہیں لیا۔ لیکن دونوں خاموش رہے۔ کسی نے ایک دوسرے سے بات نہیں کی۔ جب ڈیوس پی چکا تو انڈا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے خان نے کہا۔

"مجھے عزیز رکھتے ہو؟"

ڈیوس نے کہا "ہاں میں تمہیں بے حد عزیز رکھتا ہوں۔"

خان خاموش ہو گیا۔ اس نے گلاس بھرا اور غٹا غٹ کیا۔ انڈا چھیلتے ہوئے اس نے پھر سوچا۔

"تو تم مجھے عزیز رکھتے ہو"

ڈیوس نے برا مانتے ہوئے کہا۔

"خداوند یسوع نے جب یہی سوال تیسری بار اپنے چیلے سے کیا تو

ضمیر تم سے کیا تھا تو اس کے دل کو تکلیف ہوئی تھی ۔ تم اور میں تو ان کے پاؤں کی خاک بھی نہیں ہیں ۔ اور میں تو بہت چھوٹا آدمی ہوں ۔ پھر بھی تم اپنے جانڈس پر بھروسہ تو کر سکتے ہو اگر نہیں کر سکتے تو زبان کیوں کھولتے ہو ۔ مجھے آزمائش میں مبتلا کیوں کرتے ہو؟"

"اسی لئے کہ میں تم پر بھروسہ کرتا ہوں"

"پھر بتاتے کیوں نہیں؟"

"مجھے پہلے یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیسے آ گئے" خان نے ڈیوس سے پوچھا۔

"جب تم اتنے دنوں سے نہیں ملے تو میں تمہارے گھر گیا تھا ۔ تمہاری بیوی نے مجھ پر بھروسہ کیا ۔ اس نے مجھ سے کہا کہ تم باہر گئے ہوئے ہو اور اسی طرح گئے ہو جس طرح تم روز ہی گھر سے نکلتے تھے۔

خان کا چہرہ چمک اٹھا۔ "اس نے اچھا کیا" وہ کہنے لگا۔ "تم گویا میری مدد کو پہنچے گئے ہو"

"اب بتاؤ بھی ۔ میں تمہارے کیا کام آسکتا ہوں؟"

"لو پھر سن ہی لیں" کچھ دیر توقف کر کے خان پھر کہنے لگا "رنجیت سنگھ کو میں نے زبان دی تھی ۔ اس وقت تک ۔ یہ نیا قانون نافذ نہیں ہوا تھا ۔ اس کے ہی گاؤں میں اس کی بیٹی کی شادی ہے ۔ اس کو نئے قانون کے نفاذ کی اطلاع بھی نہیں ہے کیونکہ وہ دور دراز گاؤں میں ہے ۔ مال اس تک نہیں پہنچے گا ۔ تو اس کی بڑی سبکی ہو گی ۔ میرا آدمی تمہارے ساتھ رہے گا ۔ جسے میں تمہیں شراب کے بیرل لے پہنچانا ہے ۔ اسے ساری باتیں بتلا دینا کہ صبح ہونے تک اگر شراب ختم ہو تو وہ منع نہ کرے ۔ میں سرحد ہی پر رہوں گا تاکہ پکڑا جاؤں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ پولیس کو پتہ چل گیا ہے ۔ وہ مجھے گرفتار کر لے گی تو پھر مطمئن ہو گی اور رنجیت سنگھ تک پہنچنے کی کوئی بھی زحمت نہیں کرے گا۔

"تم خود کو گرفتاری سے نہیں بچا سکتے؟"

"بالکل نہیں ۔ اور اگر بچا لوں تو رنجیت سنگھ کے ناک میں پھنگ پڑ جائے گا مجھے کسی قیمت پر گوارا نہیں ہے۔

"تو پھر اٹھو ۔ خداوند یسوع ہماری مدد کرے گا"

ڈیوس خان سے پہلے کھڑا ہو گیا۔

بچی کھچی انہوں نے ہاتھوں سے بہا دی۔

خالی بوتلیں مٹی ڈال کر انہوں نے جلدی جلدی میں پھینک دیں جو فوراً ڈوب گئیں پل پار کر کے جب وہ جنگل کی طرف روانہ ہوئے تو گھنے درختوں کے سائے میں پہنچنے سے پہلے ڈیوس نے کہا۔

"تم جانتے ہو کہ یہ چاندنی کیا ہے جو تمہارے علاقے میں ساحل سے ملی ہوئی ہے اور جو یہ صدیوں کا راز جانتی ہے کہ ہم کیوں اس کے ساتھ مل کر گھنے جنگل کی تاریکی میں خود کو چھپا رہے ہیں۔"

"ہاں" خان نے سینہ تان کر کہا کہ میں جانتا ہوں۔

"تو پھر مجھ سے وعدہ کرو کہ تم اس زمین کو نہیں چھوڑو گے جس پر تم نے جنم لیا مجھ سے وعدہ کرو کہ یہ چاندنی ہم پر حرام ہو گی اگر وہ کسی اور خطہ زمین پر ہمیں ملے" خان نے ڈیوس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے لئے اور اتنے زور سے دبایا کہ ڈیوس مسکرا کر بھی تڑپ اٹھا ۔ اس نے اپنے ہاتھ خان کی گرفت سے کھینچ کر اس وقت تک جدا نہیں کئے جب تک کہ خان کی گرفت خود ڈھیلی نہ پڑ گئی ۔ اور پھر دونوں روانہ ہو گئے ۔

دیکھتے ہوئے چاند نے اور اس کی پھیلی ہوئی چاندنی نے انہیں تاریکیوں کو سونپ دیا اور پھر صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے ڈیوس اپنے گھر لوٹ چکا تھا۔

اور جب صبح کا سورج طلوع ہوا تو لوگوں نے مجھے بتایا کہ خان گرفتار کر لیا گیا ان بتانے والوں میں سب سے اونچی آواز میں جو بول رہا تھا وہ گیتا رام کا [illegible] تھا جس کا اصلی نام جان ڈیوس تھا لیکن لوگ اس کو جانڈس ہی پکارتے تھے ۔

اس نے مقدس انجیل سے ماخوذ قانائے گلیل میں شادی کا قصہ سنایا تو سب کے سب اسی کا منہ تک رہے تھے ۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ڈیوس کسی نئی بات کا انکشاف کرے گا ۔ لیکن اس نے ٹھنڈی سانس لی جو زیادہ لمبی نہ تھی اور کہنے لگا ۔

"یوحنا رسول کی معرفت لکھی گئی انجیل مقدس کی قسم خداوند یسوع خان کی مدد کرے گا ۔

صبح سویرے جب خداوند یسوع ہیکل میں آیا اور سب لوگ اس کے پاس آئے اور وہ بیٹھ کر انہیں تعلیم دینے لگا اور فقیہ اور فریسی ایک عورت کو لائے جو زنا میں پکڑی گئی تھی اور اسے بیچ میں کھڑا کر کے یسوع سے کہا ۔ اے استاد یہ عورت زنا میں عین فعل کے وقت پکڑی گئی ہے ۔ توریت میں موسیٰ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ایسی عورتوں کو سنگسار کریں ۔ پس تو اس عورت کی نسبت کیا کہتا ہے ...... یسوع جھک کر انگلی سے زمین پر لکھنے لگا۔

وہ یہ سن کر بڑوں سے لے کر چھوٹوں تک ایک ایک کر کے سب نکل گئے ۔ اور یسوع اکیلا رہ گیا اور عورت وہیں بیچ میں رہ گئی یسوع نے سیدھے ہو کر اس سے کہا اے عورت یہ لوگ کہاں گئے؟ کیا تجھ پر کسی نے حکم نہیں لگایا؟ اس نے کہا اے خداوند باقی

اُردو زبان کی اہم اور مُفید کُتب

کتاب	مصنف	قیمت	کتاب	مصنف	قیمت
آبِ حیات	محمد حسین آزاد	۹/-	انتخاب طلسم ہوشربا	حسن عسکری	۱۶/-
سخندانِ فارس	"	۱۲/۵۰	اردو شاعری میں قومی یکجہتی کی روایت	سید مجاور حسین	۲۰/-
مبادیٔ فلسفہ	عبدالماجد دریابادی	۱۰/-	اردو میں قومی شاعری کے سو سال	علی جواد زیدی	۱۴/-
گنجینۂ تحقیق	بیخود موہانی	۱۰/۵۰	خواب خواب سفر	رام لعل	۷۵/-
یادگارِ غالب	الطاف حسین حالی	۸/-	زرد پتوں کی بہار	"	۱۳/-
بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں	مرزا جعفر حسین	۳/-	معصوم آنکھوں کا جرم	"	۱۰/-
دلی کا دبستانِ شاعری	نورالحسن ہاشمی	۲۲/۵۰	اردو میں خود نوشت سوانح حیات	ڈاکٹر صبیحہ انور	۷۵/-
اردو مثنوی کا ارتقاء	سید عقیل رضوی	۱۵/-	نئے افسانے کا سلسلۂ عمل	مہدی جعفر	۳۰/-
اردو مرثیے کا ارتقاء	مسیح الزماں	۲۰/۵۰	لو لیے	اوپندر ناتھ اشک	۱۵/-
اردو تنقید کا ارتقاء	"	۶/-	انجو باجی	"	۳۰/-
اردو قصیدہ نگاری تنقیدی جائزہ	محمود الٰہی	۱۵/۵۰	گرداب	"	۱۵/-
ساغر نظامی شخصیت اور فن مع انتخاب کلام	ضامن مرادآبادی	۴۵/-	جنت کی تلاش	"	۲۰/-
جگر مرادآبادی ایک مطالعہ	"	۲۵/-	منٹو میرا دشمن	"	۱۵/-
خطبۂ صدارت سے	ضیاء فتح آبادی	۱۵/-	گرتی دیواریں	"	۷۵/-
ہندی کے مسلمان شعراء	رتن پنڈوروی	۵/-	چھوٹا بیٹا	"	۱۵/-
سرمایۂ بلاغت	"	۴۰/-	سکھ دکھ	کوشلیا اشک	۱۵/-
فنِ تاریخ گوئی	"	۱۵/-	پینترے	اوپندر ناتھ اشک	۱۵/-
سر مغفرت منظوم ترجمہ گیتا	"	۱۲/-	پتھر الپتھر	"	۲۰/-
آخری نظر شاعری	"	۱۵/-	تبصرے	کریمی الاحسانی	۳۰/-
بہشتِ نظر	"	۲۰/-	ادب کی تلاش	بلراج کومل	۳۰/-
پیامِ نظر	"	۱۵/-	صبح و شام	ل۔ احمد اکبرآبادی	۱۲/۵۰
اندازِ نظر	"	۱۵/-	زندگی کے کھیل	"	۱۲/۵۰
رباعیاتِ رتن	"	۵/-	ملاحظات نفسی	"	۴/۵۰
شفق سحر	باقی	۲۵/-	ادبی تاثرات	"	۱۸/۷۵
غزلیاتِ جمیل	جمیل مظہری	۲۵/-			

کتاب	مصنف	قیمت	کتاب	مصنف	قیمت
مشارق ادب	ساحل احمد	۲۰/-	نتھ کا غرور	واجدہ تبسم	۳۰/-
وہ فقیر اور	بمل کرشن اشک	۱۰/-	نتھ اتروائی	〃	۳۰/-
سحر حرف	ساحر ہوشیارپوری	۲۰/-	سنگسار کمرے میں	کرشنا کماری	۱۰/-
سحر نغمہ	〃	۱۵/	اسلامی نام	مکتبہ دینیات	۱۶/-
اردو کی عشقیہ مثنویاں	شہناز سلطانہ	۱۴/-	روشنی کے مینار	بزرگوں کے حالات	۲۰/-
اپنا دامن اپنی آگ	کیول دھیر	۳۶/-	آئینۂ عملیات		۲۰/
بکھری ہوئی زندگی	〃	۳۰/-	اندھیری رات کے مسافر	نسیم حجازی	۲۰/-
اعتراف	گوہر عثمانی	۲۵/-	داستان مجاہد	〃	۲/-
غزل سانوری	بیکل اتساہی	۳۰/-	پاکستان ایکسپریس	خوشونت سنگھ	۳۰/-
چراغِ منزل	دواکر راہی	۲۵/-	ذکالی	مظہر الحق علوی	۱۸/-
گلدستہ (مشاعرے)	عروجِ ادب	۱۵/-	سورج کا لہو	〃	۳۶/-
روحِ نظیر	نظیر اکبرآبادی	۲۰/۵۰	اندر کا آدمی	الیاس سیتاپوری	۱۸/-
پل صراط	موسیٰ مجروح	۲۵/-	حرم سرا کا محبوب	〃	۱۵/-
پراسرار افسانے	سردار حسین	۲۰/-	حرم سرا	〃	۱۵/-
کتابِ غزل	حفیظ بنارسی	۲۵/-	چاند کا خدا	〃	۱۵/-
لحنِ جگر	جگر جالندھری	۱۰/۲۵	دیوی کے پرستار	〃	۱۵/-
خونِ جگر	〃	۲۵/-	راگ کا بدن	〃	۱۰/-
شہید انسانیت	علی نقی نقوی	۴۰/-	شہزادی کا نیلام	〃	۱۵/-
آدھا راستہ	کرشن چندر	۱۶/-	بالاخانے کی دلہن	〃	۱۵/-
اجنبی لڑکی کالے بال	〃	۱۵/-	داستانِ حور	〃	۱۵/-
جیسے دریا	واجدہ تبسم	۲۶/-	عجائب خانۂ عشق	〃	۱۵/-
پھول کھلنے دو	〃	۳۰/	کشمیر کی کلی	〃	۱۶/-
اترن	〃	۳۰/-	یادوں کی برات	جوش ملیح آبادی	۴۰/-
کیسے سمجھاؤں	〃	۱۶/-	غبارِ شب	قاضی عبدالستار	۱۶/-
روزی کا سوال	〃	۱۵/-	چار چہرے	سہیل عظیم آبادی	۱۲/-
کیسے کاٹوں رین اندھیری	〃	۱۵/-	حرفِ زیرِ لب	عفت بانو زیبا	۶/-
نتھ کا بوجھ	〃	۳۰/-	ہنوز شیشۂ گراں	کیسرہ کشور	۱۲/-
نتھ کی عزت	〃	۳۰/-	ڈالی کا جوگ	حامد اللہ افسر	۱۵/-
نتھ کا زخم	〃	۳۰/-	خودگزشت	برجیس طلعت	۱۵/-

دفتر ماہنامہ شانِ ہند - فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

احمد حسین شمس ایڈوکیٹ
دکشن گنج،

اور دھرتی کانپ اٹھی

چھٹی قسط

لوگوں نے ہر شعر پر دل کھول کر داد دی، میاں فہمی پھولے نہ سمائے ہر شعر پر جھک جھک کر سلام کرتے ہیں اور داد طلب نگاہوں سے اپنے دوستوں کو دیکھتے ہیں مگر دوستوں کو شعر کے حسن و قبح سے کیا نسبت، انہیں تو ایک مشغلہ ملنا چاہئے خوب خوب داد دی گئی مجلس کا رنگ بدل گیا کشن لال اپنی قسمت پر ناز کرنے لگے حسین بخش شعر سنتے جاتے اور اپنے ہاتھ فرش پر مارتے جاتے تھے بیچ بیچ کر داد دے رہے تھے وہ۔

تھوڑی دیر کے بعد مجلس شانت ہوئی۔ نوکر نے آکر کہا سب ٹھیک ہے سب دسترخوان پر جا بیٹھے کھانا کھاتے وقت بھی فہمی شعر گوئی سے باز نہ آئے کھانے کے ہر ہر آئیٹم پر انہوں نے ایک ایک شعر فی البدیہہ کہا احباب لطف لے لے کر کھا بھی رہے تھے اور شعر بھی سن رہے تھے۔

کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے دس بج گئے گوپال گنج کے احباب نے رخصت چاہی، فہمی نے پھر آئندہ سنیچر کو ملنے کا وعدہ کیا اور پھر ایک ایک کر کے تمام دوست رخصت ہو گئے اب اس جگہ رہ گئے صرف میاں حسین بخش۔

حسین بخش نے کہا۔ کشن لال اب مجھے بھی جانے دو۔

"یار ٹھہرو بھی ابھی دعوت خصوصی تو ہوئی ہی نہیں۔"

"بیگم راہ دیکھ رہی ہوں گی۔"

"ٹھیک کہا تھا فہمی نے واقعی تم زن مرید ہو۔"

"مگر رات زیادہ ہو رہی ہے۔"

"زمانے میں شیر تو نہیں بیٹھا ہے کہو تو تمہاری فٹن واپس کرادوں اور کہلوا بھیجوں۔"

"کہ آج رات میاں صاحب یہیں قیام کریں گے حسین بخش؟ اسے ان سوال کر آئیں ان دنوں تنہا ہوں میں بھی پریشان رہتا ہوں اور تم بھی خانگی معاملات میں الجھے رہتے ہو آج موقع ملا ہے ذرا دل کھول کر ہنس بول تو لیں۔

حسین بخش نے کہا۔ بات تو مجھے بھی تم سے کچھ کرنی ہے اچھا ذرا کوچوان کو آواز تو دینا۔

کوچوان کے آنے پر میاں حسین بخش نے اسے فٹن واپس لے جانے کو کہا وہ آج رات یہیں قیام کریں گے۔

بیٹھک سے اٹھ کر یہ دونوں دوست کشن لال کے خاص کمرے میں آئے یہ کمرہ تو عروس کی طرح موجودہ ساری آرائشوں سے مزین تھا حسین بخش پلنگ پر لیٹ گئے۔

کشن لال نے کہا۔ ذرا ٹھہرو میں بھی کھانے سے فارغ ہو لوں

"میں یہاں اکیلے بیٹھا رہوں"

"نہیں جناب دل بہلانے کے سامان بھی ہیں" کشن لال، یہ کہہ کر واپس چلے گئے اور تھوڑی دیر کے بعد حسین بخش کے کانوں میں پائل کی سرور آمیز جھنکار آنے لگی وہ اٹھ بیٹھے اور گھبرا گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے ابھی وہ ادھر ادھر جھانک ہی رہے تھے ایک حور وش دوشیزہ زیوروں سے آراستہ پیراستہ ناک میں ایک بڑا سا نتھ پہنے دروازے پر کھڑی تھی میاں حسین بخش اچھل پڑے۔ پائل [illegible] اتر کر دو قدم آگے بڑھ کر حسینہ نے [illegible] جھک کر سلام کیا۔

"اچھا تو آپ ہیں جس کے لئے کشن لال نے مجھے روک رکھا ہے"

اور انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اس حسینہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"ایک ادائے معشوقانہ کے ساتھ اس حسینہ نے کہا۔ آپ کی کنیز"

"کنیز نہ کہئے آپ تو حسن و شباب کی وہ دیوی ہیں جس کی پوجا کرنا عین ثواب ہے۔ آپ کنیز نہیں ملکہ ہیں کیا نام ہے آپ کا ...؟" حسین بخش کے دل میں ایک عجیب گدگدی پیدا ہو رہی تھی وہ بے تحاشہ ہنسنا چاہتے تھے۔ مگر [illegible]

ضبط سے کام لیا دل ہی دل میں کشن لال کے حسن انتخاب کی داد
ں دے رہے تھے۔

"مجھے زہرا کہتے ہیں"

ابھو گوپال گنج کی مشہور مغنیہ آئیے تشریف لائیے آپ کو میرے
پاس پلنگ پر بیٹھنے میں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔

"آپ ہم سے زیادہ میری عزت افزائی کر رہے ہیں کہاں آپ
بال میں" حسینہ شرمائی جا رہی تھی۔

آپ کو دیکھ کر میں اپنی قسمت پر ناز کرتا ہوں آپ نے میرے
خیال نغمہ چمن میں بپا بدلا دی ہے جی چاہتا ہے آپ کو سینے سے لگا لوں"
اور حسین بخش نے کچھ ایسا ارادہ بھی ظاہر کیا حسینہ ہاتھ چھڑا
کے جا کھڑی ہوئی ہاں وہ پیشہ ستر سے سرک کر زمین پر آ رہا حسین بخش
نے خود جھک کر اسے اٹھایا اور حسینہ کو لے کر پلنگ پر بیٹھ گئے۔

"حسین بخش نے کہا۔ آپ کے حسن کی شہرت سن کر بھی کتنی کر
رات دیے اور آج نصیب ہوا آپ انسان نہیں چاند کا ٹکڑا ہیں جیسے
شراب اور شہد میں گھول کر انسانی شکل و صورت میں خدا نے پیش کیا
یہ قدرت کی صناعیوں کا بہترین نمونہ اور پھر آپ کا شباب ماشاءاللہ
شراب کی چھلکتی ہوئی مینا"

"اب آپ شاعری کرنے لگے" زہرہ مسکرائی اور ایک ایسا
رنگ جو بالکل مصنوعی تھا اپنے چہرے پر لانے کی کوشش کی زہرہ ایسے
روز ایسے ایسے تعریفی اور خوشامدانہ جملے سنتے سنتے بہری ہو گئی
نہ ہر عاشق نے اس کے حسن کی تعریف کی ہر شخص اس سے محبت
بے پایاں دم بھرتا تھا ہر رات زہرہ کے خلوت کدے میں ایک
عاشق آتا اور چند گھنٹے دل بہلا کر رخصت ہو جاتا تھا ہاں جاتے
وقت چاندی کے چند سکے اس کی طرف پھینک بھی جاتا تھا زہرہ
جنس شباب کا سودا چاندی کے چند سکوں پر کرتی ماحول
نے اسے یہ سمجھنے پر مجبور کر رکھا تھا کہ عصمت درحقیقت دولت ہی
دوسرا نام ہے مرد روپے لٹاتے اور وہ اپنی جوانی لٹاتی تھی اور
پھر دنیا جہان سے بے خبر دوسری شب کے انتظار میں سو رہتی تھی
ہاں وہ اپنے طوائف تھی اس پر ہر مرد کا حق تھا وہ اس قوم کی
ایک فرد تھی جسے سماج بری نظروں سے دیکھنے کے باوجود اس
کے قدموں پر سر رکھتا تھا اس کے خلوتیاں راز شہر کے اوباش اور امرا

ہی قسم کے لوگ نہ تھے بلکہ ہر قسم کے انسان زمیندار سے لے کر
بیاہ، مجسٹریٹ بھی اور بیراسٹر بھی، وکیل مختار ساہوکار سوداگر سے
لے کر لیڈران قوم تک ہر شخص اس کی شمع جہاں سوز کا پروانہ تھا
جس کی جیب میں روپے ہوں وہ اس سے دل بہلا سکتا تھا زہرا
جیسے بڑے شہر ہر برہمن کی قید نہ تھی وہ ایک بہتی گنگا تھی جس
ہر شخص ہاتھ دھو سکتا تھا اور جو بھی آیا اس نے اس کے حسن کی
تعریف کی اس قسم کے تعریفی جملوں سے زہرہ شروع شروع میں
بہت محظوظ ہوتی تھی مگر رفتہ رفتہ اسے جلد یاد ہو گیا کہ ہر مرد اسی
قسم کے جملے بولتا ہے اور اس کا مقصد صرف اس کے جسم سے لطف
اندوز ہونا ہوتا ہے وہ اپنا حسین موقع جو چند منٹوں کے بعد
بالکل عریاں ہو جاتا تھا ہر شخص کے پاس پیش کرتی تھی اور
جب مرد کی تشنگی اس کی پیش کی ہوئی شراب سے رفع ہو جاتی تو
پھر وہی مرد دوسرے دن طوائفوں کے خلاف تقریریں کرتا اور بڑے
بڑے مدلل مضامین شائع کراتا تھا چند برسوں کی اس متضاد
تجربوں نے زہرہ کو بالکل بے حس بنا ڈالا تھا اب ایسے میٹھے میٹھے
جملے سے وہ قطعی متاثر نہ ہوتی تھی۔ مگر ان لالچی اور مغلوب
الشہوت مردوں کو خوش کرنے کے لئے وہ بھی انھیں جملوں کا اعادہ
کرتی جیسے وہ بارہا بول چکی تھی۔

میاں حسین بخش نے کہا۔ میں شاعری نہیں کرتا یہ ایک حقیقت
ہے جو بے ساختہ زبان پر آ گئی۔ واقعی خدا نے آپ کو حسن دل
آویز بخشا ہے کہ بذات خود جان غزل ہیں آپ کے تو بشکن حسن کو
دیکھ کر فرشتوں کے منہ میں بھی پانی آ جائے۔ یہ کوئی غیر ممکن نہیں۔

حسین بخش نے اسے اپنی آغوش کی طرف کھینچا یہ فوراً ان سے
دور کھسک گئی اور اس ادا سے ان کی طرف مسکرا کر دیکھا کہ حسین
بخش کلیجہ تھام کر رہ گئے۔ انھوں نے کہا۔ خدا جب حسن دیتا ہے
نزاکت آپ ہی آ جاتی ہے"

"زہرہ نے مسکرا کر کہا۔ آپ بہت جلد موج میں آ گئے"

"آپ کو دیکھ کر صبر کی تاب کہاں کسے رہتی ہے"

"ذرا ٹھہریے ابھی ابھی بابو کشن لال آئے ہوں گے"

"تو کیا آپ کو میرے صبر کا امتحان مقصود ہے"

"نہیں بلکہ بابو صاحب کا انتظار"

"تو یہ کہیے آپ کو کشن لال منظور نہیں ہاں بھئی کیوں نہیں میرے چہرے پر بالشت بھر داڑھی جو ہے اور کشن لال تو سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہو گیا ہے —"

"کیسی بات کہتے ہو حسین بخش" کہتے ہوئے کشن لال کمرے میں داخل ہوئے "یہ زہرا بائی تمہاری نذر ہیں رات بھر تم اس کوہ قاف کی پری کے ساتھ اڑتے رہو گے اس پری کی صحبت اٹھانے سے پہلے لال پری کی بھی صحبت از بس ضروری ہے کیوں؟"

"واہ واہ کیا بات کہہ دی کشن لال تم نے" حسین بخش بول اٹھے۔ اب میں دعوت خصوصی کا مفہوم سمجھا واقعی کشن لال چراغ لے کر ڈھونڈو تو بھی تمہارے جیسا ہمدم و ہمراز نہ ملے ایک تو بذات خود زہرا بائی بھی شراب تھیں اس پر تم نے ...."

"شیمپین ہے حسین بخش پیو گے تو بس جھوم اٹھو گے۔"

"ارے بھائی کشن لال تم نے تو مجھے بے داموں خرید لیا اتنا نوازتے ہو کر مجھے .... شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔"

"بس تمہارا بچپن آ گیا ارے بھئی یہ دولت آخر کس دن کام آئے گی آج ہی سلیم سیٹھ کی ساری چیزیں میں نے ہڑپ کر لی ہیں تمہارا ڈیڑھ سو روپیہ بھی ادا ہو گیا اور نقد میں مجھے ...."

"اچھا تو ڈیوٹا تم کہتے جس کی تعریف میں وہ رطب اللسان ہے اسے لیتے نہیں سوداگری)۔

"میں نے کہا — آج اس خوشی میں ایک بہترین پارٹی ہو۔ ہاں تو شراب میں سوڈا ملا دوں؟" کشن لال نے پوچھا۔

"میں تو شراب میں سوڈا ملانا حرام سمجھتا ہوں اس کی ساری تلخی دور ہو جاتی ہے"

"اچھا تو یوں ہی سہی"

"اور پھر یو ڈی کا کاگ کھلا سرخ سرخ شراب بلوریں ساغر میں لہرانے لگی زہرا بائی ساقی بنی اور یہ دونوں دوست اس کے دست نازک سے شراب لے کر ایک دوسرے کے جام صحت پینے لگے

"کشن لال نے کہا۔ حسین بخش تم ایک شادی کر لو۔"

"کیا زہرا بائی سے؟"

"زہرا بائی تو خیر اپنی ہیں ان میں تو ہم دونوں کا حق مساوی ہے اگرچہ آج رات بھر کے لئے یہ صرف تمہاری ہیں مگر میرا مقصد ہے تم کسی حسین نوجوان لڑکی سے شادی کر لو شاید بھگوان خوش ہو کر تمہیں کوئی اولاد بخش دے آخر تمہاری جائداد کا وارث تو ہونا چاہیے۔"

"آج مولوی عنایت اللہ نے بھی یہی بات کہی تھی، انھیں میں نے ہی تمہارے پاس بھیجا تھا عشرتی نام کی ایک لڑکی ہے۔ بس زہرا بائی سے ذرا انیس ہوں گی۔ دیکھو گے تو رام قسم لٹو کی طرح ناچنے لگو گے۔"

"ایک گھونٹ پی کر حسین بخش نے کہا۔ سیر دم ہو تو مایۂ خوش ہوا شراب پی کر جب دونوں دوست کافی نشے میں آ گئے تو دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر ناچنے لگے زہرا ان دونوں کی حرکت دیکھ کر دل ہی دل مسکرا رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد کشن لال شب بخیر کہہ کر لڑکھڑاتے ہوئے کمرے سے نکل گئے زہرا نے اندر سے دروازہ بند کر لیا اور پھر وہ حسین بخش کی آغوش میں تھی رات کی تنہائی اور زہرا کے شباب فرشتوں نے آنکھیں موند لیں عزازیل مسکرایا ہوگا۔

غزل

سوز باندوی

سرمایۂ حیات ہیں میری غزل کے شعر
محتاجِ التفات ہیں میری غزل کے شعر

اک ربطِ خاص ہے جنہیں فکر و نگاہ سے
وہ روحِ کائنات ہیں میری غزل کے شعر

یہ ختم کر دیں گے دعوتِ نظارۂ جمال
محسنِ تخیلات ہیں میری غزل کے شعر

تعمیرِ زیست بھی ہیں یہ تخلیقِ زیست بھی
اک شرحِ کائنات ہیں میری غزل کے شعر

سنئے گا آپ ان میں صدائے شکستِ دل
غمہائے کائنات ہیں میری غزل کے شعر

اے سوز اہلِ زیست کو معلوم ہی نہیں
گنجینۂ حیات ہیں میری غزل کے شعر

اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کا ایوارڈ یافتہ اور ملک بھر کی لائبریریوں میں، نیز ممالک غیر میں اُردو دانشوروں سے خراجِ تحسین پانے والا۔ قومی یکجہتی کے مقبول ترین اُردو افسانوں کا مجموعہ

مان سروور

(مصنف: ڈاکٹر اودے سرنے ارمان بلاروی)

جس کا ہندی ایڈیشن شائع ہو کر داد و تحسین کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ اب مان سرووَر کا انگریزی ایڈیشن بھی منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو گیا ہے۔ انگریزی ایڈیشن میں انگلینڈ کے دو مشہور انگریز دانشوروں کی تقاریظ مطالعہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ جن میں ان انگریز مصنفین نے مان سرووَر کے دیہاتی ماحول کے آئینہ دار قومی یکجہتی پر مبنی افسانوں کو خوب خوب سراہا ہے۔

ڈاکٹر ارمان خالص دیہاتی ماحول میں دجہاں دُور دُور علم کے بارے میں خاموشی ہی خاموشی ہے) رہ کر اُردو کی شمع جس انداز میں جلائے ہوئے ہیں وہ اپنی جگہ پر قابل داد ہے۔ ڈاکٹری اور کاشتکاری ایسے مصروفیت پیشے سے متعلق ہونے کے باوجود ارمان صاحب اُردو کی جو خدمت کر رہے ہیں اُسے اُردو کے دشمنوں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ بہت جلد ڈاکٹر ارمان صاحب کے اُردو افسانوں کا دوسرا مجموعہ

ہر بار کہا دل نے

ادارہ شانِ ہند شائع کر رہا ہے۔ یہ مجموعہ ظاہری و باطنی خوبیوں کے باعث انشاء اللہ اس سال کا بہترین افسانوی مجموعہ ہوگا۔

مان سرووَر اُردو	ہندی ایڈیشن	انگریزی ایڈیشن
۲۱ روپے	۱۵ روپے	۲۵ روپے

دفتر شانِ ہند فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مظفر حنفی

الماس کا محبوب!

اتنے دن انتظار کرنے کے بعد مجھے محبوب کا خط ملا لیکن
ہماری شادی کی دعوت کے اس نے کچھ اور ہی لکھا تھا۔

لیکن نہیں، میرا خیال ہے یہ داستان میں نے غلط طور پر
شروع کر دی ہے۔ پہلے مجھے آپ کو محبوب سے متعارف کرانا چاہئے۔

ان غدار شہروں سے دور، گنگا کی شاداب وادی کے دامن
میں ایک بہت چھوٹا سا موضع ہے جس کا نام ہے الماس۔ پورا
نام تو پورہ الماس تھا جسے ایک زمیندار نے اپنی اکلوتی بیٹی
الماس کے نام پر آباد کیا تھا لیکن آج کل وہ صرف الماس
ہی کہلاتا ہے۔ یہ درحقیقت ایک ایسا رومان پرور مقام ہے
کہ شہر کے ہیجان آفریں ماحول سے گھبرائی ہوئی مضطرب روحیں
اگر وہاں پہنچ جائیں تو انھیں وہ شے، وہ سکون دل جس کا نام ہے
اور جو ان شہروں میں عنقا ہے۔ بافراط وہاں دستیاب ہوگی۔

اپنے ذہن میں ایک ایسے مقام کا تصور کیجئے جو پیاری پیاری
اور نیلے نیلے سبز پوش ٹیلوں سے گھرا ہوا ہو، چمکیلے آبشار جن
کی بلندیوں سے کود کر زمین کو چومتے ہوں، خوشبودار خود رو پھولوں
کے تختے جن کی فضا کو رنگین و معطر رکھتے ہوں۔ شفاف میٹھے پانی
کی جھیلیں جن کے سینے پر نگینوں کی طرح چمکتی ہوں، خوش رنگ
خوش گلو شوخ پرندے جہاں چہچہاتے پھرتے ہوں۔ ندی کے
کنارے ان خوبصورت سرسبز پودے حسین دوشیزاؤں
کی طرح پانی میں جھک جھک کر اپنا عکس دیکھنے کی کوشش کرتے
معلوم ہوتے ہوں۔ جہاں قوس قزح اپنے تمام رنگ فراخدلی
سے بکھیر دیا کرتی ہو اور گلابی شفق اپنے سہاگی رنگ میں رنگ کر
فضا کو ایک نئی نویلی شرمیلی دلہن بنا دیا کرتی ہو۔ جہاں
چاند تارے اپنی نورانی تابانی سے جگمگا کر لوگوں کے دلوں میں
سنہرے سپنوں کی جوتیں جگاتے ہوں اور مہتاب اپنی چمکیلی کرنوں
سے وادی کو نور میں نہلائے رکھتا ہو اور جہاں سورج
چمک چمک کر جھرنوں کے نیلے پانی میں اپنی مہربان سنہری کرنوں
سے چاندی گھولا کرتا ہو۔ لطیف عطر بیز ہوائیں جہاں دلوں کو
تازگی اور طراوت بخشتی ہوں۔ مزیدار لطیف اور رسیلے پھلوں
کی بو سے آسودگی حاصل ہوتی ہو۔ اور حدِ نگاہ تک ہری بھری
لہلہاتی ہوئی کھیتیاں اور پکے ہوئے اناج کی سنہری بالیاں بھولے
بھالے کسانوں کے دلوں کو پھول کی طرح کھلائے رکھتی ہوں۔ سبزہ
[illegible] شوخ ہرنوں کی ڈاریں کلیلیں کرتی پھرتی ہوں جہاں
کے باشندے مکر و ریا کے نام سے بھی نا آشنا ہوں محبت
جن کی زندگی ہو، جن کے دل خلوص سے معمور ہوں، جہاں ہندو
مسلمان نہیں صرف انسان بستے ہوں۔ جہاں کی بھولی بھالی
البیلی دوشیزائیں، محبت، عفت اور پاکیزگی کے زندہ مجسمے ہوں
جہاں ہر چہار طرف خوشی ہو۔ محبت و مسرت، مساوات اور زندگی
ہو اور امن ہو۔

اگر آپ کے تخیل میں ایسا کوئی گوشہ ابھر سکے تو وہ الماس کا
ایک دھندلا سا عکس ہوگا۔ اور محبوب اسی موضع کا ایک بھولا
بھالا نوجوان ہے۔

میری اس سے ملاقات بھی بہت عجیب و غریب حالات میں ہوئی۔

گزشتہ سال مجھے بھی شکار کا خبط سوار ہوا تھا اور میں
اپنی بندوق لے کر انجانی منزلوں کی طرف جا پڑا تھا اور پھر
بھٹکتے بھٹکتے اس فردوس مقام پر جا نکلا تھا۔

وہ ایک بڑا ہی حسین دن تھا۔ ڈاک بنگلے سے نکل کر اپنی
بندوق لئے ہوئے میں ان نیلی پہاڑیوں میں سے ایک کی چوٹی پر
کھڑا ہوا میٹھے پانی کے آبشاروں کی روانی سے آنکھیں سیراب
کر رہا تھا۔ نہ جانے اس بے فکر لاپرواہ چشمے کو کس شے کی
جستجو ہے کہ جس کے لئے یہ پہاڑیوں کو کاٹتا، چٹانوں پر سر پٹکتا
گہرائیوں میں کودتا، لپکتا، پیچ و تاب کھاتا ہوا، پھر کہیں
گنگناتا، اٹکھیلیاں کرتا، خود رو حسین پودوں کو چھیڑتا ہوا
ایک نامعلوم منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ [illegible] یہ محویت

اس وقت ٹوٹی جب سامنے والی گہری چمکیلی نیلی جھیل میں سفید چمکدار پروں اور گلابی پیروں والے نازک نازک چیزوں کا ایک جھرمٹ نظر آیا۔ اور میں اپنی بندوق سنبھالے ہلکے ہلکے ڈگ بھرتا جھاڑیوں سے الجھتا۔ چھوٹے چھوٹے چشموں کو پھلانگتا اس جھیل کے قریب پہنچ گیا۔ جیسے کچھ چونکنے سے ہوگئے تھے مجھے ڈر تھا کہیں اڑ نہ جائیں۔ جھیل کے آس پاس کوئی مینڈھ بھی نہ تھی جس کی آڑ لے کر میں ان کی نظروں سے پوشیدہ رہتا۔ پاس ہی دو کانٹے دار ہری جھاڑیوں کے بیچ کچھ خالی جگہ نظر آئی اور دوسرے لمحے میں ان کے درمیان تھا۔ میری قمیص پر جس جگہ جگہ سے پھٹ رہ گئی تھی جلد پر بھی کہیں کہیں خراشیں آ گئی تھیں لیکن مجھے اس کی چنداں پرواہ نہ تھی۔ سوچتا تھا اس شاندار غول کے سات آٹھ شیئے بھی اگر ہاتھ لگ گئے تو ساری محنت وصول سمجھوں گا۔ جلدی سے بندوق کو ڈکی نشست لی اور دبا دی۔!

بندوق کی آواز سے آس پاس کی ساری پہاڑیاں گونج اٹھیں، جھیل کے کنارے کھڑے ہوئے تناور درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے سہمی ہوئی آواز میں پیدا کر کے فضا میں منڈلانے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اس پگھلے ہوئے سونے کی جھیل کے کنارے کھڑے ہوئے یہ پہریدار درخت ایک اجنبی شکاری کی گستاخی پر آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہوں کہ اس کی کیا سزا ہو سکتی ہے ـــ آسمان پر شفق پھولی ہوئی تھی۔

جھیل میں سات آٹھ زخمی پنچھی پھڑپھڑا رہے تھے ان کے باقیماندہ ساتھی فضا میں ادھر ادھر پرواز کرتے ہوئے جھیل کے گرد چکر کاٹ رہے تھے۔ بندوق وہیں کنارے چھوڑ کر میں نے جھیل میں چھلانگ لگا دی اور تیرتا ہوا اس خشک مقام پر پہنچا جو جھیل کے عین وسط میں تھا۔ پنچھیوں کو ادھر ادھر سے نکال کر ذبح کیا اور بیگ میں رکھ لیا اور پھر دوبارہ کنارے پر پہنچنے کے لئے پانی میں اترا۔ دو ہی چار قدم چلا تھا کہ کوئی چیز ٹانگوں سے لپٹ گئی غوطہ لگا کر چھڑانے کی کوشش کی تو ہاتھ بھی پھنس گئے۔ پھر میں نے جتنے زیادہ ہاتھ پیر پھینکے پانی کی اس بیل میں اتنا ہی الجھتا چلا گیا۔ جلدی میں ڈبکیاں لگانے اور پانی پینے لگا۔ بمشکل تمام سر پانی سے نکال کر ابھرنے کی

کوشش کی لیکن پیٹھ پر لدے ہوئے وزنی جھولے اور جسم
پرانی بیل نے اجازت نہ دی۔ ڈوبتے ہوئے آسمان
کو پھیلی ہوئی شفق خون برساتی ہوئی پھر میری آنکھوں
کا گیلا اندھیرا چھاتا گیا ـــ!

پیٹھ میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں اور سینے پر بوجھ
ہوتا تھا۔ بمشکل تمام آنکھیں کھولیں، کوئی دھندلی سی
سینے پر چڑھی بیٹھی تھی۔ پہلا خیال جو اس وقت میرے
آیا۔ یہ تھا کہ میں مر چکا ہوں اور یہ وہی مشہور زمانہ
اور نکیر ہیں جو مرنے کے بعد براہ راست مردے سے
شروع کرتے ہیں۔ آنکھیں جھپکاتے ہوئے میں نے
ڈالا اور کلمہ پڑھنے لگا۔

• شکر ہے تمہیں ہوش آگیا۔ مجھے متواتر ایک گھنٹے تک
پیٹ کے پانی نکالنے کی کوشش کرنی پڑی ہے۔ میرے
آواز آئی اور بوجھ میرے سینے پر سے ہٹ گیا۔ اس بار میں
طرح آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اور میرا دل احساس مسرت سے
آہ میرے خدا! میں تو اپنی اسی جیتی جاگتی رنگین اور حسین د
شاید مجھے ڈوبنے سے بچا لیا گیا تھا۔

چاند نکل آیا تھا اور پوری رعنائیوں کے ساتھ آسمان
تھا۔ اس کی نورانی شعاعوں کے د... ن میں نے اپنے اوپر
اس سڈول بدن والے شکیل نوجوان کو دیکھ لیا جو سفید چادر
ہوا کسی دوسری ہی دنیا کی مخلوق معلوم ہوتا تھا۔ میں نے
گرم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا۔

• تم نے مجھے ڈوبنے سے بچا لیا ہے دوست! ـــ میں کس
تمہارا شکریہ .... • اس نے بیچ ہی میں میری بات کاٹ
• تم شہریوں میں پائی جانے والی یہی عادتیں تو خراب ہوتی
اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو کیا" تمہیں ڈوب جانے دیتے۔؟!
شکریے کی بات ہے؟"

میں اس کی سادہ لوحی پر مسکرا دیا۔ قدرے توقف کے
پھر بولا۔

• بہت دنوں کے بعد یہاں بندوق کی آواز سنائی دی۔
وقت اپنے کھیتوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ دیکھنے کے لئے بھاگا کر

ے جالد کا خون ہوا۔ اور یہاں آکر دیکھا تو جناب ڈبکیاں
ر ہے تھے — خیر تمہیں تو نکال لایا لیکن افسوس تمہارا جبڑا
ت ہاری تھا اسے وہیں پھینکنا پڑا۔ اچھا تم یہ تو بتاؤ۔ میری
پر لد کر گاؤں چل سکتے ہو — ؟ یا گھوڑی لینے گاؤں جاؤں
ی تو اس علاقے میں نہیں آ سکے گی۔"

"دلہن کی طرح ڈولی میں بیٹھ کر یا بچے کی طرح پیٹھ پر لد کر تو میں جا
یں سکتا" میں نے اسی کے بے تکلف لہجہ کی نقل کی۔

"تو پھر کیا چارپائی پر لیٹ کر چلنے کا ارادہ ہے؟"

"بڑے بے تکلف ہو دوست!" میں نے کہا اس کے چہرے پہ
ت کے آثار جھلکنے لگے تو مجھے پھر کہنا پڑا — "کسی ایسے ہی مخلص
ت کی مجھے عرصے سے تلاش تھی۔"

اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ میں نے اسے سہارا دیکر ہا
تھ اٹھانے کو کہا اور پھر اس کا سہارا لے کر اٹھ کر کھڑا ہوا —
کل تمام گھسٹتے ہوئے ہم اس چھوٹے سے خوبصورت گاؤں میں
— دوسرے میں نے اپنا سامان جو کچھ ایسا زیادہ نہ تھا پھر چ
کی ڈاک بنگلے سے منگوا لیا — وہاں پہنچ کر نقاہت اور زیادہ پانی
پینے کی وجہ سے میری طبیعت خراب ہو گئی۔ اور پانچ دن تک مسلسل
بستر علالت پر پڑا رہا — اسی دوران میں اس نوجوان اور اس کے
ماں باپ نے جس تندہی سے میری تیمارداری کی اسے میں تمام عمر
بھلا سکوں گا۔ جب تک میری حالت سنبھلے۔ میں اس کا بے
تکلف دوست ہو چکا تھا۔

وہی نوجوان الماس کا محبوب تھا!

ہم دونوں تین چار دن تک ایک ساتھ خوب گھومے۔ کبھی اس
ے مرغزار دور تک پھیلے ہوئے لہلہاتے کھیتوں میں سرسبز بیلوں سے
ڈھکی ہوئی جھونپڑی میں بیٹھے غروب آفتاب کا عجیب منظر
دیکھا کرتے اور جنگلی پھولوں کے گچھے ہمارے اوپر برسا کرتے۔
کبھی گھنے درختوں کے سائے تلے بیٹھ کر لومڑیاں، خرگوشوں،
ہرنوں اور پرندوں پر نشانہ بازی کرتے کبھی جھیل میں — بیٹھا کر
چپ چاپ بیٹھ جاتے اور گھنٹوں جھلملاتے ہوئے چاند کا عکس دیکھا
کرتے جو جھیل کی عمیق گہرائی سے ہماری طرف جھانک جھانک
کر مسکرایا کرتا اور اگر ہم پانی کو ذرا سا جھکولا دے دیتے

تو اس طرح بل کھا کھا کر دوہرا ہو جاتا جیسے کسی نے چاند کو زور سے
گدگدا دیا ہو اور اس کے ساتھ ہی ساتھ کائنات پر پھیلی ہوئی
چاندنی بھی مسکرایا کرتی۔

اور ایک ایسی ہی سرور انگیز خواب آلود رات میں محبوب نے
مجھ سے اپنی محبوبہ کا ذکر کیا تھا۔ مجھے لڑکیوں کے ذکر میں دلچسپی نہیں
اس لئے میں شاید صحیح طور پر بیان نہ کر سکوں گا کہ اس نے اپنی
الماس محبوبہ کی کون کون سی خوبیاں میرے سامنے بیان کی تھیں۔

"اس کی رنگت میں شفق کی ہلکی سی سرخی اور چاندنی کی منور
سپیدی کا حسین امتزاج ہے — اس کی بڑی بڑی آنکھیں جیسے
کسی گہری نیلی جھیل میں کھلے ہوئے دو سپید کنول ہوں۔ اس کی
چال میں غزال رعنا کا سا الھڑپن اور جسم میں چھوئی موئی کی سی
نزاکت ہے صدفوں کی سی معصومیت اور پاکیزگی ہے اس میں۔
اس کی باہنوں میں روئی کے گالوں کا سا گداز ہے۔ اور اس کی
سیاہ زلفیں برسات کی گہری تاریک راتوں سے زیادہ سیاہ
اور مسحور کن اور کسی کنواری ناگن کی طرح چمکیلی ہیں۔ وہ دنیا
کی سب سے زیادہ حسین اور شرمیلی دوشیزہ ہے!"

کبھی وہ کہتا۔

"وہ۔ وہ۔ حسین وادی کی معصوم شہزادی ہے — میری
روح ہے وہ!"

اور اسی طرح وہ نہ جانے کتنی دیر تک اس دوشیزہ کی تعریف
و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملایا کرتا جو کسی قریبی گاؤں
کے زمیندار کی اکلوتی لڑکی تھی جسے اس نے چھپ چھپ کر تو کئی
بار اچھی طرح دیکھا تھا لیکن جس سے کھلم کھلا بات کرنے کی اس نے
آج تک ایک بار بھی ہمت نہ کی تھی کیونکہ یہ ان کے یہاں معیوب
سمجھا جاتا تھا اور پھر وہ خود بھی بے حد شرمیلا تھا اور پھر جب ریحان
کا ذکر آتا تو وہ چاروں طرف دیکھ کر ہولے سے کہتا۔

"مجھے اس ریحان سے بہت ڈر لگتا ہے شکاری! وہ کبھی
میری محبت کا گلا نہ گھونٹ دے وہ میری روح کو مجھ سے چھین نہ
لے کہیں —!"

ریحان اس کی محبوبہ ہی کے گاؤں کا ایک نوجوان تھا اور
محبت کے میدان میں محبوب کا کامیاب رقیب تھا۔ یہ تمام باتیں

مجھے محبوب ہی سے معلوم ہوئیں لیکن ایک عجیب بات یہ تھی کہ رحمان
اس بات سے ناواقف تھا کہ محبوب بھی ریشماں کی زلف گرہ گیر
کا اسیر ہے اور یہ بات تھی بھی تقریباً ناممکن سی۔ محبوب نے
ہر ممکن احتیاط برتی تھی کہ ریشماں کے متعلق اس کے خیالات
کا کسی کو علم نہ ہو۔ وہ صرف تصور ہی تصور میں پیکر جاناں
سے اٹھکیلیاں کر لینے پر قناعت کرتا تھا۔ اس سے آگے
دست درازی کرنا اس کے تئیں معیوب بات تھی۔ برخلاف اس
کے رحمان کئی بار ریشماں کے سامنے اظہار محبت کر چکا تھا
گو کبھی ریشماں نے اپنی زبان سے اس کی ہمت افزائی نہ کی تھی۔
محبوب کے لئے وہ لمحات انتہائی کرب خیز سا اور صبر آزما
ہوتے تھے جب رحمان اپنے گاؤں سے چل کر اس کے پاس آتا اور
ریشماں کے بارے میں اپنے خیالات اس کے سامنے پیش کرتا۔
مانی ہوئی بات ہے ایسا شخص جس سے ہمیں خفیہ عناد ہو، ہمیں
اپنا دوست جان کر اپنی مسرتوں اور عیش کی گھڑیوں کا ذکر ہمارے
سامنے کرتا ہے اور ہمیں مجبوراً اس کی ہاں میں ہاں ملانی پڑتی ہے
تو دل ایک انجانی آگ میں سلگنے لگتا ہے۔ رحمان بظاہر اپنے
لنگوٹیے یار محبوب کے روبرو جس کے ساتھ اس نے پرائمری
اسکول کی چار جماعتیں پڑھی تھیں۔ اپنی محبت کی داستانیں
سنا کر دل کی بھڑاس نکالا کرتا تھا۔ اسے کیا خبر کہ اس کا معصوم
دوست خود اسی آگ میں جل رہا ہے اور چپ چاپ سینے سے
لگائے ہوا دیتا رہتا ہے اور وہ آ کر اس کی سوزش میں کئی گنا
اضافہ کر جاتا ہے۔

پھر ایک دن محبوب نے مجھے رحمان سے بھی ملا دیا جو ایک
معمولی خدوخال کا تندرست نوجوان تھا جسے محبوب جیسے خوبرو
اور تنومند نوجوان کے مقابلے میں کسی دوشیزہ کے متعلقین عام
حالت میں ہرگز پسند نہ کر سکتے تھے اس دن تالاب کے کنارے
خنک و شفاف نیلے پانی میں روپہلی مچھلیوں کا رقص دیکھتے ہوئے
میں نے محبوب کو دلاسہ دیا۔

"نہ گھبراؤ دوست! وہ کوئی بہت ہی نادان باپ ہو گا جو اپنی
لڑکی کے لئے تمہاری جگہ رحمان کو منتخب کرے گا۔" اس نے
میری طرف ایسی ممنون نگاہوں سے دیکھا جیسے میں نے اس پر
کوئی بہت بڑا احسان کیا ہو۔

"تم ہمت کر کے ریشماں کے روبرو اپنی محبت کا اظہار کیوں
نہیں کرتے؟" میں نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں شکاری! شادی سے قبل یہ نہ ہو گا۔" اس نے
آخری جواب دیا۔ "یہ تو سچی محبت کی توہین ہو گی!"

میں خاموش ہو رہا۔

پھر کچھ دن بعد الماس سے واپس آتے ہوئے میں نے راستے میں
محبوب کے باپ کو تاکید کی کہ وہ کسی دن ریشماں کے باپ سے بات کرے
اور لڑکی کے لئے محبوب کا پیغام دے۔

"اور تم محبوب!" میں نے اپنا پتہ لکھ کر اسے دیتے ہوئے
کہا۔ "اپنی شادی میں مجھے تو بلاؤ گے ہی!" اور اس نے کسی لڑکی
کی طرح شرما کر اپنا سر جھکا لیا تھا۔

اور اب میرے سامنے اس کا خط پڑا ہوا ہے۔
لیکن یہ شادی کا دعوت نامہ نہیں ہے۔ مجھے عرصے سے اس کی
شادی کے دعوت نامے کا انتظار ہے خیال تھا اس سلسلے میں ایک
بار پھر اس حسین وادی کی سیر کا موقع ملے گا لیکن محبوب نے
لکھا ہے۔

"شکاری!

ابا ریشماں کے باپ سے ملے تھے وہ تو شادی
کے بارے میں بڑے بڑے اونچے خیالات رکھتا ہے
اس نے ابا سے کہا وہ اپنی بیٹی کی شادی کسی معمولی
کسان سے نہ کرے گا۔ شہر کے بابو سے کرے گا جو
سرکاری دفتر میں نوکر ہو۔ اس کی بیٹی کو عیش و آرام
سے رکھ سکے۔ رحمان آج کل شہر گیا ہوا ہے اور
سرکاری نوکری کی تلاش میں لگا ہوا ہے۔ میں
نہ کہتا تھا شکاری! کہ یہ رحمان میری روح کو مجھ سے
چھین لے گا۔

محبوب"

خط پڑھ کر مجھے کچھ خوشی ہی ہوئی۔ شاید اس لئے کہ اس طرح
مجھے اس احسان سے سبکدوش ہونے کا موقع مل رہا تھا جو محبوب
نے مجھے ڈوبنے سے بچا کر مجھ پر کیا تھا۔ ہم شہری لوگ اس انداز

سے سوچنے پر مجبور رکھتی تو ہیں

میرا کلاس فیلو قیوم محبوب کے ضلع میں ڈپٹی کمشنر تھا۔ میں نے اُس کے نام ایک پُرزور خط لکھا کہ وہ حامل رقعہ ہٰذا کو کسی سرکاری دفتر میں کوئی مستقل ملازمت دلوا دے اور یہ رقعہ محبوب کو ایک خط کے ہمراہ بھیج دیا۔ اُس خط میں میں نے محبوب کو لکھا تھا کہ گھبرانے کی ضرورت ہے وہ میرا پرچہ لے کر اپنے ضلع کے ڈپٹی کمشنر کے پاس چلا جائے اور ملازمت ملنے کے بعد دوبارہ پھر ریشماں کے لئے پیغام بھیجے۔

یہ خط محبوب کو بھیج کر میں ایک ماہ انتظار کرتا رہا لیکن اس کی طرف سے کوئی اطلاع مجھے موصول نہ ہوئی دو تین خط بھی لکھے لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ قیوم کو خط لکھ کر دریافت کیا تو اس نے لکھا کہ میری سفارش لے کر آنے والے نوجوان کو اس نے اپنے ہی دفتر میں جمعدار مقرر کر دیا ہے اور وہ آج کل رخصت لے کر اپنی شادی کرنے گیا ہے۔

میں حیران تھا۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ کیا محبوب مجھے مدعو کئے بغیر ہی شادی کرے گا! آخر ایک دن میں الماس کے لئے روانہ ہو گیا۔ بس موضع سے دو میل جنگل کی پگڈنڈی پر مجھے اتار کر آگے چلی گئی اور تحائف و بندوق وغیرہ سے لدا پھندا اُس تپلی سی پگڈنڈی پر ہو لیا جو اونچے نیچے ٹیلوں کے دامن سے لپٹی ہوئی الماس کی طرف جاتی تھی۔ دور مشرق میں ماہتاب ایک تناور درخت کے عقب سے طلوع ہوا اور بتدریج اس کی تابانی بڑھتی گئی۔ چھوٹی چھوٹی جھیلوں میں چاندنی کی سو روپہلی کرنیں چاندی کی مچھلیوں کی طرح اِدھر اُدھر چہل کرتی تیرتی رہی تھیں اور پھر میرا دل خوشی سے لبریز ہو گیا۔ دور سے آتی ہوئی شہنائی کی آواز نے میرے دل کو گدگدایا تھا۔ میری کوشش شاید بار آور ہوئی تھی شاید محبوب کی شادی ہو رہی تھی۔

الماس بالکل قریب آ گیا تھا میں نے لمبے لمبے ڈگ بھرنے شروع کئے۔ ایک ٹیلے سے نیچے اترتے ہوئے الماس کے [illegible]ت کے سائے تلے مجھے ایک سایہ نظر آیا۔ میں اس کے پاس جا پہنچا۔

"یا خدا! وہ تو محبوب تھا!

وہ یونہی کھڑا خلا میں جانے کیا دیکھ رہا تھا۔ دریافت کرنے پر اس نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے بتایا کہ اس نے اپنی جگہ پر رحمان کو نوکر کروا دیا تھا کیونکہ وہ واقعی ریشماں سے محبت کرتا تھا۔ سچی محبت، اور اس نے اپنی پریشانیوں کا ذکر محبوب سے کیا تھا جسے وہ اپنا دوست اور سچا رفیق سمجھتا تھا۔

اور اب ریشماں اور رحمان کی شادی ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے پرسکون چہرے پر نگاہ ڈالی۔ اس پر عجیب سی چمک تھی۔ نہ جانے اس ظاہری سکون کے پردے میں کتنے ارمان دم توڑ رہے تھے۔ کتنی آرزوئیں مچل رہی تھیں۔ میں نے سوچا کتنا بڑا دل ہے اس دیہاتی نوجوان کا۔ وہ بدستور خلا میں نظریں جمائے کھڑا رہا۔ ٹھنڈی ہوا کے ساتھ ملی جلی شہنائی کی آواز اس طرح سنائی دے جاتی تھی جیسے کوئی زخمی روح کراہ رہی ہو۔ آس پاس کی چیزوں کو سپید چاندنی نے اس طرح اپنی آغوش میں لے رکھا تھا جیسے کسی نے انھیں سفید سفید کفن پہنا دیا ہو۔ آسمان سے زمین تک خلا میں درد ہی درد تھا۔ میں نے بےچین ہو کر کہا۔

"محبوب! یہ تم نے کیا کر دیا سیدھے وقوف آدمی۔"

وہ مسکرا دیا۔ بہت پھیکی سی مسکراہٹ۔

"مجھے یہی کرنا چاہئے تھا شکاری! میں ریشماں سے ملا تھا۔ وہ بھی رحمان سے محبت کرتی تھی!"

بقیہ: سگِ لیلیٰ

تمہارے صحن میں لا کر نہیں ڈال دے تو میرا بھی نام نہیں۔ بیگم چچا یہ وارننگ دے کر چلے گئے۔

آج ہم بھی [illegible] بیگم بھی وہی ہیں اور سٹار لنگ بھی وہی ہے۔ ان کی حرکات بھی وہی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ آج کل انھوں نے کوٹھیر ایریئے میں جانا ترک کر دیا ہے مگر ہم اس بلائے ناگہانی والے دن کا انتظار کر رہے ہیں جب ہمارا صحن الانواع و اقسام کی ٹرالیوں سے بھر جائے گا۔

کالیداس گپتا رضاؔ کی

تاحال مطبوعہ تصانیف

"شعلۂ خاموش"
مجموعۂ کلام قیمت ۵۰ روپے

"شورشِ پنہاں"
مجموعۂ کلام قیمت ۲۰ روپے

"شاخِ گل"
مجموعۂ کلام قیمت ۱۵ روپے

"اُجالے"
نعت اور سلام قیمت ۱۰ روپے

"شعورِ غم"
سلام وغیرہ قیمت ۳ روپے

"شارعِ جاوید"
مجموعۂ کلام رباعیات
قیمت ۲۰ روپے

"دی سائیلینٹ فلیم"
THE SILE'T FLA'E
قیمت ۱۰ روپے

"ہندوستان مشرقی افریقہ میں"
(تاریخ)
قیمت ۱۰ روپے ۵۰ روپے

"مکتوباتِ جوشؔ ملسیانی"
بنام رضاؔ (خطوط)
قیمت ۱۹ روپے ۵۰ پیسے

"منثوراتِ جوشؔ ملسیانی"
قیمت ۲۰ روپے

"متعلقاتِ غالب"
قیمت ۲۰ روپے

"دعائے صباح"
غالب کی ایک مثنوی
قیمت ۱۵ روپے

"غالبیات ۔ چند عنوانات"
قیمت ۵۰ روپے

"انتخابِ آتش و غالب"
چکبست
قیمت = ۳۰ روپے

"چکبست اور باقیاتِ چکبست"
قیمت ۴۰ روپے

"کلیاتِ چکبست" (نظم)
قیمت ۶۰ روپے

"سہو و سراغ"
مجموعۂ مضامین
قیمت ۳۵ روپے

"مقالاتِ چکبست"
قیمت ۷۵ روپے

غیر مطبوعہ تصانیف کا اعلان
طبع ہونے پر کیا جائے گا

---

۳۰۵ چرچ گیٹ چیمبرز نیو میرین لائنز
چرچ گیٹ بمبئی ۴۰۰۰۲۰

ہلدی گھاٹیاں

کندن گوڑگانوی

شمع جلنے پر پتنگے آ ہی جاتے ہیں قریب
ابنِ مریم شوق سے خود چوم لیتے ہیں صلیب
یاد پھر دار و رسن کی تازہ کرنے کے لئے
سرمد و منصور خود آتے ہیں مرنے کے لئے

تیرگی سے پھوٹتی ہے صبح کی پہلی کرن
پھولتے ہیں پھر خزاں کے بعد اشجارِ چمن
تخت اکثر ٹوٹتے ہیں نالۂ مجبور سے
تاج اترتے ہیں عموماً نعرۂ جمہور سے

جب پہنچتی ہی نہ تھی کوئی زباں تقریر تک
حدِ آزادی فقط تھی وسعتِ زنجیر تک
گردنوں میں طوق تھے اور پاؤں میں زنجیر تھی
جاں نثارانِ وطن کی بے بسی جاگیر تھی

اہلِ گلشن کو بھلا موقع کہاں تھا سیر کا
گلستانِ ہند پر تو تھا تسلط غیر کا
خون تھا پانی نہیں تھا جوش میں آ ہی گیا
جذبۂ جمہور سلطانوں سے ٹکرا ہی گیا

سرفروشانِ وطن میدان میں آ ہی گئے
اہلِ طاقت سے وہ خالی ہاتھ ٹکرا ہی گئے
خارزاروں میں چلے آغوشِ مادر چھوڑ کر
اور تڑپاتی بہن ماں! بیوی کا گھر چھوڑ کر

دار پر آ ہی گئے وہ مسکرانے کے لئے
بازوئے قاتل کا ہر زور آزمانے کے لئے
مر گئے اور پاؤں میں زنجیر ہوتی رہ گئی
داورِ افرنگ کی تعزیر روتی رہ گئی

خواب ادھورے رہ گئے کھل کھل کے جوڑے رہ گئے
اور کلائی کو ترستے لال جوڑے رہ گئے
ہاں مگر وہ خواب سب تعبیر تک آ ہی گئے
نالے دیوانوں کے سب تاثیر تک آ ہی گئے

رنگ آخر لے ہی آیا خونِ اربابِ وفا
بس ہے یہ آزادی فقط خونِ اربابِ وفا
تم شہیدوں کو نہ بیگانہ سمجھ لینا کہیں
اس حقیقت کو نہ افسانہ سمجھ لینا کہیں

لاکھوں ہلدی گھاٹیاں ہیں اپنے ہندستان میں
کوئی ستلج کے کنارے کوئی راجستھان میں

"اچھا تو وہ بدنام زمانہ ڈارلنگ کتا آپ ہی کا ہے۔" بیگم خاموش رہیں۔

گندم چچا کچھ سوچتے ہوئے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"کہو میاں آج کل شاعری کیسی چل رہی ہے۔ سنا ہے کہ آج کل آزاد ...." ابھی وہ جملہ بھی مکمل نہیں کر پائے تھے کہ ان کا پاؤں ہمارے پلنگ کے نیچے کسی چیز پر پڑا تو اچھل کر کھڑے ہو گئے۔

"ارے یہ تم نے کوئی سانپ پال رکھا ہے؟" گندم چچا کے چہرے پر خوف کے آثار نمایاں تھے۔

"اجی یہی ڈارلنگ کتا ہے۔"

"ارے یہ کتا ہے کہ گیدڑ؟" یہ سنتے ہی ڈارلنگ کی بھی پلک جھپکی اور اس نے نہایت تیکھے انداز سے گندم چچا کی طرف دیکھا۔

"حضور یہ کتا ہی ہے السیشن کی تازہ ترین قسم ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ مجھے تو یہ گیدڑ نظر آتا ہے۔"

ڈارلنگ نے اس بار دونوں آنکھیں کھول کر گندم چچا کو دیکھا ایسی غضب ناک نگاہوں سے دیکھا کہ [illegible] کے [illegible] میں گندم چچا کو اپنی عافیت نظر آئی۔

ایک دن جب ہم گندم چچا کی دوکان پر پہنچے تو ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا ان کے ایک ہاتھ میں چمڑے کی [illegible] کوئی چیز تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی برس پڑے۔

"[illegible] اب اُس [illegible] کی اولاد کو سنبھال لیا سالے کو تمام اپنے جیسے [illegible] سکھا دئیے ہیں آج کل وہ گھر کا طواف کر رہا ہے۔"

ہم نے مسکراتے ہوئے کہا "اجی اس میں مضائقہ ہی کیا ہے اگر آپ کی کتیا [illegible] ہے تو ہمارا کتا بھی [illegible] ہے۔"

"میں ایک ڈنڈے میں سالے کی [illegible] سے [illegible] نکال دوں گا" گندم چچا بھڑک اٹھے۔

"خیر [illegible] یہ بتائیے آپ کے ہاتھ میں یہ چمڑے کی کیا [illegible] ہے؟"

"تم احمق ہو نہیں سمجھو گے"

"مگر حضور کچھ بتائیے بھی"

"چلیٹی ہیلمٹ ہے دور قدیم میں جنگجو سپہ سالار جب میدان جنگ میں لڑنے جاتے تھے تو اپنی بیگمات کو پہنا کر جاتے تھے۔ میں نے یہ لیلیٰ کے لئے بنوایا ہے۔"

اور واقعی جب یہ ہیلمٹ پہن کر گندم چچا کی کتیا باہر نکلتی ایسا لگتا کہ کوئی شادی کی گھوڑی کاٹھی لگام سے آراستہ ٹھمک ٹھمک کر چل رہی ہے۔

ساون کیا بیتا کہ ڈارلنگ کے جوش جنوں پر سینچر آ بیٹھا۔ شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا کہ حضرت پٹ پٹا کر گھر واپس نہیں آتے۔ ادھر بیگم دیدہ و دانستہ چشم پوشی اختیار کئے ہوئے تھیں ایک دن ہم نے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہہ ہی دیا۔

"اس لفنگے کو زنجیر [illegible] کیوں نہیں رکھتیں۔ جانتی ہو اس کے کارنامے؟"

"ہاں ہاں جانتی ہوں اور تمہاری جوانی کے کارنامے بھی خوب جانتی ہوں۔ تم نے کون سے کم گل کھلائے ہیں؟" بیگم الٹے ہمارے گلے پڑ گئیں۔

ایک دن شام کو ڈارلنگ معمول سے زیادہ لنگڑاتے ہوئے گھر لوٹے ہم سمجھ گئے کہ حضرت آج کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دے کر گھر لوٹے ہیں۔ ابھی ڈارلنگ ہمارے پلنگ کے نیچے بیٹھ کر اپنے زخموں پر اپنی [illegible] اپنا لعاب لگا ہی رہے تھے کہ دھڑاک سے کمرے کا دروازہ کھلا۔

"کہاں ہے وہ سگ مادر زاد۔ سالے کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔" گندم چچا غصے سے کانپ رہے تھے ان کے ایک ہاتھ میں ڈنڈا اور دوسرے میں ٹوٹا ہوا چلیٹی ہیلمٹ تھا۔

بیگم بھی سہم گئیں۔

"کیا بات ہے حضرت کچھ کہو تو" ہم نے معاملے کی نزاکت کی تہہ تک پہنچتے ہوئے پوچھا۔ "تم چپ رہو جی۔ کہاں ہے وہ سور کا بچہ" گندم چچا نے ہمارے پلنگ کے نیچے دیکھا مگر ڈارلنگ ندارد گندم چچا نے گھر کا چپہ چپہ چھان مارا مگر ڈارلنگ خدا جانے کہاں [illegible] ہو گئے تھے۔

"کوئی بات نہیں کہاں جائے گا پھر حرامی اور ہاں [illegible] تم بھی [illegible] کوشش کرو سارے کے سارے باقی [illegible] پر

یومِ آزادی پر

توصیف علوی عاصی کیرالوی

دعوتِ فکر و عمل

آؤ پھر لے کر جہاں میں امن کا پرچم اٹھیں
ہوں عمل پیرا جہاں میں کامرانی کے لئے
عزمِ محکم سے ہوا کرتی ہے تعمیرِ حیات
استقامت ہے ضروری عزمِ منزل کے لئے
زندگی میں سُرخ رُوئی کا نشاں جہد و جہد
محنت و کاوش ہے روحِ کاروانِ زندگی
قوم کی راہوں میں ہے ایثار شرطِ اوّلیں
بڑھ کے دو انساں کو پھر پیغامِ صلح و آشتی
فکر کی یکرنگیوں کا پھر اُٹھو لے کر پیام
اتحادِ باہمی کی پھر سے کھائی ہے قسم
ہیں مساوات و اخوت جوہرِ انسانیت
اس جہاں کا گوشہ گوشہ عمل سے معمور ہو
ہو صداقت آئینہ انسان کے کردار کا
ہے ضروری جذبۂ قومی بنے رازِ حیات

زندگی کے ساز کی لے کر نئی سرگم اٹھیں
دیں نئے فکر و نظر پھر زندگانی کے لئے
خونِ دل سے بنتی ہے رنگین تصویرِ حیات
جوشِ طوفاں چاہیئے تعمیرِ ساحل کے لئے
ہے ہر اک ذوقِ نظر کی داستاں جد و جہد
فکرِ پیہم ہے بہارِ گلستانِ زندگی
حُبِ قومی سے ملا کرتی ہے عظمت بالیقیں
دو جہاں والوں کو پھر آئین ربطِ باہمی
دو زمانہ کو محبت سے بھرے مینا و جام
پھر سے ہم آہنگ کرتے ہیں ہمیں دیر و حرم
"آب" پاتا ہے انہیں سے گوہرِ انسانیت
ہر طرف پھیلا مسرت کا حقیقی نُور ہو
عکس ہو انسان ہی انسان کے اطوار کا
ہو نئے نغمات کا حامل ہر اک سازِ حیات

قوم کی تعمیر ہوتی ہے بلند افکار سے
زندگی بنتی ہے عاصی فکر کے انوار سے

تعارفی رباعیات

سلام ساگری ۔ ساگر

ستارے

جو ایک غیر معمولی مشاعرہ منعقدہ "ساگر" کے موقعہ پر "ساگر" کی خنک و لطیف لہروں پر جھلملائے اور اپنی دلآویز جھلملاہٹ کا عکس اہالیانِ "ساگر" کے دلوں پر ہمیشہ کے لئے مرتسم کر گئے۔ (سلام ساگری)

جناب وکیل بھوپالی

محفل میں وکیل آئے کر آئی توقیر
ہر لفظ سے سب بن کے ادب کی تعمیر
الفاظ وہ ہو جائیں جو دل میں پیوست
اللہ رے ان کے سخن کی تاثیر

جناب صہبا قریشی

یہ حضرت صہبا ہیں کہ آیا ہے شباب
اُٹھتی چلی جاتی ہے تخیل کی نقاب
ہر مصرعہ اثر کیف و سرور انگیز ہے
ہر شعر ہے بل کھاتی ہوئی موجِ شراب

جناب باسط اوجینی

پہنچے ہیں سب اردو معلیٰ کے قریب
پیاسوں کو لے آئے ہیں دریا کے قریب
یہ ان کے خیالات کی رفعت ہے سلام
باسط کا ٹھکانا ہے ثریا کے قریب

جناب محمد حسین خاں مہر

اے مہرِ سخن حضرت مہر آتے ہیں
اشعار سے اک نور سا برساتے ہیں
بجلی ہے کہ ہر مصرعۂ تر ہے ان کا
دل بزم میں پُر نور ہوئے جاتے ہیں

جناب شاہد بھوپالی

اشعار سے ظاہر ہے طبیعت ان کی
اسلوبِ بیاں ان کا ہے جدت ان کی
شاہد ہی کا حصہ ہے نگاہِ غائر
روشن ہے ہر اک شعر سے فطرت ان کی

جناب کلیم سرونجی

اب لیجئے کلیم آپ کا نام آیا ہے
اترے جو دلوں میں وہ کلام آیا ہے
ہے خالق جذبات محبت لاریب
محفل میں نرالا یہ پیام آیا ہے

جناب گلزار ساگری

آئندہ ترقی کے ہیں ان میں آثار
الفاظ ہیں معقول مناسب معیار
الفاظ ہیں یا پھول کھلے ہیں یہ سلام
گلزار کی اک ایک غزل ہے گلزار

جناب آذر جبلپوری

تصویر نگہ میں اک جذبہ خوش منظر میں
ہر لفظ ہے نہلایا ہوا کوثر میں
اشعار میں ان کے گلستانِ رنگیں
جلوے ہیں عیاں بارگہ آذر میں

جناب نور محمد قمر

دیکھو انھیں محفل میں قمر آئے ہیں
یہ عرش سے مضمون اُڑا لائے ہیں
ان پر کرم خاص ہے قدرت کا سلام
گر ان کو سخنگوئی کے سکھلائے ہیں

جناب امتیاز انجم

معنیٰ میں نہاں حسنِ تکلم ان کا
الفاظ سے ظاہر ہے تبسم ان کا
موسیقیت اشعار میں انجم کے ملی
سونے پہ سہاگہ ہے ترنم ان کا

جناب بشر صہبائی

ہر چند کہ مدھم ہے تکلم ان کا
ہے طرزِ بیاں جیسے ترنم ان کا
پر لطف ہیں اشعار بشر صہبائی
سونے پہ سہاگہ ہے تبسم ان کا

جناب کوثر ساگری

ہر چند کہ کوثر ہے نیا شاعر ساگر
ظاہر میں نظر آتا ہے سب سے کم تر
آثار نظر آتے ہیں لیکن ایسے
ہو جائے گا یہ صاحبِ موجِ کوثر

بقیہ صفحہ ۲۲ سے

کون سنگسار ہوا

کسی نے نہیں ۔ یسوع نے کہا میں بھی تجھ پر حکم نہیں لگاتا ۔ جا ۔ پھر گناہ نہ کرنا۔
سب کے سب اس لئے ایک ایک کر کے نکل گئے تھے ۔ مجھے اب یہ سوچنے کی ضرورت نہیں کہ لوگوں نے کس بنا ۔ کا انکشاف نہیں کیا۔

کیا آپ گلے کی تکلیفوں میں اکثر مبتلا رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے سخت پریشان ہیں، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ایسی پریشان کن بیماری سے گلا کاٹ دینے سے ہی چھٹکارا مل سکتا ہے۔ ذرا ٹھہریئے! خالص دیسی ادویات سے تیار کیا ہوا "ٹونسلیکس" ایک بار، صرف ایک بار استعمال کرکے تو دیکھئے، پھر آپ کو گلے کے غدود بڑھ جانے، گلے کی سرسراہٹ، خراش، گلے کے ورم، زخم اور دوسرے تمام امراض کی شکایت نہیں رہے گی۔ اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا مریض ہو، جس کے گلے کے غدود (ٹان سلائٹس) کا آپریشن ہوتا ہے تو اُسے اس دوا کے بارے میں ضرور بتائیے گا کیوں کہ پھر اُسے آپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چھوٹے بچے جو کھٹی میٹھی چیزیں کھا کر گلا خراب کر لیتے ہیں، اُن کے لئے بھی یہ بہت کام کی دوا ہے۔ ہر گھر میں اس کا رہنا بہت ہی ضروری ہے۔

—— شعبہ (یونانی اینڈ آیورویدک) لیباریٹریز، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

Phone: 275802 Regd No D- (DN) 353
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 AUGUST 1985
Regd with the Registrar of Newspaper at R No. 644 57

خرید کر پڑھیے :
مانگ کر پڑھیے :
یا پھر
چوری کر کے پڑھیے

یہ ہے ہی اتنا خوب صورت ،
اتنا دل کش ،
اتنا مکمل کہ اسے کسی طرح بھی
حاصل کریں کیوں کہ
یہ فیض کی شخصیت اور فن پر ایک
شان دار ادبی دستاویز ہے ۔ اس میں شامل ہیں :

پندرہ روپے

★ خلوت اور جلوت کے بھید کھولنے والے ذاتی نقوش ۔
★ نادر و نایاب تصویریں ۔
★ سدا بہار ، ہزار رنگ و منتخب کلام ۔
★ فیض کی شخصیت کے وہ ڈھکے چھپے گوشے جن پر سے پہلی بار پردہ اٹھایا گیا ہے ۔
★ ہندوستان ، پاکستان ، روس اور انگلستان کے دانش وروں کی مشترکہ کاوشوں کا گلدستہ ۔

ساری اردو دنیا میں شبستان کے "فیض نمبر" کا چرچا ہے

اس سے پہلے کہ اسٹاک ختم ہو جائے آج ہی اپنے قریبی نیوز ایجنٹ سے طلب کیجیے یا براہ راست ہم سے منگوائیے ۔

شبستان اردو ڈائجسٹ آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

جلد — ۴۶
شمارہ — ۹
ستمبر ۸۵ء

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ | رجسٹرار آف نیوز پیپر فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۲۲۲۲/۵۷ | رجسٹرڈ نمبر ڈی (ڈی این) ۴۵۲

ہندو پرست ہوں نہ مسلمان پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انسان پرست ہوں
فیاض گوالیاری

ماہنامہ

شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے
زرِ سالانہ ۲۴/- روپے

جلد ۴۶ | ستمبر ۱۹۸۵ء | شمارہ ۹

عندلیب شادانی

لاہور میں جب تھے تو اچکن ہوتی تھی۔ نیچے بنیان، قمیص یا کرتا وغیرہ نہیں ہوتا تھا۔ دہرہ دون بازار و ملاح والا کے قریب ایک صاحب کی بیوی کا نام عندلیب تھا اور عندلیب نام سے ایک رسالہ اپنی بیوی کو خوش رکھنے کے لئے شائع کرنا شروع کیا۔ وہ اپنی بیوی کا نام بطور مدیرہ شائع کرتے تھے۔ عندلیب شادانی اس لڑکی سے ملنے گئے، پردہ اپنے آپ گر گیا۔ اتنے میں لڑکی کا خاوند آگیا۔ اس وقت [illegible] شادانی کی عاشقانہ غزل پڑھ رہی تھی جو کہ ماہنامہ عندلیب" میں طبع ہوئی تھی۔ بس پھر کیا تھا، شوہر کو شک ہوا اور [illegible] صاحب کا حال جو ہوا ہے وہ عندلیب کے شوہر کی زبانی سننے کے قابل تھا۔ اور یہ انکشاف انھوں نے یہ کیا کہ جب ہاتھا پائی [illegible] شادانی کی اچکن کے چیتھڑے اڑ گئے تو وہ صرف پاجامے اور بنیان میں ہی بھاگ رہے تھے۔ یعنی دہرہ دون میں بھی اچکن کے نیچے قمیص یا کرتا وغیرہ نہیں تھا۔

عندلیب شادانی صاحب نے ہر شاعر پر تنقید کی۔ سیماب اکبرآبادی نے انھیں ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ آل احمد صاحب [illegible] سرور نے ان کے بارے میں مضمون لکھ کر ان کے بخیے ادھیڑ دیے۔

طابع و ناشر سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس چھتہ شیخ منگو جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر دفتر شان ہند فلیٹ نمبر ۲ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی [illegible] سے شائع کیا۔

تابندہ اور پائندہ نسل
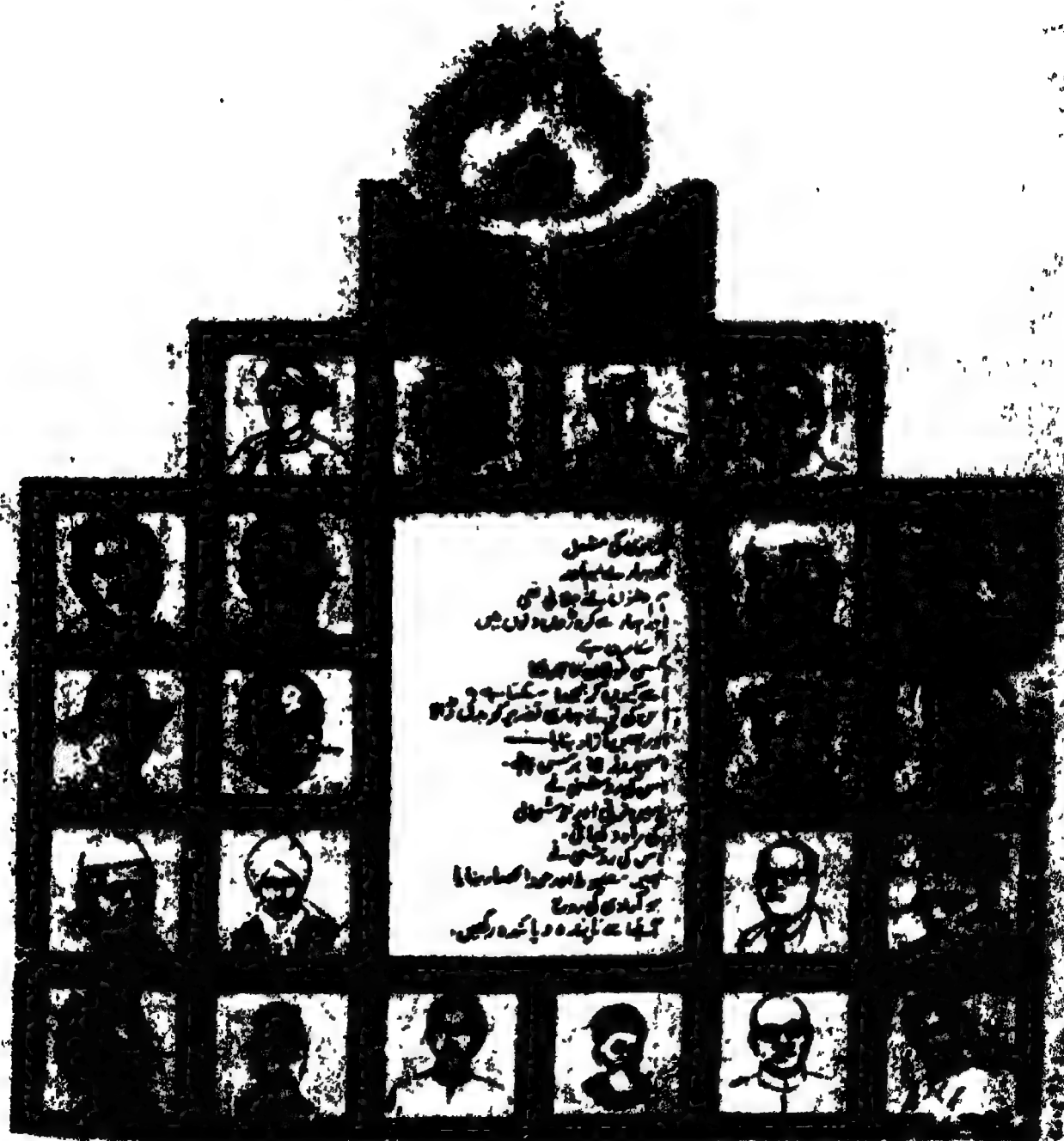
کے ذریعہ اُردو اکادمی اور ان کے ذمہ داران پر کیچڑ اُچھالی جاتی ہے۔ ہمیں یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ اُردو اکادمی کے کسی بھی ذمہ دار نے بلیک میل کرنے والوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے۔

قومی آواز کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ بلکہ ایک ٹرسٹ کی ملکیت ہے اس لئے پوری قوم اس کی مالک ہے چونکہ قومی آواز کے ذریعے شرفا کی پگڑیاں اُچھال کر اپنا مالی مفاد پورا کرنا چاہتے ہیں وہ اس اخبار کے ایک ادنیٰ سے ملازمین ہیں۔ اس لئے ان کو ایسی حرکتوں کی اجازت نہیں دی جا سکتی ہم لیش پال کپور صاحب سے بہت اچھی طرح واقف ہیں وہ انتہائی نیک۔ شریف۔ مہذب اور اُردو دوست ہیں انھیں یقیناً اپنے ان ملازمین کی کالی کرتوتوں کا علم نہیں ہے۔ ہم لیش پال کپور صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ کچھ غیر جانب دار حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دیں۔ یہ کمیٹی پچھلے ڈیڑھ سال کے قومی آواز کے فائیل کا مطالعہ کرکے یہ معلوم کرے کہ کس کس کے خلاف لکھا گیا اور کس کس نے لکھا ہے اور کیا یہ خلاف تحریریں اخبار کی پالیسی کے مطابق تھیں یا نہیں

ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ادبی تقاریب کی رپورٹیں جن لوگوں کے نام سے چھپتی ہیں وہ ان لوگوں کی لکھی ہوئی نہیں ہوتیں بلکہ باہر کے کچھ لوگوں سے لکھوائی جاتی ہیں کیونکہ یہ نا اہل لوگ تو ایک پیراگراف بھی صحیح نہیں لکھ سکتے۔

اگر اس کمیٹی ان مکتوبات کا بھی جائزہ لے جن میں شرفا کی پگڑیاں اُچھالی جاتی ہیں کیونکہ ایسا مشہور ہے کہ یہ ایسے مکتوبات قومی آواز کے دفتر میں ہی لکھے جاتے ہیں۔

اگر یہ الزامات درست ہیں تو پھر ان نا اہلوں کو قومی آواز کے دفتر میں بیٹھ کر شرفا اور نامور حضرات پر کیچڑ اچھالنے کی بجائے سڑکوں کی پیمائش کرنے کے لئے ان کی چھٹی کر دینی چاہئے۔ دراصل ان لوگوں کی روٹیاں لگ گئی ہیں۔ ہم یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ لکھنؤ سے بھی قومی آواز شائع ہوتا ہے لکھنؤ ایڈیشن میں اس طرح کی حرکتیں کیوں نہیں کی جاتیں اسی لئے کہ عشرت علی صدیقی صاحب خود نگرانی کرتے ہیں۔ قومی آواز کے ذمہ داروں کو چاہئے کہ وہ ادبی جلسوں کی رپورٹیں لکھنے کے لئے فوراً کسی ایسے پڑھے لکھے آدمی کا تقرر کریں جسے لکھنے کا سلیقہ ہو اور جو دوسروں سے رپورٹیں نہ لکھوائے۔

ہم لیش پال کپور صاحب کا بہت احترام کرتے ہیں لیکن چونکہ یہ معاملہ اُردو کی فلاح اور بہبود کا ہے اس لئے ہماری گذارش ہے کہ انھیں فوری طور پر اس طرف توجہ کرنی چاہئے .... ۱۶ ستمبر کے قومی آواز کے آخری صفحہ پر چھپی خبر اردو اکادمی کا تمثیلی مشاعرہ یا .... میں جو الزامات ڈاکٹر خلیق انجم پر لگائے گئے ہیں اگر انھیں ڈاکٹر خلیق انجم صاحب عدالت میں ثابت کرنے کے لئے چارہ جوئی کریں تو قومی آواز یہ کیسے ثابت کرے گا کہ مشاعرہ میں ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے عزیزوں دوستوں اور رشتہ داروں کو ناجائز طور پر مالی فائدہ پہنچانے کی کوشش کی۔

اگر قومی آواز جو ایک قومی ملکیت ہے اسے اسی طرح نا اہلوں نے اپنا آلۂ کار بنائے رکھا تو ہم اس اداریہ کا انگریزی ترجمہ پارلیمنٹ کے تمام ممبران کو بھیجیں گے۔ اور سینکڑوں کی تعداد میں ادیبوں کے دستخط کرا کے ایک میمورنڈم وزیر اعظم کی خدمت میں بھیجیں گے اور ایک وفد وزیر اعظم سے ملاقات کریں گے۔ کیونکہ ہم کسی صورت میں بھی یہ نہیں چاہتے کہ قومی آواز کو جو اُردو صحافت کا وقار بن چکا ہے اسے کچھ نام نہاد صحافی بازاری کے لئے بازاری سطح پر لے آئیں۔

ترقی اُردو بورڈ

[illegible] سے ہم پریشان ہیں کہ ڈائرکٹر صاحب ترقی اُردو بورڈ سے ہماری ملاقات ہو سکے تاکہ ہم انھیں تفصیلی طور پر بتا [illegible] اصلاح طلب ہیں مگر ہماری بدقسمتی ہے کہ [illegible] کیا گیا [illegible]

گئے؟ ان کا جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ اس لئے مجبوراً ڈائریکٹر صاحبہ کی توجہ بذریعہ شانِ ہند مبذول کرائی جا رہی ہے

۔ آپ کے ہاں سے اُردو دنیا ایک جگہ شائع کیا جاتا ہے جو بغیر قیمت دیا جاتا ہے اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ جو بھی ترقی اُردو
جاتا ہے تھیلا بھر کر لے آتا ہے اور کسی بھی چون دکاندار کے ہاں ڈیڑھ روپیہ کلو کے حساب سے فروخت کر دیتا ہے ترقی اُردو
ڈ کے اکثر کارکنان بخوبی جانتے ہیں کہ اُردو دنیا کون کون حضرات ردی میں فروخت کرتے ہیں۔ جب کہ اس کی اشاعت پر ہزاروں روپیہ
ادر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اُردو دنیا کے ایک شمارے پر جو روپیہ ضائع کیا جا رہا ہے اس سے ایک بہترین کتاب شائع ہو سکتی ہے۔

۲۔ اسی اُردو دنیا کے تازہ شمارہ میں اُردو ترقی بورڈ کے زیر اہتمام مختلف شہروں میں کتابت مراکز کے کچھ طلبا کی کتابت کے
نے شائع کئے گئے ہیں۔ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ یہ سب نمونے اُن اساتذہ کے ہیں جو ان مراکز میں کتابت سکھاتے ہیں
چیلنج کرتے ہیں کہ جن جن طلبا کے نام سے یہ نمونے شائع ہوئے ہیں اُنھیں عوام کے سامنے لایا جائے تو ڈائریکٹر صاحبہ کو پتہ
سکے گا کہ ان کتابت مراکز کے سربراہ محض تنخواہ پانے کی خاطر اپنی کارکردگی کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں ورنہ حقیقت یہ
کہ یہ طلبا کتابت کی الف۔ ب سے بھی واقفیت نہیں رکھتے۔

۳۔ ہم نے ایک نوجوان کو جناب ابوالفیض سحر اسسٹنٹ ڈائریکٹر ترقی اُردو بورڈ کے پاس بھجوایا کہ یہ صاحب اُردو میں
اے ہیں اور اُردو کی پروف ریڈنگ بہترین کرتے ہیں چونکہ یہ ضرورت مند ہیں اگر آپ بورڈ کی چھپنے والی کسی کتاب کی پروف
ریڈنگ ان سے کرائیں تو جہاں آپ کو ایک بہترین پروف ریڈر مل جائے گا وہاں اس نوجوان کی گزر بسر ہو جائے گی۔ مگر ابوالفیض
صاحب نے جس بے رخی کا مظاہرہ اس نوجوان سے فرمایا وہ کسی طور بھی شرافت کے دائرہ میں نہیں آتا۔ سحر صاحب
یہ بھی فرمایا کہ ہم کوالیفائڈ لوگوں کو پروف ریڈنگ کا کام دیتے ہیں۔ ان کوالیفائڈ پروف ریڈنگ کرنے والوں کی کوالیفکیشن
عالم ہے کہ بورڈ کی کتابوں اور تو اور اُردو دنیا کے تازہ شمارہ میں ہی کتابت کی سینکڑوں غلطیاں ہیں (چھپن کو [illegible]
ا گیا ہے) حالانکہ سحر صاحب کو یہ کہنا چاہئے تھا کہ ہم اپنے دوستوں کو یہ کام دیتے ہیں۔

۴۔ ترقی اردو بورڈ کی مطبوعات کی فروختگی جس قدر ماہنامہ شانِ ہند کے ذریعہ ہوتی ہے ملک بھر کے کسی بھی روزنامے، ہفت روزہ
ماہنامہ کے ذریعہ نہیں ہوتی اس کا ثبوت خود ترقی اُردو بورڈ کے سیل ڈپو میں موجود ہے۔ مگر ترقی اُردو بورڈ کی مطبوعات کے
اشتہارات جو D.A.V.P کی معرفت شائع ہوتے ہیں بورڈ کی طرف سے جن رسائل و جرائد میں یہ اشتہار شائع کرنے کی فہرست
کی جاتی ہے اس میں شانِ ہند کا نام نہیں ہوتا۔ ہم نے دو مرتبہ اس ناانصافی پر احتجاج کیا تو ہمیں زبانی بتایا گیا کہ ہم نے تو
ان ہند کا نام بھجوایا ہے مگر D.A.V.P والوں نے آپ کو اشتہار نہیں دئیے۔ اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ جو
ست بورڈ کی طرف سے DAVP کو دی گئی ہے اس میں شانِ ہند کا نام نہیں ہے۔ شانِ ہند کی اسی اشاعت میں بورڈ
کا اشتہار چھپ رہا ہے تو یہ شانِ ہند کو DAVP والوں نے از خود دیا ہے۔ کیا ڈائریکٹر صاحبہ اس ناانصافی کی وجہ
ہیں۔

۵۔ ترقی اُردو بورڈ کی نئی مطبوعات اخبارات و رسائل کے مدیران کرام کو تبصرہ کی غرض سے بھجوائی جاتی ہیں۔
رست میں شانِ ہند کا نام شامل تھا۔ مگر نہ معلوم کس وجہ سے شانِ ہند کا نام اس فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے جب کہ
ملک بھر میں ماہنامہ شانِ ہند ہی ایک ایسا ماہنامہ ہے جس کے ذریعہ سے بورڈ کی مطبوعات کی فروختگی دیگر رسائل و جرائد
کے مقابلہ کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ ہاں یہ بات دوسری ہے کہ شانِ ہند میں محض تعریفی تبصرے ہی شائع نہیں ہوتے۔
کہا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ ابوالفیض سحر صاحب کی مہربانی کا نتیجہ ہے کیا ڈائریکٹر صاحبہ بتا سکیں گی کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔

(باقی پھر)

۱۶ لاکھ صارفین کو فائدہ

دلی انتظامیہ کی طرف سے شروع کی گئی "چلتے پھرتے بازار" کی اسکیم کے تحت گزشتہ دو برسوں کے اندر ۱۶ لاکھ سے بھی زیادہ صارفین کو فائدہ پہنچا ہے۔

اس اسکیم کے تحت صارفین کو ان کے گھروں کے نزدیک روزانہ استعمال میں آنے والی ضروری اشیاء مناسب داموں پر دستیاب کرائی جاتی ہیں۔

یہ اسکیم اکتوبر ۱۹۸۲ میں شروع ہوئی تھی اور اس کے تحت اب تک چار کروڑ ۱۵ لاکھ روپے سے زیادہ قیمت کی اشیاء فروخت کی جا چکی ہیں۔

یہ اسکیم بہت ہی کامیاب اور مقبول ہو رہی ہے اس کا عام لوگوں کو اور خاص طور سے غریب کمزور طبقوں کے لوگوں کو فائدہ پہنچا ہے۔

اس اسکیم کی اہم خصوصیات یہ ہیں

- ۴۳ گاڑیاں۔ جن میں ۲۳ دلی ریاستی شہری [illegible] کارپوریشن کی اور دلی انتظامیہ [illegible] شامل ہیں۔ ان کے ذریعہ ضروری اشیاء کی فروخت جاری ہے۔
- شہر کے مختلف حصوں میں ۹۹ مقامات پر تقسیم کا انتظام۔
- چینی، چائے، دالیں، کاپیاں، سبزیاں، سرسوں اور ناریل کا تیل اور ونسپتی گھی، کنٹرول کا کپڑا، صابن، مصالحے، آلو اور پیاز وغیرہ ضروری اشیاء کی فروخت جاری ہے۔
- چائے، چینی اور دالیں جیسی چیزیں ایک کلو سیل بند پلاسٹک کی تھیلیوں میں [illegible] ایک کلو کی خصوصی تھیلیوں میں دستیاب ہیں۔

دلی انتظامیہ صارفین کے مفادات کے تحفظ کے لئے تہیہ کئے ہوئے ہے

محکمۂ اطلاعات و اشاعت، دلی انتظامیہ دلی

توصیف علوی عاصی کیرانوی

اُردو شاعری میں فنِ تاریخ گوئی

اُردو شاعری میں تاریخ گوئی ایک نہایت ہی اہم اور مشکل ترین صنعت ہے اور جتنی مشکل ہے اس سے زیادہ دلچسپ اور عجیب بھی ہے۔ اگرچہ یہ صنعت اردو شعر و سخن میں خاصی پرانی ہے اور اس کی بنیادیں کافی دور تک ہیں اور قدیم دور سے آج تک برابر ہمارے شعراء اور ادیبوں میں اس سے لگاؤ اور دلچسپی موجود ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس میدان میں قدم بڑھانا اور قلم اٹھانا بھی ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس فن کی تاریخ شاہد ہے کہ اس میں انہیں فنکاروں نے کاوش کی جرأت کی ہے جن میں اس کے لئے فطری صلاحیت بھی موجود تھی اور جو شاعرانہ فکر و فن پر بھی کافی عبور اور دسترس رکھتے تھے۔

تاریخ گوئی کا تعلق ایک خاص قسم کے حساب سے ہے جس میں ابجد ہوز کی ترتیب کے مطابق حروف تہجی کے مقررہ اعداد کی روشنی میں کسی خاص مادہ تاریخ سے جو عام طور سے مصرعہ شعر یا فقرہ کی صورت میں ہوتا ہے کسی اہم واقعہ کی تاریخ نکالی جاتی ہے اس طریقہ حساب کو "حساب جمل" کہتے ہیں۔ تاریخ گوئی کی اصطلاحی تعریف جناب آزاد بلگرامی کے الفاظ میں یہ ہے۔

"اصطلاح میں تاریخ اس کو کہتے ہیں کہ کوئی لفظ، فقرہ، مصرعہ، بیت یا عبارت ایسی تجویز کریں کہ اس کے مکتوبی حروف کے اعداد سے بحساب جمل کسی خاص واقعہ، شادی، وفات، تولید یا تصنیف کا سن معلوم ہو جائے"

جلال لکھنوی نے کچھ تھوڑے ردو بدل کے ساتھ اس صنعت کی تعریف اس طرح کی ہے۔

"جاننا چاہئے کہ تاریخ لغت میں کسی چیز کے وقت ظاہر کرنے کو کہتے ہیں اور تاریخ گوئی کو اصطلاح میں کسی امر عظیم اور واقعہ قدیم مانند کسی بادشاہ کی سلطنت یا کسی فتنہ، فساد، جنگ و کارزار، شادی و مرگ یا بنائے عمارت و باغ وغیرہ یا دیگر سوانح کے وقوعہ کی مدت معین کرنے کو بولتے ہیں"

اگرچہ اس دور میں اس فن کو ہماری شاعری میں پہلے جیسی مقبولیت حاصل نہیں رہی۔ تاہم اس کی دلچسپی سے اب بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی خاص وجہ اس فن کی وہ افادیت ہے جس کی بنا پر اس کے ذریعہ اپنی ضرورت کی تاریخ کو آسانی سے محفوظ بھی رکھا جا سکتا ہے اور قابل یاد واقعات کی تاریخوں کا تحفظ بھی ایک دلچسپ اور آسان طریقہ سے ہو جاتا ہے۔ اسی لئے فن تاریخ گوئی اردو شاعری میں ہمیشہ ہی ایک خاص صنف کے طور پر زندہ و تابندہ چلا آ رہا ہے۔ ویسے تو یہ فن شاعری کی مختلف صنائع بدائع میں سے ایک صنعت ہے۔ تاہم یہ ایک باضابطہ ایسا وسیع علم بھی ہے۔ جس کے چھوٹے بڑے اصول و ضوابط موجود ہیں۔

فن تاریخ گوئی کی بنا در اصل عربی کے حروف تہجی پر ہے اور یہ حروف اسی ترتیب سے اُردو میں آ گئے ہیں تاہم یہاں فارسی اور ہندی کے کچھ حروف مل کر ان کی تعداد میں تھوڑے اضافہ ہو گیا ہے لیکن کسی زمانہ میں عربی میں ان حروف تہجی کی ترتیب موجودہ سلسلہ سے مختلف "ابجد" کی ترتیب کے مطابق تھی۔ اسی لئے اسی ترتیب سے ان کے حساب جمل میں اعداد مقرر کئے گئے ہیں ان حروف اور ان کے اعداد کو آسانی کے لئے ان آٹھ کلمات میں مرتب کر دیا گیا ہے

ابجد ہوز حطی کلمن

(ا-ب-ج-د) (ہ-و-ز) (ح-ط-ی) (ک-ل-م-ن)

(۱-۲-۳-۴) (۵-۶-۷) (۸-۹-۱۰) (۲۰-۳۰-۴۰-۵۰)

سعفص قرشت ثخذ ضظغ

(س-ع-ف-ص) (ق-ر-ش-ت) (ث-خ-ذ) (ض-ظ-غ)

(۶۰-۷۰-۸۰-۹۰) (۱۰۰-۲۰۰-۳۰۰-۴۰۰) (۵۰۰-۶۰۰-۷۰۰) (۸۰۰-۹۰۰-۱۰۰۰)

ان آٹھ کلمات کی ایجاد کے بارے میں بھی مختلف تاریخی روایات ہیں تاہم علامہ نیاز فتحپوری کا اس ایجاد کے متعلق خیال ہے کہ اس سلسلہ میں تمام تاریخی روایات بے بنیاد ہیں حقیقت یہ ہے کہ عربوں نے یہ حروف ہی عبرانی زبان سے لئے اور چونکہ وہاں ان کی ترتیب "حروف ابجد" کے مطابق تھی اس وقت سے عربی زبان میں یہ حروف بعینہٖ اسی ترتیب سے آگئے بعد میں اگرچہ اسلوب تحریر اور [illegible] کے اعتبار سے زبان میں ان کی ترتیب بدل کر موجودہ انداز سے ہو گئی لیکن جمل کے قاعدہ میں ان کی ترتیب بدستور وہی چلی آرہی ہے۔

ابجد کے ان کلمات کے اپنے معانی بھی ہیں جو ان کی ایجاد کو ایک ٹھوس بنیاد فراہم کرتی ہے اگرچہ مختلف لغت نویسوں نے انہیں الگ الگ لکھا ہے۔ لیکن متفقہ علیہ صورت یہ ہے۔

ابجد = ابتدا کی، ہوز = ملا یا، حطی = واقف ہوا، کلمن = سخن گو ہوا۔ سعفص = جلد سیکھا، قرشت = ترتیب دیا۔ ثخذ = دل میں بٹھایا۔ ضظغ = تمام کیا

عربی زبان میں فارسی کے مخصوص حروف پ، چ، ژ، گ نہیں ہیں اور یہی صورت حال ہندی کے خاص حروف ٹ۔ ڈ۔ ڑ کی ہے جبکہ اُردو کے حروف تہجی میں عربی کے حروف ہجا کے ساتھ دونوں زبانوں کے یہ مخصوص حروف بھی شامل ہیں اس لئے اُردو میں ان حروف کے اعداد فن تاریخ گوئی کے مطابق وہی ہیں جو حروف تہجی کی ترتیب میں ان حرفوں سے پہلے آنے والے حروف کے مقرر ہیں جیسے پ = ب = ۲، ٹ = ت = ۴۰۰، چ = ج = ۳۔ ڈ = د = ۴، ڑ = ر = ۲۰۰، ژ = ز = ۷، گ = ک = ۲۰، تاریخ گوئی میں حروف کی قیمت لگانے کے سلسلہ میں یہ قاعدہ بھی خاص طور سے ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ ان حروف کے اعداد شمار کئے جاتے ہیں جو مکتوبی ہوتے ہیں یعنی تحریر میں آتے ہیں خواہ وہ بولنے میں نہ آتے ہوں جیسے عبدالرشید میں ا۔ ل۔ اور خواجہ میں و اگرچہ بولنے میں نہیں آتے ہیں مگر چونکہ مکتوبی ہیں اس لئے حساب جمل میں شامل کئے جائیں گے۔

تاریخ نکالنے کے جو اصول اور طریقے مقرر ہیں ان میں بنیادی اصول دو ہیں۔

(۱) صوری (۲) معنوی

صوری طریقہ سے مراد وہ اسلوب ہے جس میں مطلوبہ تاریخ یا سن، واضح الفاظ میں مادہ تاریخ میں بیان کر دیا جاتا ہے اور حروف کے اعداد محسوب کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ جیسے شیخ سعدی نے گلستان کی تصنیف کی تاریخ بھی ۶۵۶ھ اس طرح بیان کی ہے
"دراں مدت کہ مارا خوش وقتی بود ۔ ز ہجرت ششصد و پنجاہ و شش بود"
اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں "گلستاں" کا سن تصنیف ۶۵۶ھ ظاہر کیا گیا ہے۔ معنوی طریقہ سے کہ مادہ تاریخ کے حروف کے اعداد کے جمل کے کران کے مجموعہ سے مطلوبہ تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ دراصل یہی طریقہ تاریخ گوئی کی بنیاد ہے اور اسی پر اس فن کے تمام بنیادی خطوط مرتب کئے گئے ہیں۔ جیسے سر کشن پرشاد نے داغ دہلوی کی تاریخ وفات اس مصرعہ سے برآمد کی ہے۔ "دلی کا چراغ بجھ گیا۔ آہ" ۱۳۲۲ھ۔

معنوی طریقہ سے سن تاریخ نکالنے کے بہت سے اصول اور قاعدے ہیں اور درحقیقت فن تاریخ گوئی کی تمام تر بنیاد انہیں پر قائم ہے، اور یہی محور ہے یہ فن گھوم رہا ہے پھر ان قاعدوں سے جو شاخیں پھوٹتی ہیں انھوں نے اس فن کو اور بھی مشکل ترین اور دشوار گورکھ دھندا بنا دیا ہے۔ معنوی تاریخ گوئی کی قسموں کا دائرہ یوں تو کافی وسیع ہے مگر اردو کے فنکاروں نے جن میں قلم رسائی کی اور فن پارے بکھیرے وہ قابل ذکر اقسام یہ ہیں۔

(۱) صنعت معجمہ یا منقوطہ (۲) صنعت مہملہ یا غیر منقوطہ (۳) صنعت تعمیہ (۴) صنعت تدخلہ (۵) صنعت تخرجہ (۶) صنعت تداعون (۷) صنعت تقارب (۸) زبر بینہ (۹) توشیح (۱۰) صنعت ترجیح۔ اردو شاعری میں تاریخ گوئی بجائے خود بھی ایک خاص فکر و فن کا مظہر ہے اور پھر اس کی صنائع، بدائع تو اور بھی دماغ سوزی اور ذہنی کاوشوں کی آئینہ دار ہیں۔ اسی لئے اس فن نے اردو شاعری کو ایک ممتاز اور منفرد درجہ دے دیا ہے۔ اگرچہ اس کی اصل بنیاد عربی میں ہے وہیں سے یہ فارسی میں آیا مگر اردو شاعری نے جو اس میں چار چاند لگائے وہ بالکل منفرد حیثیت ہے جو اس سلسلہ میں ہر صنعت کے تجزیہ اور جائزہ سے ظاہر ہے۔

(۱) صنعت معجمہ میں شاعر کسی خاص مادۂ تاریخ سے اس کے صرف منقوط حروف کے اعداد سے تاریخ نکالتا ہے اور غیر منقوط کو چھوڑ دیتا ہے جیسے کلیات قدر بلگرامی کی تاریخ طباعت قیام الدین نیر نے اسی صنعت میں اس طرح نکالی ہے۔

نظم قدر بلگرامی بہتر از دُرِّ یتیم

اس مصرعہ کے صرف منقوط حروف ن۔ ظ۔ ق۔ ب
۵۰ - ۹۰۰ - ۱۰۰ - ۲ -
ی۔ ب۔ ت۔ ز۔ ی۔ ت۔ ی سے تاریخ مطلوبہ ۱۸۹۱ء
۱۰ + ۲ + ۴۰۰ + ۷ + ۱۰ + ۴۰۰ + ۱۰ = ۱۸۹۱
بنتی ہے

(۲) جب فن کار کسی مادہ تاریخ میں صرف غیر منقوط حروف لاتا ہے یا مادہ میں سے غیر منقوط حروف لے کر ان اعداد کے حساب سے تاریخ نکالتا ہے تو وہ صنعت مہملہ یا غیر منقوط کہلاتی ہے جیسے جلال لکھنوی کے ایک شاگرد نے ان کے پہلے دیوان کی طباعت کی تاریخ اس صنعت سے یوں نکالی ہے۔

سرورِ ہر دل والا گہر کرہ، اس کو کہہ ۱۳۰۰ھ

(۳) جب کوئی تاریخ کو سادہ انداز سے حروف تہجی کے مقررہ اعداد کے مطابق تاریخ نکالتا ہے اور کسی اور فنکاری کا دخل نہیں ہوتا تو وہ "صنعت تعمیہ" کہلاتی ہے جیسے حضرت عادل کیرانوی نے اپنے پیر و مرشد مولوی فیض اللہ صاحب کے مزار شریف پر کندہ قطعہ میں ان کا سالِ وصال اس طرح نکالا ہے۔

فکر تاریخ ہے کیا فیض طلب کر عادل ۔ مجھے ہاتف
نے کہا فیض کا گلشن ہے یہی"

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں مادہ تاریخ "فیض کا گلشن ہے یہی" سے بالکل سادہ طریقہ سے سن تاریخ ۱۳۸۵ھ بنتا ہے

(۴) اگر کسی مادہ تاریخ کے اعداد مطلوبہ عددوں سے کم رہ جاتے ہیں تو شاعر باہر سے کسی حرف یا لفظ کے اعداد کو اس میں داخل کرکے اصل تاریخ بناتا ہے اس کے لئے تخلیق کار شعر ہی میں یہ اشارہ بھی کرتا ہے کہ کون سے حرف یا لفظ کے عددوں کو جمع کرتا ہے جیسے سودا نے مظہر جان جاناں کی شہادت پر جو رباعی کہی تھی اس میں اسی صنعت سے کام لیا گیا ہے ۔

مظہر کا ہوا جو قاتل اک شوم ✻ اور ان کی ہوئی خبر شہادت کی عموم
تاریخ وفات ان کی کہی بے سر درد ✻ سودا نے کہ "ہائے جانِ جاناں مظلوم"

اس شعر میں مادۂ تاریخ "ہائے جانِ جاناں مظلوم" کے اعداد ۱۱۹۱ ہیں جو مطلوبہ تاریخ سے کم ہیں۔ چنانچہ "بے سر درد" میں یہ اشارہ موجود ہے کہ درد کے پہلے حرف دال کے عدد ۴ کو ۱۱۹۱ میں داخل کرکے صحیح سن وفات ۱۱۹۵ھ نکلتا ہے۔

اسی طرح قربان علی بیگ سالک نے مومن کی وفات پر جو قطعہ کہا اس کے آخری شعر میں یہی صنعت استعمال کی ہے شعر ہے:

کہا دل نے کہ داخل ہو گئے سب "ارم" میں عابد و مسکین و مومن

اسی شعر میں یہ اشارہ دیا گیا ہے کہ "ارم" کے عددوں میں عابد، مسکین و مومن کے اعداد جمع کرکے مطلوبہ تاریخ ۱۲۶۸ھ برآمد ہوتی ہے جو مومن کا سن وفات ہے۔

(۵) جب کسی مادۂ تاریخ کے اعداد مطلوبہ عددوں سے زیادہ ہو جاتے ہیں اور شاعر باہر کے کسی حرف یا لفظ کے اعداد کو ان میں سے خارج کرکے تاریخ نکالی جاتی ہے تو صنعت تخرجہ ہے جیسے استاد داغ دہلوی کی تاریخ وفات ان کے ایک شاگرد نے اسی صنعت میں اس طرح کہی تھی

"دم" نکلتا ہے سن کے یہ تاریخ ۔ آج راہی جہاں داغ ہوا
۱۳۶۶ =

۴۴ = ۱۳۲۲ھ اس شعر کے دوسرے مصرعہ کے اعداد ۱۳۶۶ مطلوبہ تاریخ سے زیادہ ہیں۔ اس لئے اس شعر میں بڑی خوبصورتی سے یہ اشارہ دیا ہے کہ "دم" کے اعداد (۴۴) کو ان اعداد میں سے کم کیا جائے تو اصل سن تاریخ ۱۳۲۲ھ جو نکل آتا ہے

(۶) بعض مادہ تاریخ کے اعداد کو دوگنا کرنے سے اصل تاریخ برآمد ہوتی ہے اسے صنعت تضاعف کہتے ہیں تضاعف کے معنی دوگنے کے ہیں جیسے ضیا حیدرآبادی نے ایک شادی کی تاریخ اسی صنعت سے نکالی ہے اور اس کے لئے شاعرانہ انداز سے اشارہ بھی موجود ہے

مبارک ہو دلہن کی رونمائی ✻ حبیب اللہ مسرت سے ہیں مخمور
ضیا نے عرض کی جلوہ کی تاریخ ✻ مضاعف ہو گیا "نور علی نور"

اس شعر میں اصل مادہ تاریخ "نور علی نور" ہے جس کے اعداد ۶۲۲ ہیں انہیں دوگنا کرکے ۱۲۴۴ھ مطلوبہ تاریخ بنتی ہے

(۷) اس طرح جب کسی مادہ تاریخ کے اعداد کو کسی عدد سے ضرب کر کے تاریخ نکالی جاتی ہے تو صنعتِ تقارب کہلاتی ہے۔ حضرت داغ کے شاگرد الم نے "مہتاب داغ" کا سال طباعت سن فصلی میں اس انداز سے نکالی ہے۔ ؎

سال فصلی یوں بھی نکلے اے الم ÷ تین چکر گر دگا ئے روزگار

اس کے معنی ہیں کہ "روزگار" لفظ کے اعداد ۴۳۴ کو تین سے ضرب کر کے اصل تاریخ ۱۳۰۲ھ ف نکل آتی ہے۔

(۸) صنعت توشیح میں شاعر قطعہ تاریخ کے پہلے اور دوسرے مصرعہ کے حرف اول کے اعداد لے کر الگ الگ تاریخ نکالتا ہے یہ بھی ایک مشکل صنعت ہے اور بوجہ طوالت اس کی مثال پیش کرنا مشکل ہے۔

(۹) صنعت ترجیح میں شاعر کچھ دوسرے ہی انداز سے فن تاریخ گوئی کا مظاہرہ کرتا ہے اس صنعت کے قطعہ تاریخ میں ہر مصرعہ سے الگ الگ تاریخ نکالی جاتی ہے۔ ایک مصرعہ سے سن ہجری نکلتا ہے تو دوسرے مصرعہ سے سن عیسوی برآمد ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صنعت میں دماغ سوزی اور ذہنی کاوش زیادہ ہوتی ہے اس لئے اشعار میں لفظی بھرتی کے ساتھ شعریت و معنویت قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ حال ہی مولانا حامد حسن قادری نے علامہ اقبال کی وفات پر جو قطعہ تاریخ کہا تھا وہ اسی صنعت کا نمونہ ہے۔ یہ قطعہ عنوان سے لے کر مرصع اور مسجع ہے۔ اس کے ایک مصرعہ سے سال ہجری اور دوسرے سے سن عیسوی برآمد ہوتا ہے۔ عنوان، پیشانی اور چند شعر بطور تمثیل اس طرح ہیں۔

سحر بیان آگاہ دل ڈاکٹر سر محمد اقبال رحمتہ اللہ علیہ

۱۹۳۸ء

در نظر عقیدت

۱۹۳۸ء

رفت اقبال، آفتاب جہاں ÷ رفت اقبال وقت بدر آیات

فخر اسلام ، نازش عالم علم ۱۳۵۷ھ ÷ تازہ مشرق بہترین صفات ۱۹۳۸ء

آں قلندر صفت سخن پیرائے ÷ آں مثال کلیم وقت نکات

(۱۰) تاریخ گوئی کی صنعتوں میں "زبر بینہ" ایک عجیب سی صنعت ہے اس میں بنیادی اصول کچھ تھوڑا سا بدلا ہوا ہے اس صنعت میں حروف تہجی کے تلفظ کو ملحوظ رکھا جاتا ہے اور ہر تلفظ کو بجائے خود ایک لفظ تصور کر کے اس صنعت سے کام لیا جاتا ہے۔ اسی اعتبار سے حروف تہجی کی تین قسمیں بنائی گئی ہیں۔

(الف) ایسے حروف جن کے تلفظ کے آخر میں الف آتا ہے اور تلفظ صرف دو حرفی ہوتا ہے جیسے ب، ت، ث، ح، خ، ر، ز، ط، ظ، ف، ہ اور ی ان کا تلفظ با، تا، ثا، حا، خا، را، زا، طا، ظا، فا، ہا اور یا ہے ان کو حروف ملفوظی کہتے ہیں۔

(ب) وہ حروف جن کے تلفظ میں ان کی آواز کے ساتھ دوسری آواز میں یا حروف میں شامل ہو جاتے ہیں حروف ملفوظی کہلاتے ہیں جیسے ا۔ ج، د، ذ، س، ش، ص، ض، ع، غ، ق، ک اور ل ہیں جن کا تلفظ الف، جیم، دال، ذال، سین، شین، صاد، ضاد، عین، غین، کاف، کیا جاتا ہے۔

(ج) م، ن اور و، یہ تین حروف مکتوبی کہے جاتے ہیں ان کے تلفظ کی صورت میں اول، آخر گھوم پھر کر وہی حرف آجاتا ہے۔ جیسے میم، نون اور واؤ۔

حروف تہجی کے تلفظ کے اعتبار سے یہ اقسام ہی "زبر بینہ" کی بنیاد ہیں اس صنعت میں تلفظ کے لحاظ سے جو لفظ بنتا ہے اس کا پہلا حرف "زبر" اور باقی حروف "بینا ت" کہلاتے ہیں جیسے "ج" حرف کا تلفظ "جیم" ہے اس کا پہلا حرف "ج" "زبر" ہے اور باقی ی، م بینات ہیں اور زبر بینہ صنعت کی بنیاد پر اس کے اعداد ہوتے ہیں ۳ + ۱۰ + ۴۰ = ۵۳، اگر اس صنعت کے اعتبار سے ہر تلفظ کے پہلے حرف کے علاوہ سے تاریخ نکالتے ہیں تو صنعت "زبر" اور باقی حروف کے اعداد سے کام لیتے ہیں تو صنعت "بینہ" کہلاتی ہے اگر دونوں اقسام کے صنعت کام میں لایا جاتا ہے تو صنعت "زبر بینہ" ہوتی ہے جیسے داغ کے دیوان "مہتاب داغ" کی تاریخ میر مہدی مجروح الم نے اسی صنعت سے ایک قطعہ میں اس طرح نکالی ہے۔

مجلس درد آفریں تعزیت میں میں بھی تھا
جب پڑھی تاریخ مومن نے یہ آکر برمحل
دست بیداد اجل سے بے سروپا ہو گئے
فقر و دیں ، فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

اس قطعہ کے آخری مصرعہ میں آئے ہوئے الفاظ فقر و دیں
فضل و ہنر وغیرہ کو بے سروپا کر کے یعنی پہلا اور آخری حرف
الگ کر باقی حروف ق ۔ ی ، ض ، ن ، ط ، ل ، اور ر کے اعداد
جمع کر کے سن تاریخ ۱۲۴۹ھ نکل آتا ہے

اس سلسلہ میں غالب کے یہاں تاریخ گوئی کے شگوفے پائے جاتے
ہیں مگر خال خال اس لئے کہ وہ دراصل فکر و معانی کے فنکار
تھے ۔ اس لفظی گورکھ دھندے سے دلچسپی نہیں تھی تاہم مرزا
جعفر کی شادی پر ان کا قطعہ ہے ۔ سہ

ہوئی جب مرزا جعفر کی شادی
ہوا بزم طرب میں رقص ناہید
کہا غالب سے تاریخ اس کی کیا ہے
تو بولا " انشراح جشن جمشید "

۱۲۶۰ھ

استاد ذوق کے یہاں بھی تاریخ کے نمونے نایاب
سے ہیں ۔ تاہم ان کے دیوان کے طبع ہونے پر ان کے
شاگردوں نے جو قطعات کہے ان میں کئی تاریخی ہیں سال
کے ایک شاگرد داغ نے جو قطعہ کہا ہے وہ اس طرح ہے سہ

جب کہ استاد کا کلام چھپا ÷ فکر تاریخ میں تھی طبع سلیم
یک بیک داغ مجھ کو ہاتف نے ÷ دی ندا ہے یہ نظم ابراہیم

۱۲۷۹ھ

لکھنؤ کے شعراء میں ناسخ کو فن تاریخ گوئی کا ذوق زیادہ
نظر آتا ہے ۔ کلام اس سلسلہ کے متعدد قطعات سے بھرا ہوا ہے
ان میں خاص خاص ہستیوں کے وفات پر کہے گئے قطعے اس
ضمن میں قابل ذکر ہیں ۔

شاہ عالم کی وفات پر کہا گیا قطعہ ہے ۔

شاہ خلد سلطنت تیمور امروز ÷ کرد ملک عدم آباد شہ کشور ہند
سال تاریخ پئے رحلت شاہ عالم ÷ گفت دل زیر زمیں رفتہ کشور ہند

۱۲۲۱ھ

تاریخ وفات نواب آصف الدولہ :۔

الٰہی آصف الدولہ بہادر ÷ بحق ناصب تو باد مغفور
نوشتم تاریخ وفاتش ÷ بود باحیدر کرار محشور

۱۲۱۲ھ

تاریخ وفات مرزا قتیل :۔

شاعر معجز بیاں مرزا قتیل ÷ رفت ازیں عالم سوئے باغ بہشت
کلک ناسخ سال تاریخ وفات ÷ سعدی شیرازی ثانی نوشت

۱۲۳۳ھ

تاریخ وفات میر یعقوب عباس :۔

افسوس ! افسوس امیر یعقوب صد افسوس ÷ از مردن او خورد ارسلہ آلام
تاریخ وفات او نوشتم یارب ÷ عباس بفردوس کنہ عیش دوام

۱۲۳۷ھ

سعادت یار خاں رنگین بڑے شوخ مزاج اور رنگین طبع
شاعر تھے اس صفت سے ان کی دلچسپی فطری ہے چنانچہ
اس موضوع پر ان کے دو قطعے ہیں ۔

نواب معتمد الدولہ کی وفات پر کہا ہے سہ

معتمد الدولہ چوں رفت از دنیا ÷ گشت زیں حادثہ مجلس افسردہ
ہاتف غیب بہ گفت رنگیں ÷ معتمد مردہ زدہر گردہ

رنگین نے اپنی تصانیف کی تعداد اسی فن میں بتائی ہے ۔ سہ

کہا اک شخص نے رنگیں یہ مجھ سے ÷ تیری تصنیف کے نسخے ہیں کتنے
اشارہ لب کی جانب کر کے اس کو ÷ کہا میں نے عدد "لب" کے ہیں جتنے

۳۲

موجودہ دور میں بھی اردو شعراء کو تاریخ گوئی سے دلچسپی ضرور ہے
لیکن چونکہ یہ دور شاعری برائے زندگی کا ہے کہ تحت شاعر اپنے
فکر و فن سے زیادہ سماجی عکاسی اور انقلابی موشگافیوں کا
دور ہے ۔ اس لئے تاریخ گوئی پر بطور فن اور صنعت کے توجہ
نہیں دی جاتی بلکہ اس صنعت سے دلچسپی رکھنے والے اہل
سخن عام ہوش کے مطابق کسی بڑی اور عظیم شخصیت کے
انتقال ، یا کسی مجموعہ کلام کی اشاعت یا کسی بڑے حادثہ
سانحہ کی تاریخ کو محفوظ رکھنے کے لئے اس سے کام لیتے ہیں
اور وہ بھی بڑا سادہ اسلوب اور انداز ہوتا ہے ۔ جس سے معنی

ہیں کہ اس دور میں تاریخ گوئی برائے تاریخ عزیز ہے برائے فن نہیں۔ اس لئے آج کل کے اس فن کے کچھ تازہ نمونے نذرِ قارئین ہیں۔

محترمہ اندرا گاندھی کے عظیم سانحۂ ارتحال پر کچھ شعراء کے فن پارے قابلِ ذکر ہیں۔

شمیم امروہوی کا قطعہ :-

نئی منزل کی جانب بڑھ رہا ہے ۔ دیارِ ہند کی وہ رہنما اب
برائے امنِ عالم جان دی ہے ۔ نہ بن جائے تصادم کی فضا اب
تقاضائے شانتی بن کا یہی ہے ۔ کوئی مصرعہ کہو تاریخ کا اب
صدا آئی لہجہ تکلیف کہہ دے ۔ ہوا ہے ختم عہدِ اندرا اب

۱۴۰۵ھ
۱۹۸۵ء

شریکِ صدمہ و آلام شمیم امروہوی

منتظر مرادآبادی کے قطعات :

۱۔ یاد کر کے اسے روئیگا زمانہ برسوں ۔
چھپ گئی خاک میں وہ روحِ چمن جانِ چمن
ہائے محروم ہوئے اسکی ضیا پاشی سے
راکھ ہو گئی جو شمعِ شبستانِ وطن

۱۴۰۵ھ

۲۔ بھول سکتے نہیں وطن والے
بلبلے اس واردات کا منظر
کاش ہم کو خدا نہ دکھلاتا
اندرا کی وفات کا منظر

۱۹۸۴ء

حضرت احسان دانش کی وفات پر صابرین ذوقی حیدرآباد (سندھ) کا قطعہ

اک فرشتہ نے کہا انعام اپنا ۔ پا چکے ہیں حضرت احسان دانش
مرحبا، صد مرحبا، جنت میں دیکھو ۔ آ چکے ہیں حضرت احسان دانش

۱۹۸۲ء

احسان دانش کی وفات پر خورشید سبحانی حیدرآباد (سندھ) کا قطعہ ۔

تھا زبان کی اصلاحات پر کام ۔ بہت اہم و نگیں احسان دانش
شرح ان دونوں کی ہی جستجو میں ۔ گیا افلاک پر احسان دانش

جوہر دیوبندی کے تحقیقی شاہکار "موجِ گنگ" پر پروفیسر بخش ناز اختر قیصری کی رباعی۔

اے مصنفِ "موجِ گنگ" ہر شام و گیاہ ۔ تو اہلِ ہنود کے سخن کا بیگانہ
تاریخ کی فکر تھی کہ آئی آواز ۔ آخر یہ شاہکار جوہر ہندا

بہر صورت "فن تاریخ گوئی" کے آئینہ میں اردو شاعری کے اس جائزہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری اردو شاعری نے دا جہاں فکر و فن اور علم و ادب کے دوسرے بے شمار اور بیش قیمت فن پاروں سے مالا مال ہے وہاں تاریخ گوئی جیسے مشکل اور اہم فن کے سرمایے بھی اس میں بدرجہ اتم موجود ہیں اور اس فن کو بھی اردو شاعروں نے چار چاند لگائے ۔ اور نئے گلہائے ہزارہ نے اس چمن کی تزئین کی۔ اس سلسلہ میں یہ حقیقت بھی باعثِ فخر ہے کہ ہندوستانی زبانوں ہی میں نہیں بلکہ بین الاقوامی زبانوں میں بھی یہ فن فارسی اور عربی کے علاوہ کسی دوسری زبان میں موجود نہیں۔

غزل

نور جہاں بیگم نور
حیدرآباد دکن

دل کی جدائی نظر سے ملاقات ہو گئی
دامن کی چشمِ تر سے ملاقات ہو گئی

تنہائی کے ہجوم میں گھر سے چلے
رستے میں ہمسفر سے ملاقات ہو

جب بھی ترا خیال ہٹا درمیان سے
آہوں کی خود اثر سے ملاقات ہو گئی

ہے کتنی دلفریب تبسم کی روشنی
جیسے نئی سحر سے ملاقات ہو

ہے جس کی رہبری میں سفینۂ جستجو
یہ کیسے راہبر سے ملاقات ہو گئی

ہم دو قدم بھی چل نہ سکے اپنے ہوش
جب ان کی رہگذر سے ملاقات ہو

اے نور اب سنبھال رکھو عظمتِ جبیں
سجدوں کی سنگِ در سے ملاقات ہو گئی

اپنے ہوئے پرائے

قمر جہاں

آج صبح سے ہی اس کا دل اداس تھا۔ لیکن رات کی تاریکی میں تو اس کی اداسی اور بھی گہری ہو گئی تھی وہ بھی کیا دن تھے جب اس کے دل میں کیسے کیسے حوصلے تھے۔ زندگی گذارنے کے لئے کیسے کیسے بلند خواب تھے۔ تمنائیں اور خواہشات تھیں۔ وہ زیر لب گنگنانے لگی ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اس نے بتی جلائی اور ایک بار آئینہ کے سامنے پھر سے اپنے سراپا کا جائزہ لیا اور کچھ دیر خاموشی سے آئینہ کو دیکھتی رہی کہ دیکھیں آئینہ کیا کہتا ہے۔

آئینہ بھی کیا شے ہے اپنی گونگی زبان میں کیا سچ بات کہہ جاتا ہے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ آئینہ پر نقاب ڈال دے یا خود اپنے اوپر یا وقت کی بے رحمی کے اوپر۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن رات کی تنہائی میں تمام چیزیں برہنہ تھیں۔ اس کا دل بھی برہنہ تھا اور تمام زخم جاگ چکے تھے۔ لوگ کہتے ہیں "ٹائم از دی بیسٹ ہیلر آف آل سوروز۔۔۔۔۔"

لیکن اس کے ساتھ تو الٹا ہی ہوا۔ گذرتے لمحوں کی چاپ سے گذرتے اس کے تمام زخم اور بھی گہرے ہو گئے ہیں۔

ماضی کے جھروکے میں اس نے جھانکا تو ایک خوبصورت ملیح زرد زرد کمزور سا چہرہ اس کے سامنے تھا۔ اسے اس چہرے سے کبھی بے حد پیار تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ ایک دن یہ چہرہ پھول کی طرح کھلے گا۔ اس کی زردی گلابی رنگت میں بدل جائے گی اور دور دیس کا کوئی اجنبی آکر اس چہرے کی صحیح قدر و قیمت لگائے گا اور وہ مسکراتی ہوئی پیا ملن کے گیت سنتی ہوئی بابل کے گھر سے ایک اجنبی کے گھر چلی جائے گی۔۔۔ اجنبی۔۔۔۔۔۔۔ اجنبی نہیں رہے گا بلکہ وہ تو اس کی زندگی بن جائے گا۔ وہ ٹوٹ کر اس سے پیار کرے گی اور اپنے گھر کو جنت کا نمونہ بنا دے گی۔ اسے اس بات کا یقین تھا کہ ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

وقت دبے قدموں گذرتا گیا ــــــ زرد زرد چہرہ تھوڑا بھرتا گیا اور اس کی رنگت پہلے سے بھی زیادہ نکھر گئی۔ آنکھوں سے شراب چھلکنے لگی۔ لیکن اس کے سپنوں کا وہ اجنبی شہزادہ نہ جانے کن راستوں میں بھٹک گیا تھا ــــــ وہ انتظار اور ابھی، اور ابھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور ابھی کے بے سود نعرے لگاتی رہی۔ شروع میں وہ اپنے تصوراتی شہزادہ کے لئے سال چھ ماہ میں دلہن کی طرح سجتی سنورتی رہی اور ہر بار آئینہ دیکھ کر خود ہی شرما جاتی۔ کوئی اس کے کانوں میں چپکے سے کہتا:

"ہاں بہت خوب لگ رہی ہے تو۔۔۔۔۔۔"

لیکن دوسرے ہی لمحے تلخ اور کڑوی صداقتوں کا سامنا ہوتا اور اس کے تمام سپنے ایک۔۔۔۔۔۔ ایک کرکے بکھر جاتے سپنوں کے اس سنورنے اور بکھرنے کا سلسلہ طویل سے طویل تر ہوتا گیا۔ بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ اس کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز سے تیز تر ہوتی گئیں اور اس کے سجنے اور سنورنے کا وقفہ بھی جلد جلد آنے لگا۔ کبھی کبھی تو وہ ہر ہفتہ تماشہ بننے پر مجبور

کی جاتی ــــــ تماشائی آتے، کھاتے پیتے اور مسکراتے ہوئے چلے جاتے ۔ لیکن جاتے جاتے اس کے دل پر وار لگا جاتے ۔

کوئی کہتا :-

"سب کچھ تو ٹھیک ہے مگر لڑکی کا قد چھوٹا ہے"

کوئی کہتا :-

"لڑکی کا نقشہ تو بہت اچھا ہے مگر چارم نہیں ہے"

کہیں سے کوئی آواز ابھرتی :-

"لڑکی دبلی بہت ہے"

"اور بعد میں تو لوگ یہ بھی کہنے لگے کہ :-

"لڑکی کی عمر بہت زیادہ ہے"

غرض ہر تماشائی ایک وار لگا جاتا ــــــ کسی نے بھی تو یہ نہیں سوچا کہ اس ننھے سے دل پر کتنے وار لگ چکے ہیں اور اب جبکہ اس نے اپنی عمر کے پینتیس سال گذار لئے ہیں اور تماشہ بنتے بنتے تھک چکی ہے تو اسے اپنی حماقت پر افسوس ہو رہا ہے ــــــ کاش ! اس نے بہت پہلے ہی یہ فیصلہ کر لیا ہوتا ۔ کیا ہوتا اس کی شادی نہیں ہوتی ۔ لیکن اس طرح بے حساب زخم تو اس کے ننھے سے کلیجہ کو چھلنی نہ کرتے ۔

آج صبح سے ہی اس کے گھر والے بضد تھے کہ ایک بار صرف ایک بار وہ تماشہ بن جائے لیکن وہ بھی اپنی ضد پر اٹل تھی اب وہ ایک بار بھی ...... بن کر خود کو مذاق کا موضوع بنانا نہیں چاہتی تھی ۔ وہ جانتی تھی کہ ہر بار کی طرح اس بار بھی تماشائی اس کا منہ چڑائے گی ۔ لہٰذا وہ اپنی ضد پر قائم رہی ۔ لوگ آئے اور اسکو دیکھے بغیر ہی چلے گئے ۔

مہمانوں کے جانے کے بعد اس کے گھر والے ظالم کی طرح اس پر جھپٹ پڑے ۔ اس کے بوڑھے والد نے بڑی بے رحمی سے اسے کمرے سے گھسیٹتے ہوئے آنگن میں لا پٹخا اور دو چار زبردست تھپڑ اس کے رخسار پر لگاتے ہوئے بڑبڑانے لگے ۔

"کمبخت ضدی لڑکی ! اب یہ عمر بھر کنواری، کتنی منسوب تھی، لیکن کمبخت کی ضد نے سب چوپٹ کر دیا" گھر کے دیگر افراد بھی کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے ۔

رات گہری ہو چلی تھی، سارا سنسار سو یا پڑا تھا لیکن .... وہ جاگ رہی تھی .... اس کے دل کا ہر زخم جاگ اٹھا تھا اور وہ سسکیوں کے ساتھ سوچ رہی تھی ! ــــــ

"اب تک تو اس نے غیروں سے ہی غم کھائے تھے لیکن آج .... آج تو اپنے بھی پرائے ہو گئے"

غزل

بسمل نقشبندی رتلامی

حادثے ایسے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا
زخم دل گہرے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا

بیٹھ کر تنہائیوں میں روئیں گے ہم زار زار
نیند پر پہرے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا

آنسوؤں میں آگ کی تاثیر بھی آ جائے گی
شبنمی شعلے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا

لمحہ بھر کو بھی سکوں حاصل نہیں ہوگا ہمیں
روز و شب ایسے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا

ہمنشینی آپ کی محسوس تو ہوتی مگر
درمیاں پردے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا

اپنی بربادی کے افسانے بنیں گے اور پھر
کو بکو چرچے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا

غیر تو پھر غیر ہیں غیروں کا کیا شکوہ مگر
بر گماں اپنے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا

دل سی نازک شے کے ٹکڑے میں نے بسمل کر دیے
آئینے جیسے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا

بمبئی مرکنٹائل کو آپریٹیو بنک لمیٹڈ

رجسٹرڈ آفس ۷۸-۸۷ محمد علی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

دہلی آفس نمبر ۲۵۵۵/۲ نیتا جی سبھاش مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

فون نمبر ۲۶۸۲۶۶ — ۲۶۴۳۷۲

- ہمارے یہاں شرح سود تمام نیشنلائزڈ اور شیڈولڈ کمرشیل بنکوں کے مقابلہ ایک فیصد زیادہ ہے۔
- ہندوستان کا پہلا کوآپریٹیو بنک جس کو زرِ مبادلہ میں کاروبار کے لئے لائسنس جاری کیا گیا۔
- ہمارے بنک میں اوقاف کی جمع شدہ رقم کی آمدنی دفعہ ۱۳ (۵) (الف XIII) انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔

اس کے علاوہ

- ہم آپ کے آرام و آسائش کی ضروریات مہیا کرنے کے لئے آسان قسطوں پر قرضہ فراہم کرتے ہیں۔ ایک فیصدی کا فرق بہت بڑا فرق ہے۔ یہ آپ کی رقم میں ہزاروں روپیہ کا اضافہ کرتا ہے۔ آپ بھی اس کا فائدہ اٹھائیں۔

شمیم کاظم	حسینی۔ ایس ڈاکٹر	نفیس جی رنگون والا
(اسسٹنٹ جنرل منیجر۔ شمالی ہند)	(چیرمین)	منیجنگ ڈائرکٹر

غزل

سوز یاروی

جب بھی کسی کے ظلم و ستم یاد آ گئے
ہم جو بھلا چکے تھے وہ غم یاد آ گئے

جلتے ہوئے گھروں کی طرف دیکھ کر ہمیں
ہنگامہ ہائے دیر و حرم یاد آ گئے

اپنی تباہی کا جو سبب یاد آ گیا
وہ بھی ہمیں خدا کی قسم یاد آ گئے

شرمائے اور آئینہ ہاتھوں سے رکھ دیا
شاید کسی طرح انھیں ہم یاد آ گئے

رِسنے لگے ہیں پھر سبھی زخمِ دل و جگر
پھر آج مجھ کو تیرے کرم یاد آ گئے

آئی جو یاد مجھ کو تمہارے شباب کی
جتنے بھی سر ہوئے تھے قلم یاد آ گئے

بھٹکا نہ چاہا سوز اگر رہنماؤں نے
ہم کو ترے نقوشِ قدم یاد آ گئے

غزل

اختر شاہجہاں پوری

بیش قیمت ہیں ترے افکار بھی
علم و فن کا دیکھ لے بازار بھی

اب نہیں بکتا کوئی یوسف کہیں
دیکھ آئے مصر کا بازار بھی

اب یہ چاہوں ہوں کہ شب دیکھوں تجھے
تھا کبھی ملنے سے لیکن عار بھی

میں تمہارے خیر مقدم کے لئے
بھول بیٹھا عظمتِ دستار بھی

یوں بھی ہم سمجھے ہیں کس آرام سے
کاش ہوتا عشق کا آزار بھی

ہم تخیل ست گامی ایک دن
روک لیں گے وقت کی رفتار بھی

بڑھ گیا دیوانہ پن اختر مرا
کم ہوا جب التفاتِ یار بھی

غزل

ڈاکٹر [illegible]
لندن

اس شہر میں ملتے ہیں شباب اور طرح کے
چہروں پہ ہیں غازوں کے نقاب اور طرح کے

یہ وہ نہیں شاہین کہ ہو پرواز فلک پر
اڑتے ہیں فضاؤں میں عقاب اور طرح کے

مشکل ہے نہ تلوار نہ تو دار و رسن سے
اس بار کئے اس نے عتاب اور طرح کے

ڈرتا ہوں مری طرح نہ رسوا ہو مرا رب
یہ شیخِ حرم تو ہیں جناب اور طرح کے

خوشبو ہے نہ جگنو ہے نہ آنکھوں میں ہے آنسو
اس فصل میں دیکھے گئے خواب اور طرح کے

ملتے ہیں کھلے دل سے وہ اپنا ہو کہ ہو غیر
ہم وہ نہیں جو رکھیں حساب اور طرح کے

دیوانے کہاں ہوئے وفا ڈھونڈنے نکلے
اس فصل میں کھلتے ہیں گلاب اور طرح کے

غزل

نوشاد مونس اعظمی توڑیل در لے گڈھ

خاموش کیوں ہیں آپ سزا کچھ تو دیجئے
اُف تک نہ میں کروں گا یقیں میرا کیجئے

یہ راز کھل نہ جائے ذرا سوچئے حضور
غیروں کے سامنے نہ مرا نام لیجئے

یہ آتشِ حسد ہے بجھے گی نہ آب سے
حاضر ہے میرا خونِ جگر اس کو پیجئے

غیروں سے بات کیجئے میں روکتا نہیں
لیکن نہ میرے سامنے یہ جرم کیجئے

پختہ تعلقات اگر چاہتے ہیں آپ
مجھ کو کسی بھی شکل میں کچھ تحفہ دیجئے

آدابِ میکدہ کا بھی ساقی خیال کر
پہلے کسی سے کہئے نہیں آپ پیجئے

مونس یہ زندہ رہنے کا محکم اصول ہے
کم ظرف دوستوں پہ بھروسہ نہ کیجئے

غزل

محمد یسین نغمہ

اُن کے سر سے جو ڈھل گیا آنچل
دل کی دنیا بدل گیا آنچل

چہرہ کیوں ہے دھواں دھواں اشانہ
چاندنی سے بدل گیا آنچل

جس کے ہاتھوں کی چوڑیاں ٹوٹیں
اُس کے سر کا ہی جل گیا آنچل

اُف یہ غیرت قریب آنے پر
سر پہ تیرے سنبھل گیا آنچل

میری قسمت نے یاوری کی ہے
اب خیالوں میں ڈھل گیا آنچل

ہر خوشی زندگی سے دور ہوئی
ہاتھ سے جب نکل گیا آنچل

بات کچھ ایسی آپڑی نغمہ
سر خیال رخ پہ کل گیا آنچل

غزل

غمگسار و انتہائے درد و غم ہو جائے گی
میں نہ رویا تو تمہاری آنکھ نم ہو جائے گی

یہ وفا کی اتنی قسمیں کچھ خبر بھی ہے تمہیں
کل تمہاری ہر قسم عہدِ ستم ہو جائے گی

طے کیا جو ہم نے تنہا تھا محبت کا سفر
راہ میں نفرت کی دنیا ہم قدم ہو جائے گی

جانتا ہوں اس محبت کو تو مجھ سے کچھ نہ پوچھ
گر بہت ہو گی ترا رحم و کرم ہو جائے گی

اس قدر تیری محبت اس قدر تیرا خلوص
اس طرح تو تشنگی اے دوست کم ہو جائے گی

فکر ناحق ہے تجھے میری اُداسی کی "دوست"
کھل کے رو لوں گا اگر پل بھر تو کم ہو جائے گی

غزل

پروفیسر ایس۔ پی شرما تفتہ (کوروکشیتر)

اے جانِ جہاں! تیرا جہاں نقشِ قدم ہے
ہر لمحہ یہاں خلد ہے ہر لحظہ ارم ہے

ہم فاصلہ رکھتے نہیں دل اور زباں میں
جو لفظ زباں پر ہے وہی دل پہ رقم ہے

کیا کیا نہ ستم ڈھائے مری جان پہ سب نے
زندہ ہوں اگر تو یہ تیری شانِ کرم ہے

دُنیا کے مناظر نظر آتے ہیں برابر
آئینۂ دل کیا ہے مرا ساغرِ جم ہے

قدریں کبھی دُنیا میں برابر نہیں ہوتیں
جو زہر کو امرت ہے وہی بکر کو سم ہے

فنکار زر و سیم کے پیچھے نہیں پھرتا
فنکار کا سرمایہ فقط اُس کا قلم ہے

یہ امرِ مسلّم ہے کہ احسان بھلانا
انسان کے کردار میں سب سے بڑا غم ہے

یہ طرز ادا کوئی بھلا کیا گل نہ کھلا دے
"کیا جانیے کیوں آج وہ مائل بہ کرم ہے"

انسانوں میں انسان کے اوصاف ہیں عنقا
اس دور میں اے تفتہ یہی ایک ستم ہے

غزل

نور ریواڑی

دل لگانے کی بات کرتے ہو
کس زمانے کی بات کرتے ہو

توڑ کر پھول سا ہمارا دل
مسکرانے کی بات کرتے ہو

قید کر کے قفس میں پنچھی کو
آب و دانے کی بات کرتے ہو

توڑ کر آئینہ محبت کا
منہ دکھانے کی بات کرتے ہو

فاصلہ بڑھ رہے ہوں جب دل کے
پاس آنے کی بات کہتے ہو

جان دیتا جو وفا پہ اُسے
آزمانے کی بات کرتے ہو

یوں ہی کیا کم ہیں غم زمانے کے
دل دُکھانے کی بات کرتے ہو

اپنے گھر کی نہیں خبر تم کو
تم زمانے کی بات کرتے ہو

بجلیوں کے چمن میں تم اے نور
آشیانے کی بات کرتے ہو

وحشتِ مجنوں و لیلیٰ کے حوالے، پتھر
ہم کو بر قاب و تمازت سے نہیں کوئی ضرر
چوٹ اس دل پہ لگی درد بھی محسوس ہوا
ان میں اخلاق و محبت کی جگہ سختی ہے
فرقِ پربت پہ کسی طور نہیں پڑ سکتا

موتی ساگر سے نہیں ہم نے نکالے پتھر
پتھروں پر کوئی کس طرح اُچھالے پتھر
جتنے آئے مرے ہاتھوں میں سنبھالے پتھر
دورِ حاضر نے بشر تو نہیں، ڈھالے پتھر
جتنے چاہے مری تقدیر اُچھالے پتھر

جو بھی مشتاق محبت کا طلبگار ملے
اس سے کہئے کہ کلیجے سے لگالے پتھر

درسِ عبرت

ڈاکٹر اودے سرن اسان

شہر میں ایک معمولی سی ملازمت خدا خدا کر کے ملی۔ تنخواہ معمولی اور بالائی آمدنی کا کوئی امکان ہی نہ تھا اس لئے اپنے اہل و عیال کو گاؤں میں ہی رکھنے پر مجبور تھا۔ فٹ پاتھ پر سردار جی کے ڈھابے پر دوپہر کا کھانا کھا لیتا اور شام کو جاتے ہوئے بسکٹ پر اکتفا کرتے ہوئے سو جاتا۔ ایک دن ڈھابے سے کھانا کھا کر دفتر کی طرف جا رہا تھا کہ سڑک پر ایک بٹوا پڑا ہوا دیکھا اور ایک راہگیر چند قدم کے فاصلے پر جا رہے ایک سائیکل سوار کو زور زور سے آوازیں لگا رہا تھا سائیکل والے بھائی صاحب تمہارا بٹوا گر گیا ہے۔

سائیکل سوار نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور سائیکل سے اتر کر دائیں بائیں اور آگے پیچھے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اطمینان کر لیا کہ کوئی نہیں ہے اور یہ اچھی طرح جانتے ہوئے کہ اس کا بٹوا نہیں گرا مگر یہ سمجھتے ہوئے کہ ہاتھ آئی لکشمی کو کیوں ٹھوکر ماری جائے۔ راہگیر تو بے وقوف ہے جو مجھے آواز دینے کی بجائے چپ چاپ بٹوا اٹھا کر اپنی راہ لیتا۔

سائیکل سوار نے پھرتی سے سائیکل سڑک کے کنارے کھڑی کی اور بٹوے کی طرف اس تیزی سے لپکا جیسے مرے ہوئے چوہے پر چیل جھپٹتی ہے۔ جونہی سائیکل سوار بٹوے کی طرف لپکا راہگیر نے اس کی سائیکل لی اور یہ جا وہ جا۔ سائیکل والا بٹوا اٹھا کر مالِ غنیمت کی جانچ کر رہا تھا اور راہگیر سائیکل اڑاتے جا رہا تھا۔ سائیکل سوار کو بٹوے میں صرف ایک کاغذ ملا جسے اس نے پڑھ کر پھر بٹوے میں ہی ٹھونس دیا اور بٹوے کو انتہائی بے اعتنائی کے ساتھ وہیں پھینک دیا۔ اور جونہی اس نے اپنا رخ سائیکل کی طرف کیا تو سائیکل اس راہگیر کو اٹھائے اسے کافی فاصلے پر دکھائی دی اور وہ ٹھگے جانے کے افسوسناک تاثرات کے ساتھ فوری طور پر ایک سائیکل رکشا جو اس کے پاس سے گزر رہی تھی پر سوار ہو گیا اور رکشہ والے سے کہنے لگا کہ جلدی کرو بھائی سائیکل چور کا پیچھا کرنا ہے جو سامنے کچھ فاصلے پر دکھائی دے رہا ہے۔

گرے ہوئے بٹوے کا لالچ دلا کر ٹھگی کی اس واردات پر دل ہی دل میں راہگیر کے اس فنکارانہ ڈھنگ کی داد دیتے ہوئے بٹوے کی طرف بڑھا تاکہ یہ دیکھ سکوں کہ بٹوے سے کاغذ اور ٹھونسے ہوئے پرچے پر کیا لکھا ہوا ہے۔ میں نے بٹوے کو اٹھا کر اس میں سے نکال کر پڑھا۔ لکھا تھا۔

"جب یہ بٹوا تیرا تھا ہی نہیں تو اسے حاصل کرنے کے لئے اپنی سائیکل چھوڑ کر ادھر کیوں لپکا تھا۔ بے ایمان کہیں کے جس کی نیت پرائے مال پر خراب ہوتی ہے بھگوان اس کو اسی طرح کی سزا دیتا ہے۔"

میں اس کاغذ کو پھر بٹوے میں ٹھونس کر وہیں پھینک آیا تاکہ اسی طرح کچھ اور لوگوں کو بھی نصیحت مل جائے۔ کیونکہ ہمارے یہاں لوگوں کی کمی تھوڑے ہی ہے جن کی نظر دوسروں کے بٹوے پر

نئی دریافت

مکمل علمِ عروض ہندی میں

نہایت آسان اور دلچسپ

مصنف: مہر کشش

ہندی۔ اردو دونوں زبانیں جاننے والوں کے لئے یکساں طور پر مفید

— (ماہر العروض ڈاکٹر آزار علامی)

قیمت مع رجسٹری ‎-/17‎ (پیشگی)

پانچ پر کتابوں 25% — دس یا اس سے زائد پر 35% کمیشن۔

پتہ:- آر۔ پی شرما۔ 6/12 بورلا سوسائٹی چیمبور۔ بمبئی۔ 400074

ساتویں قسط

اور دھرتی کانپ اُٹھی

(احمد حسین شمس ایڈووکیٹ دکشن گنج)

شباب ہی کا تو دوسرا نام حسن ہے پھر ہیرا کو حسین کیوں نہ
نہ یہ چودھویں بہار تھی جو اس پر نثار ہو رہی تھی باد نسیم کے خوشگوار
پُرکیف جھونکے کلی کو پھول کی صورت بخشنے کے لئے بیقرار تھے ہیرا کا
ایک ایک عضو سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ گالوں میں اگر شراب کی سرخی دوڑ
رہی تھی تو اس کی چال میں ایک شرابی کی ساری مستیاں لہرا رہی تھیں
کشن لال نے اس کی تعلیم و تربیت میں کسی قسم کی کمی نہیں کی ہیرا جب
بارہ سال کی ہوئی تو اسے بلا ضرورت گھر سے نکلنے کو منع کر دیا گیا اور
اب تو ہیرا کا چودھواں سال تھا۔ پر رعنائی کا چاند! چند منازل
طے کرنے کے بعد یہ شبھ گھڑی نصیب ہوتی ہے

ہولی اپنی ساری رعنائیوں کے ساتھ آئی اور سب کو بیخود بنا کر
گزر گئی ہیرا نے اگرچہ بہت کوشش کی کہ ہولی کے موقع پر کسی صورت
سے اپنے بچپن کے ساتھی منوہر سے دو باتیں کرے مگر اس کا موقعہ
اسے نہ ملا ہولی کے تیسرے روز کشن لال اور منوہر پٹنہ چلے گئے
ہیرا اپنے پتا جی کی پریشانیاں آج سال بھر سے دیکھ رہی تھی گھر کے
کسی کام کاج سے اس کے پتا جی کو کوئی سروکار نہ تھا دن رات وہ
ہیرا کی سگائی ہی کی فکر میں لگے رہتے جہاں کہیں پتہ چلا وہیں دوڑ پڑے
اور اب کی دفعہ وہ پٹنہ گئے ہوئے ہیں۔

آج صبح ہیرا اپنے کمرے میں بیٹھ کر نندن کے لئے ایک سوتی بنیاین
بنا رہی تھی کروشیا کی رفتار کے ساتھ اس کے خیالات میں بھی
ہیجان پیدا ہو رہا تھا جوانی کی مستیاں ہیرا کو اپنے قابو میں رکھنا چاہتی
تھیں ہر لمحے اس کے خیالات میں نئے ولولے اور نئی امنگیں پیدا
ہو رہی تھیں ہر لمحہ اس کے تخیلات کی رنگینیاں بڑھتی جاتی تھیں
اور ہیرا چاہتی تھی کہ وہ اپنے ان جذبات و خیالات کو کتابوں اور
دستکاریوں کی نذر کر دے وہ لاکھ کوشش کرتی تھی کہ کسی طرح وہ
اپنے کو بہلائے رکھے مگر شباب نے اس کے دل و دماغ کو مسحور
کر رکھا تھا راتوں کی تنہائیوں میں وہ اکثر سوچتی کاش اس سے
اس وقت کوئی میٹھی میٹھی باتیں کرتا اور اس کے امڈتے ہوئے جذبات
کو تھپکیاں دے دے کر سلا دیتا۔ مگر وہ صرف کروٹیں بدل کر رہ جاتی
تھی اور جب اضطراب کچھ زیادہ بڑھتا تو وہ بارہ ایک بجے رات کو بھی
اٹھ کر کسی کتاب کے مطالعہ میں محو ہو جاتی تھی۔ آخر یہ جوانی چاہتی
کیا ہے؟ سکون؟ مگر وہ سکون کہاں ہے؟ دل کے گوشے سے
ایک خفیف دلنواز آواز آتی ایسی آواز گویا کوئی اس سے سرگوشیاں کر
رہا ہو۔ مرد کی آغوش میں۔ مگر وہ مرد کون ہے؟

ہیرا سہم جاتی جیسے ہرنی کی طرح اے کاش وہ منوہر ہوتا منوہر
نے اسے بچپن میں بہت دق کیا۔ ہے پھر بھی نہ جانے کیوں منوہر کی
طرف دل کھنچا جا رہا ہے۔ سات دن پہلے منوہر گاؤں آیا مگر
اس سے ملاقات نہ ہو سکی صرف اس روز اسے ذرا ایک نظر دیکھ لیا
تھا اور بس۔

اتنے میں اس کی بھاوج نندن کو گود میں لئے ہوئے آئی اور
ہیرا کے سامنے ایک مونڈھے پر بیٹھ گئی۔

ہیرا نے کہا "نندن نے ذرا آنا تو ایک دفعہ ادھر تیری ناپ لے لوں"
نندن ماں کی گود سے اتر کر تن کر اپنی پھوپھی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

ہیرا نے اس کی ناپ لے کر پوچھا "صرف کھیلتے ہی ہو" گرو جی کے
پاس جی لگا کر پڑھتے بھی ہو؟"

"واہ پڑھتا کیوں نہیں۔ اب شششولبودھ ختم بھی کر رہا ہوں"
اس کی ماں نے کہا "نندن ذرا وہ بلی والا دوہا اپنی پھوپھو کو سنا
تو دے"

ہیرا نے ہاتھ روک کر کہا "ہاں ذرا پڑھو تو منو"
اور نندن نے پڑھنا شروع کیا۔ "دیکھو لڑکو بلی آئی چوہیوں نے لڑکی
کیسی کہانی!" اور پھر اس نے پوری کی پوری نظم زبانی سنا دی

"واہ منو" ہیرا نے کہا۔ "اب تو تم بہت پڑھ گئے"
نندن نے اپنی ماں سے پوچھا "ماں ہیرا پھپھو مجھے منو کیوں

کہتی ہیں؟

"چھوٹے بچے کو منوہر کہتے ہیں"

"اور منوہر کا - کا کا کی تو اس کے بھیا منو کہتے ہیں"

"تو وہ اپنے بھیا سے چھوٹے جو ہیں"

ہیرا نے پوچھا "منوہر کا کا کے گھر تو کب گیا تھا"

"ہولی کے دن" اور پھر اس نے ماں سے کہنا شروع کیا بڑی کاکی ہیں جو تاں ماں انھوں نے منو کا کا کے سر پر ایک موٹا رنگ ڈال دیا منوہر کا کا کھسیانے ہو کر اس کی طرف دوڑے وہ چلیں بھاگ منوہر کا کا نے [illegible] سے کہا - ننھو ذرا اپنی کاکی کو پکڑ تو میں دوڑا اور لگیا اور میں ساڑی پکڑ کر اسے کھینچ لایا وہ ساڑی بھی سنبھالتی جا رہی تھیں اور چھڑا لینے بھی جا رہی تھیں اور ادھر منو کا کا نے وہ پچکاریاں چلائیں ماں وہ پچکاریاں چلائیں کہ کاکی رنگ سے تر ابور ہو گئیں اور پھر ایک مٹھی عبیر لے کر اس کے منہ پر یوں مل ڈالا - اور واقعی ننھن نے اپنی ماں کے چہرے کو ملنا شروع کیا۔

— ادھر ہیرا کے دل میں ایک عجیب گدگدی پیدا ہونے لگی۔ اس کی ماں نے جھنجھلا کر کہا "بڑا پاجی ہے اے تو یہ کیا حرکت ہے"

"ماں منوہر کا کا میرے یہاں ہولی کھیلنے کیوں نہیں آئے؟"

"پھر وہ کس کے ساتھ ہولی کھیلتے"

"کیوں؟ تم جو ہو پھپھی جو ہیں"

ہیرا کی آنکھیں اضطراری طور پر ننھن کی طرف اٹھیں اور آپ ہی آپ جھک گئیں - ہیرا شرما گئی - چہرے پر ایک ایسا رنگ آیا جیسے اس کی سجاوٹ [illegible] اور اس کے دل نے کچھ محسوس کیا

ننھن کی ماں نے کہا - "وہ دیکھ تیری پھپھی شرما رہی ہیں۔"

"واہ واہ - [illegible] شرمانے کی کون سی بات ہے ہولی تو سبھی کھیلتے ہیں"

"مگر ہیرا کو رنگ سے نفرت ہے"

"تو لاؤ میں پھپھو کی ساڑی میں رنگ لگا دوں" اور ننھن نے باہر جانا چاہا۔

ہیرا نے ڈانٹ کر کہا "کہاں جاتا ہے۔"

ننھن وہیں کھڑا ٹھٹھک گیا اور کبھی ہیرا کی طرف کبھی ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

ہیرا بولی - "دیکھتی ہوں تو روز بروز بدمعاش ہوا جا رہا ہے، مار دوں گی" - "چپ بس بھی بھی وہ نہ ننھے کا بیٹھ چپ چاپ کی گود میں" اور ننھن اپنی ماں کی گود میں دبک کر بیٹھ رہا

ننھن کی ماں نے کہا "ہیرا! اب کی تم منوہر دلہن بن..."

"چپ بھی رہو بھابی - تم بھی کیا بات لے بیٹھیں"

"اتنی شرماتی کیوں ہو ایک دن میں بھی تمہاری طرح کنواری ... مگر تمہیں تو میرے بھیا سے ساز باز تھا بھیا گئے۔ اور بیٹھا کر لے آئے"

"تم بھی کسی کی گود میں بیٹھ کر رنگ رلیاں مناؤ گی اور ہوا ہو گی اپنے ساجن کی کر سال چھ مہینے میں خدا سے بھی کو یاد نہ کرو گی دل تو تڑپ رہا ہو گا ہیرا کیوں" "اور بھابی تم"

"میں شادی نہ کروں گی بھابی"

"ہاں" منہ بنا کر بھابی نے کہا۔ ہر لڑکی شادی کے پہلے یہ ہے اور دل سے جو پوچھو تو وہ پاگل ہو رہا ہے۔

"اب اپنے دل کی بات مجھ سے نہ بولو"

"یہ اچھی کہی" بھابی نے ذرا سنبھالا

"مجھے تو مردوں سے چڑ ہے بھابی" ہیرا نے مسکرا کر کہا۔

ہاں چڑ کیوں نہ ہو - اس دن دروازے پر منوہر بابو آئے جھانک کر میں ہی تو دیکھ رہی تھی۔

ہیرا نے بھابی کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا کر نظر نیچی کر لیں۔

"لو چہرہ رنگ اڑا نہ گیا۔"

"بھابی" اور ہیرا شرما گئی

"تو یہ کیوں نہ کہو ہیرا کہ تمہیں سارے مردوں سے چڑ ہے ایک منوہر بابو کو چھوڑ کر"

ہیرا نے بھابی کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور گھبرا کر کہا "بھابی بھگوان کے لئے ذرا دھیرے بولو کوئی سن لے گا تو کیا کہے گا" "کیا؟" لاپرواہی سے ننھن کی ماں نے کہا۔

"اب چپ بھی رہو - بھابی ورنہ میں بھاگ جاؤں گی۔"

اس کی بھابی نے ننھن سے کہا - "بیٹا ذرا دوڑ کر اپنے

تو دے سکا۔

نندن وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد بھابھی نے
ہیرا، وہ دعوت کی رات تمہیں یاد ہے؟

"کیوں کیا ہوا؟"

"اس دن منوہر اور تمہارے بھیا سے بہت سی باتیں ہوئی تھیں
ارے بھیا وہ ساری باتیں آج مجھ سے کہہ رہے تھے۔"

شاید وہ شاعر صاحب کی بکواس کے بارے میں کہہ رہے ہوں گے
یہ عین وشین کی کیا کہہ گئے ترکش بھیا۔ اور دوسرا مصرعہ کیا پڑھا
اس فہمی نے بڑا زندہ دل آدمی معلوم ہوتا ہے یہ فہمی بھی۔ جب
میاں حسین بخش آئے تھے تو انھیں دیکھنے کے لیے میں بھی دروازے
تک گئی تھی بھابھی نے نہ جانے کیا کہا کہ فہمی صاحب نے عین وشین
دیتا پڑھ دی یہ عین وشین کون ہے بھابھی؟ یہ بڈھے بھی
مل بیٹھتے ہیں تو جوانوں کو بھی مات کر دیتے ہیں۔"

"ہوگی کوئی ایسی ویسی۔"

"اور سنا کچھ بھابھی تم نے" آہستہ سے ہیرا نے کہا۔

"کیا؟"

"یہ بڈھے بھی بڑے رنگین ہوتے ہیں۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم۔"

"قریب ایک بجے رات کو میری آنکھ کھلی تو باہر سے گفتگو
کی آواز آ رہی تھی۔"

"حویلی میں تو یہ سب ہوتا ہی ہے۔"

"میاں صاحب (حسین بخش) اس رات کو یہیں رہ گئے تھے
یا مکان چلے گئے تھے؟"

"مجھے معلوم نہیں" اس کی بھابھی نے کہا۔

"بھابھی تم بڑی بھولی ہو۔"

"اسی سے تم مجھے باتوں میں بہلا رہی ہو۔ میں کیا کہنے آئی اور
تم نے کیا بات چھیڑ دی۔"

"تم منوہر کے بارے میں کہو گی" منہ بنا کر ہیرا نے کہا

"ہاں۔"

"میں منوہر کے بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتی کیونکہ وہ مجھے
بہت دق کرتا تھا۔"

"اور اب اس نے زندگی بھر دق کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔"

ہیرا کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ چاہتی تھی کہ دن بھر کوئی منوہر کے
بارے میں اس سے باتیں کرتا رہے مگر زبان اس کے دل کی مخالفت
کر رہی تھی جب جب منوہر کا نام اس کی بھابھی کی زبان پر آتا ہیرا
شرما جاتی تھی۔ ممکن ہے مرد عورت کے اس انداز کا صحیح اندازہ
نہ لگا سکیں مگر ایک عورت عورت کے دل سے اچھی طرح واقف
ہوتی ہے بعض باتوں میں جس طرح تمام مرد یکساں ہوتے ہیں اسی طرح
ناز و نخرہ انداز و ادا دنیا کی تمام عورتوں میں قدر مشترک ہے انکار و
اقرار عورتوں کی لغت میں بالکل برعکس مفہوم رکھتے ہیں اس کی بھابھی
اس کے جذبۂ دل کو تاڑ گئی جس بات کا اسے شبہ تھا اب یقین کی صورت
اختیار کر گئی تھی نندن کے بیاہ جی نے جذبات منوہر کی طرف سے اس
نے بھانپ لی تھی ہیرا کی ادائیں اس کی تصدیق کر رہی تھیں منوہر دل تھا
اس کے دل کی بات اس کی زبان پر آ گئی۔ ہیرا عورت تھی اس
کی آنکھوں نے جذبات دل اپنے اندر سمیٹ لیے مگر دونوں کا مفہوم
تو ایک ہی تھا عورت کا دل سمندر ہے سمندر کا راز سمندر ہی جانتا ہے
باہر سے ہلکی ہلکی لہریں دیکھ کر یا تلاطم خیز طوفان دیکھ کر اس کی
تہہ کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے ہیرا کو جتنا کچھ کہنا تھا اس
سے زیادہ کہہ گئی مگر یہ مسئلہ حل کیسے ہو نندن ہیرا کے بھیا کی خواہش
اس کے بیاہ کی خواہش نہیں بن سکتی تو کیا اس کے معنی یہ
ہوئے یہ دو معصوم روحیں زندگی بھر آپس میں مل ہی نہ سکیں۔

اس کی بھابھی نے کہا۔ "ہیرا سچ کہو اگر منوہر سے تمہاری شادی
ہو جائے تو کیسا رہے۔"

"اب چپ بھی رہو بھابھی۔ اس وقت سے تم میرا سر کھا
رہی ہو۔"

"اور دل تو چاہتا ہوگا" اس کی بھابھی نے چٹکی لیتے ہوئے
کہا۔ کہ منوہر کی گود میں کب جا بیٹھیں

"تمہیں جا کر بیٹھ رہو۔ اگر وہ اس قدر پیارا ہے۔"

"مجھے تو یقیناً وہ پسند ہے مگر اپنے لیے نہیں تمہارے
لیے آج ہی منوہر کے گھر جاؤں گی اور اس کی بھابھی سے ساری
باتیں کہہ دوں گی کہ دونوں کس طرح ایک دوسرے پہ لٹو
ہیں۔"

(جاری ہے)

دِلّی اُردو اکادمی، دلّی دُوردرشن۔ آکاش وانی دلّی
اور
جولیس نحیف دہلوی

مسیحی شعراء میں جولیس نحیف دہلوی بہ لحاظ کلام، شاعرانہ ترنم اور ایک اچھے انسان کے اپنی مثال آپ ہیں۔ مسیحی شعراء اور ادیبوں میں عام طور پر یہ عیب پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے دوسرے مسیحی شعراء اور ادیبوں کی تخلیقات پر حرف گیری کرتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ خدا واسطے کی دشمنی رکھتے ہیں۔ مگر جولیس نحیف دہلوی خدا کے فضل سے کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھتے اور نہ ہی کسی کی شعری یا نثری تخلیق میں کیڑے نکالتے ہیں۔ بلکہ جو بھی ان کے قریب گیا اس کی مقدور بھر خدمت کرتے ہیں۔ عام مشاعروں میں یہ اپنے مخصوص ترنم اور عام فہم کلام کے لئے مشہور ہیں۔

دلی اُردو اکادمی کو آج تک یہ شرف حاصل نہ ہو سکا کہ وہ اپنے مشاعروں میں کسی مسیحی اُردو شاعر کو مدعو کر سکے۔ ہم کنور مہندر سنگھ بیدی سحر صدر پروگرام کمیٹی دلی اُردو اکادمی سے منصفانہ مطالبہ کریں گے کہ وہ مشاعروں میں جہاں کئی متشاعروں اور خوشامدی شاعروں کو بار بار مدعو کرتے ہیں وہاں دلی اُردو اکادمی کے مشاعروں میں جولیس نحیف دہلوی ایسے مسیحی شعراء کو بھی مدعو کیا کریں کیونکہ جب ہم یہ دعوےٰ کرتے ہیں کہ اُردو سب کی زبان ہے پھر کیا وجہ ہے کہ کسی مسیحی شاعر کو اردو اکادمی کے مشاعرے میں مدعو نہیں کیا جاتا جبکہ اُردو اکادمی دلی جناب جولیس نحیف دہلوی کے مجموعہ کلام "آوازِ دل" پر انعام دے چکی ہے۔ ہم آکاش وانی اور دلی دُوردرشن کے ذمہ دار ارکان سے بھی گزارش کریں گے کہ وہ کنوئیں کے مینڈک بن کر نہ رہیں بلکہ انہوں نے اپنے ارد گرد جو خوشامدیوں کا دائرہ بنا رکھا ہے اس سے باہر بھی نکلیں اور اُردو کے مسیحی شعراء کو بھی اپنے مشاعروں وغیرہ میں شرکت کی دعوت دیں اور اس ضمن میں ہم جولیس نحیف دہلوی کے لئے پُرزور مطالبہ کرتے ہیں۔ حال ہی میں مکتبہ جامعہ دلی نے ایک کتاب "جائزے" شائع کی ہے جس میں تقریباً دو صد اُردو کی اچھی کتابوں پر تبصرے کئے گئے ہیں۔ "جائزے" میں جناب نحیف دہلوی کے مجموعہ کلام آوازِ دل پر حسب ذیل تبصرہ جناب سیفی پریمی نے کیا ہے جو اُردو اکادمی دلی اور دوردرشن دلی نیز آکاش وانی دلی کے اُردو پروگراموں کے ذمہ داروں کے لئے باعثِ شرم ہے کہ ایسے شاعر کو مدعو نہیں کیا جاتا۔

آوازِ دل شاعر:- جولیس نحیف دہلوی۔ ناشر: ماہنامہ شانِ ہند نئی دہلی ۲۔ قیمت [illegible] روپے

مسیحی اہلِ قلم نے اردو ادب میں قابلِ لحاظ اضافہ کیا ہے۔ ان میں جولیس نحیف دہلوی شامل ہیں ان کا شعری مجموعہ "آوازِ دل" ماہنامہ شانِ ہند دہلی نے شائع کیا ہے۔ "آوازِ دل" میں بلاتیاں، قطعات، غزلیات درج ہیں۔ ان کے علاوہ وطنی نظمیں ہیں۔ تیوہاروں پر نظمیں ہیں۔ شخصیات پر نظمیں ہیں۔ یسوع مسیح پر عقیدت مندانہ نظم ہے۔ مروجہ زمینوں میں نحیف نے بعض اشعار اچھے نکالے ہیں۔ مثلاً ؎

گوشے گوشے میں مرے دل کے نظر آئیں گے آپ ؞ چیر کر دل کو اِدھر سے یا اُدھر سے دیکھیے

شاعر نے اپنے حالاتِ زندگی اور شاعری کے بارے میں جو لکھا ہے وہ "موجِ زیبائی" کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہیں۔ جولیس نحیف کے یہاں بعض انسانی تجربوں کو پیش کیا گیا ہے۔ وارداتِ قلبی کی سرگزشت بھی ہے نفسیاتی عنصر بھی۔ اس کے ساتھ زندگی میں روشنی پر مکمل اعتماد یہ رجائی پہلو قابلِ قدر ہے۔ درج ذیل اشعار میں ان اوصاف کی تلاش کی جا سکتی ہے۔

یادِ محبوب ترا ساتھ دیا ہے میں نے ؞ کس خطا کے لئے تو مجھ کو سزا دیتی ہے

رفتہ رفتہ حیا جائے گی ؞ پہلی پہلی ملاقات ہے

ہزاروں بار تاریکی نے حملہ تو کیا لیکن ؞ چراغِ آرزو کی روشنی مدھم نہیں ہوتی

(سیفی پریمی)

لال شہزادہ

محمد احسن فاروقی

نواب منصور علی خاں عرف چھوٹے مرزا صاحب کے خاندانی قبرستان میں ایک قبر سب سے الگ تھی اور سب سے زیادہ نمایاں اس وجہ سے تھی کہ وہ سرخ پتھر کی بنی ہوئی تھی۔ جو بھی اس قبرستان میں پہنچ جاتا وہ بے ساختہ یہ سوال ضرور کرتا "یہ قبر کس کی ہے؟" اس سوال کے جواب میں جو کوئی بھی نواب صاحب کے خاندان کا فرد موجود ہوتا وہ ایک عجیب قصہ سناتا۔ میں ایسے موقع سے وہاں پہنچا تھا کہ نواب صاحب جن کا سن نوّے برس کا تھا خود ساتھ تھے اور میرے سوال کے جواب میں انھوں نے کہنا شروع کیا۔

"یہ میری بہن تھی، مجھ سے چھوٹی تھی۔ ہم دو بھائی تھے۔ بڑے مرزا صاحب جن کی وہ سفید قبر دیکھ رہے ہو اور چھوٹے مرزا یعنی میں اور تیسری اولاد والد مرحوم کی یہ لڑکی تھی کس قدر خوبصورت تھی۔ ایسا صاف رنگ کہ پان کھاتی تھی تو گلے میں پیک دکھائی دیتی تھی بال اتنے بڑے کہ ٹخنوں تک آتے تھے۔ کاندھے میں رکھ کر دھوئے جاتے اور ایسے سیاہ اور ایسے چمکدار کہ ناگن معلوم ہوتے تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں اور دکھائی ایسی کہ دیکھتے آدمی نشے میں آجائے۔ غریب نرگس مستانہ جو آتش نے کہا نہیں ہے ؎

مگر اس کو فریب نرگس مستانہ آتا ہے
الٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

تو وہ عالم تھا۔ ستواں ناک۔ کتابی چہرہ، چوڑا ماتھا۔ بھبھوکا سے سرخ گال۔ اللہ نے اپنے ہاتھ سے خاص طور سے بنایا تھا۔ شہر بھر کی بیگمات اسے دیکھنے کے لئے آتیں اور اکثر دیکھ کر غش کھا جاتیں۔"

"کسی غیر مرد نے تو کبھی دیکھا نہ ہوگا؟" میں نے سوال کیا۔

"کیا مجال جو پرندہ بھی پر مار جاتا۔ بس ان لوگوں کا سامنا تھا جن سے شرع نے پردہ جائز رکھا۔ والد تھے۔ بھائی جان اور میں۔ چچا ماموں کے لڑکوں سے بھی پردہ تھا۔"

"پڑھی لکھی بھی نہ ہوں گی؟"

"لکھنی تو تم جانتے ہو کہ ہمارے یہاں لڑکیوں کو لکھنا نہیں سکھایا جاتا۔ ہاں پڑھی ضرور تھی اور اس پڑھنے ہی سے اس کا قصہ شروع ہوتا ہے۔ یہی کوئی آٹھ نو برس کی ہوگی، استانی پڑھا رہی تھی استانی کہا کرتی تھی کہ قیامت کا ذہن پایا ہے صاحبزادی نے آپ سے آپ نکال لیتی ہیں اور ایک دفعہ پڑھنے میں حفظ اور پڑھنے کا لہجہ "قیامت" کہ جن سننے لگیں۔ اور یہی تو قیامت ہوئی کہ ایک جن عاشق ہوگیا۔"

"جن؟ یہ کیسے معلوم ہوا آپ کو؟"

"ایک دن استانی پڑھاتے پڑھاتے اٹھ کر بھاگی اور امی جان کے پاس آکر بولی "میں نہیں پڑھا سکتی صاحبزادی کو۔ ان پر کسی جن کا سایہ ہے۔" یہ کہہ کر وہ برقعہ اوڑھ بگٹٹ بھاگی اور پھر ہمارے گھر کا رخ نہیں کیا۔ امی جان نے دیکھا۔ ماشاء اللہ بیگم کو۔ اس کا نام ماشاء اللہ بیگم رکھا گیا تھا، سمجھے؟ تو سرخ ہو رہی تھی۔ آنکھیں تک سرخ ہو رہی تھیں۔ بس اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر پڑ گئی اور کمرے کے دروازے اندر سے بند ہو گئے۔ سب کھٹکھٹایا کئے بالکل نہ کھلے میں گھر میں آیا۔ امی جان مرحومہ نے مجھ سے کہا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کوئی جواب نہیں۔ اس کمرے کی دو کھڑکیاں باغ کی طرف تھیں، ہوا آنے کے لئے اور عورتوں کے باغ دکھانے کے لئے۔ میں ادھر جا کر دیکھا۔ دونوں کھڑکیاں بھی پٹ بند تھیں۔ کھڑکیاں زیادہ اونچی نہ تھیں اور ان کے پاس درخت تھے ان پر چڑھ کر میں نے زور زور سے کھڑکیوں پر ہاتھ مارے مگر معلوم ہوتا تھا پتھر ہوگئی تھیں وہ کھڑکیاں۔ ہاں آپا جان مرحوم کے کہنے پر آواز آئی "پریشان نہ کیجئے لال شہزادے آئے ہیں۔ جب چلے جائیں گے تو دروازے کھل جائیں گے۔"

"یہ آواز کیسی تھی، آپ نے سنی تھی؟"

"وہی ماشاء اللہ بیگم۔ میری بہن کی آواز تھی۔ جب بھی جواب آیا امی

کی آوازیں۔ "وہ لال شہزادہ کبھی خود نہیں بولا۔ ابا جان پلٹے تو عجیب طرح سے نظر آئے۔ امی جان یہ سن کر رونے لگیں۔ امام باڑے کے سامنے جاکر گر پڑیں اور دعائیں کرنے لگیں۔ ہم دونوں بھائیوں نے کہا یہ سب کچھ نہیں۔ لال شہزادہ ویزادہ کچھ نہیں۔ اس لڑکی کا دماغ کچھ پھر گیا ہے۔ امی جان نے کہا کچھ جھاڑ پھونک ہو مگر ابا جان نے کہا کہ غیر مرد کا سامنا ہوگا ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد کمرے کے تینوں دروازے اور دونوں کھڑکیاں آپ سے آپ کھل گئیں۔ ہم سب کمرے میں گئے۔ دیکھا ماشاء اللہ پلنگ پر جھکی ہوئی پڑی ہے بڑے بڑے بال کنڈلی مارے ایک طرف رکھے ہیں۔ ہم کو دیکھ کر اس نے آنکھیں کھولیں۔ شرمائی۔ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سر سے دوپٹہ اوڑھا اور منہ چھپا لیا۔ ماں پاس بیٹھ گئیں۔ لونڈیاں پاس کھڑی ہوگئیں ہم مرد لوگ چلے آئے۔ یہ پہلا واقعہ تھا۔

"تو کیا ایسے واقعے روز ہوتے؟"

"نہیں ہر جمعرات کو۔ کمرہ آپ سے آپ کیوڑے گلاب سے دھل جاتا۔ لوبان اور اگربتی کی وہ خوشبو کہ میں کیا کہوں۔ ایسی خوشبو کبھی سونگھی نہیں۔ مگر کسی کی ہمت نہیں کہ کمرے کے اندر جائے۔ بیگم کے پلنگ پر چادر، تکیہ غلاف، چھت گیری، پردے سب چمکنے لگتے۔ ماشاء اللہ بیگم بیٹھے بیٹھے ایک دم سرخ ہوجاتی۔ لال بسر ہوتی اور اٹھ کر بھاگتی۔ کمرے میں چلی جاتی۔ ایک ایک کرکے سب دروازے پھٹ پھٹ بند ہوجاتے ہم سب دیکھتے رہتے کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ تعجب کے عالم میں آجاتے۔ پہلے پہلے تو مجھے رات رات بھر نیند نہ آتی مگر پھر عادت پڑگئی کیونکہ ہر جمعرات کا تو یہ ورد ہوگیا تھا۔

"آپ نے باہر لوگوں سے یہ ذکر نہیں کیا؟"

"نہیں ابا جان نے کہا کہ لوگ کہیں گے کوئی مرد آتا ہوگا۔ جن کا فریب بنایا اور پھر لال شہزادے کی یہ تاکید تھی کہ راز گھر سے باہر نہ جائے نہیں تو سارے خاندان کو راندھ دیں گے۔

"یہ تاکید آپ کو کیسے معلوم ہوئی؟"

ابا جان مرحوم کی آواز پر جواب ضرور آتا۔ ایک دن انھوں نے دروازے کے پاس جاکر کہا "آخر آپ جن بھی تو ہماری طرح عمر کے پابند ہیں۔ نا فرجن تو جنابِ امیر کا غلام ہوگیا تھا۔ آپ بھی تو امی کے

خاندان سے ہیں۔ آپ کا مطلب کیا ہے؟ مجھے باپ کی حیثیت سے دریافت کرنے کا حق پہنچتا ہے" تو وہی لڑکی کی آواز میں جواب آیا۔ "ہمارا مطلب کسی کو تکلیف دینا نہیں ہے ہم اس پر عاشق ہوگئے ہیں۔ اس کو قرآن پڑھتے سنا اور اس کی آواز دل میں اتر گئی اور پھر دیکھا تو ایک جان چھوڑ ہزار جان سے عاشق ہوگئے۔ ہمارا اس کا نکاح ہوگیا ہے۔ ہم ہر جمعرات آیا کریں گے۔ آپنے اگر سانس لی تو پھر خاندان بھر کی خیر نہیں ہے۔ آپ جو بھی مانگیں ہم آپ کو دیں گے اور اگر راز کھلا تو سب کو راندھ دیں گے" ڈر کے مارے امی جان تک نے کسی سے کچھ نہ کہا اور ہم لوگ دم سادھ گئے۔ لونڈیاں اگر کہیں کہنے بیٹھتیں تو آپ سے آپ منہ بند ہوجاتا۔ ہر جمعرات کو یہ ہوتا رہا اور سب کمال سکوت میں رہے۔"

"اچھا، آپ کے والد صاحب مرحوم نے ان لال شہزادے سے کبھی کچھ مانگا بھی؟"

ابا جان کی ایک بڑی تمنا تھی کہ انھیں سچے ہیرے الماس کی انگوٹھی پہننے کو ملے۔ ویسی ہی جیسی انھوں نے جان عالم حضرت واجد علی شاہ کے ہاتھ میں دیکھی تھی اور کوئی تمنا نہ تھی۔ خدا کا دیا سب کچھ گھر میں تھا۔ تو ایک رات انھوں نے دروازے کے پاس جاکر کہا "اگر آپ جو چاہیں لا سکتے ہیں تو مجھے ایک ہیرے کی انگوٹھی لادیجئے، ویسی ہی جیسی جان عالم پہنتے ہیں" جواب آیا "اس سے بہتر مگر ایک شرط ہے۔ کل رات آدھی رات کے بعد آپ گومتی میں جاکر گھٹنے گھٹنے پانی میں کھڑے ہوں اور آنکھیں بند کرلیں اور جب آواز آئے تو ہاتھ پھیلا دیں اور انگوٹھی لے لیں" والد مرحوم یہ شرط پوری کرنے کو تیار نہ ہوسکے۔ میں نے کہا میں کروں گا ایسا" دوسری جمعرات کو انھوں نے لال شہزادے سے اجازت مانگی تو جواب ملا "اگر آپ نہیں تو بڑے مرزا یا چھوٹے مرزا ہی آجائیں مگر تیسرا کوئی نہیں" تو صاحب دوسری ہی رات کو میں گھوڑے پر سوار ہوکر گومتی پہنچا۔ چاند ماہ کامل ہو رہا تھا، لہریں بڑی ناز سے کھیل رہی تھیں۔ ادھر حسین آباد کے پاس گومتی کا موڑ نہیں ہے؟ گومتی کا نام ہی گومتی ہے کیونکہ وہ گھومتی بل کھاتی جاتی ہے۔ اس موڑ پر ہم لوگ سیر کیا کرتے تھے اور چلتے وقت مجھے وہی یاد آیا۔ میں وہاں پہنچا۔ گھوڑے کو چھوڑ دیا۔ سدھا ہوا جانور، کیا مجال جو جگہ سے ہٹے۔ ساکت کھڑا ہوگیا۔ میں جوتا اتار پائنچے چڑھا گھٹنے گھٹنے پانی میں پہنچ کر کھڑا ہوگیا

آنکھیں بند کئے کافی دیر کھڑا رہا۔ دل مضبوط کئے رہا۔ ایکدم سے آواز آئی "یہ لیجئے چھوٹے بھائی انگوٹھی" بالکل ماشاء اللہ بیگم کی آواز تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھایا اور انگوٹھی ہاتھ میں آگئی۔

"انگوٹھی!" تعجب سے میرے منہ سے نکلا۔

"جی ہاں صاحب سچ مچ کی چاندی کی انگوٹھی اور اس میں وہ ہیرا لگا ہوا کہ کسی نے کبھی خواب میں نہ دیکھا ہو"۔

"اس کو دوسروں کو دکھانے کی اجازت تو نہ ہوگی؟"

"کیوں نہیں، بالکل اجازت تھی صاحب۔ ابا جان نے جوہریوں کو دکھائی۔ پچیس ہزار اور تیس ہزار کی آنکی گئی۔ کہا گیا کہ جانِ عالم کی بھی انگوٹھی اس تک نہیں پہنچتی۔ وہ والد پہنے رہے اس کے بعد بھائی جان پہنے رہے۔ لوگ اسے دیکھنے آتے۔ میری انگلی میں رہی۔ غدر کے بہت بعد جب ہم سب لٹ لٹا گئے اور کچھ پاس نہ رہا تو میں نے تیس ہزار کی ایک مہاراجہ کے ہاتھ بیچی۔ ان کے یہاں اب تک ہے"۔

"یہ سب سے زیادہ تعجب کی بات ہے"۔

ارے آپ اسی پر تعجب کرتے ہیں۔ اب دنیا میں گناہ بہت بڑھ گئے ہیں۔ اس لئے جناتوں نے بھی اپنا تعلق توڑ دیا ہے ورنہ ہماری جماعت میں یہ بات بڑی عام تھی اور لال شہزادے تو گھر کے داماد تھے جو فرمائش کی جاتی پوری ہوتی"۔

"یہی گرمی میں گھٹنے گھٹنے پانی میں کھڑے ہو کر؟"

"نہیں بعد میں یہ خبط بھی نہیں۔ صبح ہوتی دروازے کھلتے، ماشاءاللہ بیگم ادھر شاہ نشین میں امی جان کے پاس آتی۔ ہم کمرے میں جاتے اور جو چیز مانگی ہوتی وہ وہاں رکھی ملتی۔ اور سنئے بھائی جان نے ایک دفعہ جاڑے میں اصلی سفیدہ آم مانگے۔ یہ ناممکن بات تھی مگر صبح کو وہ بھی رکھے ملے اور وہ مزے کے سفیدے کہ کیا کہوں ایسا مزہ تو کبھی ملا ہی نہیں۔ امی جان کی تاکید تھی کہ داماد سے مانگنا بڑی شبکی ہے اس لئے ہم لوگ زیادہ مانگتے نہیں تھے۔ یہ چیزیں بھی اتفاقاً مانگی تھیں اور صاحب گھر میں جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی جیسے مسندیں، تکئے، ظروف، پردے وغیرہ وہ آجاتے۔ ایک دفعہ ابا جان نے کہا کہ یہ سب پردے پرانے ہوگئے۔ نئے کمخواب کے ہوتے۔ دوسرے دن نئے کمخواب کے پردے ہر جگہ کے لئے کمرے میں رکھے ملے۔ امی جان کا چاندی کا پاندان پرانا ہوگیا تھا۔ کہا کہ جتنی خادمائیں رکھ گیا تھا وہ سب نئے آگئے اور پہلے والوں سے وزن میں کہیں زیادہ۔ صاحب کٹھیوں میں اناج غلہ جو بھرا جاتا تھا وہ ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ گائے بھینسوں کا دودھ بڑھ گیا۔ بکریوں کے تین تین بچے ہونے لگے تھے۔ گھوڑے بڑے چاق و چوبند ہوگئے تھے۔ لال شہزادے کے سائے کا عجب اثر تھا۔ میاں آپ لوگوں سے بیان کرتا ہوں تو یقین نہیں کرتے۔ کیسے یقین آئے۔ اسی شیطانی دجالی دور نے دماغ کو چوپٹ کر دیئے ہیں۔ امی جان کہتی تھیں کہ صندوقچہ آپ سے آپ روپیوں سے بھر جاتا ہے۔ لونڈیوں کے سرہانے تکیہ کے نیچے اشرفیاں نکلیں۔ کیا کیا بتاؤں۔ پورے سات برس تک یہی ہوتا رہا۔ ماشاءاللہ بیگم کوئی سولہ برس کی تھی" اور یہ کہہ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ ہاتھ سے آنسو پونچھنے لگے۔

پھر وہ قبر کے پاس آکر اس پر ہاتھ ٹیک کر فاتحہ پڑھنے لگے۔ اب وہ زار و قطار رو رہے تھے۔ رومال سے آنکھیں پونچھ کر بولے "اچھا ہوا مر گئی۔ جانِ عالم ہی کے زمانے میں بھگدڑ میں نہ معلوم کیا حال ہوتا اور آج کل کلجگ میں کیا معلوم کیسے جیتی۔ آنکھوں کے سامنے اس کا نقشہ آجاتا ہے جی تڑپنے لگتا ہے۔ مگر جو اللہ کی مرضی۔

میں تھوڑی دیر خاموش رہا۔ وہ قبر سے الگ ہو کر پھر اسی جگہ آکر بیٹھ گئے جہاں پہلے بیٹھے تھے۔ میں نے سوال کرنے کی جسارت کی "آخر ان کا انتقال کیسے ہوا"۔

انہوں نے افسردہ آواز میں کہا "اب کیا بتاؤں میاں۔ انگریزوں کا زمانہ اس معنے میں اچھا ہے کہ کوئی کسی سے زبردستی نہیں کر سکتا مگر ادھر غدر سے پہلے پولیس کا یہ انتظام نہ تھا۔ جس کا زمانہ ہوا بس جو چاہا کر لیا۔ ماشاءاللہ بیگم کے حسن کا چرچا ہر بڑے گھر میں تھا۔ مشاطائیں مہریاں دوڑتی تھیں جب سے وہ بارہ برس کی ہوئی روز ابا جان کے پاس پیغام آتے تھے وہ کہتے ابھی بچہ ہے ابھی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی ابھی دائیاں منع کرتی ہیں یہاں تک کہ کہہ دیا کہ وہ عورت ہی نہیں ہے میاں اس کی شادی نہ ہو سکے گی۔ مگر لوگ کہاں ماننے والے تھے۔ چار برس تک دن رات

پیغام پر پیغام رقعے پر رقعے آتے رہے - ہم سب رد کرتے رہے مگر منہ سے یہ نہیں نکال سکتے تھے کہ اس کی شادی لال شہزادے سے ہو گئی ہے ورنہ زندہ نہ رہنے پاتے - آخر کو شہزادے دارا قدر جو ایک کشتی سے اس کا حال پڑھ سن کر عاشق ہو گئے تھے اس قدر ضد کی کہ کیا کہا جائے آخر میں دھمکی دی کہ گھر پر حملہ بول دیں گے اور اٹھا کر لڑکی کو لے جائیں گے - آج کل انگریزی حکومت میں ایک ایسی شریف کیا چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے ساتھ ایسا کرنا ممکن نہیں - بس ایک صورت تھی کہ جانِ عالم تک رسائی ہو مگر یہ معاملہ ایسا تھا کہ ان پر بھی اعتبار کرنا عبث تھا۔"

"وہ لال شہزادے سے کوئی مدد نہ مانگی ؟ آخر ان کا ہی معاملہ تھا۔"

سنئے تو - ان سے ابا جان نے کہا - کوئی جواب نہ آیا - بار بار کہا کوئی جواب نہیں اور پھر ابا جان نے بھی تو غضب کیا اسے انتظار کرتے - دارا قدر کے سپاہیوں کو آنے تو دیتے مجھے تو یقین تھا کہ وہ سب دھوئیں کی طرح اڑ جاتے مگر ابا جان ڈر گئے اور کہہ بیٹھے " اس کی شادی لال شہزادے سے ہو چکی۔"

"بس پھر کیا تھا - ماشاء اللہ بیگم کے سخت بخار چڑھا - ایسا سخت کہ جسم پر چنے ڈال دو تو بھن جائیں - کسی حکیم کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہوا - امی جان قلق سے بے بس ہو کر زمین پر گریں اور جان بحق تسلیم ہو گئیں - ماشاء اللہ بیگم سوتی کی سوتی رہ گئیں - اس کو یہاں لا کر دفن کیا - ابا جان نے سرخ پتھر کی قبر بنوائی مگر تھوڑے ہی دنوں میں وہ بھی مر گئے جانِ عالم کو انگریزوں نے قید کر کے کلکتے بھیج دیا - بھگدڑ پڑی دارا قدر تادار ہو گئے - ہمارا بھی سب کچھ لٹ گیا ہم دو بھائی رہ گئے بھائی جان بھی گزر گئے - میں اکیلا رہ گیا ہوں - ہاں بچے پوتے نواسے سب ہی ہیں - ماشاء اللہ گھر بھرا ہے - وثیقہ ملتا ہے آرام ہے مگر جینے کو جی نہیں چاہتا - عمر ہے کہ شیطان کی آنت ہو گئی ہے - سانپ ہو گیا ہوں - خدا آنکھوں کے سامنے کھڑا کیا اب کوئی ستر برس ہو گئے ہیں - معلوم ہوتا ہے کل کی بات ہے - ماشاء اللہ بیگم اس قبر سے نکلی ہوئی سامنے دکھائی دیتی ہے - ویسی ہی لال جیسی لال شہزادے کے اس پر آنے کے وقت ہو جایا کرتی تھی۔

نواب صاحب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے اس لئے میں نے آگے کوئی سوال کرنا مناسب نہ سمجھا - ہم دونوں قبرستان سے چلے آئے - اب میرے لئے یہ قصہ نواب صاحب کے خیال کے ساتھ وابستہ ہو گیا تھا اور جب ایک دن پھر اطمینان سے لگے دن پھر ان سے ملا تو میں نے پوچھا " لال شہزادے والا قصہ روحانی اور مادی تعلقات کا کچھ ایسا قصہ ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا "

وہ بگڑ کر بولے " قصہ - قصہ کیسا ؟ یہ سب ان آنکھوں کا دیکھا واقعہ ہے آج کل کے آپ لوگ گھڑی ہوئی کہانی سمجھتے ہیں میرے لئے عین الیقین سے عین الیقین - اور لو یہ کہ لال شہزادے غائب ہی رہے اور چیزیں سب ملتی رہیں - ماشاء اللہ بیگم کی لاش لے گئے جسم چھوٹ گئے - تو میاں جنات لوگ ایسا ہی کرتے تھے - یہ یہ آپ لوگوں کے سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے - مشاہدہ محض مشاہدہ - میں نے آنکھوں دیکھی آپ بیتی آپ بیتی بیان کی "

نقوشِ داغ

جہاں استاد فصیح الملک داغ دہلوی کے دبستان سے متعلق شعراء حضرات کا ایک تذکرہ نقوشِ داغ کے نام سے مرتب کیا جا رہا ہے - جو شاگردانِ داغ کے شاگردوں اور آگے ان کے شاگردوں کے حالات اور نمونۂ کلام پر مشتمل ہو گا - اس تذکرہ کی مجوزہ ضخامت تقریباً ۵۰۰ صفحات ہو گی - حالات اور نمونۂ کلام کے ساتھ تصویر بھی شامل تذکرہ کی جائے گی - اس سلسلے میں متعدد حضرات سے مطلوبہ مواد فراہم ہو چکا ہے اور زیرِ کتابت ہے - خانوادۂ داغ سے نسبت رکھنے والے شعراء حضرات سے التماس ہے کہ اگر وہ اس تذکرہ میں شامل ہونے کے متمنی ہوں - تو درجِ ذیل پتہ پر خط لکھ کر تفصیلات طلب فرمائیں۔

ساحر ہوشیارپوری

۲۲۶۹ سیکٹر ۲۸ فرید آباد 121003

کیا آپ گلے کی تکلیفوں میں اکثر مبتلا رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے سخت پریشان ہیں، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ایسی پریشان کن بیماری
سے گلا کاٹ دینے سے ہی چھٹکارا مل سکتا ہے۔ ذرا ٹھہریے! خالص دیسی ادویات سے تیار کیا ہوا "ٹونسلیکس" ایک بار
صرف ایک بار استعمال کر کے تو دیکھئے، پھر آپ کو گلے کے غدود بڑھ جانے، گلے کی سرسراہٹ، خراش، گلے کے ورم، زخم اور
دوسرے تمام امراض کی شکایت نہیں رہے گی۔ اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا مریض ہو جس کے گلے کے غدود (ٹانسلائٹس) کا
آپریشن ہوتا ہے تو اسے اس دوا کے بارے میں ضرور بتائیے کیونکہ اسے آپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چھوٹے بچے
جو کھٹی میٹھی چیزیں کھا کر گلا خراب کر لیتے ہیں، ان کے لئے بھی یہ بہت کام کی دوا ہے۔ گھر میں اس کا رکھنا بہت ہی ضروری ہے۔

——— شرع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیبارٹریز، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

Phone: 275602
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002
Regd with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57
Regd No D- (DN) 353
SEPTEMBER 1985

قیمت : پندرہ روپے

خرید کر پڑھئے :

مانگ کر پڑھئے :

یا پھر

چوری کر کے پڑھئے

یہ ہے ہی اتنا خوب صورت،
اتنا دل کش،
اتنا مکمل کہ اسے کسی طرح بھی
حاصل کریں کیوں کہ
یہ فیض کی شخصیت اور فن پر ایک
شان دار ادبی دستاویز ہے۔ اِس میں شامل ہیں:

★ خلوت اور جلوت کے بھید کھولنے والے ذاتی نقوش۔
★ نادر و نایاب تصویریں۔
★ سدا بہار، ہزار رنگ و منتخب کلام۔
★ فیض کی شخصیت کے وہ ڈھکے چھپے گوشے جن پر سے پہلی بار پردہ اٹھایا گیا ہے۔
★ ہندوستان، پاکستان، روس اور انگلستان کے دانش وروں کی مشترکہ کاوشوں کا گلدستہ۔

ساری اردو دنیا میں شبستان کے "فیض نمبر" کا چرچا ہے

اس سے پہلے کہ اسٹاک ختم ہو جائے آج ہی اپنے قریبی نیوز ایجنٹ سے طلب کیجئے یا براہِ راست ہم سے منگوائیے۔

شبستان اردو ڈائجسٹ آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

Dr. Zakir Husain Library
J.M.I. New Delhi
شمارہ — ۱۰

ٹیلیفون: ۲۷۵۰۴۳ رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۷۵/۴۴۴۰ رجسٹرڈ نمبر ڈی (ڈی این) ۳۴۳

ہندو پرست ہوں نہ مسلمان پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انسان پرست ہوں
فیاض گوالیاری

ماہنامہ

شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

فی پرچہ: ۲/۵۰ روپے
زرِ سالانہ: ۲۴/- روپے

جلد ۴۶ | اکتوبر ۱۹۸۵ء | شمارہ ۱۰

مرحومہ وزیر اعظم

شریمتی اندرا گاندھی

کی یاد میں

اُن کے پہلے یومِ شہادت پر

ادارہ شانِ ہند

اپنی دلی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے ہزاروں سلام

پیش کرتا ہے

ودیا پرکاش سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس بچہ ... جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ نمبر ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

"میری زندگی ہی میرا پیغام ہے"

صداقت
عدم تشدد
امن
محبت
رواداری
بے خوفی
مساوات
سادگی
سودیشی

ایک پیغام ، جو ہمارے لئے
ہمیشہ مشعل راہ ہے

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

اردو رابطہ کمیٹی "بدست طفلاں"

اردو رابطہ کمیٹی کے چیرمین رام لعل صاحب تین دن ہوئے ماسکو سے تشریف لائے ہیں۔ دفتر شانِ ہند میں آپ کی تشریف آوری ہوئی جب انھوں نے اردو رابطہ کمیٹی کی علامتی بھوک ہڑتال (۲ اکتوبر ۱۹۸۶ء) کے بارے میں راقم الحروف سے دریافت فرمایا تو انھیں بتا دیا گیا کہ یہ علامتی بھوک ہڑتال جو بظاہر کامیاب نظر آرہی تھی، دراصل ناکام تھی اور اس کی وجوہات حسب ذیل تھیں۔

۱- اردو رابطہ کمیٹی کے نائب صدر اور کنوینر ردولوی صاحب دلی میں کئی دن تک ڈیرا ڈالے رہے مگر انھوں نے اپنا دائرہ محض مسلمان نوجوانوں تک ہی محدود رکھا۔ اور ماسوائے روزنامہ "قومی آواز" کے انھوں نے ایسے خالص مسلم خیالات کی سرپرستی میں رہنا پسند کیا جو مسلمانوں کو مذہب کی افیون پلاکر ان کی جیبیں خالی کرنے میں ماہر ہیں۔

۲- علامتی بھوک ہڑتال کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد کے مزار کی بجائے مہاتما گاندھی کی سمادھی موزوں اور بہتر رہتی۔ کیونکہ مولانا آزاد نے اردو کے حق میں ایک جملہ کہنے کے علاوہ اردو کے لئے کیا ہی کیا تھا؟ حالانکہ وہ خود وزیر تعلیم تھے۔ پنڈت جواہرلال نہرو پر ان کا اثر تھا اور حکومت ان کی رائے کی قدر کرتی تھی مگر انھوں نے اردو کے لئے کچھ نہ کیا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ مولانا آزاد کی بہ نسبت بہار کے سابق چیف منسٹر جگن ناتھ صاحب نے اردو کے لئے کچھ تو کیا اور بہار کے کچھ اضلاع میں اسے بہار کی دوسری سرکاری زبان قرار دے دیا) اور مہاتما گاندھی نے اردو کے لئے ہمیشہ ہی مخلصانہ رویہ اپنایا ان کی ہندوستانی ایک طرح سے اردو ہی تھی۔ اور پھر بھوک ہڑتال کا جو تاثر مہاتما گاندھی کے نام سے پیدا ہوتا ہے وہ مولانا آزاد کے نام کے ساتھ بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے

۳- اس میں کوئی شک نہیں کہ بارش نے سارا پروگرام تحس نحس کر کے رکھ دیا مگر اس میں دو رائیں نہیں ہو سکیں کہ انتظام نہایت ہی خراب تھا اور ہر کوئی اپنے آپ کو اس علامتی بھوک ہڑتال کا روح رواں سمجھتا تھا اور جو جس کے دل میں آتا تھا وہ بغیر سوچے سمجھے زبان سے نکال دیتا تھا۔ گیسو دراز مخدوم زادہ مختار رشتانی جناب خواجہ حسن نظامی ثانی سے گلزار کا تعریف کا غذ پر دستخط کرانے پہنچے اور خواجہ صاحب دستخط فرما ہی رہے تھے کہ اسٹیج سے آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ "انہیں نکال دو۔ انہیں نکال دو" خواجہ صاحب نے مختار رشتانی صاحب سے پوچھا کس کے نکالنے کے لئے کہا جا رہا ہے تو انھوں نے بتلا کر گلزار دہلوی اور کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے لئے یہ کہا جا رہا ہے۔ خواجہ صاحب نے قلم وہیں رکھ دیا اور وہاں سے اٹھ کر گئے۔ یہ آوازیں لگانے والوں سے کون کہے کہ عزیزو تم جب پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ تب سے گلزار دہلوی اور کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اردو کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہیں۔ اور اگر دہلی میں اردو کی کسی بھی تقریب سے گلزار دہلوی اور کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب موصوف کا نام نکال دیا جائے تو پھر باقی کیا رہے گا۔؟

۴- اردو رابطہ کمیٹی کے نائب صدر جناب ملک زادہ منظور احمد صاحب نے اپنی افتتاحی تقریر میں روزنامہ "قومی آواز" کا نام تک نہ لیا بلکہ دوسرے ایسے خیالات کا نام لیا جو قومی آواز کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے اور حقیقت یہ ہے کہ اردو رابطہ

کمیٹی کے کا ذکر جس قدر قومی آواز نے اُجاگر کیا کسی دوسرے اخبار نے ایسا نہیں کیا۔ کلکٹر صاحب کی اس ہٹ دھرمی کو شدت کے ساتھ اردو دوستوں نے محسوس کیا۔

۵۔ تقریر کرنے والوں میں سے اکثر ایسے اصحاب تھے جنھیں شاید پہلی بار تقریر کرنے کا موقع ملا تھا۔ لہٰذا انھوں نے جو بولنے میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے مسئلہ کو خالص اسلامی قرار دیتے ہوئے جو اُن کے منہ میں آیا بولتے رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لکھنؤ کے عاطف صاحب علی گڑھ کے حیرت بن واحد۔ جناب ساحر ہوشیارپوری اور دیگر ایک دو حضرات کی تقاریر قابلِ تعریف تھیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ۶ر اکتوبر کو سارا دن بارش ہوتی رہی۔ اور پنڈال کی یہ حالت تھی کہ اوپر سے شامیانے بُری طرح ٹپک رہے تھے۔ اور نیچے میدان میں چھ چھ انچ پانی کھڑا تھا۔ مگر ایسی حالت میں سارا دن اردو کے شیدائی "کسی جلسے اور کسی بھی وقت پانچ چھ سو سے کم کی تعداد میں حاضرین نہیں رہے ہوں گے۔ جناب غلام ربانی تاباں صاحب نے علامتی بھوک ہڑتال میں شرکت فرمائی اور جناب رحمٰن نیّر صاحب ایڈیٹر و مالک بیسویں صدی و رُوبی نے دلی اردو اکاڈمی کی ممبری سے استعفیٰ دے کر اس تقریب کو جلا بخشی۔ مگر یہ کہنے میں باک نہیں کہ درحقیقت یہ ساری تقریب "بدست طفلاں" رہی۔ کاش کہ اسے مناسب اور منظم ڈھنگ سے منایا جاتا۔ اور پھر دس بجے تک اچھی طرح سے پیٹ بھر کر شام کے پانچ بجے تک علامتی ہڑتال محض بھوک ہڑتال کا منہ چڑانے والی بات تھی۔ اور اگر انگریزی اور ہندی پریس نے خصوصاً اور اردو پریس نے عموماً اس تحریک کا ساتھ نہیں دیا تو اس میں بھی اردو رابطہ کمیٹی کے کارکنان کا قصور ہے۔ انھیں چاہئے تھا کہ ۵ راکتوبر کو پریس کانفرنس بلائی جاتی اور اس علامتی بھوک ہڑتال کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی جاتی۔ مگر نہ معلوم اس کی ضرورت کیوں نہ سمجھی گئی۔ اب چونکہ اردو رابطہ کمیٹی کے صدر جناب رام لال صاحب یورپ کے دورہ سے واپس آگئے ہیں اس لئے امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اس تحریک کو سنجیدگی سے جاری رکھیں گے۔

"قومی آواز کے قلم تراش صاحب اپنی پگڑی سنبھالئے"

روزنامہ "قومی آواز" کے شمارہ ۱۵ راکتوبر ۸۰ء کے صفحہ ۶ پر "قلم تراش" نے بات نکلے گی تو پھر ... عنوان کے زیر تحت رامپور کے کسی گمنام اور غیر معروف ماہنامہ کا جس بھونڈے پن سے ذکر کیا ہے وہ چھلّی کھار ہا ہے کہ "قلم تراش" نے اس گمنام اور غیر معروف ماہنامہ کی مذمت کے پردے میں اپنی کم علمی۔ جاہلیت اور گنوار پن کو چھپانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اگر یہ ماہنامہ اتنا ہی غیر معروف اور گمنام تھا تو پھر "قلم تراش" نے "قومی آواز" ایسے مشہور و معروف اور نیک نام روزنامہ میں اس کا تذکرہ کرنے کی بھیک کیوں ماری ؟

"قلم تراش" کو شاید یہ معلوم نہیں کہ یہ گمنام اور غیر معروف ماہنامہ اس وقت سے مشہور و معروف ہے۔ جب کہ قلم تراش کچھ عرصہ [illegible] سال بعد وجود میں آئے۔ اس گمنام اور غیر معروف ماہنامہ نے نہ معلوم آپ ایسے کتنے عجمی اور نا اہل صحافیوں کو صحافت کے لفظی معنوں سے روشناس کرایا۔

"قلم تراش" صاحب آپ نے اپنے اسی نام نہاد مزاحیہ شذرہ میں جس طرح طنز و مزاح کا منہ چڑایا ہے وہ "قومی آواز" ایسے بلند مقام روزنامہ کے معیار کا حامل نہیں ہے۔

اور حقیقت یہی کسی ادبی موضوع پر کچھ کہنا آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔ آپ نے اپنے مزاحیہ شذرہ میں پگڑی اپنی سنبھالئے گا [illegible] ادبی انداز میں [illegible] فرمایا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا ادبی شعور کتنا ابھرا ہے [illegible] آپ نے اس مصرع کو [illegible]

رع بتایا ہے۔ جو صریحاً غلط ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کبھی کلیاتِ میر کی ورق گردانی بھی نہیں کی ہوگی مطالعہ تو
ت دور کی بات ہے کیا آپ یا "قومی آواز" ادارے کا کوئی اور باذوق رکن کلیاتِ میر سے اس مصرع کا حوالہ دے سکتے ہیں۔
دریہ مصرع بیچارے میر کا ہے ہی نہیں۔ یہ دراصل انشاء اللہ خان انشاؔ کا مصرع ہے جو میر کے خلاف لکھا گیا تھا۔ آپ کی
قفیت کے لئے یہ عرض کر دیا جائے کہ یہ مصرع ایک قطعہ میں آیا ہے جو درج ذیل ہے:

توبہ زاہد کی تو بہ تلی ہے — چلے بیٹھے تو تسبیح چلی ہے
پگڑی اپنی سنبھالئے گا میر — اور بستی نہیں یہ دلی ہے

اگر آپ کو مزید ثبوت درکار ہے تو "آبِ حیات" مطبوعہ لاہور ۱۹۵۰ء کے صفحہ ۲۲۰ پر اس قطعہ کو ملاحظہ فرما کر اپنی مینائی
روشن کر سکتے ہیں اور پھر خدا لگتی کہیے کہ آپ کی اپنی ہی ڈیڑھ آنکھ ہے کسی دوسرے کی نہیں
آپ کی اس حماقت کا تذکرہ ہم نے ایک مراسلہ بعنوان قلم تراش صاحب اپنی پگڑی سنبھالیے" "قومی آواز" میں اشاعت
کے لئے بھیجا تھا اور یہ مراسلہ نور جہاں صاحبہ ثروت کے ہاتھ میں دیا گیا تھا۔ مگر "قومی آواز" ایسے مشہور و معروف
روزنامہ کا اعلیٰ صحافتی معیار یہ کہاں گوارا کر سکتا ہے کہ قلم تراش ایسے کم علم و جاہل مصنف کی [illegible] نے [illegible] ایسا مراسلہ
اشاعت پذیر ہو۔

دلی اُردو اکاڈمی کی حاتم طائی کی قبر پر......

دلی اُردو اکاڈمی اپنی کارکردگی کی بعض کارروائیوں کو اس طرح پردہ راز میں رکھتی ہے جیسے اس نے کوئی گناہ
کیا ہو اور جس کی تشہیر سے اسے ذہنی کوفت ہونے کا اندیشہ ہو۔ ماہنامہ "شاعر" بمبئی کے حالیہ شمارہ میں اعلان کیا
گیا ہے کہ دہلی اُردو اکاڈمی نے ماہنامہ شاعر کی تاریخ ساز ادبی اور صحافتی خدمات کو سراہتے ہوئے دو ہزار روپے کی خصوصی
گرانٹ دی ہے۔
اُردو اکاڈمی کا یہ اقدام ایسا نہیں تھا کہ جس کی پریس ریلیز جاری کرنے میں اسے کسی مخالفت کا اندیشہ تھا یا اس سے
کسی باز پرس کی اُمید کی جا سکتی تھی۔ کیونکہ اسے دلی حکومت نے جو تیس لاکھ روپیہ کی گرانٹ دی ہے وہ دی ہی اسی لئے گئی ہے
یہ ایک اچھا اقدام تھا اس لئے اس کی کوئی اطلاع دفتر اکاڈمی سے جاری نہیں کی گئی۔ جبکہ پورن سنگھ ہنر ایسے غیر شاعر اور مطرب
نما جو گھنٹوں ایسے اوسط درجے کے شاعر کو مہمانِ خصوصی کے طور پر امرتسر اور لکھنؤ سے مدعو کر کے ان کی عزت افزائی کے لئے
اکاڈمی کی قابلِ ذکر رقم ضائع کر دی گئی اور اس تقریب پر جو دعوت نامے جاری کئے گئے محض ان پر ہی ایک ہزار سے زائد روپیہ
خرچ ہوا۔
مزید شاعر یا صحافی میں یہ نفس نفیس اکاڈمی کے نامزد کردہ ممبران اور دیگر اکا [illegible] سے مل کر اور کئی سفارشیں کرانے کے بعد
یہ گرانٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ اس سلسلے میں ہمیں ایک واقعہ یاد آ رہا ہے وہ یوں کہ پٹیالہ کے مشہور سابق مہاراجہ
بھوپندر سنگھ آنجہانی اپنے اے۔ ڈی سی کے ساتھ ایک شام کو سیر کے لئے نکلے تو راہ میں سڑک کے کنارے ایک سیخ
کباب بیچنے والے سے پیٹ بھر کے سیخ کباب کھائے۔ مہاراجہ کے اے ڈی سی پانچ روپے کا نوٹ کبابی کو دینے لگے
تو مہاراجہ صاحب نے پنجابی میں ایک موٹی سی گالی دیتے ہوئے کہا کہ اگر تمہیں اپنا رتبہ نہ یاد نہیں تو کم از کم میری
عزت کا تو خیال کیا ہوتا اور مزید گالیاں دیتے ہوئے حکم دیا کہ کبابی کو پانچ صد روپیہ دیا جائے۔ ہم پنجابی کی موٹی گالی
اگر مہاراجہ کے اے۔ ڈی سی کی نذر کرتے ہوئے یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اگر دلی اُردو اکاڈمی کے متعلقہ ارباب کو

اتنی عزت کا خیال نہیں تھا تو کم از کم ماہنامہ مشاعر کی تاریخ ساز [illegible] علمی و ادبی اور ثقافتی خدمات کا تو لحاظ رکھا ہوتا اور کم از کم دس ہزار روپیہ گرانٹ [illegible] جاتی۔ دو ہزار سے تو مشاعر کا ایک شمارہ بھی نہیں چھپ سکتا جب کہ اکاڈمی کے ایک ممبر جناب ڈاکٹر کامل قریشی صاحب ایک ماہ میں ہی لیٹر مشاعر۔ ایکٹر، تمثیل نگار اور اناؤنسر [illegible] روپیہ سے [illegible] وصول کر چکے ہیں۔

جناب سکریٹری اردو اکاڈمی دلی سے مودبانہ گذارش ہے کہ جہاں وہ اکاڈمی کی دیگر کارروائیوں کے بارے میں پریس ریلیز جاری کرتے ہیں۔ اسی طرح ایسے اچھے اقدامات کے بارے میں بھی پریس ریلیز جاری کیا کریں۔ چاہے یہ اچھے اقدام محض حاتم طائی کی قبر پر لات مارنے کے مترادف ہی کیوں نہ ہوں۔

بابا ہردت سنگھ بیدی کا انتقال

گورمیندر سنگھ بیدی گورجیت سنگھ [illegible] بزرگوار بابا ہردت سنگھ جی بیدی ۱۵ اکتوبر بروز جمعرات کی رات کو دس بجے اپنے صاحبزادے گورمیندر سنگھ صاحب جی کی رہائش گاہ پر چندی گڑھ میں انتقال فرما گئے۔ بابا جی نے ایک سو دو سال عمر پائی اور اس عمر میں بھی وہ ہشاش بشاش اور تندرست تھے۔ [illegible] اپنے ہر روز کے فرائض خوش اسلوبی سے ادا فرماتے تھے۔

مدیر شان ہند بابا جی کے فرزندان ارجمند عالیجناب کنور جگجیت سنگھ جی بیدی، کنور مہندر سنگھ صاحب سحر بیدی، کنور سریندر سنگھ جی بیدی اور کنور رابندر سنگھ جی بیدی کے اس صدمہ میں برابر کا شریک ہے اور دعا گو ہے کہ واہگورو جی بابا جی کی آتما کو شانتی بخشیں اور انہیں اپنے چرنوں میں جگہ دیں۔

"قومی آواز" بھگوان شری رام کی توہین کا مرتکب

پہلے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

"قومی آواز" مورخہ ۱۵ اکتوبر صفحہ ۲ "بات نکلے گی تو پھر" کے عنوان کے تحت قلم تراش فرماتے ہیں "مشاعرے کے شاعروں سے زیادہ رام لیلا کے اداکار نظر آتے تھے۔"

قومی آواز۔ ۲۲ اکتوبر۔ مراسلہ بعنوان تمثیلی مشاعرہ از شوکت مریم۔ ۳-۵۔ گووند کھنڈ۔ وشوکرما نگر۔ شاہدرہ دہلی "ایک کمی ہو تو گنواؤں یہاں تو کمیوں اور کمزوریوں کا ایک ضخیم مجموعہ ہے۔ کرداروں کے ملبوسات کو دیکھ کر رام لیلا اور نوٹنکی کے کردار یاد آ گئے۔"

قومی آواز ۱۷ اکتوبر۔ صفحہ ۳۔ مراسلہ بعنوان تمثیلی مشاعرہ از تسلیم الدین۔ ۳/۵۔ جعفر آباد شاہدرہ۔ "اس تمثیلی مشاعرے میں جو لباس شعراء حضرات کو پہنائے گئے ہیں۔ ان کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ رام لیلا یا نوٹنکی والا سے کام چلانے کے لئے اُدھار لئے گئے۔"

حال ہی میں اردو اکاڈمی دلی کے تحت ایک تمثیلی مشاعرہ ہوا ہے۔ یہ مراسلے اور جناب قلم تراش کا مضمون اس تمثیلی مشاعرہ کے خلاف اظہار ناپسندیدگی کے طور پر قومی آواز میں شائع ہوئے ہیں۔

"رام لیلا" کا جس انداز میں مذاق اڑایا گیا ہے وہ ہر ہندو کے لئے باعث توہین ہے۔ کیونکہ رام لیلا بھگوان رام کی چودہ سالہ بن باس کی وہ غیر فانی داستان ہے جو ہر ہندو کا ایمان ہے اور مذہبی طور پر بھگوان رام کو ایشور کا اوتار [illegible] والوں کے لئے یہ یقیناً ناقابل برداشت ہے۔

غنیمت تو یہ ہے کہ قومی آواز چند حلقوں میں ایک گمنام روزنامے کی حیثیت رکھتا ہے اور اگر راقم الحروف ایسے دس پانچ غیر مسلم مشاعروں سے یہ اخبار گزر تا بھی ہے تو وہ اسے اس لئے اہمیت نہیں دیتے کہ یہ محض قلم تراشی ایسے کچھ نا سمجھ اور مذہبی تعصب میں اعتدال بھی نوجوانوں کی کمینہ حرکت ہے لہٰذا اسے درگزر ہی کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ مگر ہر دو سرے تیسرے سال رام لیلا کو نوٹنکی کے ہم پلہ لکھ کر اس طرح سے "رام لیلا" کی توہین کرنا کہاں کی انسانیت ہے۔ رام لیلا بھگوان رام سے متعلق یادگار ہے اور نوٹنکی محض حسن و عشق کی داستانوں پر ہی مشتمل ہوتی ہے۔ روزنامہ قومی آواز جو سیکولرازم کا دعوے دار اور قومی یکجہتی کا علمبردار ہونے کا دم بھرتا ہے اس کی نظر میں رام لیلا اور نوٹنکی ایک ہی چیز ہیں۔ حالانکہ رام لیلا کروڑوں ہندوؤں کا ایک ایسا دھارمک اُتسو ہے جو ہزاروں سالوں سے منایا جا رہا ہے۔ شری رام ہندوؤں کے لئے ایشور کا اوتار ہیں۔ اور رام لیلا انھیں سے متعلق ایک ایسا حقیقی اور ناقابل تردید مذہبی فریضہ ہے جو کروڑوں ہندوؤں کے لئے راحت جاں ہے۔

قومی آواز کے آئینی سربراہ جناب یشپال کپور ایک ایسی اعلیٰ کمیٹی کی گورنمنٹ کے رکن ہیں جنھیں "ڈھائی گھرا" کہا جاتا ہے کیا وہ ایمان سے کہہ سکتے ہیں کہ رام لیلا کو نوٹنکی کا ہم پلہ بتایا جانا رام لیلا۔ بلکہ شری رام چندر جی کی توہین نہیں ہے۔ اور اگر واقعی یہ رام لیلا۔ شری رام چندر جی اور کروڑہا ہندوؤں کے مذہبی جذبات کی توہین ہے تو پھر قومی آواز کا یہ دعوے کہ وہ سیکولرازم اور قومی یکجہتی کا علمبردار ہے محض جھوٹ اور فریب ہے بلکہ وہ ہندوؤں کی اور ساتھ کے ایشور اوتار شری رام چندر جی مہاراج کی توہین کا مرتکب ہو کر محض مسلمانوں کو خوش کر کے اپنی اشاعت کی توسیع کے لئے کوشاں ہے۔ اور ہندوؤں کو کانگریس سے متنفر کرنے کی ایک کوشش۔ کیونکہ قومی آواز کو کانگریس کا ہی اخبار کہا جاتا ہے۔

ہم جناب یشپال کپور سے درخواست کریں گے۔ کہ وہ قومی آواز کو مذہبی طور پر متنازعہ اخبار نہ بنائیں یعنی اپنے عملہ کو خیال کریں کہ وہ مذہبی رواداری کا خاص خیال رکھیں اور عملے کے دو ایک حضرات اپنی ذاتی دشمنی کے تحت "قومی آواز" کو ڈھال نہ بنائیں۔ اور ان ناتجربہ کار صحافیوں کو سمجھائیں کہ اگر انھوں نے جھک ماری ہی تھی تو رام لیلا کی جگہ "اندر سبھا" لکھ دیا ہوتا۔

ڈاکٹر ہیرا لال چوپڑہ کو صدمہ

پچھلے دنوں مشہور دانشور ڈاکٹر ہیرا لال چوپڑہ کی اہلیہ محترمہ شریمتی راج کماری کا انتقال کلکتہ میں ان کے صاحبزادے کی رہائش گاہ پر ہوا۔ گزشتہ ۵۰ سالوں میں چوپڑہ صاحب کی تمام علمی، ادبی، سماجی مصروفیتوں اور کامیابیوں میں مرحومہ کا تعاون نہ صرف معین و مددگار تھا بلکہ ذمہ دار بھی تھا۔ ان کو ادب میں گہرا شغف تھا۔ شان ہند کے مطالعہ نے ان کو مشاعروں کا شیدا اور مشتاق بنا دیا تھا۔ غیر مسلم خواتین میں اردو ادب کے مطالعہ کا جو ذوق و شوق مرحومہ کو تھا وہ لیاکم ہی خواتین میں دیکھنے میں آتا ہے۔

گزشتہ نصف صدی سے راقم کے برادرانہ تعلقات چوپڑہ فیملی سے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ایک شفیق اور ہمدرد بہن کا سایہ سر سے اٹھ گیا ہے۔

چوپڑہ صاحب ان کے دونوں صاحبزادگان اور صاحبزادی نیز جملہ متعلقین سے اس صدمہ میں ہم برابر کے شریک ہیں اور دعا ہے کہ سرو شکتی مان پرماتما مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

ضروری اعلان جو حضرات اپنا مجموعہ کلام یا افسانوں کا مجموعہ شائع کرانا چاہتے ہوں وہ دفتر شان ہند سے مراسلت فرمائیں۔ مجموعہ انتہائی دلکش شائع کیا جائے گا اور دیگر کئی ایسی سہولیات مصنفین کو بہم پہونچائی جاتی ہیں جو کسی دوسرے ادارے کے بس کا روگ نہیں ہیں۔ تفصیلات کے لئے جوابی لفافہ بھجوائیے۔ (ادارہ)

اپنے اسٹیشن کو صاف رکھئے

- اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ صاف ستھرا ماحول ایک طرف کسی شخص کے کردار کا آئینہ ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کردار کو نکھارتا ہے۔ صاف ستھرا گردو پیش خوشی ا مسرت بکھیرتا رہتا ہے۔
- ہم اپنے گھر صاف ستھرے رکھتے ہیں تو پھر ان جگہوں کو صاف و شفاف کیوں نہ رکھیں جنھیں ہم سب استعمال کرتے ہیں۔
- ریلوے پلیٹ فارموں، ویٹنگ روموں، سواری ڈبوں اور در حقیقت ان تمام جگہوں کو جہاں بڑی تعداد میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں گردو پیش کو صاف شفاف رکھنا بہت ہی ضروری ہے۔

ریلوے نے صفائی مہم شروع کی ہے جس کے بہت اچھے نتائج نکلے ہیں اب ریلوے صاف ستھرے نظر آتے ہیں لیکن ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں بھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ہم زیادہ صفائی کے لئے اپنی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔

آپ بھی اس سلسلے میں ریلوے کی مدد کر سکتے ہیں آپ صرف اتنا ہی خیال رکھیں کہ آپ کے آس پاس کی جگہ بالکل صاف و شفاف حالت میں رہے۔ اس طرح اسٹیشن اور منسلکہ مقامات صاف ستھرے رہ سکتے ہیں اور ہاں آپ ریلوے صفائی محکمہ کے کارکنوں کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ وہ صرف آپ کی خدمت کے لئے ہی رکھے گئے ہیں۔

آپ بھی ذرا خیال رکھیے کہ کوڑا کرکٹ آپ کے ہاتھ سے ادھر ادھر نہ بکھرنے پائے بلکہ کوڑادان میں پھینکا جائے۔ آپ کا یہ معمولی سا کام ہمیں آپ کی بہتر خدمات کرنے میں کافی مدد دیتا ہے۔

ریلوے آپ کی پراپرٹی ہے اسے صاف شفاف رکھئے

ناردن ریلوے

"... بھگوان کی کرپا سے ٹھیک ہے۔" منگلو نے
ایک چٹکی تمباکو منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔
"گاؤں کی حالت؟"
"گاؤں میں تو سرکار غضب ہو گیا۔"
"کیا ہوا؟" کشن لال نے چونک کر پوچھا۔
"میاں صاحب نے آگ لگنے کا مقدمہ تھانے میں دائر کر
دیا ہے۔ دو دن سے تھانہ پولیس سب موجود۔"
"حسین بخش کے ساتھ کس نالائق نے ایسی حرکت کی؟"
"میاں صاحب کا کہنا ہے سلیم میاں علاقے کے چند ہندو
اور مسلمانوں کو ورغلا کر ان کی عمارت کو آگ لگا کر خاک کر دینا
چاہتے تھے وہ تو خیریت ہوئی آگ زیادہ بھڑکنے نہ پائی تھی
کہ لوگوں نے پہونچ کر آگ بجھا دی۔" اور پھر منگلو نے چلم سے
ایک گندی سی پیک پھینکی۔
"سلیم کا سر پھر گیا ہے کیا؟"
"سرکار یہ مقدمہ بالکل جھوٹا ہے۔"
"کیا کہتے ہو؟"
"جی ہاں آگ لگتے وقت تو میں خود وہاں موجود تھا، میاں
صاحب نے میرا نام بھی گواہی میں دے دیا ہے۔"
"آخر بات کیا ہے؟"
"بابو جی! میاں صاحب کا دل بہت کالا ہے گاؤں میں
کچھ ہندو مسلمان اب کھاتے پیتے ہیں تو وہی میاں صاحب
کو پھوٹی آنکھ نہیں بھاتی اور سلیم کا تو صرف بہانہ ہے۔"
"جب تم وہاں موجود تھے تو پھر آگ لگنے ہی کیوں دی۔"
"بڑوں کے کام میں کون دخل دے۔"
"آخر آگ لگی کیسے؟"
"آگ کہاں لگی بابو! گھاس میں دلاور خاں نے آگ لگائی
اور میں نے جا کر بجھا دی ادھر میں آگ بجھانے میں مصروف تھا
ادھر دلاور خاں گھوڑے پر سوار گوپال گنج تھانے چلا گیا اور پھر تو
دو گھنٹے کے اندر اندر ایک ہنگامہ میاں صاحب کے دروازے
پر برپا ہو گیا سلیم، جمنو، لچھمن، کلوا، بھیم ۔ [illegible] سب
کے سب گرفتار کر لئے گئے تیل کا ایک ٹین اور

رپورٹ کی ایک بوتل بھی سامنے رکھی گئی۔ پولیس مار پیٹ
کے ذریعہ ان بے قصوروں سے اقبال جرم کرانا چاہتی تھی دلاور
خاں کہہ رہا ہے کہ وہ چہرے سے سب کو پہچانتا ہے اب دیکھئے
کس کس کی شامت آتی ہے یہ تو گھور اندھیر ہے سرکار" اور
منگلو نے پھر بیلوں کو ٹٹکارا۔
کشن لال نے پوچھا "آتے وقت تم میاں حسین بخش کے
دروازے ہو کر آئے تھے؟"
"جی ہاں۔"
"داروغہ صاحب واپس چلے گئے یا وہیں موجود ہیں۔"
"ابھی تک وہیں ہوں گے۔"
"اچھا تو سیدھے وہیں چلو۔"
ایک گھنٹے کے اندر اندر رام پور کی ٹولی میں گاڑی پہونچ
گئی بستی کے لوگ ہراساں پریشان نظر آ رہے تھے بچے بوڑھے سب
سہمے ہوئے تھے چار گھروں سے رونے کی آواز آ رہی تھی عورتیں
چیخ چیخ کر رو رہی تھیں جب گاڑی سلیم میاں کے دروازے پر آئی
تو وہاں کا سماں دیکھ کر کشن لال بھی اپنے کو ضبط نہ کر سکے معلوم ایسا
ہوتا تھا کہ کسی نے اسی وقت انتقال کیا ہو اور لاش ابھی گھر کے
اندر ہی ہے لڑکے آگے کھڑے ہیں اور عورتیں الگ واویلا
مچا رہی ہیں۔ کشن لال نے گاڑی رکوا کر ایک لڑکے سے پوچھا۔
"کیا ہوا ہے؟"
وہ لڑکا دوڑ کر اندر گیا اور تھوڑی دیر کے بعد سلیم میاں کی بیوی
اپنے گود کے بچے کو لئے آئی اور دروازے پر کھڑی ہو کر بلک بلک کر
رونے لگی۔
کشن لال نے پوچھا "کون سی آفت آ گئی؟"
سلیم کی بی بی بوڑھی ہو چلی اور آج تک وہ کشن لال کے سامنے
نہیں آئی تھی، مگر آج اس ضعیفہ کو بے پردہ دیکھ کر کشن لال بھی متاثر
ہوئے بغیر نہ رہ سکے ایک دفعہ ان کا دل بھی اپنے دوست حسین بخش
کی طرف سے متنفر ہو گیا صرف ایک حسین بخش کے باعث آج بستی کی
بستی تباہ و برباد ہو رہی تھی۔
منگلو نے کہا "اب تم صرف روتی رہو گی! کچھ بولو گی بھی سرکار پوچھ
رہے ہیں اور تم خاموش ہو۔"

سلیم کی بی بی نے آنچل سنبھالتے ہوئے کہا "ان کو پولیس نے
...ار کر لیا ہے بھلا کہئے بابو صاحب دن دھاڑے وہ جائیں گے
...ں صاحب کی عمارت کو آگ لگانے کیا اندھیر مچا رکھا ہے انھوں
...بھی"

"مگر اب تو سلیم گرفتار ہو چکا" کشن لال نے کہا۔ "اسے
...انے کی تدبیر کرنی چاہیئے صرف رونے سے کیا فائدہ۔ تم خاطر
...رکھو ابھی میں میاں صاحب کے دروازے ہی پر جاتا ہوں"۔

"بابو صاحب" اس ضعیفہ نے روتے ہوئے کہا خدا آپ کو
...ونی رات چوگنی ترقی دے آپ غریبوں کے سہارا ہیں وہ
...لکل بے گناہ ہیں انھوں نے ہرگز کوئی ایسی حرکت نہیں کی وہ تو
...سے بیمار گھر میں پڑے کراہ رہے تھے آج ظالم سپاہی آئے اور
...ر میں گھس کر انھیں پکڑ لے گئے اور پھر وہ عورت آنچل میں منھ چھپا
...سسکیاں بھرنے لگیں۔

کشن لال کی گاڑی دیکھ کر محلے کے چند اور اشخاص
...ہاں جمع ہو گئے مردوں سے زیادہ عورتیں تھیں سب نے آکر اپنا
دکھڑا رونا شروع کیا۔ کشن لال کی دہائی دینے لگیں کشن
لال نے سب کو اطمینان دلایا انھیں گھر میں چپ چاپ بیٹھنے
...کہا اور پھر منگلو سے کہا جلد چلو۔

تھوڑی دیر میں گاڑی میاں حسین بخش کے دروازے
پر آلگی حسین بخش اپنے کمرے میں آرام کرسی پہ بیٹھے ہوئے
تھے ان کے پاس ہی ایک کرسی پر تھانے کا انچارج داروغہ
بیٹھا ہوا ان سے سرگوشیاں کر رہا تھا سامنے صحن پر دونوں
محلوں کے پانچ چھ ہندو مسلمان ہتھکڑیاں پہنے ہوئے کھڑے
رہے تھے تین چار سب ہی ایک طرف چپ چاپ بیٹھے آپس
میں باتیں کر رہے تھے دلاور خاں کچھ دور پر دو تین چوکیداروں
کے ساتھ خوش گپیاں کر رہا تھا۔

منگلو نے گاڑی کھڑی کی اور کشن لال اس سے اترے
عین وقت پر انھیں دیکھ کر میاں حسین بخش اچھل پڑے کرسی سے
اٹھے اور آگے بڑھ کر کشن لال سے معانقہ کیا داروغہ صاحب
بدستور اپنی کرسی پہ بیٹھے سگریٹ نوشی سے جی بہلا رہے تھے
دلاور نے دوڑ کر اندر سے ایک کرسی لا کر میاں صاحب کی
کرسی کے قبل میں رکھ دی دونوں دوست اپنی اپنی کرسی
پر آ بیٹھے۔

حسین بخش نے پوچھا "پٹنہ سے آ رہے ہو شاید"

"ہاں ابھی دو بجے والی ٹرین سے اترا ہوں اور سیدھے
تمہارے یہاں آ گیا۔"

"بڑی مہربانی کی میں دل ہی دل میں تمہیں یاد کر رہا تھا
دروازے کا نقشہ دیکھ رہے ہو۔ یہ رہے ہمارے داروغہ
صاحب بڑے گھر کے چشم و چراغ ہیں جب سے آئے ہیں
علاقے کے بدمعاشوں کی ماں مر گئی ہے آپ کا نام ہے پی کے
اگروالا"

داروغہ صاحب نے تصحیح کی کے پی اگروالا۔

"ہاں بھئی کے پی اگروالا" اور پھر داروغہ صاحب سے
مخاطب ہو کر کہا داروغہ صاحب ان کا نام آپ نے سنا ہوگا
مگر پہچانتے نہ ہوں گے یہ ہیں میرے دوست کشن لال رئیس
اعظم"۔

داروغہ صاحب نے رسمی جملہ ادا کیا۔ "بڑی خوشی ہوئی آپ
سے مل کر" اور پھر دونوں نے ایک زوردار [illegible] بلند کیا۔
داروغہ صاحب نے سگریٹ پیش کیا اور کشن لال نے ہاتھ
جوڑ کر معافی مانگ لی۔

حسین بخش نے کشن لال سے کہا "اچھے وقت آئے کشن
لال ان غنڈوں نے تو آج تباہ ہی کر ڈالا ہوتا وہ تو خیریت ہوئی
منگلو عین وقت پر کہاں سے آ نکلا۔ اور پھر حسین بخش نے
اختصار میں ساری روداد کہہ سنائی اور ان ساری بدمعاشیوں کا
سرغنہ سلیم ہی کو ثابت کرنے لگے۔ سلیم نے ایک دفعہ اپنے
مایوس ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور کشن لال
کی طرف دیکھا سلیم کی آنکھیں صاف کہہ رہی تھیں یہ کہانی
بالکل جھوٹ ہے۔ صرف ہم لوگوں کو تباہ کرنے کی چال چلی
گئی ہے۔

(باقی)

غزل
ڈاکٹر کے۔ کے۔ رشی

دل میں اِک درد بدستور گوارا کرنا
اتنا آساں نہیں یادوں پہ گذارا کرنا

جان دینی ہے ترے عشق میں یاد مجھے
بھول جاؤں بھی اگر میں تو اشارا کرنا

بھول سے آنا ہوا اُن کو چمن کے سائے سے
ان کے گھر جاؤ تو یہ کام ہمارا کرنا

دوستی ہو گئی آساں زمانے میں بہت
شکوہ میں پاس آئی نا مصیبت میں کنارا کرنا

حقیقت اور نہ راتوں کے اندھیروں کی گرجش
سرِ شام نہ زلفوں کو سنوارا کرنا

یاس اور کیف کی ہم اتنی حقیقت سمجھے
اک تمہیں بھول کے ہیاں تمہارا کرنا

عقل تو سوچتی ہے ترکِ وفا کا یا نہیں
دل یہ کہتا ہے رشی یہ نہ گوارا کرنا

غزل
ایم۔ آر۔ قریشی سوز۔ ریوا

جب بھی کسی کے ظلم و ستم یاد آ گئے
ہم جو بھلا چکے تھے وہ غم یاد آ گئے

جلتے ہوئے گھروں کی طرف دیکھ کر ہمیں
ہنگامہ ہائے دیر و حرم یاد آ گئے

اپنی تباہی کا جو سبب یاد آ گیا
وہ بھی ہمیں خدا کی قسم یاد آ گئے

شرمائے اور آئینہ ہاتھوں سے رکھ دیا
شاید کسی طرح انھیں ہم آج یاد آ گئے

رِسنے لگے ہیں پھر سبھی زخمِ دل و جگر
پھر آج مجھ کو تیرے کرم یاد آ گئے

آئی جو یاد مجھ کو تمہارے شباب کی
جتنے بھی سر ہوئے تھے قلم یاد آ گئے

بھٹکا دیا ہے سوز اگر رہنماؤں نے
ہم کو ترے نقوشِ قدم یاد آ گئے

غزل
محمد تقی خاں اثر اندوری۔ جھابوہ

بخت کہتا ہے سنوار، تو سنور جاؤں گا
میں کوئی خواب نہیں ہوں جو بکھر جاؤں گا

میں ہوں فن کار مرا موت سے رشتہ کیا ہے
یہ غلط فہمی دنیا ہے کہ مر جاؤں گا

ظلم کی آگ برستی ہے چناروں سے ابھی
امن کے پھول کھلانے میں اِدھر جاؤں گا

گرمئی جبر سے دنیا کو بچا لینے دے
پھر تری زلف کے سائے میں بکھر جاؤں گا

آپ سے دور مجھے شوق ہے کر دو لیکن
کل میں تاریخ کے دامن میں بکھر جاؤں گا

ذکرِ ساحل کا جو ہوتا ہے کوئی ! جھوم اٹھی
یہ غلط ہے کہ تلاطم سے میں ڈر جاؤں گا

یوں بھی پھرتا ہوں پئے لطف زمانے بھر میں
اُن کے کوچے میں بھی کچھ دیر ٹھہر جاؤں گا

جب کوئی ذکرِ وفا بزم میں چھیڑے گا اثر
نقش بن کے میں ذہنوں پہ ابھر جاؤں گا

غزل
نسیم شاہجہانپوری

ا کا نام اب احساں ہے دیکھئے کیا ہو
وا سر بگریباں ہے دیکھئے کیا ہو

خرد، جنوں کی نگہباں ہے دیکھئے کیا ہو
جنوں خرد سے گریزاں ہے دیکھئے کیا ہو

ن کو لوٹتے گزری ہے زندگی جس کی
اب حسن کا نگہباں ہے دیکھئے کیا ہو

نہ اُن کا غم، نہ زمانے کا غم، نہ اپنا غم
حیات بے سروساماں ہے دیکھئے کیا ہو

م نصیب ہیں مجبور مسکرانے پر
ال میں جشن بہاراں ہے دیکھئے کیا ہو

نہ عشق اس کا ہے مسلک نہ ہے وہ فلسفی
ہوس پرست اب انساں ہے دیکھئے کیا ہو

عشق و ہوس اُٹھ گئی زمانے سے
کفر تھا وہ اب ایماں ہے دیکھئے کیا ہو

اُداس پھولوں کے چہروں پہ بھی ہے رنگ امید
خزاں، بہار بداماں ہے دیکھئے کیا ہو

بہ خلوص سے شیخ حرم بھی آج نسیم
شریک محفل رنداں ہے دیکھئے کیا ہو

جو فن شناس ہیں ان ناقدوں کی محفل میں
نسیم آج غزل خواں ہے دیکھئے کیا ہو

غزل
قمر الیوری (پال گھر)

درد کی داستاں نہیں معلوم
کس نے کی تھی بیاں نہیں معلوم

کیا کوئی دیدہ ور ہوا رخصت
رو رہا تھا جہاں نہیں معلوم

جانتے ہو تو دو بتا یارو!
وہ حقیقت کہاں نہیں معلوم

ہر قدم خارزار میں اُلجھا
تھا وہی گلستاں نہیں معلوم

تھی صدائے جرس یا وہ لوری
سو گیا کارواں نہیں معلوم

برق تھی یا تھی سازش مالی؟
کیوں جلا آشیاں نہیں معلوم

مر گئے آرزو میں جینے کی
زندگی تھی کہاں نہیں معلوم

حیف! رزمے کیا ہمیں گو لنگا
ہم تھے کب بے زباں نہیں معلوم

کس لئے شیخ کے طنز رندوں کے!
چپ تھا پیر مغاں نہیں معلوم

مٹ گئے پھر بھی دل سے مٹ نہ سکا
کون تھا مہرباں نہیں معلوم

تیرے اشعار کی ضیا تھی قمر
یا تھی وہ کہکشاں نہیں معلوم

غزل
اختر شاہجہانپوری

کیا کوئی مہر کسی بشر سے ملے
مہر و مہ سے جبیں پہ روشن ہیں
کر رہے ہیں طواف اہل خرد
اس کو کہتے ہیں عشق کی معراج
انتہا ہے یہ نارسائی کی
اس کے سائے سے دھوپ بہتر ہے

جو ملے بھی وہ کم نظر سے ملے
زخم جو دست بے ہنر سے ملے
اے جنوں کچھ تو تیرے در سے ملے
میرا ہونا تری خبر سے ملے
لفظ بھی ہم کو بے اثر سے ملے
زخم سر ہم کو جس شجر سے ملے
... سے ملے

غزل

سلامؔ ساگری ساگر (ایم پی)

بدلتے ہی مرے کیا کیا نہ رنگِ آسماں بدلا
زمیں بدلی، زباں بدلی، مکیں بدلا مکاں بدلا

مری تقدیر بدلی اور دورِ آسماں بدلا
جو میں بدلا حقیقت میں نظامِ دو جہاں بدلا

وہیں پائے خرد نے لغزشوں پہ لغزشیں کھائیں
جنونِ عشق نے اپنے ارادے کو جہاں بدلا

زمین و آسماں کا فرق ہے حسن و محبت میں
نہ خوئے عاشقاں بدلی نہ رنگِ مہوشاں بدلا

خزاں کے بعد فصلِ گل بہار اپنی دکھائے گی
اسی امید پر ہم نے نہ اپنا آشیاں بدلا

رہا محرومِ سجدہ جب تک تو بن گیا کعبہ
جبیں میں نے جہاں رکھ دی وہیں وہ آستاں بدلا

بتوں کی یاد ہم کو کھینچ لائی صحنِ کعبہ سے
سلامؔ! اپنا ارادہ دیکھئے جا کر کہاں بدلا

غزل

فخر واحدی (قنوجی)

ساقی کے فیضِ جام کا جب یہ اثر نہیں
محفل میں آج کوئی بھی یوں باخبر نہیں

جس کی نظر تغیرِ حالات پر نہیں
بے شک وہ کامیاب زمانہ نشیں نہیں

اتنے فریب کھائے ہیں راہِ حیات میں
میری نظر میں آج کوئی معتبر نہیں

واعظ کے قول و فعل میں خود اک تضاد
اس کی نصیحتوں میں تبھی تو اثر نہیں

وہ ذاتِ پاک جب سے مری ناخدا ہوئی
طوفانِ زندگی کا مجھے کچھ خطر نہیں

دنیا کے سامنے جو کبھی خم نہ ہو سکے
اس سر سے بڑھ کے فخرؔ کوئی اور سر نہیں

"ایک شعر دو رنگ"

کندن لعل گوہر

رنگِ قدیم تضمین

کفر و ایماں کا کبھی دام بچھا لیتی ہے
جامۂ زہد میں گردِ "ریا" لیتی ہے
علم و حکمت کا کبھی طرّہ سجا لیتی ہے
عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بے چارہ نہ مُلّا ہے نہ زاہد نہ حکیم

رنگِ جدید

بھاشنوں سے کبھی جنتا کو بھا لیتی ہے
بن کے ممبر کبھی "کرسی" کا مزا لیتی ہے
کبھی دربارِ "وزارت" کا لگا لیتی ہے
"عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے"
عشق بے چارہ نہ لیڈر ہے نہ ممبر نہ وزیر

ایلورا

ڈاکٹر [illegible] آستانوی
ڈبل ایم اے - ایل ایل بی - پی ایچ ڈی
(یو ایس اے)

۱

پتھروں کو جب زباں دینے لگا تھا بت تراش
اُس کی خاموشی میں کتنے راز ہونگے مضطرب
منجمد ہوں گی نگاہوں میں ہزاروں بجلیاں
دستِ صناعی میں کتنے ساز ہوں گے مضطرب

۲

جب تراشے ہوں گے دیوی دیوتاؤں کے نقوش
ایک سر تا پا عقیدت بن گیا ہو گا کوئی
پایۂ تکمیل تک پہنچا کے نصب العینِ زیست
کارفرمائے مشیت بن گیا ہو گا کوئی

۳

جلوتوں میں لا کے اپنی خلوتوں کا اضطرار
اپنی تشنہ کامیوں کو صورتِ میخانہ دی
پھونک کر گمنام سے بے جان سے ذروں میں روح
اپنی ساکن زندگی کو گردشِ پیمانہ دی

۴

عہدِ رفتہ کا مقدس ذات فنکارِ عظیم
پتھروں میں ڈھل گئی ہے زندگی جس کی تمام
عہدِ رفتہ کا نہیں ہر عہد کا فنکار ہے
وقت سے اٹکھیلیاں کرتا ہے کا جو [illegible]

۵

گردشِ دوراں نہ چھو پائے گی فن جس کا کبھی
آنچ نہ پائے گا کبھی جس کی ترنگوں میں جمود
ارتقائے نسلِ آدم کا نمایاں سنگِ میل
منبعِ سرمستیٔ انوار ہے جس کا وجود

۶

پتھروں میں اس طرح ڈھالا ہے اپنا حسنِ ظن
مل گئی ہے پتھروں کو تا ابد گویا ثبات
کوئی دیکھے تو کرشمہ سازیاں تاثیر کی
بہہ رہا ہے پتھروں سے دمبدم آبِ حیات

۷

دیکھ کر اُس ماہرِ فن کے نقوشِ ذی کمال
کس قدر ہر آنکھ ہے حیران دیکھے تو کوئی
ڈھونڈنے والے اُسے ہر حال میں پا لیتے ہیں
ہے بتوں میں بھی خدا کی شان دیکھے تو [illegible]

۸

پتھروں میں بھی خدا آنے لگا گویا نظر
جب عقیدت کی جہاں کچھ آنچ پائی ہوئی
مٹ گئی تفریق کتنی ہی خالق و مخلوق میں
[illegible] ہستی سے بھی [illegible] تراشی [illegible]

قسط ...

بے آواز روشنی

ڈاکٹر اُدے سرن ارمان

Dr. Zakir Husain Library, Jamia Nagar, J.M.I. New Delhi

اپنے مکان کے پیچھے قلعی سے پتی ہوئی دیوار پر نظریں
جمائے منشی جی بہت دیر سے ٹھہرے تھے۔ شاید دیوار پر لکھی کسی
عبارت کو پڑھنے کی کوشش میں۔ مگر نہیں وہ تو ہندی اچھی خاصی
جانتے تھے اور پھر عبارت بہت صاف تھی۔ "چیچک کی سب سے
پہلی سوچنا دینے والے کو ایک ہزار روپے نقد انعام۔" راہ سے
گزرتے سیکڑوں بار اس فقرے پر میری نگاہ پڑی ہوگی مگر میرے
لئے اس میں دلچسپی کا کوئی پہلو نہ تھا۔ بے ربط اور اوٹ
پٹانگ سی بات تھی۔ ایسی غیر اہم باتوں پر میں کوئی دھیان
نہیں دیتا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی ارے بھائی چیچک کوئی
ایسا چھپا مرض تو ہے نہیں ہماری آئے گی تو مریض خود اسپتال
پہونچ جائے گا۔ پھر منشی جی کو بھلا اس معمولی سے فقرے میں
کیا خاص بات نظر آگئی۔

میں انھیں خیالات میں گم تھا کہ معاً میری نگاہ منشی
جی کے چہرے پر پڑی کتنے اداس تھے وہ اس وقت خاموش
ساکت سے کسی سوچ میں گم "چرچل کی طرح"۔ مجھ سے رہا نہ گیا
وہ قریب جاکر پوچھ ہی بیٹھا۔ "منشی جی بہت دیر سے کیا پڑھ
رہے ہیں آپ؟ ایک دم چونک کر انھوں نے میری طرف دیکھا
پھر سنبھل کر بولے —— "میں سوچ رہا تھا کہ انسان نے
پلیگ اور طاعون کی طرح چیچک پر بھی قبضہ پا لیا کتنی بڑی بات
ہے۔" یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئے۔

میں منتظر تھا کوئی نئی بات سننے کا جب بہت دیر تک وہ کچھ
نہیں بولے تو میں نے ان کی طرف بغور دیکھا ان کی آنکھوں
میں آنسو تھے وہ رو رہے تھے مجھے تعجب ہوا کہ وہ ایکدم کیا
سوچ کر رونے لگے۔ میں نے پوچھا۔ "منشی جی آپ بلاوجہ کیوں
رو رہے ہیں۔"

وہ آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے بولے "دنیا میں
کوئی کام بلاوجہ نہیں ہوتا۔ میرے رونے کی بھی ایک خاص وجہ
ہے جسے تم نہیں سمجھ سکتے۔ اسی چیچک نے میری بیوی مجھ سے
چھین کر میری زندگی ہی تباہ کر دی۔ میرے تمام سکھوں پر پانی
پھیر دیا۔"

یہ کہتے کہتے وہ پھر سسک سسک کر رونے لگے۔ میں اب
جان گیا تھا کہ ان کو اس اشتہار سے اپنی مرحومہ بیوی کی یاد
آ گئی تھی۔ میں نے دھارمک پروچنوں کا سہارا لے کر ان کو
طرح طرح سے سمجھایا دلاسا دیا "منشی جی آپ ٹھیک کہتے ہیں۔
واقعی بیوی کے مرنے کے بعد آدمی کے تمام سکھوں کا جیسے
انت ہی ہو جاتا ہے۔" منشی جی سونی آنکھوں سے میری جانب
دیکھتے ہوئے بولے۔

"رو بہت بیوی کے مرنے کے بعد نہ صرف آدمی کے سکھوں
کا خاتمہ ہو جاتا ہے بلکہ سماج کی نظروں میں اس شخص کی مان مریادا
اور وقار بھی جاتا رہتا ہے۔ نہ اس کا اعتبار قائم رہتا ہے نہ اعتماد
ساری ساکھ ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی شرافت اور
بھلمنساہت کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔"

منشی جی کی ایک بات سے تو میں اتفاق کرتا تھا۔
مگر یہ تمام باتیں — بیوی کے مرنے کے بعد عزت، شرافت
وغیرہ سب ختم ہو جاتی ہیں۔ مجھے اس پر شک تھا اور
دل ہی دل میں اس امر سے متفق نہیں تھا۔ لیکن ابھی میں
نے لب کشائی بھی نہیں کی تھی اور بمشکل ان کی طرف متوجہ
تھا کہ انھوں نے سلسلۂ کلام کو آگے بڑھایا۔ "ہو بہت
مجھے اس کا تجربہ اپنی بیوی کے مرنے کے بعد ہوا ہے۔" وہ
چند ثانیے ٹھہرے میں نے ان کے دل کو کریدا تو وہ بولے۔
جب میری بیوی کا انتم سمے آیا اس وقت میرے پاس
دو بچے تھے ایک ڈیڑھ برس کا دوسرا تین ماہ کا پھر جب میں

بتا نہیں دیتا ہے رنڈوا آدمی ہے۔ ایک کام اس کا
نکال دیا تو دس کام اپنے ہی نکالے گا۔ وہ بھی احسان
سے دب کر [illegible] نہ کر سکے گی۔ اس زمانے میں بے مطلب
کوئی کسی کی مدد نہیں کرتا ہے۔ بستی کے لوگوں کی یہ ساری
باتیں کسی نہ کسی طرح مجھ تک بھی پہنچ جاتی رہیں۔ بہت دکھ
ہوتا کبھی تو جی چاہتا کہ گھر چھوڑ کر کہیں دور چلا جاؤں اور
ان لوگوں کا شکل نہ دیکھوں پھر خیال آتا کہ جہاں بھی جاؤں
کا سماج ضرور ملا ہوا ملے گا۔ مگر سوچنے کا ڈھنگ اس سماج
کا ایسا ہی ہوگا۔ اس لئے یہی ٹھیک ہے میں اپنے راستے پر
ٹھیک ہوں۔ اس طرح میں اپنے دل کو سمجھا لیتا۔
ایک بار وہ بہت سوکھ کر کانٹا [illegible] جانتے ہی ہو گئے اس کا
لڑکا سردی کے مارے ٹھٹھر رہا تھا میں نے ترس کھا کر اپنے
بچوں کے کچھ اترے ہوئے کپڑے اس کو دے دئے۔ جس سے
اس کا جسم ڈھک گیا اور سردی دور ہو گئی اس بچے کو مجھ سے
پیار ہو گیا اور وہ میرے گھر آنے جانے لگا۔ گھنٹوں میرے
بچوں کے ساتھ کھیلتا رہتا تھا کبھی کبھار میں اس کو کھانا بھی
کھلا دیتا تھا۔ کبھی کوئی چیز بھی دے دیتا تھا۔ وہ میری ان
باتوں کو بہت اچھا سمجھتا تھا اس کی ماں ان باتوں کو
اپنی ساتھی عورتوں سے بلا تکلف کہتی تھی۔ عورتوں کی [illegible]
زبان ہوتی ہے اس طرح میری یہ باتیں ساری بستی میں عام
ہو گئیں۔ وہی عورتیں جو میری تعریف کیا کرتی تھیں [illegible]
بھی کسر نہ چھوڑتیں [illegible] وغیرہ۔ رنڈوا [illegible]
پیار [illegible] تھا کسی عورت کا دل [illegible] والا پہلے اس کے
بیٹے ہی کو پیار کرتا [illegible] پھر [illegible]
اپنا لیں میرے [illegible] سا لگ جاتا مگر میں ضبط سے کام
لیتا رہا۔ [illegible] اس طرح کی باتیں سننے کا عادی ہو گیا تھا۔
اور کسی کی کوئی پرواہ نہیں کرتا تھا جسے جو اچھا لگتا کہتا
تھا۔ میں اپنی عادت سے مجبور رہا۔ اور اپنی عادت کے
مطابق ہی [illegible] تھا لوگوں کی وقت ضرورت مدد کر دیتا تھا
ایک بات ختم نہیں ہو پاتی تھی کہ دوسری یاد آ جاتی ہے
اسے سنبھالئے گا منشی جی [illegible] سے بیچھے کر گیا۔

ابھی اس کی شادی کو ایک ہی برس ہوا تھا۔ اس کی ٹانگ
ٹوٹ گئی پلاسٹر چڑھایا گیا۔ اور وہ چالیس روز تک
بستر پر پڑا رہا۔ [illegible] تھا۔ مگر کسی نے اس کے
گھر کا کام دیکھنا تو درکنار [illegible] نہیں۔ وہ اپنی
بیوی کو تنہا کھیت کیاری میں بھیجنا پسند نہیں کرتا تھا۔ [illegible]
اس کا پڑوسی تھا جس سے اس کی مجبوری میں بگڑتا ہوا کام
نہیں دیکھا گیا۔ اس ہمدردی کا کیا نتیجہ نکلا پتہ ہے؟
میں نے ان کے سوالیہ انداز پر کہا کیا نتیجہ نکلا۔
وہ بولے وہ لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے منشی جی بہت
ہوشیار آدمی ہیں۔ [illegible] کی بیوی سے ملاقات کا
کیا طریقہ نکالا ہے۔ کبھی کھیتوں پر اپنا کام دیکھنے جائے گی ہی
مجبوری سب کو ڈگا دیتی ہے۔ اس طرح یہ اپنا الو سیدھا
کر لیں گے۔
ان تمام باتوں سے تم نے کیا مطلب نکالا [illegible]؟ منشی
جی نے مجھ سے سوال کیا۔ میں نے کہا منشی جی آپ نے شرافت
سے کسی کی حفاظت کی کسی مجبور کی مدد کی کسی غریب پر ترس
کھا کر اس کو کپڑا دے دیا۔ کسی کے بچے کے ساتھ اپنا بچہ سمجھ
کر خلوص [illegible] اور کسی لاچار کے وقت پر کام آئے
یہ سب بڑے پن اور اچھے رشتوں کی علامت ہے۔ مگر سماج
نے ان تمام باتوں کا ایک ہی مطلب نکالا۔ کیونکہ سب کے
سوچنے کا ڈھنگ ایک ہی جیسا ہے۔ اگر آپ کی بیوی زندہ
ہوتیں تو یہی لوگ اور طرح سے سوچتے اور آپ کی شرافت
کے گیت بھی نہ اچھالتے۔ منشی جی آپ نے جن لوگوں کے ساتھ
اچھائی کی ہے۔ کیا وہ بھی آپ کو غلط سمجھتے ہیں؟ میرے
سوال پر منشی جی ایک دم چونک کر بولے نہیں ان میں سے
ایک بھی نہیں۔ وہ سبھی میری تعریف کرتے ہیں۔ بلکہ مجھے برا
بتانے والے سے وہ لوگ لڑ بھی بیٹھتے ہیں۔
منشی جی بھگوان کا شکریہ ادا کریے کہ وہ سبھی لوگ آپ
کے ممنون ہیں۔ مداح ہیں۔ پوری بستی میں آپ کی تعریف
کرنے والے اور احسان ماننے والے چار چھ لوگ ہیں
تو سہی۔ دیکھتے جائیے ایسا وقت بھی آنے والا ہے۔

باقی صفحہ پر

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹیو بنک لمیٹڈ

رجسٹرڈ آفس ۷۸ محمد علی روڈ بمبئی ۳...۴۰۰

دہلی آفس نمبر ۲۳۵۵ نیتا جی سبھاش مارگ نئی دہلی ۱۱...۰۰۲

فون نمبر:۔ ۲۶۸۲۶۶ —— ۲۶۴۳۷۲

- ہمارے یہاں شرح سود تمام نیشنلائزڈ اور شیڈولڈ کمرشیل بنکوں کے مقابلہ ایک فیصد زیادہ ہے
- ہندوستان کا پہلا کوآپریٹیو بنک جس کو زرمبادلہ میں کاروبار کے لئے لائسنس جاری کیا گیا۔
- ہمارے بنک میں اوقاف کی جمع شدہ رقم کی آمدنی دفعہ ۱۳ (۵) (الف) ۱۱۱ انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔

اس کے علاوہ

- ہم آپ کے آرام و آسائش کی ضروریات مہیا کرنے کے لئے آسان قسطوں پر قرضہ فراہم کرتے ہیں۔ ایک فیصدی کا فرق بہت بڑا فرق ہے۔ یہ آپ کی رقم میں ہزاروں روپیہ کا اضافہ کرتا ہے۔ آپ بھی اس کا فائدہ اٹھائیں۔

زین۔ جی رنگون والا (مینیجنگ ڈائرکٹر)

حسینی۔ ایس ڈاکٹر (چیرمین)

شمیم کاظم (اسسٹنٹ جنرل منیجر۔ شمالی ہند)

باب تنقید

(ادارہ)

کلیاتِ میر (جلد اول، مکمل چھ دیوان) مرتب ظل عباس عباسی سائز ۳۰×۲۰/۸ ضخامت ۸۴۰ صفحات۔ کتابت طباعت بہترین۔ کاغذ سرکاری امداد جو فلیمنٹ ہے۔ قیمت مجلد باون روپیہ ناشر ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو۔ ویسٹ بلاک ۸ آر۔ کے پورم نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

پیش لفظ:۔ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو۔ تعارف:۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ مختصر حالاتِ زندگی:۔ قاضی عبدالودود۔ اس کے بعد مولف نے میر کا ذکر تذکروں میں کے تحت سترہ ایسے مستند تذکروں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ جن میں میر کا ذکر آیا ہے۔ اس کے بعد "میر کے مطالعہ کی اہمیت" عنوان سے پروفیسر آل احمد سرور کا سیر حاصل مقالہ ہے جسے میر کا کلام پڑھنے سے پہلے مطالعہ کرنا انتہائی ضروری ہے۔ اور پھر پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری نے "میر کی عالمگیر مقبولیت" عنوان سے جن بیش بہا خیالات کا اظہار فرمایا ہے اس کی ابتدا یوں کی ہے۔

"میر کی جادو نگاری اور کلام میر کی سحر کاری میں جو بات سب سے زیادہ اہم معلوم ہوتی ہے۔ جو حقیقت سب سے زیادہ نظر آتی ہے اور جس میں اس کی عالمگیر مقبولیت کا راز پنہاں ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے اطیف ترین محسوسات کی اتنی فطری مصوری اور وہ بھی کم سے کم الفاظ میں، سادہ سے سادہ الفاظ میں، معمولی سے معمولی الفاظ میں اردو کا کوئی دوسرا شاعر نہیں کر سکا۔ ان کے ایسے اشعار ہمارے دلوں کی آخری تہوں سے نکلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میر نہیں بول رہے ہیں۔ ہماری انسانیت اور ہماری فطرت بول رہی ہے۔"

جناب ظل عباس عباسی صاحب نے کلیاتِ میر مدت ہوئی کسی دوسرے ادبی ادارے کے تعاون سے شائع کی تھی۔ یہ اسی کا دوسرا ایڈیشن ہے جو ہر لحاظ سے بہتر انداز میں شائع ہوا ہے۔ با ذوق حضرات اور عاشقانِ میر کے لئے کلیاتِ میر ایک نعمت سے کم نہیں ہے۔

(دفتر شانِ ہند سے بھی کلیاتِ میر دستیاب ہے)

رقصِ آواز:۔ مجموعۂ کلام جناب جگ راج کنول سائز ۲۲×۱۸/۸ حجم ۱۱۲ صفحات۔ کاغذ، کتابت، طباعت دیدہ زیب۔ جلد دلکش قیمت ۲۰ روپے۔

جناب جگ راج کنول گورداسپوری پنجاب کے سرکردہ شعراء کی صف اول میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں حال ہی میں ان کی اکاون غزلیات اور گیارہ نظموں کا یہ مجموعہ منصۂ شہود پر آیا ہے جو اُن کے گزشتہ چالیس سال سے زائد کے شعری سرمایے کا سرسری انتخاب ہے۔ جو ہر با ذوق سخن فہم کے ذوقِ مطالعہ کے لئے نعمتِ خداوندی سے کم نہیں۔ پیش گفتار عنوان کے تحت جناب کرشن کانت صاحب نے جو پُر مغز مقالہ کنول صاحب کی شاعری پر لکھا ہے اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پنجاب کے شعراء اور ادیب اس دور میں بھی اُردو زبان کے تحفظ کے امین ہیں۔ کتاب کی قیمت تو پیش گفتار پڑھنے سے ہی وصول ہو جاتی ہے۔ ایک اچھے شعری مجموعہ کے طالبان سے رقصِ آواز کے مطالعہ کی پُر زور سفارش کی جاتی ہے۔ "رقصِ آواز" کے تقسیم کار کتب کیندر گوپال نگر۔ امرتسر پنجاب ہیں۔ ویسے یہ مجموعہ دفتر شانِ ہند نئی دہلی ۲ سے بھی مل سکتا ہے۔

گلِ تر:۔ راجیش کمار اوج کا یہ مجموعۂ کلام ۳۰×۲۰/۱۶ سائز پر ۱۹۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ کاغذ بہت اچھا۔ چھپائی لکھائی اور روش اور بہترین۔ سرورق دیدہ زیب اور دلکش قیمت چالیس روپیہ (جو یقیناً زیادہ ہے) ہے انجمن ترقی

بالوگنج شملہ اور دفتر بلیسویں صدی دریا گنج نئی دہلی علا کے علاوہ دفتر شان ہند۔ دریا گنج۔ انصاری مارکیٹ نئی دہلی ملا سے خریدا جا سکتا ہے۔

شروع میں نو صفحات پر ابوالاثر حفیظ جالندھری نے اوج صاحب اور ان کی شاعری پر ایسا پیش لفظ لکھا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مغیث الدین فریدی دلی یونیورسٹی نے مختصراً آنگل تر اور اوج صاحب کے بارے میں اپنی رائے گرامی سے نوازا ہے۔ جناب رحمان نیر ایڈیٹر بلیسویں صدی نے دو صفحات میں اوج صاحب کی صفات اور "گل تر" کی شاعرانہ حیثیت پر جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ اس بات کا مظہر ہے کہ رحمان نیر صاحب خود شاعر تو نہیں مگر سخن فہمی اور سخن شناسی سے دور نہیں ہیں اور پھر جناب دھرم پال صاحب عاقل نے اوج صاحب اور ان کی شاعری کے سلسلے میں بچے تلے الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔

جناب اوج صاحب شملہ میں پولیس کے ڈی۔ آئی جی ہیں۔ اس لیے خیال گزرا کہ مذکورہ بالا حضرات نے محض ان کے عہدے اور ذاتی تعلقات کی بنا پر دیوان اور صاحب دیوان کی تعریف کر دی ہوگی۔ مگر اپنے دیرینہ کرم فرما مرحوم نواب امین الدین احمد لوہارو سابق گورنر ہماچل کی تقریظ پڑھ کر اپنی رائے بدلنی پڑی کہ گورنر کو اپنے ڈی آئی۔ جی پولیس سے کیا غرض ہو سکتی تھی جو انھوں نے اوج صاحب کے فرائض منصبی کی تعریف کے ساتھ ساتھ ان کے کئی اشعار کا حوالہ دیتے ہوئے ان کے وطن پرستانہ، صوفیانہ، مناظر فطرت سے متعلق اور عاشقانہ انداز سخن پر بھی خوشنودی کا اظہار فرمایا ہے۔ اور اس کے علاوہ جب اوج صاحب کی غزلیات۔ قطعات۔ رباعیات اور نظموں کو پڑھا تو دل نے گواہی دی کہ اوج واقعی شاعر ہے۔ راقم الحروف کی مصروفیات اتنی زیادہ ہیں کہ مطالعہ کے لئے بہت کم وقت ملتا ہے تاہم یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ "گل تر" کو میں نے شروع سے آخر تک پڑھا۔ اگر آپ کی جیب اجازت دے یا آپ

کسی لائبریری کے ممبر ہیں تو گل تر کو ضرور پڑھئے یقیناً آپ میرے ہمنوا ہوں گے کہ گل تر واقعی مطالعہ کے قابل شعری مجموعہ ہے۔

جنوبی ہند کی تاریخ :۔ مصنف: کے۔ اے نیل کنٹھ شاستری۔ مترجم آر۔ کے بھٹناگر، سائز $\frac{18 \times 22}{8}$ ضخامت ۵۷۶ صفحات۔ کاغذ چھپائی لکھائی بہتر۔ ناشر ترقی اُردو بیورو۔ نئی دہلی۔ قیمت ۲۲ روپے۔ یہ کتاب دفتر شان ہند سے بھی دستیاب ہے۔

زمانہ ماقبل تاریخ سے وجے نگر کے زوال تک کی اس تاریخ کا شروع کے ۳۸ صفحات میں جائزہ بہت اچھی طرح تاریخی ماخذ کی روشنی میں لیا گیا ہے اور پھر تاریخی پس منظر میں جغرافیائی حالات۔ ابتدائی اقوام اور تہذیبی تاریخ کا آغاز اور آریوں کا عروج۔ موریہ سلطنت کا زمانہ ستواہن اور ان کے جانشین۔ سنگم اور اس کے بعد کا عہد تین سلطنتوں کا تصادم۔ دو مملکتوں کا توازن۔ چار سلطنتوں کا عہد بھی اور وجے نگر سلطنتوں کا عروج۔ وجے نگر سلطنت معاشی و معاشرتی زندگی۔ ادب، مذہب اور فلسفہ فنون لطیفہ اور طرز تعمیر عنوانات سے پندرہ ابواب کے زیر تحت اس تاریخ کو ہر ممکن طور پر مکمل و بہتر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مترجم نے نہایت صاف سلیس اور آسان اُردو میں قاری کے لئے ان تاریخی واقعات کے مطالعہ کے آسانیاں پیدا کی ہیں۔ یعنی بلا ضرورت اپنی ہمہ دانی کا ثبوت دینے کے لئے مشکل اور [illegible] زبان کا استعمال نہیں کیا گیا۔ تاریخ سے رغبت رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب حسن بھاتی تو ہے ہی مگر اُردو زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کتاب کا سیر حاصل باب "ادب" یقینی طور پر ادبی معلومات میں متعدد اضافوں کا باعث ہوگا۔

علم عروض ہندی میں :۔ (ہندی غزل کی رچنا۔ ایک تعارف) مصنف و ناشر:۔ جناب آر۔ پی شرما [illegible] سائز $\frac{10 \times 24}{16}$ کے ۱۰۶ صفحات پر یہ کتاب اپنے ڈھنگ کی نرالی کتاب ہے جسے مصنف نے حضرت علامہ عشق آبادی کے عروضی جانشین [illegible] کی نگرانی میں [illegible] ہے۔ مصنف

مکمل سکے عروض کو ہندی میں اس طرح ڈھالا ہے کہ ہندی غزل کہنے والے بھی اس علم سے پورے طور سے روشناس ہو سکیں ابھی تک ہندی میں عروض پر ایسی کوئی تصنیف نہیں شائع ہوئی جس میں عروض تا پر [illegible] احاطہ کیا گیا ہو۔ ارکان۔ اوزان فروعات وزحافات۔ بحور وغیرہ سب ہندی میں ہیں جسے ہندی کے شاعروں کے لئے عروض سے متعلق ایک نادر بات کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر فعولن کو "[illegible]" فاعلن کو "[illegible]" اسکا [illegible] "[illegible]" اوزان کو "[illegible]" فروعات وزحافات کو "[illegible]" "بحر متقارب" کو "[illegible] چھند" وغیرہ کیا گیا ہے جس سے اس لئے کہ ہندی والوں کو سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو۔

تقطیع کے مکمل اصول ہندی الفاظ کے تلفظ اور قواعد کو مدنظر رکھکر تشکیل کئے گئے ہیں۔ مقبول بحور اور اوزان کو تقطیع کر کے سمجھایا گیا ہے۔

علم عروض میں بحر متقارب اور بحر متدارک میں جو فرق اور پیچیدگیاں ہیں انھیں بھی مصنف نے امثال دے کر بخوبی سمجھایا ہے۔ تخنیق اور تسکین کا عمل ان بحور میں کس طرح واقع ہوتا ہے یہ بھی اس تصنیف میں تفصیل سے بتایا گیا ہے تخنیق کو ہندی میں "[illegible]" اور تسکین کو "[illegible]" کیا ہے۔

موجودہ انیس بحور اور فروعات کی مکمل فہرست دی گئی ہے اور فروعات سے بحریں تشکیل کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔

رباعی کے مروجہ ۲۴ اوزان اور ان کے علاوہ حضرت علامہ سحر عشق آبادی کے ایجاد کردہ بارہ اوزان کی فہرست بھی دی گئی ہے۔

کتاب کے آخر میں تقطیع کے لئے کچھ مشق بھی فراہم کی گئی ہے جناب ڈاکٹر زار علامی نے اس تصنیف کو بغور ملاحظہ فرمانے کے بعد مصنف کو گرانقدر مشوروں اور عروضی اصلاحوں سے نوازا جس کی روشنی میں مصنف نے یہ علم عروض پر مستند کتاب شائع کی۔

چونکہ ہندی ارکان۔ اوزان۔ فروعات وزحافات۔ [illegible] کے ساتھ ساتھ اردو ارکان وغیرہ درج کئے گئے ہیں۔ اس لئے ہندی اور اردو دونوں زبانیں جاننے والوں کے لئے یہ کتاب یکساں طور پر مفید ثابت ہوگی شائقین علم عروض کے لئے تو یہ کتاب بڑا [illegible] کارآمد ہی مگر مبتدی اور منتہی دونوں کے حق میں اس کا مطالعہ راحت ثابت ہوگا۔

بقیہ :- بے آواز روشنی

جب کوئی کسی کا احسان ہی نہیں مانے گا۔ اور بھلی [illegible] کی تعریف ہی نہیں کرے گا۔ اچھا سوچنا اور اچھا کرنا اچھا کا کام ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اچھے لوگ گھٹتے جاتے ہیں۔ اچھائی کم ہوتی جا رہی ہے۔

میری بات سن کر منشی جی کے چہرے پر ایسی خوشی کی لہر دوڑ گئی جیسے عموماً سے بے زار کسی مضطرب کے چہرے پر صبح کی روشنی دیکھ کر خوشی چھا جاتی ہے۔

پاکستانی نژاد شہنشاہ غزل
مرحوم ناصر کاظمی
کا شہرۂ آفاق مجموعہ کلام

دیوان

آفسٹ چھپائی۔ بہترین کاغذ۔ خوشنما جلد
بہت کم جلدیں فروخت کے لئے موجود ہیں
قیمت : ساڑھے بارہ روپے
آج ہی طلب فرمائیں
دفتر شان ہند۔ فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ
دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ماہنامہ شانِ ہند۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اندرا، ماں امر شہید ہوئی

محترمہ اندرا گاندھی کی شہادت پر جناب ساحر ہوشیارپوری نے ایک نظم "امر شہید" کہی (جو سرورق کے دوسرے صفحہ پر مرحومہ کی تصویر کے ساتھ شائع کی جا رہی ہے) اس نظم کو ساحر ہوشیارپوری نے بڑے ہی اچھے انداز میں مرحومہ کی تصویر اور ان کی آخری تقریر کے ایک یادگاری فقرے کو شائع کیا ملک بھر کے ادیبوں، شعراء اور دانشوروں نے اس نظم کی پسندیدگی پر جو آراء گرامی بھجوائی ہیں انھیں امر شہید محترمہ اندرا گاندھی کی پہلی برسی پر انتہائی دلی عقیدت کے ساتھ مرحومہ کے چرنوں میں بھینٹ کیا جا رہا ہے۔

ودیا پرکاش سرور تونسوی، ایڈیٹر

نورالحسن ہاشمی۔ لکھنؤ

آپ نے اندرا گاندھی کی شہادت پر "امر شہید" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے۔ وہ بہت خوب ہے۔ مختصر اور جامع۔ مطلع تو بہت خوب۔ ظاہری طباعت وغیرہ بہت نفیس۔

عروج زیدی رامپور

اب سے پہلے اور بہت پہلے آپ کی خوب صورت نظم "امر شہید" کے مطالعہ کا شرف نصیب ہوا تھا میں اس زمانہ میں بستر علالت پر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی رسید بروقت ارسال خدمت نہ کر سکا۔ اب حالت قدرے سنبھلی ہے تو یہ سطور معرض تحریر میں لائی جا رہی ہیں۔ تاخیر پر ندامت کے ساتھ۔ مذکورہ بالا عنوان نظم تو دو مصرعوں کے بات بھی مل سکتا ہے مگر انداز بیان میں جو ندرت اور صداقت ہے اس کا جواب ممکن نہیں۔

امر چند قیس۔ بسی کلاں (ہوشیارپور)

"امر شہید" خوب ہے۔ کیا کہنا اس سلسلہ کی تمام اُمیں ایک طرف (ترازو کے پلڑے میں) اور "امر شہید" دوسرے پلڑے میں۔ دوسرا پلڑا بھاری رہے گا پہلے شعر میں دو الفاظ درد بالا بالا۔ ایسے شعر کو مرصع شعر کہتے ہیں۔ دونوں مصرعوں کے الفاظ کی تعداد برابر (صنعت ترصیع) دوسرے شعر کا دوسرا مصرع۔ لاجواب تیسرے مصرع میں تشبیہ (مثال) خوب۔ اگلے تین اشعار کا کیا کہنا! (طنز جمیل) آپ کی جرأت؟ خدا کی شان!

کتابت، طباعت دیدہ زیب اعلیٰ بے نظیر۔

جتی اختر امرتسری۔ دلی

آپ کی ارسال کردہ نظم اندرا جی سے متعلق "امر شہید" کے عنوان سے مجھے اور عزیز راکر دونوں کے لئے نظر نواز ہوئی بہت بہت شکریہ۔ نظم "امر شہید" کا آغاز بہت ہی عمدہ ہے جس کی داد کے لئے مجھے الفاظ نہیں مل رہے کہ میں اس کی خوبی کو ظاہر کر سکوں کہانی کے انداز میں جس کا آغاز آپ نے کیا جو دل میں بیٹھ جانے والا ہے۔ (ایک رانی کے دو محافظ تھے) کون کون؟ اور پھر کیا ہوا؟ انھوں نے کیا کیا؟ نتیجہ کیا نکلا۔ قربان جائیے اس انداز بیان۔ یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ شعر نمبر ۱۔ ایک بے ساختہ سا نام ہوتے ہوئے اس کی بے وفائی کی ندا کو ظاہر کر رہا ہے اور ایک ست وقت۔ یہ بھی اس سنام کو ظاہر کرتے ہوئے اس کی بے حیائی کی سچی ملکیت کا مظہر ہے خوب اور بہت خوب۔ طنز کی چاشنی بھی ہے بیج انشا کر کے زور قلم اور زیادہ آمیز بھر کے پانچ نظم سلک مروارید ہے

قاری کی توجہ کو اپنی طرف جذب کر لیتا ہے اور بعد کا شعر اس ابہام کی تفصیل بن جاتا ہے۔ قاتلوں کے نام کی معنویت سے آپ نے فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑی شاعرانہ سلیقہ مندی کا مظاہرہ کیا ہے اور پھر بعد کے دو شعروں میں جو الفاظ ایسے ننگِ انسانیت اور بدسرشت قاتلوں کے لئے استعمال کئے گئے ہیں دراصل وہ اسی کے مستحق ہیں۔

سہ کام دونوں نے لا مثال کیا
خوب حق نمک حلال کیا

میں چھپے ہوئے طنز، درد، کرب اور کراہ کو صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے آپ نے اس کو جس اہتمام و اہتشام سے شائع کرایا ہے یہ نظم اپنے ایجاز کے اعجاز کی وجہ سے اس اعزاز کی بلاشبہ مستحق ہے۔ میں تو اسے فریم میں سجا کر بطور یادگار رکھ دوں گا۔ یہی نہیں جب سے مجھے یہ نظم ملی ہے اپنے کئی سخن فہم دوستوں کو سنا چکا ہوں سب نے اسے بے حد پسند کیا۔ آپ نے یہ بھی بہت اچھا کیا کہ ایک طرف ہندی رسم الخط میں اسے چھپوا دیا۔ میرے ایک عزیز اردو داں دوست سری کھیم چند ہیں انھوں نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ ایک کاپی ان کے لئے منگوا دوں۔ وہ بھی اسے فریم میں سجا کر رکھنا چاہتے ہیں اور بھی کچھ احباب کی فرمائش ہے اگر آپ کے پاس کچھ کاپیاں موجود ہوں تو آپ کچھ اور بھجوا کر مزید کرم فرمائیں۔

واکی آسی (لکھنؤ)

آپ نے اپنی بے انتہا نفاست پسند طبیعت کے تقاضے سے "امر شہید" نامی خوبصورت نظم چھپوا کر اردو کے تمام شاعروں کے جذبات کی نمائندگی کی ہے۔ اتنی مختصر سی نظم میں اتنی بڑی بات کہنا ہر ایک کے بس کی بات بھی نہیں۔

ہمت لال شرما (بمبئی)

آپ کی ارسال کردہ معرکۃ الآرا نظم "امر شہید" نظر نواز ہوئی واللہ کیا بات ہے! اس سے پیشتر بھی میں نے یہ نظم پریم رشتل صاحب کے دفتر میں آپ سے سنی تھی۔ ایسی اچھوتی نظم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ آپ کی یہ کاوش قابل ستائش [illegible]

صابر ابوہری (نئی دہلی)

"امر شہید" اندرا گاندھی سے متعلق آپ کا ارسال کردہ پمفلٹ مل گیا۔ شکریہ۔ نظم جتنی مختصر ہے اتنی ہی زیادہ موثر ہے۔ پمفلٹ کی تشکیل و ترتیب اور اندرا گاندھی کے انگریزی اقتباسات کی شمولیت نے اس کے تاثر کو اور بھی دوگنا بڑھا دیا ہے۔

تسنیم فاروقی (لکھنؤ)

آپ کی نظم "امر شہید" ملی۔ حسین و جمیل کارڈ پر یہ ایسی اہتمام و رنگ آپ کے جذبات کو معلوم دیکھ کر دلی مسرت ہوئی۔ یہ صرف و حرف کسی نہایت حساس شاعری کا کام ہو سکتا ہے۔ آپ نے بجا طور پر اردو کے شعراء کی نمائندگی اس انداز میں انجام دی ہے۔ سہل و معیار کے اعتبار سے یہ آپ کی پہلی نظم ہے ورنہ بہت سی نظمیں آنجہانی اندرا گاندھی پر میری نظروں سے گزریں اس خلوص آفریں لہجے کا فقدان تھا۔

گربچن چندن (نئی دہلی)

محترمہ اندرا گاندھی کی شہادت پر آپ کی نظم مل گئی تھی۔ بہت دل سوز اور پر اثر تخلیق تھی۔ ایک شاعر کا والہانہ خراج عقیدت تھا۔ ایک دردمند کے آنسوؤں کا ناہموار تھا۔

اختر لکھنوی (گوالیار)

"امر شہید" آپ کا ایک امر اور لازوال کارنامہ ہے اس میں احساس کی گہرائی بھی ہے اور تاثرات کی گہرائی بھی۔

عفت موہانی (حیدر آباد)

کل آپ کا مرسلہ "اندرا شہید" کا کارڈ ملا۔ بہت خوبصورت بہت خوب ہے مجھے بہت پسند آیا۔ یہ ایک مستقل دستاویز بن گیا ہے۔ ہم سب کے لئے۔ پوری قوم کے لئے۔ ایک کاپی بذریعہ رجسٹری وزیر اعظم کی خدمت میں بھی پیش کیجئے۔ آپ کے اشعار موقع کی مناسبت سے اتنے مضبوط ہیں جیسے کسی زمین پر کوہ گراں ان میں کوئی تبدیلی کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا۔

ممتاز مرزا۔ (دلی)

"امر شہید" محترمہ اندرا گاندھی کی دردناک شہادت کی المناک تصویر ہے۔ آپ نے جس سادگی اور خلوص سے ہم سب کے جذبات کی عکاسی کی ہے۔ وہ درحقیقت آپ کا حصہ ہے۔ [illegible]

نور قلم اور زیادہ۔

کاش یہ نظم ذرا طویل ہوتی تاکہ اندرا جی کی ذات کے دوسرے پہلو بھی اجاگر ہو سکتے اور اس طرح اس سانحۂ عظیم اور ناقابلِ تلافی نقصان کا بیشتر احساس ہو سکتا۔

یادؔ دہلوی (لکھنؤ)

اندرا جی کے المناک حادثے نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا ان پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ آپ نے اپنے تاثرات بڑی خوبصورتی سے نظم کیے ہیں۔

کنہیا لال پوسوال (چنڈی گڑھ)

"امر شہید" نظم فرما کر آپ نے قوم پر احسان کیا ہے۔ مبارکباد۔ مجھے بے حد پسند آئی اور جن دوستوں نے پڑھا سب نے داد دی۔

شریف الحسن نقوی (سکریٹری اُردو اکادمی۔ دہلی)

"امر شہید" کے نام سے آپ کی نہایت خوبصورت نظم اندرا جی کی تصویر کے ساتھ ملی۔ آپ نے واقعی بہت اچھا فولڈر نکالا۔ ا[illegible] [illegible] ہی کچھ اور اہمیت بھی۔

دانش (دہلی)

اندرا جی کو خراجِ عقیدت جس طریقے سے آپ نے پیش کیا ہے [illegible] سے آپ کی قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے۔

حکیم گنگا رام گاندھی (دہلی)

مسز اندرا گاندھی کی شہادت کے سلسلے میں لکھی ہوئی آپ کی چھپی ہوئی نظم مع مرحومہ کا فوٹو ملی۔ "بے امانت" اور "سد وفت" [illegible] زخم و زمین کی تشبیہ بہت خوب ہے۔ اگر اس مصرعہ میں (دہ اکٹھا) لفظ تلاش کر سکتے تو اور اچھا ہوتا۔

ایس پی جین (نئی دہلی)

یادآوری کا شکریہ۔ نظم بہت خوب لکھی ہے اور حسبِ موقع ہے۔ یقیناً ملک کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

ایم۔ اے۔ صدیقی۔ (دہلی)

مسز گاندھی کی موت سے متعلق کارڈ ملا۔ شکرگزار ہوں۔ یہ خیال اچھا، جگہ منتخب اور بہت اچھا رہا۔ مبارکباد قبول فرمائیں۔ ترتیب اور طباعت دونوں بہت ٹھیک ہے۔ بہرحال یہ کارڈ دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔

سرداری لال نشتر (شملہ)

ابھی ابھی نوکِ خامہ کو نوکِ نشتر بنانے والا "امر شہید" موصول ہوا۔ بہت بہت شکریہ! عجیب شے تھی۔ امر شہید ہونے والی عظیم ہستی... جو زمیں سے گردوں کی رفعتوں تک علم ستارے بھی خرارے اچھالتی تھی... تاکہ رابطہ نہ ٹوٹے زندگی سے روشنی کا!

حسن نعیم (بمبئی)

آپ کی خوبصورت نظم "امر شہید" موصول ہوئی تھی۔ پڑھ کر بہت سی یادیں تازہ ہو گئیں۔ آپ نے اچھا کیا جو یہ فولڈر تیار کروا لیا۔

دل الوبی (ٹونک)

ابھی گھنٹہ بھر پہلے آپ کی نظم "امر شہید" کارڈ کی صورت میں موصول ہوئی۔ نظم ہی کیا کم تھی اس پر یہ اندازِ پیشکش! یہ ادا بھی دل کے ٹکڑے کر گئی!! معاً خیال ہوا کہ نظم کی داد نظم ہی میں کیوں نہ دی جائے۔ ملاحظہ ہو:-

ایک ماں کے شہید ہونے سے
جتنے فرزند تھے، تڑپ اُٹھے
چین دل کا خیال و خواب ہوا
موج خوں، دیدۂ پُرآب ہوا
آسمان و زمیں کو ماتم تھا
خامشی کیا تھی ہُو کا عالم تھا
وار اک اور کر گیا قاتل
خوں ہوا قلبِ شاعرِ بسمل
رگِ احساسِ فن پھڑک اٹھی
یارِ نو آگ سی بھڑک اٹھی
[illegible] جب نہیں رہا یارا
بند کوزے میں کر گیا دریا
دل کا آئینہ چور چور ہوا
ساحرِ ہوشیار پور ہوا

یوگیندر پال صابر (شکوہ آباد)

آپ کی نظم "امر شہید" موصول ہوئی۔ نظم پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ اندرا جی کی شہادت پر جو بہترین نظمیں کہی گئی ہیں آپ کی نظم ان میں سے ایک ہے۔

برہمانند جلیس (نئی دہلی)

لافانی نظم بروفات اندرا گاندھی موصول ہوئی۔ اس مختصر اور مکمل گراں مایہ تخلیق کے لئے جس قدر داد دی جائے کم ہے جن جن حضرات کے پاس یہ پہنچے گی یقیناً خراج تحسین اصول کریں گے۔ پھر جس اہتمام سے آپ نے اسے محترمہ گاندھی کے فوٹو کے ساتھ اشاعت پذیر کروایا ہے وہ ایک نادر چیز بن گئی ہے جو یادگار کی شکل میں محفوظ رہے گی۔

نظام الدین نظام (بمبئی)

خوبصورت کاغذ پر آپ کی شاہکار نظم امر شہید موصول ہوئی بلاشبہ آپ کی یہ نظم غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ بالخصوص پہلا شعر جس میں "اندرا" "اور "ستم" کا خوب صورت استعمال آپ ہی کا حصہ ہے۔

رئیس رامپوری (رامپور)

آج محترمہ اندرا گاندھی صاحبہ پر آپ کی نظم ان کا آخری تاریخی ارشاد اور ان کی تصویر نظر نواز ہوئی۔ اس مختصر مگر جامع نظم کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے یوں تو اس سلسلے میں ان پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے مگر جس انداز سے آپ نے قلم اٹھایا ہے وہ انتہائی متاثر کن ہے اور اس لیئے لائق صد ستائش ہے۔

پرکاش ناتھ پرویز (چنڈی گڑھ)

آپ کی نظم "امر شہید" موصول ہوئی شکریہ۔ محترمہ اندرا گاندھی کی شہادت سے متعلق آپ کے اشعار لاکھوں دلوں کے جذبات اور محسوسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مرحومہ کا نام تاریخ ہمیشہ درخشندہ و تابندہ رہے گا۔

چندر پرکاش جوہر بجنوری (الہ آباد)

محترمہ اندرا گاندھی پر لکھی ہوئی نظم "امر شہید" موصول ہوئی۔ اس نظم کی حقیقی جتنی تعریف کی جائے کم ہے میری جانب سے اس سلسلے میں دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ آپ نے اس نظم کو چھپوانے میں بڑے اہتمام سے کام لیا ہے۔ آپ کے اس سلیقے کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ خدا آپ کو بہت دنوں تک ہم لوگوں کے درمیان قائم رکھے۔

پرکاش تیواری (نئی دہلی)

آپ کا ارسال کردہ نظم والا کارڈ ملا گیا۔ بہت بہت شکریہ اور ساتھ ہی یادآوری کے لئے سراپا سپاس ہوں نظم پسند آئی اور ایک اچھی نظم کے لئے مبارکباد قبول فرمائیں۔

شفیع اللہ خاں راز فرا اٹاوی (اٹاوہ)

ابھی ابھی ڈاک سے عنایت کردہ تحفہ نظم "امر شہید" موصول ہوئی پڑھ کر جھوم رہا ہوں۔ کالج میں احباب کو پڑھ کر دکھایا سب حضرات نے نظم کو بہت سراہا۔ نظم کی ندرت وانفرادیت متاثر کرتی ہے۔

پرکاش فکری (رانچی)

"امر شہید" کے لئے آپ نے مجھے بھی یادوں میں رکھا میں اس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ میرا غم و غصہ پورے دیش کو سا لیقہ بڑا اس کا اظہار اسی ڈھنگ سے ہونا چاہیئے تھا۔

ہردیال شوق (چنڈی گڑھ)

آپ کی نظم بعنوان "امر شہید" بہت خوب اور مؤثر ہے اس میں ہندوستانی عوام کے عقیدتمندانہ جذبات کی بدرجہ اتم ترجمانی کی گئی ہے۔

گوہر عثمانی (مراد آباد)

"امر شہید" موصول ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اندرا جی کی شہادت پر کہی گئی ہندوستان کی تمام نظموں میں یہ سرفہرست نظم ہے۔ بہترین بندشیں۔ اچھوتے خیالات اور ندرت بیان اس کے ہر مصرعے سے آشکار ہے۔ آپ کا شمار ہندوستان کے صف اول کے اساتذہ میں ہے۔ میں دست بدعا ہوں کہ مولائے کائنات آپ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم و دائم رکھے۔ (آمین)

شاہد احسن (مراد آباد)

مقتولہ وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی جنہیں آپ نے بجا طور پر "امر شہید" کہا ہے ان کے قاتلوں کی مذمت میں کہی گئی نظم کا فولڈر موصول ہوا۔ یادآوری کے لئے شکرگزار ہوں۔ آپ نے اپنی نظم میں ایک سچے وطن پرست کے دل میں چھپے ہوئے درد کی عکاسی اور جن بے ریا جذبات کا اظہار کیا ہے وہ لائق ستائش ہے۔

نسیم شاہجہانپوری (شاہجہانپور)

آپ کی نظم "امر شہید" نظر نواز ہوئی بہت بہت شکریہ

آپ کی نظم میں حقیقت کی صحیح عکاسی پائی جاتی ہے آپ کی شاعرانہ عظمت سے کسے انکار ہے۔

آتش بہاولپوری (سونی پت)

سابق وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی شہادت کے متعلق قبلہ ساحر ہوشیارپوری کی نظم "امر شہید" ایک نہایت متاثر کن اور کامیاب تخلیق ہے۔

عرش صہبائی (روہتک)

"امر شہید" مختصر لیکن پُر تاثیر نظم ہے۔ جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

آزاد گورداسپوری (جمشید پور)

شریمتی اندرا گاندھی سے متعلق آپ کی بہترین کاوش بعنوان "امر شہید" باصرہ نواز ہوئی۔ آپ نے نہایت ہی موثر انداز میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ جس کے لئے آپ مستحق ہزار تحسین و آفریں ہیں۔

م۔ م۔ راجندر (دلی)

اندرا جی کی موت ساری قوم کے لئے المناک ترین سانحہ ہے۔ آپ کے محسوسات پر مشتمل کارڈ ملا۔ یاد آوری کے لئے بیحد شکر گزار ہوں۔

سیف الرحمٰن عباد

آپ کا ارسال کردہ کارڈ ملا۔ نظم اور اسے پیش کرنے کا انداز دونوں خوب ہیں۔ مبارکباد قبول فرمائیں۔

کیلاش ماہر (نئی دلی)

مدتوں بعد آپ نے یاد کیا وہ بھی اپنی نظم بھجوا کر۔ بہت خوب نظم لکھی ہے جو بالکل ساحر ہوشیارپوری، فصاحت و بلاغت کا دوسرا نام، جیسی ہے

آزاد گلاٹی (نابھہ)

آپ نے نہایت سادہ، لیکن دل کی گہرائیوں میں اترنے والے الفاظ میں قومی المیہ کو فنکارانہ چابکدستی سے اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری کے دل میں اس المیہ سے پیدا شدہ حزنیہ کیفیت پوری طرح سرایت کر جاتی ہے اور کہیں کہیں طنز کی ہلکی سی چاشنی آپ کے ذاتی ردِ عمل کو کتنے ہی دلہا کا ردِ عمل بنا دیتی ہے۔

پریم کمار نظر (ہوشیارپور)

یہ نظم "امر شہید" اس شخصیت کی طرح بے مثال ہو کر کہی گئی ہے اور میں اس حوصلے اور اہتمام کی داد دوں گا جو اسے لکھنے اور پیش کرنے میں برتا گیا ہے۔ مبارک۔

مہر گیرا (جالندھر)

آپ کی نظم اور فولڈر بہت خوب ہے۔ سبھی دوستوں نے اس قومی احساس کی بہت تعریف کی ہے۔

ساحر پالمپوری (مارنڈہ)

مرحومہ وزیر اعظم اندرا گاندھی کی تعزیت میں تخلیق آپ کی حقیقت پسندانہ بیباک نظم ایک دیدہ زیب کارڈ کی صورت میں باصرہ نواز ہوئی۔

ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

کرشن کمار طور

میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے شریمتی گاندھی کے بہیمانہ قتل پر اپنے تاثرات سے نوازا۔ آپ کی نظم کے دلی دُکھ کی نہ صرف آئینہ دار ہے بلکہ یہ ہم سبھوں کے جذبات کی بھی عکاسی کرتی ہے۔

سکھدیو شرما (جالندھر)

شہید شریمتی گاندھی پر آپ کی درد انگیز نظم پڑھ کر بہت متاثر ہوا ہوں۔

اجیت کمار دل (نکودر)

"امر شہید" کے عنوان سے چھپی نظم قابلِ تعریف اور حقیقت پر مبنی ہے۔ دیش کے داغ قوم کے غدار، خوب کہا ہے۔ صاف گوئی کی زندہ مثال ہے۔

ضیا فتح آبادی (دلی)

کچھ روز پیشتر شریمتی اندرا گاندھی کی شہادت پر آپ کی مختصر مگر جامع نظم نظر نواز ہوئی تھی۔ نظم واقعی آپ نے بڑی محنت اور لگن سے کہی ہے اور اسے شائع بھی بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ اس نظم میں آپ نے بڑی چابکدستی سے رقت اور صداقت کے ساتھ جذبات کو سمو دیا

مل یہ جذبات آپ کے ہونٹوں تمام آ رہے ہیں اور
سبب اس چھوٹی سی نظم کی تاثیر اور تاثر کا ہے۔ اس
اب نظم پر آپ واقعی مستحق مبارکباد ہیں۔ جب غزل کا
رکلیاب نظم کہتا ہے تو وہ نظم کچھ زیادہ ہی کامیاب
ہے۔ اندرا جی کو یہ بیش قیمت خراجِ عقیدت ہے۔

بل نند سوز (فرید آباد)

شاعر کا خراجِ عقیدت ہمیشہ اس کے اشعار ہی ہیں
۔ وہ نہ تو کسی کا مجسمہ کھڑا کرنے کی استطاعت رکھتا ہے
نہ کوئی تاج محل بنوانے کی۔ اس کے جذبات اور
احساسات ہی اس کا سرمایہ ہوتے ہیں جنھیں وہ پورے
ن اور صدقِ دلی کے ساتھ الفاظ کے گلدستوں میں
کر اس عظیم اور قابلِ تعظیم ہستی کی نذر کرتا ہے جس سے
عقیدت ہوتی ہے۔

جناب ساحر ہوشیارپوری نے بھی اسی جذبے کے
ت وطن دشمنوں کے سفاکانہ فعل سے دل گرفتہ ہو کر
ب رہنمائے ملت شریمتی اندرا گاندھی کی شہادت پر
کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے اشعار عقیدت کے طور پر
ش کئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس المناک تاریخی سانحہ
بارگاہ میں یہ گلہائے عقیدت صدیوں تک شگفتہ اور
بہار رہیں گے۔

م پرکاش راحت (فرید آباد)

جناب ساحر ہوشیارپوری کی نظم "امر شہید" پڑھ کر
محسوس ہوا کہ ابھی کچھ اہلِ قلم باقی ہیں۔ جو حق بات
کی جرأت رکھتے ہیں۔ قاتلوں کے ناموں کو جس خوبی
معنوی طور پر انھوں نے استعمال کیا ہے۔ یہ انھی کا
حصہ ہے۔

او۔ پی۔ منگال (لدھیانہ)

سابق وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی سے متعلق آپ
نظم پمفلٹ کی صورت میں نظر نواز ہوئی نظم اور فولڈر
دونوں نہایت شاندار ہیں۔ اس ناقابلِ تلافی نقصان
آپ نے جس انداز سے نظم کو پیش کیا ہے اس سے
آپ کے شدید رنج و غم کا احساس ہوتا ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

او پی۔ او بیری (مدراس)

آپ کا فرستادہ فولڈر موصول ہوا۔ جسے دیکھ کر
گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ تمام افرادِ خانہ کو نظم پڑھ کر
سنائی اس وقت میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے
کارڈ اور نظم دونوں کی حلقۂ احباب نے بھی بہت تعریف
کی۔ آپ مزید کرم کر کے کچھ فولڈرس اور بھجوا دیں
تاکہ میں انھیں یہاں کی چند اہم شخصیتوں اور دوستوں
میں تقسیم کر سکوں۔

(انگریزی سے ترجمہ)

پی۔ ایم۔ اگروال (دلی)

اندرا گاندھی سے متعلق آپ کی نظم بعنوان 'امر
شہید' کا فولڈر موصول ہوا۔ نظم کیا ہے سفاکانہ مزاج
رکھنے والے اندرا گاندھی کے محافظوں کی منہ بولتی تصویر
ہے۔ جنھیں مرحومہ اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتی تھیں۔
کامل یقین ہے کہ یہ نظم اردو اور ہندی کے معروف اخبارات
و رسائل میں نمایاں طور پر شائع ہو گی۔ بہرکیف ایسی عمدہ
نظم پیش کرنے کے لئے مبارکباد قبول فرمائیں۔

(انگریزی سے ترجمہ)

اوم پرکاش ورما (نئی دلی)

آپ کی نظم بعنوان 'امر شہید' کا فولڈر ملا، شکریہ،
نظم واقعی بڑی ہی دلدوز اور اعلیٰ درجے کی ہے۔ میرے
کئی دوستوں نے اس کی بڑی سراہنا کی آپ اس کے لئے
مبارکباد کے مستحق ہیں۔

(ہندی سے ترجمہ)

بیگم توقیر نیازی (امرتسر)

آنجہانی مسز گاندھی کی موت پر جو چند اشعار آپ
نے کہے ہیں واقعی پڑھ کر دل پر گہرا اثر ہوتا ہے اس
حادثہ کی سنگینی کو بڑی خوبی سے آپ نے اپنے شعروں
میں ڈھال لیا ہے۔

"ایکلا
چلو رے"
صحیح راستہ پر
آپ کا عزم صمیم کے ساتھ
اکیلے ہی گامزن رہنا
آپ کا حوصلہ اور آپ کی رہنمائی
محروم اور مایوس لوگوں کے لئے
آپ کی فکرمندی
ہندوستان اور ہندوستانیوں
کے لئے آپ کی محبت
ہر رنگ کے بنی نوع انسان کے لئے
آپ کی جدوجہد
اسے ہم آج اور ہر وقت
یاد کرتے ہیں۔
ہم جانتے ہیں کہ آپ کو
یاد رکھنے کا صحیح طریقہ ہے
اپنے اتحاد کو قائم رکھنا
آپ کی شان کے شایان یادگار ہے
امن و آشتی بنائے رکھنا
davp 85/399

کیا آپ گلے کی تکلیفوں میں اکثر مبتلا رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے سخت پریشان ہیں، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ایسی پریشان کن بیماری
سے گلا کاٹ دینے سے ہی چھٹکارا مل سکتا ہے۔ ذرا ٹھہریئے! خالص دیسی ادویات سے تیار کیا ہوا "ٹونسلیکس" ایک بار
صرف ایک بار استعمال کر کے تو دیکھئے، پھر آپ کو گلے کے غدود بڑھ جانے، گلے کی سرسراہٹ، خراش، گلے کے ورم، زخم اور
دوسرے تمام امراض کی شکایت نہیں رہے گی۔ اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا مریض ہو، جس کے گلے کے غدود (ٹانسلائٹس) کا
آپریشن ہونا ہے تو اُسے اس دوا کے بارے میں ضرور بتایئے کیونکہ پھر اُسے آپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چھوٹے بچے
جو کھٹی میٹھی چیزیں کھا کر گلا خراب کر لیتے ہیں، اُن کے لئے بھی یہ بہت کام کی دوا ہے۔ گھر میں اس کا رہنا بہت ہی ضروری ہے۔

—— شرع (یونانی اینڈ آیوروید ک) لیبارٹریز، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

OCTOBER 1985
خرید کر پڑھئے :
مانگ کر پڑھئے :
یا پھر
چوری کر کے پڑھئے
یہ ہے ہی اتنا خوب صورت،
اتنا دل کش،
اتنا مکمّل کہ اسے کسی طرح بھی
حاصل کریں کیوں کہ
یہ فیض کی شخصیت اور فن پر ایک
شان دار ادبی دستاویز ہے۔ اِس میں شامل ہیں:
★ خلوت اور جلوت کے بھید کھولنے والے ذاتی نقوش۔
★ نادر و نایاب تصویریں۔
★ سدا بہار، ہزار رنگ و منتخب کلام۔
★ فیض کی شخصیت کے وہ ڈھکے چھپے گوشے جن پر سے پہلی بار پردہ اُٹھایا گیا ہے۔
★ ہندوستان، پاکستان، رُوس اور انگلستان کے دانش وروں کی مشترکہ کاوشوں کا گلدستہ۔
قیمت : پندرہ روپے
ساری اُردو دنیا میں شبستان کے "فیض نمبر" کا چرچا ہے
اس سے پہلے کہ اسٹاک ختم ہو جائے آج ہی اپنے قریبی نیوز ایجنٹ سے طلب کیجئے یا براہِ راست ہم سے منگوائیے۔
شبستان اُردو ڈائجسٹ، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

Dr. Zakir Husain Library
Jamia Nagar
J. M. I New Delhi
جلد ــــ ۱۱ء
شمارہ ــــ ۱۱
نومبر ۸۵ء

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ | رجسٹرار آف نیوز پیپر انڈیا محکمہ رجسٹریشن نمبر ۶۲/۲/۵۰ | رجسٹرڈ نمبر دہلی ڈویژن ۲۵۲۱

ہندو پرست ہوں نہ مسلمان پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرہ وطن سے ہے فیاضؔ مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انسان پرست ہوں
فیاضؔ گوالیاری

ماہنامہ

شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر سرور تونسوی

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے
زرسالانہ ۲۴/- روپے

جلد ۴۶ | نومبر ۱۹۸۵ء | شمارہ ۱۱

ضروری اعلان

پچھلے دنوں دفتر شانِ ہند کی ایک چھت گر جانے کے باعث نیز دیمک کی وجہ سے کئی ہزار روپیہ کی کتابوں کا اسٹاک اور دفتر کا ریکارڈ تہس نہس ہو گیا۔

اب دو ماہ سے مکان کی مرمت وغیرہ مکمل ہو چکی ہے اور دفتری کام باقاعدگی سے ہو رہا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں حسبِ ذیل معروضات پر دھیان دیا جائے۔

۱۔ اگر کسی مصنف یا ایجنٹ سیلر کا فروختگی کتب کے سلسلے میں کوئی بل ہمارے ذمہ واجب الادا ہو۔ تو براہ کرم تفصیل سے آگاہ فرمائیے تاکہ ایسے بلوں کی ادائیگی فی الفور ہو سکے۔

۲۔ اس کے علاوہ اگر کسی بھی صاحب کی کوئی رقم ہمارے ذمہ واجب الادا ہو تو براہ کرم تفصیلی طور پر تحریر فرمایا جائے تاکہ جائز مطالبات کی ادائیگی کی جا سکے۔

۳۔ جن حضرات کو خطوط کے جوابات موصول نہ ہوئے ہوں وہ بھی دوبارہ یاد فرمائیں تو کرم ہوگا۔ فقط

نیاز مند — سرور تونسوی ایڈیٹر و مالک ماہنامہ شانِ ہند نئی دہلی ۲-۱۱

وِدیا پرکاش سرور تونسوی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے خواجہ پریس چتلی قبر منگلو جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲-۱۱ سے شائع کیا۔

امر شہید

شانِ ہند کے سابقہ شمارے میں جناب ساحر ہوشیار پوری کی مشہور نظم "امر شہید" کی اشاعت پریس میں کاتبوں کی گڑبڑ کے باعث عمل میں نہ آسکی۔ جس کی وجہ سے قارئینِ شانِ ہند کو شکایت کا موقع ملا۔ جس کے لیے ہم معافی خواہ ہیں۔
ذیل میں جناب ساحر ہوشیار پوری کی یہ امر نظم "امر شہید" شائع کی جا رہی ہے۔ (ادارہ)

ایک رانی کے دو محافظ تھے
ایک "بے انت" بے وفائی میں
ایک "ست ونت" بے حیائی میں

دیش کے داغ، قوم کے غدار
بدنظر، بدلحاظ، بد اطوار

بدرگ و بدقوم، وطن دشمن
بدسرشتی میں زاغ اور زغن

غیر سے نامہ و پیام کیے
زر کے بدلے ضمیر بیچ دیے

کام دونوں نے لا مثال کیا
خوب حقِ نمک حلال کیا

اپنی رانی کو مار دی گولی
دھوم سے کھیلی خون کی ہولی

ان کے دشمنوں کی عید ہوئی
اور اماں امر شہید ہوئی

[illegible]

بُلبُل چہ گفت؟ گُل چہ شُنید؟ و صبا چہ کرد؟

دلّی کے لفٹیننٹ گورنر کے نام کھلا خط

محترم المقام جناب کپور صاحب ـ خوش آمدید

فارسی زبان میں ایک کہاوت ہے کہ ہر کہ آمد عمارت
لخت (یعنی جو بھی آتا ہے وہ نئی عمارت بناتا ہے)
کہاوت کے مطابق آپ نے بھی دلّی کے لفٹیننٹ گورنر کا
د سنبھالتے ہی جو وعدے فرمائے ہیں آپ کے پیشرو
ب ایم ـ ایم ـ کے ولی صاحب نے بھی یہی وعدے
ے تھے اور اُن سے پہلے جناب جگموہن صاحب نے
بھی کچھ فرمایا تھا۔
) رشوت ستانی ختم کی جائے گی ـ (۲) عوام کو انصاف
دان کی زندگی سنیز مال و متاع کو تحفظ ملے گا ـ (۳) غنڈہ
دی ختم کی جائے گی (۴) پولیس عوام کے تئیں اپنے
لض کو ایمانداری سے نبھائے گی ـ وغیرہ وغیرہ ـ مگر
ور والا اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ
لرے وہی پورے کر سکتا ہے جو نہ تو خوشامد پسند ہو اور
ہی کسی خوشامدی کو اپنے پاس پھٹکنے دے ـ اور دوسرے
کہ وہ کسی سیاسی دباؤ کے تحت نہ ہو ـ اور تیسرے
کہ وہ خود ایمانداری ، دیانت داری اور حق و انصاف
اوالہ و شیدا اور اعلیٰ منتظم ہو اور اپنے کسی بھی ماتحت
قصوروار پائے تو قرار واقعی سزا دے ـ اور سب
روری یہ کہ فریادی اُس تک بلا جھجک اس یقین کے
ساتھ پہنچ سکے کہ اس کی بات سُنی جائے گی اور اُسے
انصاف ملے گا ـ

آئیے اس ضمن میں کچھ حقائق بھی سُن لیجئے ـ
جناب جگموہن صاحب کی گورنری کے دورِ اول میں

ایک اخبار نویس خوشامد کے اس بُلند [illegible]
کہ جگموہن صاحب کے سوا انھیں دلّی میں کوئی [illegible] نہیں آتا
تھا ـ کرنا خدا کا کہ جناب جگموہن صاحب کو ہٹا کر لفٹیننٹ
گورنر مقرر کر دیا گیا تو ان کے تشریف لے جانے کے بعد اسی
اخبار نویس نے لکھا کہ جگموہن کا مزاج بگڑ گیا تھا اچھا ہوا
کہ اندرا گاندھی صاحبہ نے انھیں دلّی سے رخصت کر دیا
اور نئے لفٹیننٹ گورنر صاحب کی تعریف کے پُل باندھنے
شروع کر دئیے ـ حالات نے پھر پلٹا کھایا اور جناب جگموہن
صاحب پھر دلّی کے لفٹیننٹ گورنر ہو کر آ گئے تو اس اخبار
نویس نے جگموہن صاحب کی تعریف میں وہ وہ قصیدے
لکھے کہ شعرائے متقدمین نے بھی اپنے بادشاہوں کی شان
میں کیا لکھے ہوں گے ـ یہ تو تھا خوشامد اور خوشامد پسندی کا
ایک نمونہ ـ سیاسی دباؤ عوام کو نظر نہیں آتا مگر جب وہ
کارفرما ہوتا ہے تو عوام اسے محسوس ضرور کرتے ہیں مگر ان
بیچاروں کے بس کی بات نہیں ہوتی کہ وہ اس ضمن میں کچھ
کہہ سکیں ـ

سب سے ضروری بات یہ کہ فریادی کی فریاد سُنی جائے
اور فریادی بلا جھجک اور بغیر کسی رکاوٹ کے انصاف کرنے
والے کے سامنے جا سکے ـ اس ضمن میں ایک ذاتی واقعہ سُنیئے ـ

ہم جناب جگموہن سابق ایل ـ جی دلّی کی خدمت میں
کچھ ایسے سچے واقعات رکھنا چاہتے تھے جن میں کچھ لوگوں
کی حق تلفی ہوئی تھی اور کچھ کے ساتھ سرکاری کارندوں نے
ظالمانہ سلوک کیا تھا ـ لہٰذا انھیں رجسٹرڈ خط لکھا گیا کہ کچھ
سچے واقعات آپ کے ماتحت سرکاری کارندوں کی کارگزاری

سکے آپ کے گوش گذار کرتے ہیں ملاقات کا وقت دیجئے مگر ان کے پاس سچی باتیں سننے کا وقت ہی نہ تھا۔ اسی طرح جناب ایم۔ ایم۔ کھولی صاحب سابق ایل جی کی خدمت میں ایک سرکاری ادارے کی فضول خرچیوں اور من مانیوں کے بارے میں وضاحت گوش گزار کرنے کے لئے بذریعہ رجسٹرڈ خط وقت مانگا گیا مگر جواب ندارد۔

اب آپ ہی غور فرمائیے جب لفٹیننٹ گورنر تک اپنے کسی ماتحت افسر یا محکمے کے بارے میں سچے واقعات تک سننے کو تیار نہیں تو وہ رشوت ستانی کیسے ختم کر سکتا ہے۔ وہ ظالم اور بد قماش ملازمین سرکار کی کارستانیوں کے خلاف کیا قدم اٹھا سکے گا۔

اگر کوئی خوشامدی اور چاپلوس شخص ان سابقہ گورنر صاحبان کو یہ کہ آپ تو دھرم راج ہیں ہے دلی کی ساری خلقت آپ کی تعریف کر رہی ہے اور ہمیں ایک وفد وزیر اعظم صاحب کے ہاں لے جانا چاہتا ہوں جو وزیر اعظم صاحب سے کہے گا کہ ہمارے گورنر تو ایسے ہیں کہ شاید دنیا میں ایسا کوئی گورنر ہی نہیں تو یہ ایل۔ جی صاحبان فوراً انھیں شرف ملاقات بخشتے اور ہر طرح کی مدد بھی فرماتے

مندرجہ بالا واقعات لکھنے سے نہ تو کسی سابقہ ایل۔ جی صاحب کی توہین کرنا ہے اور نہ ہی یہ مقصد ہے کہ وہ نا اہل تھے۔ بلکہ صرف اور صرف یہ کہنا ہے کہ جو لوگ واقعی عوام کی بھلائی کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں یا کم از کم ایسی توقع رکھتے ہیں انھیں محض اس لئے درگزر کیا جاتا ہے کہ وہ خوشامد کا ڈھنگ نہیں جانتے۔

آپ ایک فوجی ہیں۔ اور ایک کامیاب فوجی کے بارے میں جو کچھ کتابوں میں پڑھا ہے وہ یہ ہے کہ ۱۔ فوجی خوشامد پسند نہیں ہوتا اور نہ وہ خوشامدیوں کو اپنا مشیر بناتا ہے۔ ۲۔ ڈسپلن ہر فوجی کا پہلا اور آخری کرتویہ ہے۔

۳۔ ہر فوجی وطن پرست ہوتا ہے اگر وہ وطن پرست نہ ہو تو وہ فوج میں بھرتی ہی کیوں؟ اور فوج میں بھرتی ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ اپنے وطن پر قربان ہو جانے سے گریز نہیں کر سکتا۔

اور جس شخص میں یہ خوبیاں ہوں وہ اپنے عوام کو منانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ آپ ایک فوجی ہیں اور فوج کے ایک اعلیٰ عہدہ سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ اس لئے آپ نے تو مندرجہ ذیل بالا صفات اپنے ماتحت فوجیوں میں پیدا کرنے کی اور رکھنے کی کوشش کی ہو گی۔ لہٰذا آپ پر اہل دلی کو کافی حد تک اطمینان ہے کہ آپ ان کے دکھ درد کو سمجھیں گے۔ جن کا ثبوت بھی آپ نے چند دنوں میں ہی دے دیا ہے۔ ڈی۔ ڈی۔ اے اب جو مکانات بنوا رہی ہے ان کی بنیاد کافی گہری ہے جیسا کہ جنتا کوارٹرز جھگی جھونپڑی میں بن رہے ہیں۔ اگر آپ نے ڈی ڈی اے کی رشوت ستانی کسی حد تک بھی روک دی تو یہ سمجھئے کہ دلی کی آدھی بد عتیں ختم ہو جائیں گی۔ آپ کی اسی ڈی ڈی اے نے جناب مشتاق عراقی صاحب دہرن (سعودی عرب) کے ساتھ جو نامناسب سلوک روا رکھ چھوڑا ہے اس کی تفصیل بہت جلد آپ کی خدمت میں بھجوائی جا رہی ہے۔

ہم کو بھروسہ ہے آپ کی توجہ ایسے واقعات کی جانب مبذول کرائے رہیں گے جن میں ناانصافی ہوا ہی ہو گی۔

آپ کا احسان ہوگا اگر آپ اپنے پرنسپل افیسر صاحب سے ہمارا وہ رجسٹرڈ خط تلاش کرا کے ملاحظہ فرمائیں جو جناب ایم۔ ایم کے ولی صاحب کی خدمت میں بھجوایا گیا تھا دباقی پھر)

دلی اردو اکاڈمی اور خوشتر گرامی

دلی اردو اکاڈمی ہر سال ایک ایوارڈ کسی ایسے صحافی کو دیتی ہے جس نے اردو صحافت کی قابل قدر خدمت کی ہو۔ اس سلسلے میں اب تک جناب ناز انصاری جناب دھرم پال گپتا وفا اور جناب مفتی شوکت علی فہمی کی قدر افزائی کی جا چکی ہے۔ بیسویں صدی جب تک خوشتر

...ی صاحب کی دیکھ ریکھ میں رسالہ ہند ... ان کا
...ب معیاری اُردو ماہنامہ رہا۔ اور اُردو ادب کی
...دمت نصف صدی تک کرنے کی اُسے کوئی بھی اُردو داں
...موش نہیں کر سکتا۔

خوشتر گرامی گذشتہ چار سالوں سے تشویشناک حد تک
...ل ہیں۔ محترم المقام اعلیٰ جناب گیانی ذیل سنگھ صاحب صدر
...ہند گذشتہ سال جب ممبئی تشریف لے گئے تھے
... آپ کی مزاج پرسی کے لئے ان کی رہائش گاہ پر بھی تشریف لے گئے تھے
...راشٹرپتی صاحب نے وعدہ فرمایا تھا کہ خوشتر صاحب کا علاج
...معالجہ حکومت کی طرف سے ہوگا۔ مگر نہ معلوم کیا وجہ ہوئی کہ
...راشٹرپتی صاحب کے احکام کی تعمیل ابھی تک نہ تو حکومت
...ہند کی طرف سے ہوئی اور نہ ہی حکومت مہاراشٹر کی طرف سے۔

اس وقت حالت یہ ہے کہ خوشتر گرامی اپنے علاج
معالجہ کے لئے قیمتی ادویات بھی نہیں خرید سکتے۔ چنانچہ پچھلے
...نوں ہم نے دلی اُردو اکادمی کی ایوارڈ کمیٹی کے سرکردہ
...ممبران کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تھی کہ دلی اُردو اکادمی
...اپنے فرض کا احساس کرے اور اس مشکل وقت میں
...اُردو صحافت کا ایوارڈ خوشتر گرامی صاحب کو دیا جائے۔ مگر
...ہمیں یہ بتایا گیا کہ چونکہ خوشتر گرامی صاحب مالدار ہیں اس
لئے اُنھیں انعام کی کیا ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ
دلیل کچھ وزن نہیں رکھتی۔ ایوارڈ خدمات کی بنا پر دیا
جاتا ہے۔ حال ہی میں غالب انسٹی ٹیوٹ نے صحافت کا
ایوارڈ عزیز محترم جناب یونس دہلوی مدیر شمع، کو دیا
ہے۔ اگر غالب انسٹی ٹیوٹ والے بھی یہی نظریہ رکھتے تو پھر
یونس دہلوی صاحب شاید اس کے حقدار نہ ٹھہرائے
جاتے کیونکہ وہ بفضل خدا خوشتر صاحب سے کہیں زیادہ
مالدار ہیں۔ مگر غالب انسٹی ٹیوٹ کی انعامی کمیٹی نے
یونس صاحب کی خدمات کو ملحوظ نظر رکھا۔ اسی طرح
ہم چاہتے ہیں کہ دلی اُردو اکادمی بھی ایوارڈ دیتے
وقت خدمات کو پیش نظر رکھے۔ کسی کی اچھی مالی حالت
اس انتخاب میں رکاوٹ نہیں ہونی چاہیئے۔ اور پھر اس
وقت تو خوشتر گرامی صاحب کی مالی حالت اچھی ہے بھی نہیں۔

ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ دلی اُردو اکادمی کی ایوارڈ کمیٹی کے
اکثر و بیشتر فیصلے جناب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور جناب گلزار
دہلوی ہی فرماتے ہیں اور گلزار دہلوی صاحب کسی وجہ سے
خوشتر گرامی سے ناخوش ہیں اس لئے وہ کسی طور بھی خوشتر
گرامی صاحب کو یہ ایوارڈ دینا منظور نہیں کریں گے۔

اگر کسی وجہ سے گلزار دہلوی صاحب خوشتر گرامی صاحب
سے ناخوش ہیں تو حق و انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ گلزار دہلوی
صاحب کو اپنی ذاتی رنجش دلی اُردو اکادمی کے معاملات
میں نہیں لانی چاہیئے اور پھر ایسی حالت میں تو یہ اور بھی ضروری
ہے کہ گلزار دہلوی صاحب ایک جج کی حیثیت سے ایوارڈز
کا فیصلہ کرنے والے ایک ممبر ہیں۔ اور جب کوئی فیصلہ بہ
حیثیت جج کیا جاتا ہے تو اس میں ذاتی رنجش کو بروئے
کار لانا انتہائی گناہ ہے اور اللہ اس گناہ کو کبھی معاف
نہیں کرتا۔ اسی لئے ہماری مودبانہ گذارش ہے کہ اب
اُردو اکادمی دلی کے پاس اتنا روپیہ وافر ہے کہ وہ اسے
ٹھکانے لگانے کے ذرائع سوچ رہی ہے کیا یہ ممکن
نہیں ہے کہ تیس لاکھ کی گرانقدر رقم سے دس پانچ ہزار
روپیہ خوشتر گرامی صاحب کی ادبی خدمات کو سراہنے کے
لئے اُنھیں سپیشل ایوارڈ دیا جا سکے۔؟

ہم جائز طور پر یہ اُمید رکھتے ہیں کہ اُردو اکادمی دلی
کی ایوارڈ کمیٹی اپنے فرض کا احساس کرے گی اور ایک
ایسے شخص کی عزت افزائی کرے گی۔ جنہوں نے فی الحقیقت
اُردو کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔

مشاعرۂ جشن جمہوریت ۱۹۸۶ء اور دلی اُردو اکادمی

۱۹۸۵ء کا مشاعرۂ جشن جمہوریت جس قدر ناکام
ہوا تھا اُس کی مثال دلی کی تاریخ میں نہیں ملتی اور اسی
کے بعد جشن آزادی ۱۹۸۵ء کا مشاعرہ بھی قطعاً ناکام
رہا تھا۔ اور یہ حقیقت بلا امتیاز دلی اُردو اکادمی کے

به کوئے یار به انداز محرمانه گذر

سرور تونسوی

مرحوم حافظ محمد یوسف صاحب دہلوی کا یہ معمول
تھا کہ ہر اتوار کو وہ صبح پیا ملک حبش خاں تشریف لے
جاتے۔ وہاں حکیم صاحب کی دوکان پر چند منٹ ضرور بیٹھتے
پھر لالہ منوہر لال کی دوکان پر چند منٹ بیٹھتے حالانکہ لالہ منوہر
لال نے حافظ صاحب کو کافی مالی نقصان پہنچایا مگر حافظ
صاحب نے اپنی روایت میں فرق نہیں آنے دیا۔ اس کے
بعد شیخ لیبارٹریز تشریف لاتے۔ دواخانہ کا ایک چکر لگاتے
دواخانہ کے تمام ملازمین کو پتہ ہوتا تھا کہ حافظ صاحب تشریف
لائیں گے لہٰذا ہر شخص چاق و چوبند اور اپنے کام میں مگن
ہوتا۔ حافظ صاحب ہر ایک پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے
سپلائی ڈیپارٹمنٹ میں آتے۔ جن آرڈرز کی تعمیل ہو رہی
ہوتی اُن پر ایک نظر ڈالتے اور حکیم ثنا صاحب کے پاس چند
منٹ بیٹھنے کے بعد جامع مسجد پر موٹر پارٹس کی ایک دوکان
پر چند منٹ بیٹھتے۔ یہاں ان کے چند مداح پہلے سے ہی جمع رہتے
تھے۔ کچھ منٹ گپ شپ کے بعد جامع مسجد کے اردگرد بیٹھے فقیروں
کو پیسے بانٹتے اور کار میں بیٹھ کر دریا گنج میں میرے غریب
خانہ پر تشریف لاتے یا پھر کوٹھی پر تشریف لے جاتے۔
اگر ان کی مرضی ہوتی تو میرے غریب خانہ پر چند منٹ تشریف
رکھتے اور کیمپا اور رُخ پی کر تشریف لے جاتے۔ ورنہ
گاڑی میں ہی بیٹھے رہتے اور میں کیمپا اور رُخ کی بوتل
وہیں پیش کرتا اور وہ اسے پی کر تشریف لے جاتے۔ حافظ
صاحب کو کولڈ ڈرنکس میں کیمپا اور رُخ زیادہ اچھا لگتا تھا۔
میرے غریب خانہ کے سامنے دریا گنج سناتن دھرم کا
رام [illegible]ی کے اکثر و بیشتر مندروں میں نمایاں حیثیت
رکھتا ہے۔ مندر کی طرف سے ہر روز ساڑھے گیارہ بجے
بلا تفریق مذہب و ملت لنگر بٹتا ہے۔ جس کا جی چاہے کھانا
کھا سکتا ہے۔ ایک اتوار کو حافظ صاحب مجھے میرے
غریب خانہ پر چھوڑتے ہوئے اپنی رہائش گاہ پر جا رہے تھے
کہ مندر کے برآمدے میں متعدد مفلوک الحال لوگوں میں لنگر تقسیم
ہوتے ہوئے دیکھ کر گاڑی ایک کنارے رکوا کر مجھے ڈرائیور کو
مجھے بلانے کے لئے بھیجا۔ میں فوراً حاضر ہوا تو فرمانے لگے
سرور صاحب یہ جو لنگر تقسیم ہو رہا ہے اس کے بارے میں مندر
کے منتظمان سے مفصل دریافت کر کے مجھے بتائیے۔ اگلے
روز میں نے حافظ صاحب کو اس سلسلے میں تفصیل بتا دی
تو فرمانے لگے یوں کیجئے کہ ہر جمعرات کو مندر کے لنگر کے
اخراجات میں ادا کیا کروں گا اور ایک مہینے کی چار جمعرات کے
روپے مجھے دے دیجئے۔
میرا معمول تھا کہ ہر روز شام کو ساڑھے پانچ بجے تک
دفتر شمع پہنچ جاتا۔ اور منوہر لال اور جناب ماہر نقوی بھی
تشریف لے آتے۔ مسٹر ترلوک ناتھ ہفتہ میں ایک دو بار
تشریف لاتے۔ اور یہ محفل رات کے سات ساڑھے سات
بجے تک چلتی۔ اس کے بعد حافظ صاحب ماہر نقوی صاحب کو ڈیلائٹ
سنیما کے قریب اور مجھے دریا گنج میرے غریب خانہ تک پہنچانے
کے بعد اپنے دولت خانہ پر تشریف لے جاتے۔ مندر کے
لنگر خانے کے لئے حافظ صاحب کے دئیے ہوئے روپے
میرے پاس تھے لہٰذا میں نے راستے میں کار میں ہی حافظ
صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے عرض کیا کہ حافظ صاحب
آپ مسلمان ہیں اور مندر کے لنگر خانے کے لئے روپے دے
رہے ہیں کیا اس سے آپ کے ہم مذہب اعتراض نہیں کریں
گے؟ فرمانے لگے اول تو یہ بات کسی سے کہنے کی ہے ہی
نہیں اور اگر انہیں پتہ چل بھی جائے تو کوئی سچا مسلمان جو
خدا پر اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے اس پر اعتراض

نہیں کریگا۔ کیونکہ ہمارے خدا کا حکم ہے کہ بھوکوں کو کھلاؤ یہ
نہیں کہ مسلمانوں کو کھلاؤ لہٰذا آپ کے ہاں مندر میں بھوکوں
کو کھلایا جاتا ہے اس لئے میرا یہ اقدام کسی طور بھی قابلِ اعتراض
نہیں ہو سکتا۔

میں نے مندر کے منتری جی کو حافظ صاحب کے دیئے ہوئے
روپے دیئے اور ساتھ ہی حافظ صاحب کا بتایا ہوا یہ جملہ بھی دہرایا
کہ ہمارے خدا کا یہ حکم ہے کہ بھوکوں کو کھلاؤ نہ کہ مسلمانوں کو
کھلاؤ۔ منتری جی اُچھل پڑے اور دوسرے ہی دن صبح کے
کیرتن میں اُنھوں نے حافظ صاحب کے اس اقدام کی تعریف
کرتے ہوئے تمام حاضرین سے التجا کی کہ وہ حافظ صاحب کے
اس طرزِ عمل پر چلیں اور بغیر یہ سوچے کہ بھوکا ہندو ہے یا مسلمان
اُسے کھانا کھلائیں۔ چنانچہ حافظ صاحب کے اس اقدام کا نتیجہ
یہ ہوا کہ مندر میں آنے والے سینکڑوں ہندو اب محض براہمنوں
کی تلاش میں مارے مارے نہیں پھرتے کہ اُنھیں کھانا کھلائیں
بلکہ جو بھی بھوکا اُنھیں نظر آتا ہے اُسے کھانا کھلاتے ہیں
اور تیوہاروں کے دنوں میں بھی پیٹ بھرے براہمنوں کی جگہ
ضرورت مند بھوکوں کو بلا تمیز مذہب و ملت کھانا کھلایا جاتا ہے
میں تو خیر کئی باتوں میں حافظ صاحب کو اپنا گورو تسلیم کرتا ہوں مگر
میرا نواسہ جو حافظ صاحب سے بہت مانوس ہے اور اب بھی اُن
کی تصویر جہاں کہیں دیکھتا ہے تو آبدیدہ ہو جاتا ہے۔ درگاہ حضرت
بختیار کاکی کے لنگر میں حسبِ توفیق ہر ماہ نذرانہ پیش کرتا مگر یہ
سلسلہ اب منقطع ہو گیا ہے کیونکہ حافظ صاحب کے ساتھ میں
اور میرا نواسہ ہر جمعرات کو حضرت نظام الدین اولیاؒ۔ حضرت
امیر خسروؒ۔ حضرت بختیار کاکیؒ۔ حضرت شاہ فرہادؒ محمد اور کئی
مزارات پر فاتحہ کے لئے جایا کرتے تھے۔ حافظ صاحب کی علالت
کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

کچھ دنوں بعد حافظ صاحب نے ہر جمعرات کے علاوہ ہر جمعہ کے روز کی
مندر کے لنگر کے اخراجات اپنے ذمہ لے لئے اور یہ سلسلہ کئی سال چلتا رہا
اُن کی علالت کے زمانے میں بھی اور اب اُن کے انتقالِ پُر ملال کے بعد
یہ سلسلہ اُن کے فرزندان ارجمند جاری رکھے ہوئے ہیں۔

چونکہ مندر کے منتری اکثر اپنی تقریر میں حافظ صاحب کی تعریف
کرتے لہٰذا مندر کی مینجنگ کمیٹی کے ممبران اور مندر میں حاضری دینے والے
اکثر حضرات نے منتری جی کی معرفت اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا
پہنچایا کہ وہ حافظ صاحب کو دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ کون سا مسلمان ہے
جو اس فرقہ پرستی کے زمانے میں مندر کے لنگر خانے میں ہر ماہ ایک معقول رقم
دان دیتا ہے۔ چنانچہ مندر کے منتری اور مینیجنگ کمیٹی کے چار ممبران
میرے ہمراہ حافظ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُن سے جنم
اشٹمی کے روز مندر میں آنے کا نمنترن دیا۔ جسے حافظ صاحب نے بخوشی
منظور کرتے ہوئے مجھے ہدایت کی کہ میں اُنھیں اُس روز مندر لے چلوں

جنم اشٹمی کے روز وقت مقررہ پر حافظ صاحب میرے ہمراہ
مندر میں آئے۔ سینکڑوں ہندو حضرات اور میں خود ننگے سر تھے مگر
حافظ صاحب نے سر پر ٹوپی رکھ لی۔ مندر کے منتظمان نے حافظ صاحب
کی اس طرح عزت افزائی کی جیسے کوئی اُن کا مذہبی دیوتا مندر
میں آیا ہو۔ ایک پنڈت جی تقریر کر رہے تھے تو حافظ صاحب فرمانے لگے
کہ حضرات ہمارے قرآن میں یہ آیت ہے جس کا مطلب بالکل وہی ہے
جو پنڈت جی ابھی کہہ رہے تھے۔ حاضرین نے حافظ صاحب کی بات سُن
کر پُرزور تالیوں سے اظہارِ پسندیدگی کیا۔ حافظ صاحب کو پھولوں سے
لاد دیا گیا۔ اور مندر میں موجود ہر شخص حافظ صاحب کی فراخدلی پر اظہارِ
خوشنودی کر رہا تھا۔ اُنھوں نے مندر کے لنگر خانے کو ہر ماہ مالی مدد دے
کر عملی طور پر ثبوت دیا ہے کہ ہمارے خدا کا یہ حکم ہے کہ بھوکے کو کھلاؤ
نہ کہ مسلمان کو کھلاؤ۔ اس مندر کی طرف سے ماہ اکتوبر میں ایک
خاص دن عام لنگر ہوتا ہے جس کا انتظام مندر کے قریب ہندی
پارک میں شامیانے لگا کر اور ہزاروں آدمیوں کے بیٹھنے کا فرشی
انتظام کیا جاتا ہے۔ کم و بیش کئی ہزار افراد بغیر امتیاز مذہب و
ملت اور بلا تمیز امیر و غریب صفوں میں بیٹھ کر پتلوں پر کھانا کھاتے
ہیں۔ اور اس تقریب میں پرشاد (کھانا) حاصل کرنا فال
سمجھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کئی ہزار اشخاص کے لئے پیٹ بھر کھانا
جس میں کھیر یا حلوہ۔ پوری، کچوری، دو سبزیاں ہوں اس کے لئے کافی
اخراجات کا متحمل ہونا پڑتا ہے اور یہ اخراجات عوامی عطیات ہی سے پورے
ہوتے ہیں۔ حافظ صاحب نے اپنی علالت سے پہلے تک ہر سال اس
مجلسی تقریب کے لئے معقول رقم عطیہ میں دی اور وہ ہر سال جنم
اشٹمی کے موقع پر بھی لنگر کے لئے تین صد روپے بھجوایا کرتے تھے۔ مندر
کی ایگزیکٹو کمیٹی ہر سال آمدنی و اخراجات کی رپورٹ شائع کرتی ہے اس
فہرست میں حافظ صاحب کا نام جگہ جگہ نظر آتا تھا۔ باقی [illegible]

خوشۂ عقیدت صدیقی

آل انڈیا مسالمہ کامٹی

خلیل انجم

ہر سال کی طرح اس سال بھی کامٹی میں الحاج صوفی عبدالحکیمؒ کے ۶۹ویں عرس مبارک کے موقع پر نیز شہدائے کربلا بالخصوص حضرت امام حسینؓ عالی مقام کی شہادت عظمیٰ کی یاد میں ایک غیر طرحی کل ہند مسالمہ آج ۲۳ر محرم الحرام ۱۴۰۶ھ بمطابق ۹ر اکتوبر ۱۹۸۵ء بعد نماز عشاء منعقد ہوا۔ آستانۂ صوفی میں آراستہ کئے گئے خوبصورت پنڈال میں اسٹیج کو سجا کر دولہن بنا دیا گیا ہے۔ سامعین کرام و نیز عقیدت مند حضرات کثیر تعداد میں یہاں جمع ہیں اور مسالمہ کی کارروائی کے بے تابی سے منتظر ہیں۔ مسالمہ کی صدارت جناب جوگا سنگھ انور صاحب فرما رہے ہیں۔ میں نے اُن سے درخواست کی ہے کہ وہ مسندِ صدارت پر رونق افروز ہو کر ممنون فرمائیں کامٹی کے نوجوان شاعر عبدالباری عارف نے تائید فرمائی ہے اور صدر محترم کے ساتھ ساتھ بیرونی و چند مقامی شعرائے کرام بھی اسٹیج پر تشریف لاتے ہیں۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بج چکے ہیں اور مجمع اپنے شعرائے کرام کے کلام سے مستفیض ہونے کے لئے بے تاب ہے۔ مسالمہ کے کنوینر استادِ محترم شاطر حکیمی صاحب کی ذاتِ گرامی کا یہ اثر ہے کہ آج بھی چند نامور بیرونی شعرائے کرام اسٹیج کی زینت بنے ہوئے ہیں ؎

یہ ایک حقیقت ہے ہمدم جب ماہِ محرم آتا ہے
کہ زمین کے ذرے ذرے پر اک رنگِ الم چھا جاتا ہے
حسینؓ کے عزم و ہمت نے اک درس دیا ہے دنیا کو
اللہ کے سچے بندوں کا جھکتا نہیں سر کٹ جاتا ہے

جناب نیاز انجم مرحوم کے ان اشعار سے مسالمہ کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ مسالمہ کے اغراض و مقاصد پر مختصراً عرض کرنے کے بعد میں نے کامٹی کے خوش گلو فن کار صوفی محمد جابر کو دعوت دی ہے کہ وہ کلام پاک کی تلاوت فرمائیں۔ صوفی محمد جابر سورۂ رحمٰن کے چند آیات کی تلاوت کرنے کے بعد محترم شاطر حکیمی کی نعت شریف پیش کر رہے ہیں اور مجمع نے نعت پر داد بھی دی ہے۔ محترم شاطر حکیمی صاحب کی اس نعت شریف کے یہ دو شعر بہت پسند فرمائے گئے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

دمِ فراق جب آئی صبا مدینے سے
نکل کے رہ گئی اک آہ میرے سینے سے
ہم اس کو لازمۂ زندگی سمجھتے ہیں
یہ اور بات ہے ہم دور ہیں مدینے سے

محمد جابر صاحب کے بعد کہکشاں صاحبہ سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ بھی ایک نعت شریف عطا کریں۔ کہکشاں صاحبہ ناگپور کی طالبہ ہیں اور اپنی خوش گلوئی کی وجہ سے ریڈیو اور ٹی وی پر بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرتی رہتی ہیں ہر چند کہ مسالمہ کی باقاعدہ کارروائی میں تاخیر ہو رہی ہے تاہم سامعین اس خوش گلو اور نوجوان فن کارہ کو توجہ سے سن رہے ہیں اور حوصلہ افزائی فرما رہے ہیں۔ کہکشاں صاحبہ کی نعت شریف کا یہ شعر بہت پسند کیا گیا ؎

آنکھیں دکھا رہا ہے اگرچہ خوفِ مغفرت
دل شاد ہے کہ شافعِ محشر رسولؐ ہیں

نعت شریف ختم کر کے کہکشاں صاحبہ 'واہ واہ' کی صداؤں میں اسٹیج سے رخصت ہوئیں تو مجھے فرحت کا یہ شعر یاد آگیا ؎

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو!

اب آستانۂ صوفی کی جانب سے صدرِ محترم کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا جا رہا ہے۔ سپاسنامہ میں سوار چرن سنگھ صاحب انور کی شعری و ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں "ترجمانِ اردو" کے خطاب سے نوازا گیا ہے۔ اب مشاعرہ کی باقاعدہ کارروائی شروع کی جا رہی ہے۔ اس مشاعرہ کی نظامت کے لئے ملک کے مشہور شاعر اور دانشور ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد صاحب کا اسمِ گرامی منتخب کیا گیا تھا۔ ان کی منظوری آچکی تھی مگر اچانک انھیں یوپی اردو رابطہ کمیٹی کے وفد کے ساتھ صدرِ جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ صاحب سے ملاقات کی غرض سے دلی جانا پڑ گیا۔ کامٹی کے نوجوان شاعر اشفاق نجمی معمولی سی لیت و پیش کے بعد نظامت کے فرائض کے لئے راضی ہو گئے ہیں۔ اور میں مائیک اشفاق نجمی صاحب کے سپرد کر کے انھیں کے پاس بیٹھ گیا ہوں تاکہ ضرورت ہو تو ان کی مدد بھی کر سکوں۔ مشاعرہ کے آغاز کے لئے کامٹی کے نوجوان شاعر ابوالحسن کمال کو زحمت دی جا رہی ہے۔ کمال صاحب ترنم میں اپنا کلام سنا رہے ہیں اور داد وصول کر رہے ہیں۔ ان کے دو شعر خاص طور سے بہت پسند کئے گئے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

مانگے گی اب نہ ہاتھ کسی بھی امام کا
بیعت کی توڑ دی ہے کلائی حسینؑ نے
جنت کو چھوڑ چھوڑ کے بسنے لگے ملک
بستی وہ کربلا میں بسا دی حسینؑ نے

کمال صاحب مائیک سے رخصت ہوئے تو کامٹی کے نوجوان اور خوش گلو شاعر عبدالباری عارف کو آواز دی گئی ہے۔ مائیک پر آکر خلافت اور ملوکیت کے تضاد کو بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے کلام میں پیش کر رہے ہیں ؎

خلافت سجدۂ عرشِ الٰہی ✤ ملوکیت۔ ہے کیا اک آذری ہے
خلافت پہ ملوکیت ہے خنداں ✤ ملوکیت پہ مولا خندہ زن ہے

عارف صاحب بڑے اطمینان کے ساتھ اپنا کلام سنا رہے ہیں اور سامعین جھوم جھوم کر داد دے رہے ہیں ملاحظہ فرمائیے ؎

خلافت سے ہر اک بن باغ ہوگا ✤ ملوکیت میں ہر اک باغ بن ہے

اور جب وہ اس شعر پر پہونچے تو مشاعرہ گاہ میں واہ واہ اور "سبحان اللہ" کے شور سے طوفان برپا ہو گیا ہے ؎

ملوکیت ہے انساں پر اماوس ✤ خلافت صبح کی پہلی کرن ہے

داد و تحسین کا شور کم ہوا تو عارف صاحب نے پھر اس شعر پر ہنگامہ مچا دیا ہے ؎

ملوکیت ہے کیا دندانِ ہندہ ✤ خلافت کیا ہے حمزہؓ کا بدن ہے

عارف صاحب اپنی کامیابی پر مائیک سے مسکراتے ہوئے لوٹ رہے ہیں۔ اشفاق صاحب ان کے کچھ اشعار دہرا کر مہمان شاعر انور اشرفی صاحب کو جو رائے پور سے تشریف لائے ہیں۔ زحمت دے رہے ہیں۔ انور اشرفی اونچے توانا قسم کے شاعر ہیں۔ اپنی وضع قطع سے بھی شاعر لگتے ہیں۔ مائیک پر آکر الاپ رہے ہیں ؎

چمکی ہے نور بن کے شجاعت حسینؓ کی
اسلام کی بقا ہے شہادت حسینؓ کی
میدانِ کربلا سے اٹھی شمس کی طرح
عالم پہ چھا گئی ہے صداقت حسینؓ کی

انور اشرفی کا ترنم اور ان کے پڑھنے کا انداز سامعین کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں اور جب وہ اس شعر پر پہونچے تو سامعین ہر طرف سے ہاتھ ہلا ہلا کر داد و تحسین کے شور و غل سے ان سے بار بار پڑھنے کی درخواست کر رہے ہیں ؎

جو بدنصیب ہیں انھیں کیسے نصیب ہو
اللہ کا کرم ہے محبت حسینؓ کی

اپنا سلام ختم کر کے انور اشرفی رخصت ہو رہے ہیں اور اب شہر کے ایک اور نوجوان اور خوش فکر شاعر ظہیر حیدری کو آواز دی جا رہی ہے۔ ظہیر حیدری حسبِ معمول تحت میں اپنا سلام سنا رہے ہیں اور داد سے نوازے جا رہے ہیں ؎

سوا حسینؓ کے یوں سر کٹا سکا نہ کوئی
فضائے مرگ میں جینا سکھا سکا نہ کوئی
خودی کا شیش محل چور ہو گیا آخر
پڑا وہ صبر کا پتھر بچا سکا نہ کوئی

حصارِ فکر سے باہر ہے عظمتِ شبیرؑ
بقدرِ فہم بھی اب تک بتا سکا نہ کوئی

اب رمضان طالب ناگپوری سے درخواست کی جا رہی ہے۔ رمضان طالب نے ابھی پڑھنا ہی شروع کیا تھا کہ بارش کا زوردار حملہ ہوا۔ جو لوگ باہر سے لطف اندوز ہو رہے تھے جگہ بنا کر اندر شامیانے میں آ رہے ہیں۔ مسالمہ کی روانی کچھ دیر کے لئے روک دی گئی ہے۔ جلد ہی بارش کا زور ختم ہو گیا۔ یہ سامعین کے لئے امتحان کی گھڑی تھی۔ سامعین بھلا کب ہمت ہارنے والے تھے نام لیوائے حسینؑ جو ٹھہرے۔ اب پھر مسالمہ کی کارروائی شروع ہو رہی ہے۔ اسٹیج پر بچھائی ہوئی چادریں اور گدّے بھیگ چکے ہیں اس لئے ان پر کرسیاں لگا دی گئی ہیں۔ بارش کے اثر سے ماحول خوشگوار ہو گیا ہے۔ مگر داد و تحسین کی آنچ میں کوئی کمی نہیں آئی۔ رمضان طالب کے اس شعر سے سامعین پر گرمی طاری ہو گئی ہے ؎

فسانہ اپنی جگہ پھر فسانہ ہوتا ہے
حقیقتوں کے دریچوں کی داستاں ہے حسینؑ

اب مختصر سے تعارف کے بعد مہمان اور خوش کلام شاعر نیئر دہلوی کو زحمتِ سخن دی جا رہی ہے۔ سامعین سنبھل کر بیٹھ گئے ہیں ہر طرف ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ اب مسالمہ نقطۂ عروج کی طرف بڑھ رہا ہے۔ نیئر دہلوی گزشتہ مسالمہ میں بھی تشریف لائے تھے۔ اس سال پھر انہیں یاد کیا گیا ہے جو اس بات کا مظہر ہے کہ سامعین انہیں پسند فرماتے ہیں۔ وہ اپنی وضع قطع سے شاعر بھی نظر آتے ہیں اور صوفی بھی۔ میری نظر میں ایک اچھے فن کار کے لئے ضروری ہے کہ وہ اچھا آدمی بھی ہو۔ نیئر دہلوی سے ایک بار ملو تو بار بار ملنے کی تمنا ہوتی ہے۔ بہرحال! نیئر صاحب مائیک پر آ کر ماحول کا جائزہ لے رہے ہیں اور چند قطعات سنا کر سخن فہمی کا امتحان سامعین سے لے رہے ہیں۔ ایک قطعہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

رسول اللہ کا دلبر اگر مسند پر آ جاتا
فلک کیا شے ہے عرشِ خالقِ اکبر اتر آتا

حسینؑ ابنِ علیؑ کی تشنگی میں راز تھا ورنہ
زمینِ کربلا پر چشمۂ کوثر اتر آتا

اب ترنم میں اپنا سلام سنا رہے ہیں ؎

دین کی زندگی حسینؑ سے ہے ۔ شانِ ایمان کی حسینؑ سے ہے
اس کو کوئی مٹا نہیں سکتا ۔ جس کو وابستگی حسینؑ سے ہے
اللہ اللہ حسینؑ کی عظمت ۔ خوش لگ ہر دلی حسینؑ سے ہے

نیئر دہلوی اپنا سلام سنا کر رخصت ہوا ہی چاہتے ہیں کہ ہر طرف سے "ایک اور" "ایک اور" کی صدائیں گونجنے لگیں۔ مجبوراً نیئر دہلوی کو مائیک پر ہی ٹھہرنا پڑا۔ اور سامعین کی فرمائش پر ایک گیت نما سلام پیش کر رہے ہیں جس کے بول ہیں ؎

دین کے سنتری ایمان کی بگیا کے ولی ۔ حسینؑ ابنِ علیؑ
ذاتِ حق کی سورے سرکار کے رب کو بھلی ۔ حسینؑ ابنِ علیؑ

اس گیت نما سلام پر مجمع بے قابو ہوا جا رہا ہے اور دل کھول کر داد دی جا رہی ہے۔ ہر بند کو سراہا جا رہا ہے۔ میں خود اتنا محو ہو گیا کہ کوئی بند نوٹ نہیں کر سکا۔ بہرحال، مسالمہ نہایت کامیاب جا رہا ہے۔ بارش سے گرچہ ماحول کچھ سرد ہو گیا ہے لیکن سامعین موسم کی بے کیفی کو نظر انداز کر کے اپنی سخن فہمی اور بیداری کا ثبوت دے رہے ہیں۔ نیئر دہلوی نہایت کامیاب اور خوش کلام سرد ماحول میں بھی پسینہ پونچھتے ہوئے مائیک سے لوٹ رہے ہیں۔ اب کامٹی کے نوجوان شاعر منظور رشاکر مائیک پر آ گئے ہیں منظور رشاکر کی شاعری میں مذہبی رنگ کی آمیزش زیادہ ہوتی ہے اور چونکہ یہ مجلس بھی اسی نوعیت کی ہے اس لئے منظور رشاکر کو خاطر خواہ داد مل رہی ہے۔ وہ کامیابی کے ساتھ مائیک سے لوٹ رہے ہیں اور ادھر خاکسار کو آواز دی جا رہی ہے۔ آٹھ دوپہر میں محترمہ ملکہ نسیم صاحبہ نے دورانِ مباحثہ مسالمہ کے عنوان کے پیشِ نظر شاعر جمالی کے سلام کے چند شعر سنائے تھے۔ سلام کا مطلع میرے ذہن میں گونج رہا تھا۔ مائیک پر آ کر اس مطلع کو نذرِ سامعین کر رہا ہوں مگر دل میں کچھ کھٹک سا گیا (محترمہ ملکہ نسیم نے پیچھے سے ٹوک دیا) تو مجھے داد مل گئی۔ شاعر جمالی کے اس مطلع کو سامعین نے بھی بے حد پسند فرمایا۔ مطلع آپ کی نذر کرتا

ہوں سے

نہ کوئی تیر نہ تلوار ساتھ لے جانا
محاذِ جنگ پہ کردار ساتھ لے جانا

بہرحال! حسبِ معمول اپنا سلام بعنوان "غمِ حسینؓ" ترنم میں سامعین و شعرائے کرام کی نذر کر رہا ہوں۔ سلام کے جن اشعار کو سامعین نے پسند فرماکر خاکسار کی حوصلہ افزائی کی آپ کی ضیافتِ طبع کے لئے درج کر رہا ہوں سے

دل کا سکون نظر کا سہارا غمِ حسینؓ
ہوتی نہ زندگی جو نہ ہوتا غمِ حسینؓ
صدیوں کا واقعہ ہے یہ برسوں کی بات ہے
دیکھا گیا ہے آج بھی تازہ غمِ حسینؓ
سورج سے واسطہ نہ غرض چاند سے مجھے
ہے دل کی انجمن کا اُجالا غمِ حسینؓ

اب جمیل احمد جمیل ناگپوری مائیک پر آگئے ہیں اور تحت میں اپنا سلام سنا رہے ہیں مگر مجمع کو متاثر نہیں کر پا رہے ہیں۔ لیجئے! اب پھر ایک مہمان شاعر خادم شبیر نصیر آبادی کو زحمت دی جا رہی ہے۔ خادم شبیر نوجوان ہیں اور ترنم کسی قدر بلند ہے۔ مجمع پر تابڑ توڑ گئے ہیں مگر اشعار میں سطحی پن زیادہ ہے۔ ہاتھ ہلا ہلا کر پڑھنے کا اسٹائل ہی صرف سامعین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ تاہم یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں سے

رُکا نہیں ہے کسی اک جگہ یہ ذکرِ حسینؓ
زمیں کی بات ہے کیا آسماں کے پار گیا
بلند نیزے پہ جو سر تھا سر بلند ہے آج
بتا یزید کہاں تیرا اقتدار گیا
یہ شام و کوفہ کے ذرّوں سے آرہی ہے صدا
حسینؓ جیت گئے اور یزید ہار گیا

خادم شبیر کو داد تو ملی مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ داد اشعار پر کم اور ان کے اسٹائل پر زیادہ دی گئی ہے۔ بہرحال اب کامٹی کے ایک بزرگ شاعر عبد الرحیم خاں صاحب طالب سے درخواست کی جا رہی ہے۔ طالب صاحب ترنم میں پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن سامعین بیزاری و ناپسندیدگی کا اظہار کر رہے ہیں حالانکہ طالب صاحب کے کچھ شعر میں شعریت ضرور ہے۔ اشفاق انجمی صاحب کسی ضرورت سے اسٹیج چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور ان کی جگہ میں نے مائیک سنبھال لیا ہے۔ سامعین کے اصرار پر جوں ہی میں نے شاعرۂ ملت ملکہ نسیم صاحبہ کا نام لیا مجمع میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مختصر سے تعارف کے بعد میں نے ملکہ نسیم صاحبہ کے ہی اس شعر کے ساتھ ان سے مائیک پر تشریف لانے کی زحمت دی سے

ظلمت کی آندھیاں بھی نہ جس کو بجھا سکیں
اُلفت کی رہگزر کا وہ جلتا دیا ہیں ہم

ملکہ نسیم آج تیسری بار اس تاریخی مسالمہ میں شریک ہوئی ہیں۔ سامعین حضرات و خواتین محترم کی نگاہیں مائیک پر جمی ہوئی ہیں۔ ماحول پر ایک نظر ڈالتے ہوئے ملکہ نسیم پہلے تو شاعر جمالی کے وہ شعر سنا رہی ہیں جن کا مطلع سنا کر میں نے سامعین کو تشنہ چھوڑ دیا تھا۔ شاعر جمالی کے بقیہ اشعار آپ بھی ملکہ نسیم صاحبہ کی زبانی سماعت فرمائیں سے

تمہاری نسل کو حاجت ہے اک مسیحا کی
مرے قبیلے کا بیمار ساتھ لے جانا
تمہارا سر کوئی ظالم جھکا نہیں سکتا
بس ایک جرأتِ انکار ساتھ لے جانا
ارادہ کر تو لیا ہے وطن سے ہجرت کا
تم اپنے سب در و دیوار ساتھ لے جانا؟
میں جانتا ہوں وہاں تن سے سر جدا ہوں گے
منافقوں کو ہے بے کار ساتھ لے جانا

سامعین شاعر ... کے اشعار سے بہت محظوظ ہو رہے ہیں۔ اور اب ملکہ نسیم اپنا سلام حسبِ معمول ترنم میں سنا رہی ہیں۔ ملکہ نسیم کو قدرت نے کھنکتی ہوئی آواز سے نوازا ہے۔ اور ان کے پڑھنے کا انداز بھی لائق ...

...ے اس لیے وہ ترنم کی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔ دُور درشن
...شاعروں کی مقبولیت اس بات کا ثبوت ہے کہ ترنم
...ں کلام سنانا اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ ملکہ نسیم سلام
...مطلع عنایت کر رہی ہیں ؎

اللہ رے شانِ شبیری نیزے پہ تلاوت ہوتی ہے
تعظیم عبادت کی خاطر تیغوں میں عبادت ہوتی ہے

داد ہے کہ اس مطلع کا حق ہے۔ پنڈال میں ایک ہنگامہ
...ا مچا ہوا ہے۔ قدرے سکوت کے بعد ملکہ نسیم ارشاد
...ر رہی ہیں ؎

وہ کوفہ ہو یا کرب و بلا اس گھر کا چلن ہے قربانی
ایمان کی عظمت کی خاطر سجدے میں شہادت ہوتی ہے

اس شعر نے پھر پنڈال اڑانے کی کوشش کی ہے۔ ملکہ نسیم
اسی اعتماد کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں ؎

جب کفر جہاں میں بڑھتا ہے تسلیم و رضا والے بڑھ کر
سر راہِ خدا میں دیتے ہیں ایماں کی حفاظت ہوتی ہے
یہ ان کے کرم کا صدقہ ہے اسلام جو اب تک زندہ ہے
شبیر کے خوں سے ایماں کی رگ رگ میں حرارت ہوتی ہے

دراصل جس کے دل میں امام حسین عالی مقام کی محبت
ہے وہی ایسے شعر کہہ سکتا ہے۔ ملکہ نسیم اپنا سلام ختم کر کے
رخصت ہونا چاہتی ہیں لیکن ہر طرف سے "ایک اور ایک اور"
کا نعرہ بلند ہونے لگا تو وہ ٹھہر گئیں۔ اور دوسرا سلام پیش
کر رہی ہیں ؎

تمہاری بزم میں جلتے ہیں برتری کے چراغ
تمہیں نے دین کو بخشے ہیں روشنی کے چراغ
تو بادشاہ ہو کہ بادشاہ آج بھی ہے
تمام ... جلتے ہیں تیری ہی سروری کے چراغ

اہلِ فن کار میں اگر صلاحیت ہے تو وہ سنگلاخ زمین
کو بھی اپنی محنت سے گلزار بنا سکتا ہے۔ یہی الفاظ ملکہ نسیم
صاحبہ پر بھی صادق آتے ہیں۔ آگے فرماتی ہیں ؎

سلگتے خیموں کی زینب رہی تھیں پاسبان اِدھر
یزیدیت نے جلائے اُدھر خوشی کے چراغ
ترے لہو سے لویں تیز ہو گئیں سب کی
لرز رہے تھے ہوا میں پیمبری کے چراغ

ملکہ نسیم کو ان کے ہر شعر پر بھرپور داد مل رہی ہے۔ اب
مقطع عنایت کر رہی ہیں ؎

تمہارے غم کے تصدق میں کربلا والو
نسیم کو بھی عطا ہوں سخنوری کے چراغ

ملکہ نسیم اپنا سلام ختم کر کے بہت کامیاب مائیک سے
رخصت ہو رہی ہیں۔

اس وقت رات کے دو بجا چاہتے ہیں۔ وقت کا کچھ
پتہ ہی نہیں چل رہا ہے۔ ابھی صدر محترم تک پہونچنے کے لئے
پانچ منزلیں باقی رہ گئی ہیں۔ میرے پاس آستانۂ صوفی
کے سجادہ نشین محترم صوفی حبیب الرحمان صاحب نے پیغام
بھیجا ہے کہ چند عقیدت مند حضرات جو دور دراز سے تشریف
لائے ہیں صدر محترم کو سننا چاہتے ہیں۔ گرچہ یہ مسئلہ یا
کسی مشاعرہ کے روایتی اصول کے خلاف ہے کہ درمیان میں
صدر محترم کو زحمت دی جائے لیکن جوں ہی حکم کے مطابق اعلان
کیا گیا سامعین دخل اندازی پر اتر آئے۔ لہذا سامعین کا ردِ
عمل دیکھ کر اصول کی خلاف ورزی کی جرأت نہیں کی جا سکی۔
اب حمید ناگپوری کو آواز دی جا رہی ہے۔ لیکن وہ زیادہ متاثر
نہیں کر سکے اور چلتے ہی وہ مائیک سے کھسکے کامٹی کے تابش
حلیمی کو آواز دی گئی۔ تابش حلیمی کا شمار اب کامٹی کے بزرگ
شعراء میں ہونے لگا ہے۔ نگران کے ترنم میں جس کی وجہ سے
وہ جانے پہچانے جاتے ہیں وہی لوچ ہے۔ اپنا ایک بہت
پرانا سلام سنا رہے ہیں۔ ان کا یہ شعر بہت پسند کیا گیا ؎

کربلا والے تو اپنا فرض پورا کر گئے
اسوۂ حسنہ پہ چلنا اب ہمارا کام ہے

اب ناگپور کے مولانا مصطفیٰ شائق صاحب کو زحمت
سخن دی جا رہی ہے۔ شائق صاحب بھی بجھے بجھے سے نظر آ رہے
ہیں۔ ان کا یہ شعر بڑی مشکل سے لوٹ کر سکا ؎

عابد کہ جس کو کہتے ہیں بیمارِ کربلا
نرغے میں قاتلوں کے مسیحا دکھائی دے

شائق صاحب کے بعد ایک اور مہمان شاعر گوپال کرشن راہی سکرالوی کو زحمت دی جا رہی ہے۔ راہی صاحب دبلے پتلے سے درمیانے قد کے آدمی ہیں۔ تحت میں اپنا کلام سنا رہے ہیں اور لوگ انھیں توجہ سے سماعت فرما رہے ہیں مگر افسوس کہ ان کا کوئی شعر لوٹ نہیں کر سکا۔ اب صابر صدیقی ناگپوری کو آواز دی جا رہی ہے۔ صابر صاحب بھی مجمع کو زیادہ متاثر نہیں کر پا رہے ہیں۔ لوگ پہلو بدل بدل کر انھیں سن رہے ہیں۔ صابر صاحب مائیک سے ہٹے تو ناگپور کے نوجوان اور مترنم شاعر اختر کبیر کو دعوت دی گئی۔ اختر صاحب کامیاب رہے چھوٹی بحر میں خوشگوار ترنم میں اپنا سلام سنا رہے ہیں۔ ان کا ترنم کانپور کی شاعرہ ترنم کانپوری کا بار بار تازہ کر رہا ہے

بات بگڑی چادر کی تنویر کی ÷ یہ ضیا ہے جلوۂ شبیرؑ کی
ہائے عابدؑ کی جرأت دیکھ کر ÷ ہر کڑی کترا گئی زنجیر کی

اب صدر محترم سے پہلے محترم شاکر حکیمی صاحب سرپرست مشاعرہ کی باری ہے مگر جب ان سے کہا گیا تو انھوں نے معذرت طلب فرمائی کیونکہ آج کل ان کی طبیعت ناساز رہا کرتی ہے۔ بہرحال اب مشاعرہ کے صدر محترم جوگا سنگھ انور صاحب کو نہایت ادب و احترام کے ساتھ زحمت سخن دی جا رہی ہے۔ اس وقت گھڑی میں ساڑھے تین سے کچھ زیادہ ہو گئے ہیں۔ سامعین جس ذوق و شوق سے اپنے شعرائے کرام کو سن رہے ہیں اس کے پیش نظر میں دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا ہوں کہ چند نامور بیرونی و معتبر مقامی شعرائے کرام کی عدم شرکت کے باوجود بھی آج کا مشاعرہ نہایت کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچ رہا ہے ذہن میں محترم شاکر حکیمی صاحب کا یہ مصرعہ جانے یہ کس کی دعاؤں کا اثر ہوتا ہے [illegible] گونج رہا ہے۔ کیونکہ مشاعرہ کے ابتدا میں ایسا لگ رہا تھا کہ مشاعرہ دو گھنٹے سے زیادہ نہیں چل سکے گا۔ محترم جوگا سنگھ انور اپنی مختصر سی صدارتی تقریر کے بعد اپنا کلام اپنے مخصوص ترنم میں سنا رہے ہیں

بالیقیں قتل کی شب قافلہ پیاسا ہوگا۔
اور یہ حادثہ یارو لب دریا ہوگا

جوگا سنگھ انور جب مائیک پر آنے کے [illegible] پنڈال میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ماحول پر سکوت غالب تھا۔ جس طرح سمندر کی خاموشی سے طوفان کے آثار کا اندازہ لگا لیا جاتا ہے جیسا کہ ڈاکٹر ایل بھی رند صبیر صاحب مرحوم کا یہ شعر ہے

طوفان سے کچھ پہلے خاموش سمندر ہے
کیوں درد ہوا کم ہم خوب سمجھتے ہیں

بالکل ایسا ہی ماحول یہاں بنا ہوا ہے یعنی اب مشاعرہ گاہ میں ایک بہت بڑا دھماکہ ہونے والا ہے اور جیسے ہی جوگا سنگھ انور نے اپنا مطلع پورا کیا مشاعرہ گاہ کی چھت "سبحان اللہ" اور "واہ واہ" کی صداؤں سے اڑنے لگی۔ انور صاحب قدرے سکوت پا کر ارشاد کر رہے ہیں

موجزن سامنے جس کے ہوں فرات و دجلہ
کتنا باظرف وہ انساں ہے جو پیاسا ہوگا

جوگا سنگھ انور صاحب اپنی صدارت کا حق ادا کر رہے ہیں۔

آسماں تیری بلندی بھی اسے ہیچ لگے
جس کی نظروں میں رخ گنبد خضرا ہوگا
مدتوں خاک میں اشکوں کی نمی بھی ہوگی
قافلہ درد کا جس راہ سے گزرا ہوگا
جہل سے ہاتھ سے پتھر ہی ملیں گے انور
اور ہونٹوں پہ مگر حرف دعا کا ہوگا

انور صاحب حسب معمول بہت کامیاب رہے۔ ان کے تمام اشعار بار بار پڑھائے گئے اور جوں ہی انھوں نے اپنا سلام ختم کر کے رخصت ہونے کا ارادہ کیا "ایک اور ایک اور" کی ایک ساتھ کئی آوازیں بلند ہونے لگیں لیجئے انور صاحب تعمیل ارشاد میں اپنا دوسرا سلام بھی پیش کر رہے ہیں۔ سلام کی ردیف غزل کی ردیف ہے لیکن اس میں بھی انور صاحب نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ سلام کے تقاضے کو پورا کیا ہے۔ سامعین بھی انھیں خوب داد دے رہے ہیں

بچا بچا کر تو کردار کا اثاثہ رکھو
ملے جو شرط پہ دریا تو خود کو پیاسا رکھو
حسینؑ پیاس کی عظمت کو تو بھی ترسے گا
یزید ہے تو ہوا کر تو اپنا دریا رکھو

جہاں میں صاحبِ کردار بن کے جینا سیکھ
نظر میں عزمِ حسینیؓ کو تو ہمیشہ رکھ
کلام ایسا کہ دشمن کا بھی نہ دل ٹوٹے
لبِ حسینؓ کی مانند شیریں لہجہ رکھ

واقعی حضرت امام حسینؓ عالی مقام کی شہادتِ عظمیٰ ہمارے لئے ایک بہت بڑا سبق ہے۔ ہم ہر سال محرم میں ان کی یاد میں بڑے خلوص اور عقیدت کے ساتھ مجلسیں منعقد تو کرتے ہیں مگر یہ سب چیزیں محض رسمی بن کر رہ گئی ہیں جیسا کہ محترم کریم الاحسانی صاحب نے ارشاد کیا ہے ؎

ہم شہیدوں کے ذکر پر اب بھی
سر جھکاتے تو ہیں مگر رسماً

بہرحال! اس وقت صبح کے چار سے کچھ زیادہ بجا چاہتے ہیں اور مسالمہ کے اختتام کا اعلان کیا جا رہا ہے اس کامیاب اور تاریخی مسالمہ کے لئے محترم شاطرؔ حکیمی صاحب اور محترم صوفی مجیب الرحمان صاحب کے علاوہ صوفی حفیظ الرحمٰن۔ صوفی غلام رسولؐ صادق۔ غلام رحمان ساجد وغیرہ بھی بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ یہ حق تلفی ہوگی اگر ڈاکٹر عشرت جاوید انصاری صدر استقبالیہ۔ محترم ڈاکٹر الیس ناتھ، ماسٹر ظہیر عمر، ماسٹر کاظم علی اور جمشید پور سے تشریف لائے ہوئے عقیدت مند حضرات مثلاً ڈاکٹر بلیناتک صاحب۔ ایڈوکیٹ جوالا پرساد صاحب، عبدالوہاب صاحب فوٹو گرافر، گلزار احمد صاحب، گنگولی صاحب وغیرہ کا بھی شکریہ ادا نہ کیا جائے جن کے پُر خلوص تعاون سے آج کا مسالمہ حسبِ معمول بہت کامیاب اور تاریخی ثابت ہوا۔

رام لعل نابھوی کی دو گرانقدر تخلیقات

"تبسم" طنزیہ مزاحیہ خاکوں کا مجموعہ دوسرا ایڈیشن -/۲۰
"آم کے آم" انشائیوں کا مجموعہ آفسیٹ طباعت -/۳۰

ملنے کا پتہ
دفترِ شانِ ہند فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲

گرسرن لال ادیبؔ لکھنوی

اندرا گاندھی کی یاد

یہ اشعار ۳۱ر اکتوبر کو راشٹرپتی بھون کے مشاعرے میں پڑھے گئے۔

غیر ممکن ہے مٹائے اس کو مرگِ ناگہاں
ہیں نمایاں چار جانب جس کی عظمت کے نشاں

اپنی ہستی جو مٹا دیتے ہیں کارِ خیر میں
لاتی ہے موت ان کی پیغامِ حیاتِ جاوداں

اندرا گاندھی سراپا امن کی دیوی تھی تو
تھی یہ کوشش متحد ہو جائیں اقوامِ جہاں

چاند غائب ہے مگر ہے چاندنی پھیلی ہوئی
جسمِ خاکی مٹ گیا ہے روح لیکن ضو فشاں

کیوں نہ ہم کو یاد اس دیوی کی آئے اے ادیبؔ
اپنے خوں سے جس نے سینچا گلشنِ ہندوستاں

غزل

نور جہاں بیگم نورؔ حیدرآبادی

بسر کرنی ہے ان کی یاد میں اب زندگی اپنی
سمو کر رہ گئی ہے اب خودی میں بیخودی اپنی

شکستِ آرزو ٹوٹے ہوئے دل کا نمونہ ہے
جنوں کے نذر ہو کر رہ گئی ہے آگہی اپنی

نگاہوں کے تصادم نے ہمیں مدہوش کر ڈالا
عجب انداز سے ساقی بنی کم مے کشی اپنی

متاعِ دردِ اُلفت ہے فقط اک کائناتِ دل
ہوئی اندر محبت زندگی بھر کی خوشی اپنی

جگر میں درد ہے ویران اک عالم اضطرابِ دل
سمٹ کر رہ گئی ہے نورؔ ان میں بے کسی اپنی

"اجنتا"

ڈاکٹر حقیر آستانی
ڈبل ایم اے۔ ایل ایل بی۔ پی ایچ ڈی
(ڈی ایس اے)

سمو کر نظر میں نظارت کے رنگ
وہ بیٹھا ہوا ہے مصور کوئی

گلابی شرابی نشیلے تمام　　کوئی خم کے خم جیسے پی لے تمام
لجیلے کٹیلے رسیلے تمام　　کوئی زندگی جیسے جی لے تمام
مسرت، صباحت، بشاشت کے رنگ
سمو کر نظر میں نظارت کے رنگ
وہ بیٹھا ہوا ہے مصور کوئی

کہیں کھل رہے ہیں چمن در چمن　　کہیں موجزن ہے دلوں کی لگن
کہیں رقص میں ہے روپہلی کرن　　کہیں حسن ہے تو کہیں حسنِ ظن
صداقت، طہارت، سعادت کے رنگ
سمو کر نظر میں نظارت کے رنگ
وہ بیٹھا ہوا ہے مصور کوئی

کہیں ماہِ کامل کہیں کہکشاں　　کہیں دھول اڑاتے ہوئے کارواں
کہیں گھر کے چھائی ہوئی بدلیاں　　کہیں زندگی ہے دما دم رواں
مشقت، اعادت، ریاضت کے رنگ
نظر میں سمو کر نظارت کے رنگ
وہ بیٹھا ہوا ہے مصور کوئی

کہیں حسن نازاں کہیں اشکبار　　کہیں عشق خنداں کہیں سوگوار
کہیں حسن مائل بہ لطفِ ہزار　　کہیں عشق بے خود بے اختیار
نزاکت، لطافت، بشارت کے رنگ
نظر میں سمو کر نظارت کے رنگ
وہ بیٹھا ہوا ہے مصور کوئی

سنبھلتی ہوئی سرخوشی ہے کہیں　　مچلتی ہوئی دلبری ہے کہیں
سکوں ہی سکوں دائمی ہے کہیں　　خودی ہے کہیں بیخودی ہے کہیں
اخوت، مروت، رفاقت کے رنگ
نظر میں سمو کر نظارت کے رنگ
وہ بیٹھا ہوا ہے مصور کوئی

یہ صدیوں کے رنگین نقوشِ کہن نمائندۂ خاکسارانِ فن
کمالِ نفاست ہیں شانِ وطن ہمیشہ رہے گی یہ ان کی پھبن
عقیدت، عزیمت، عبادت کے رنگ
نظر میں سمو کر نظارت کے رنگ
وہ بیٹھا ہوا ہے مصور کوئی

یہ شہکارِ ماضی ابد کے مکیں خداؤں کے محرم بتوں کے امیں
صدا آرہی ہے زِ چرخِ بریں زوال ان کو آئے گا ہرگز نہیں
طریقت، شریعت، شہادت کے رنگ
سمو کر نظر میں نظارت کے رنگ

وہ بیٹھا ہوا ہے مصور کوئی

غزل

مجھ کو مجھ سے چرا لیا ظالم
ہائے تو نے یہ کیا کیا ظالم

جان لے گی یہ ایک دن میری
جان لیوا تری ادا ظالم

تیرے وعدے کا اعتبار نہیں
میرے سر کی قسم نہ کھا ظالم

عمر بھر تیرا انتظار کیا
تو نہ آیا نہ آئے گا ظالم

اک جھلک دیکھنے کی چاہت میں
ہم نے خود کو مٹا دیا ظالم

اب مرا دم نکلنے والا ہے
اب تو جلوہ ذرا دکھا ظالم

ہو نہ مغرور یوں جوانی پر
ہے یہ دھوکا سراب کا ظالم

ہم کو تجھ پر بہت بھروسہ تھا
تجھ کو سمجھے تھے ناخدا ظالم

لاکھ طوفان سے کنارے پر
کیوں سفینہ ڈبو دیا ظالم

ان کا کچھ اثر نہیں ہوتا
ہے زمانہ بہت بڑا ظالم

وقت پر موت ساتھ دیتی ہے
زندگی تو ہے بے وفا ظالم

جان سے بھی عزیز تھا جو رفیق
دشمنِ جاں وہ بن گیا ظالم

بقیہ: اندرا گاندھی

روشنی کی مشعل اب اس کے لڑکے کے ہاتھ میں آگئی تھی لیکن مجھے محسوس ہوا گویا دیوتاؤں خصوصاً ہندوستانی دیوتاؤں کی مدھم روشنی گل ہو رہی تھی تب مجھے اسپینی ادیب رسے میرو گیلو کا قول یاد آیا اس نے کہا ہے کہ اس دور میں جنون اور پاگل پن کتنا ہی زور کیوں نہ پکڑے لیکن زندگی کے بحرِ ظلمات میں ہندوستان کی روشنی کا مینار ہمیشہ راہ دکھاتا رہے گا۔

اندرا کی راکھ کے نزدیک جھیلی اور گلاب رہی ہوئی ایک لڑکی نے اٹھالی جو بڑی حسین اور سرسبز تھی۔ افسردہ سے میں نے اسے زمین پر رکھ دیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے یہ مسل خیر مقدم کر رہے پھول مسکرا رہے ہوں۔ وہ مسرور تھے کہ میں ہندوستان لوٹ آیا ہوں۔ یہ علامت تھی اس امر کی کہ کوئی شے ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ ایک عظیم ہندوستانی دوستی اور انسانی محبت کے نمایاں کارنامے لازوال ہوتے ہیں۔

نذرِ عقیدت

بخدمتِ گرامی
الحاج حکیم حاذق
عالیجناب حکیم
سید یحییٰ احمد
صاحب
مدظلہ العالی

مراد

ذہن میں اس وقت میرے حکمتِ ابتدا ہے
علمِ طب کا ذکر ہے قرآنِ اعظم میں ندیم
علمِ حکمت میں یہ ہستی اک عظیم الشان ہے
بعدِ لقماں پھر ہوئے سقراط بھی بقراط بھی
پھر بنے ہیں فیثاغورث اصل میں قائم مقام
علمِ طب میں دونوں گزرے ہیں بہت عالی مقام
آج بھی وردِ زباں ہے بو علی سینا کا نام
آج بھی دنیا میں اجمل خاں کی شہرت لاکلام
نظم میری کیوں نہ ہو جذبات کی آئینہ دار
یعنی وہ یحییٰ میاں حاذقِ حکیمِ معتبر
آپ سے ہیں آج روشن علم و حکمت کے چراغ
آپ کے اسلاف میں احمد علی سیماب تھے
آپ کے والد سعید احمد میاں ذی اقتدار
آپ ہی کے خانداں میں ہستیاں گزریں عظیم
وہ سعیدی خانداں ہے جس نے یہ پایا شرف
افضل و اعلیٰ جو گزرے ہیں طبیبِ نیک نام
فضلِ حق سے ٹونک میں ہیں صاحبِ عظمت نشاں
آپ کو قدرت نے وہ دستِ شفا بخشا جناب
ضامنِ صحت ہے بے شک آپ کا دار الشفا
طالبانِ فنِ طب کو آپ دیتے ہیں سبق
علمِ طب میں آج بھی ہیں آفتاب و ماہتاب
باغِ حکمت میں بہاراں آپ ہی کے دم سے ہے
آسمانِ علمِ طب ہے یوں منور آنجناب
علمِ طب میں جگمگاتے ہی رہے اس شان سے
آپ کو آلِ محمد سے وہ نسبت ہے جناب
روضۂ اقدس بھی دیکھا اپنی آنکھوں سے ندیم
آپ کو اللہ نے بخشی بزرگی دوام
خوش نظر خوش فکر اور خدمت گزار یکساں
یہ دعا ہے میرے دل کی اے خداوندِ کریم
اللہ مہ و اختر کا جب تک یہ فلک یاور رہے

جس کا قائل آج تک بھی حضرتِ لقمان ہے
تم کو طب کو مرتبہ اللہ نے بخشا عظیم
کی شاہد حشر تک اک سورۂ لقمان ہے
علمِ طب میں آج بھی شہرت ہے اُن کے نام کی
زندہ جاوید ہے اب تک جہاں میں ان کا نام
تھے فلاطون و ارسطو فنِ طب کے تاجدار
اور جالینوس بھی استادِ فن تھے لاکلام
تھا شریفی خانداں بھارت میں مقبولِ عوام
جب کہ شخصیت ہے میرے ذہن میں عالی وقار
خدمتِ خلقِ خدا کرتے ہیں جو شام و سحر
حشر تک مہکا کریں گے علم و حکمت ہی کے باغ
بحرِ حکمت کے وہی اک گوہرِ نایاب تھے
شاعری اور فنِ طب کے تھے وہی اک شاہکار
جن میں شاعر مولوی تھے اور تھے حاذق حکیم
جن کی شہرت علم و حکمت میں ہے چاروں طرف
ان کی صف میں حضرتِ یحییٰ میاں ہیں لاکلام
جن کے ہر نسخہ میں پوشیدہ شفا ہے بے گماں
آپ کی ہر اک دوا ہو کر رہی ہے کامیاب
تندرستی جس سے ہوتی ہے مریضوں کو عطا
ہر کتابِ طب کا اب بھی یاد ہے اک اک ورق
علمِ طب میں بن گئے کتنے ہی ذرے آفتاب
باغِ حکمت یوں گل افشاں آپ ہی کے دم سے ہے
دیکھ کر شرمندہ جس کو آفتاب و ماہتاب
سلسلہ ملتا ہے جا کر آپ کا لقمان سے
آپ کو ملتا رہا فیضِ علی بو تراب
بن گئی تکمیلِ حج خوشنودیٔ ربِ کریم
ہند و مسلم آپ کا کرتے ہیں بے حد احترام
اپنے فن میں کامل و اکمل بنے یحییٰ میاں
مرتبہ اعلیٰ ملے کونین میں ربِ حکیم
آپ کا سایہ جہاں میں تا ابد سر پر رہے

سارا عالم جس کو کہتا ہے مرادِ خوش بیاں
وہ سعیدی خاندان کا ہی رہا ہے قدرداں

بقیہ : عقل و حکمت

تم جھوٹ بولتے ہو غداری کی ہے دھوکا دیا ہے تم نیچ ہو۔ ظالم ہو بزدل ہو۔

"دوچوہے دوست تم ناراض مت ہو میں بہادر بھی ہوں اور جنگل کا راجہ بھی جو تم سوچ رہے ہو میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ہے میں نے تمہاری بیوی کو تمہارے جاتے ہی چھوڑ دیا تھا۔ مجھے پکا بھروسہ تھا کہ تم میرا کام کر کے ضرور لاؤ گے چھوٹے لوگ دل کے صاف ہوتے ہیں۔ دھرم ایمان کو نبھانے والے ہوتے ہیں اُن کی ہمدردی پاک صاف ہوتی ہے میں اپنا پیٹ بھرلوں اور تم اپنی بیوی سے جا کر حال چال پوچھو تو کیسے ہو" کہہ کے شیر نے ہرن کے گلے پر جبڑے جما دیئے اور ہرن کے خون کے دھار اُس کے منہ میں جانے لگی۔

چوہا گھر پہنچا تو چوہیا منڈو سے کی بالیں کُتر رہی تھی وہ تم آگئے؟ دیکھتے ہی بالیں ایک طرف رکھتے ہوئے پاس آکر بولی ہاں آگیا۔ تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔

بالکل نہیں۔ وہ آدمی کی طرح دھوکے باز تھوڑے ہی تھا جو بے دانہ میں روٹی کا ٹکڑا لگا کر بھوکے چوہوں کو پھنسا کر مار ڈالتا ہے۔ اس نے تو تمہارے جاتے ہی مجھے ڈھیلا کر دیا تھا۔ اور مجھ سے پیار سے بولا۔ بیٹی تم گھبراؤ نہیں میں تمہیں کھاؤں گا نہیں۔ تم میرے دوست کی بیوی ہو۔ میں آدمی کی طرح دوستی میں دغا نہیں کروں گا کبھی کوئی کام آپڑے تو یاد کرنا اب مجھ میں طاقت تو ہے ہی نہیں عقل ہی رہ گئی ہے اور رہ گیا عمر بھر کا تجربہ اسی سے دنیا بھر پر راج کیا جاتا ہے اسی کے بل پر تمہاری کسی وقت بھی مدد کر سکتا ہوں۔ اتنا کہہ کر شیر نے چھوڑ دیا اور میں چلی آئی۔

چلتے وقت نمستے اور شکریہ بھی نہیں کہا۔

"ارے میں تو یہ سب کچھ بھول ہی گئی۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ کبھی تمہارے کام آسکتا ہے چوہے کے سوال پر چوہیا چپ ہوگئی اور کچھ سوچنے لگی چوہا پھر بولا" مجھے تو اس کی اس ہمدردی میں بھی ایک چال نظر آتی ہے جو کبھی ظاہر ہوجائیگی بڑے لوگوں سے دوستی کرنا اچھا نہیں ہوتا ہے پیڑوں کے سایہ میں پودے کبھی بھی پرورش نہیں پاتے ہیں سمجھیں!

غزل

نور ریوانی

جب بھی میرے پاس آیا کیجئے
آپ یوں ہی مسکرایا کیجئے

آنکھوں میں آنسو نہیں سجتے حسین
بیٹھ کر کچھ گنگنایا کیجئے

جتنا ہنس ہنس کے اٹھایا جاسکے
بوجھ اُتنا ہی اٹھایا کیجئے

پھول سے چہرے پہ غم اچھا نہیں
پھول جیسا مسکرایا کیجئے

آپ کیوں ہم کو سمجھتے غیر ہیں
حالِ دل کچھ تو سنایا کیجئے

دور منزل اور راہیں پُرخطر
یوں نہ تنہا آیا جایا کیجئے

تیرگی ہو جائے گی نظروں سے دور
نور کو دل میں بسایا کیجئے

غزل

ڈاکٹر سید محمود دیوان (مرحوم)

اچھے وقت شام آگیا ✤ ساقی کے لئے جام آگیا
آپ آئے کیا جہاں میں ✤ دہر میں نظام آگیا
میری نطق چومے لب مرا ✤ لب پہ حسن کا نام آگیا
آپ کے طفیل میں جناب ✤ مجھ کو بھی سلام آگیا
سامنے حضور کے ہوں اب ✤ حکم ہو غلام آگیا
جان بھی نثار اب کروں ✤ دل تو اُن کے کام آگیا
میری بے بسی نہ پوچھئے ✤ موت کا پیام آگیا
آپ کیا حضور آگئے ✤ میکدہ تمام آگیا
لوٹ کے گھٹا برس پڑی ✤ کون تشنہ کام آگیا
لوگ جھونک چل کے کیجئے ✤ قادر الکلام آگیا
اب تو تم دیوان کو کہو ✤ جنت المقام آگیا

کے مقدس تہوار پر

ہر ہندوستانی کو دِلی

مبارکباد

دُعا ہے کہ ہم سب کے لئے دیوالی حقیقی خوشیوں، خوشحالی اور قومی ایکتا کی ضامن روایات کی امین ثابت ہو۔ اور ہم سب مل کر ملک کی ترقی کے لئے قدم سے قدم ملا کر کوشاں رہیں تا کہ آنے والی نسلیں بہتر انداز میں دیوالی کی خوشیوں سے ہم کنار ہو سکیں۔

موہن گولڈ واسٹر

ڈالی گنج لکھنؤ۔ یوپی

شعرائے غازی آباد

جناب گربرن لال ادیب لکھنوی

غازی آباد میرٹھ سے تیس کلومیٹر اور دہلی سے بیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اسی لئے اس شہر پر ان دونوں شہروں کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ نہ صرف کاروباری معاملات میں بلکہ اُردو ادب کے معاملے میں بھی۔ آج بھی جب کہ اُردو زبان کا بازار سرد ہے، پیش اُردو کے شاعروں کی تعداد ۲۵ ہے۔ اس شہر میں اردو شاعری کے اعتبار سے مانگے کا اُجالا ہے بیشتر شعرا غازی آباد کے باہر کے رہنے والے ہیں۔ بقول حضرت امیر مینائیؒ۔

آمیز جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے
یہ اختلاط دل دوستاں رہے نہ رہے

غازی آباد کے شعراء کا ایک تذکرہ ترتیب دینے کا خیال مجھ خاکسار کے دل میں آیا۔ ممکن ہے ادب اردو کی تاریخ لکھنے والوں کو اس تذکرے سے کچھ سہولت بہم پہنچے۔

ضیا میرٹھی:۔ کرشن مراری لال برہمن ضیا تخلص۔ ولادت ضلع میرٹھ میں بتاریخ ۱۴ فروری ۱۹۱۴ء۔ ابھی ۸ برس کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بڑے بھائی نے پرورش کی۔ حسب دل خواہ تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ اُردو اور ہندی مڈل پاس کیا اور اپنا ایک مدرسہ جاری کیا۔ اسی اثناء میں ہائی اسکول اور اعلیٰ قابلیت کے امتحانات پاس کئے۔ کچھ عرصہ بعد ایک سرکاری منظوری یافتہ ہوئے مڈل سکول میں مدرس رہے۔ منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ آخر کو ہیڈ ماسٹری پر فائز ہوئے۔

خاندان۔ آپ کے والد بھی معلم تھے۔ آپ کی اہلیہ کا انتقال عالم شباب میں ہو گیا۔ آپ نے دوسری شادی نہیں کی۔ آپ کے دو فرزند ہیں۔ بڑے صاحبزادے ہندی میں ایم اے ہیں اور سینیر ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر۔ چھوٹے صاحبزادے لیبر آفیسر ہیں۔ یہ اُردو میں شعر کہتے ہیں اور ... تخلص فرماتے ہیں۔ جناب ضیا کا قیام بیشتر بڑے صاحبزادے کے پاس رہتا ہے یعنی سپرنٹنڈنٹ کے جونیر ہائی اسکول میں گھنٹہ گھر غازی آباد کے پاس۔

شاعری:۔ جناب ضیا میرٹھی فنِ عروض میں اچھا دخل رکھتے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی شعر کہتے ہیں۔ جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی فرماتے ہیں بہت زود گو ہیں۔ کلام معائب سخن سے پاک ہے۔ شروع میں جناب شمس میرٹھی سے تلمذ اختیار کیا کچھ کلام جناب سیماب سیماب اکبر آبادی کو دکھایا۔ ان کے پاکستان چلے جانے کے بعد کچھ کلام پر جناب علامہ کیفی دہلوی سے اصلاح لی۔

اخلاق و عادت:۔ بہت وسیع الاخلاق ہیں۔ مذہبی تعصب سے بہت دور۔ آپ کے ملنے والوں میں ہندوں اور مسلمانوں کی تعداد قریب قریب برابر ہی ہے۔ بہت سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ لباس اور غذا دونوں ہی میں تکلف نہیں۔ دودھ دہی کا شوق ہے اس لئے بھینس یا گائے ہمیشہ پالتے ہیں۔ بہت مہمان نواز اور منکسر المزاج ہیں۔ ایک بار مل کر دوسری بار ملنے کو جی چاہتا ہے۔ زبان اُردو سے بہت محبت ہے۔ انجمن یادگار امن ... کے ماہانہ مشاعرے آپ ہی کے در دولت پر ہوتے ہیں۔ ... یا اور کوئی نشہ استعمال نہیں کرتے۔ آپ کو ہندوستان سے محبت ہے اور ہمیشہ کانگریس کے ہمنوا رہے ہیں۔

آپ نے اپنی سرگزشتِ حیات کے عنوان سے ایک نظم لکھی جو درج ذیل ہے۔

نہ پوچھو ... شرح ملال غم کشتی میری
بھائی ... سرگزشت زندگی میری
بروز ... سن ... سنہ تیرہ
حسینہ فروری کا تھا ولادت جب ہوئی میری

اٹھاتے رہے ہیں یہ پدر کا سر سے میرے عین بچپن میں
بڑے بھائی نے کی بیچارگی میں پادری میری
پڑا اٹھانا بار سر پر اپنے بچوں کا جوانی میں
بچی دے کر امانت میں شریک زندگی میری
رہا مسلک ہمیشہ خدمت قوم و وطن میرا
ملا پیشہ معلم کا یہ تھی خوش قسمتی میری
مری فطرت ہے ہمدردی محبت میرا ایمان ہے
برہمن ہو کہ گبر ہے شیخ سب ہی دوستی میری
یہ دولت گر نہ کام آتی تو غم سے گھٹ کے مر جاتا
ضیا کام آ گئی ناکامیوں میں شاعری میری

نمونۂ کلام پیش ہے۔

رباعی

ہنسنا بھی کبھی عذاب ہو جاتا ہے
رونا بھی عتاب ہو جاتا ہے
افسوس یہ راز عشق ہم پر نہ کھلا
رخ کون سا کامیاب ہو جاتا ہے

دیگر

اُلفت کی بہاروں میں تجھے ڈھونڈھ لیا
دلچسپ نظاروں میں تجھے ڈھونڈھ لیا
اک شوخ طرحدار کی آنکھوں کی قسم
نازک سے اشاروں میں تجھے ڈھونڈھ لیا

قطعہ

قابلِ رشکِ جہاں ہے باعثِ اعزاز ہے
ہے وطن ہندوستاں میرا جو انساں ساز ہے
نغمہ برانداز ہوں میں جس کی زباں میں اے ضیا
وہ زباں اُردو ہے میری جس زباں پہ ناز ہے

قطعہ

بر وفات لال بہادر شاستری ـ وزیر اعظم ہندوستان۔

جو تھا طوفانوں میں دل کا آسرا جاتا رہا
کشتی ہندوستاں کا ناخدا جاتا رہا
اب لکھو تاریخ رحلت خون دل سے اے ضیا
ہمت و عزم و ارادے کا خدا جاتا رہا

نظم صبح وطن کے چند بند

پتا پتا زر نگار ✣ ذرہ ذرہ مشکبار
یہ عطائے کردگار ✣ دل مرا تجھ پر نثار

اے مری صبح وطن

تیرا نغمہ سرمدی ✣ جلوہ سحر سامری
تو ہے روح دلکشی ✣ تو ہے جانِ شاعری

اے مری صبح وطن

جناب ضیا کے اشعار کی تعداد ہزاروں میں ہے مگر افسوس ہے کہ ضیا صاحب کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں کر سکے نیچے غزل کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

غزل

نہ وہ کیف جام شراب میں نہ وہ لطف صبح و مسا میں ہے
جسے کہئے حاصل زندگی وہ تو ذکر و فکر خدا میں ہے
نہیں نالۂ دل کامراں رسا نہ اثر ہی میری دعا میں ہے
مرا آفتاب نصیب کیا ابھی ابر شام بلا میں ہے
ترا حسن زیر نقاب کیا کوئی برق دام سحاب کیا
وہی بات جو ہے حجاب میں تری رسم شرم و حیا میں ہے
جو ہے مہر و ماہ میں روشنی جو گلوں نے پائی ہے دلکشی
وہی شان و شوکت و تازگی ترے حسن رنگیں ادا میں ہے
جسے پہلے اپنا بنا لیا ۔ اُسے غیر کہہ کے اٹھا دیا
یہی ذکر ہے تری بزم میں یہی شور اہل وفا میں ہے
شب و روز رہتے تھے بدگماں جسے تم نے سمجھا تھا ناتواں
وہی اک مسافر خستہ جاں ابھی کاروانِ وفا میں ہے
میں شہید ناز ہوں اے ضیا مرا دل ہے پیار کا آئینہ
نہیں راہ حق سے گریز پا، مرا اعتقاد خدا میں ہے

غزل دیگر

ہے قدم ہوش کی منزل میں گماں تیز ابھی
توسن عقل کو ہے حاجت مہمیز ابھی
باغباں کی نظر خاص ہے اب تو ان پر
خوف گلچیں کا نہ کھائیں گل نوخیز ابھی
پینے والوں کا یہاں قحط رہا ہے شاید
ساقیا جام نظر ہے ترا لبریز ابھی

اے ضیا بن کے رہیں گے یہ چراغ محفل
داغ دل اپنے نظر آتے ہیں ضو ریز ابھی

بُغدم چچا کا عشقِ حقیقی

جوزف انوَر

محلّے میں ہمارے گھر کے عین مقابل ہمارے لنگوٹیا یار بلکہ اس سے بھی ما قبل پیریڈ کے خاص الخاص دوست ماموں رشتہ عرف بُغدم چچا کا مکان تھا۔ عجیب باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ شاعری کے علاوہ دیگر فنونِ لطیفہ یعنی پتنگ بازی کبوتر بازی، نظر بازی یعنی منجملہ دیگر زبانوں میں محاورۃً کیا سارے شہر میں ہمارے سوا ان کا کوئی مدِمقابل نہیں تھا۔ والدین کی جوتیوں کے صدقے، جیسے تیسے آٹھویں جماعت بھی پاس کر ڈالی تھی اگرچہ مزاج روزِ اوّل کے بجائے صرف لڑکپن ہی سے عاشقانہ لکھا کر لائے تھے مگر اللہ ہو غنی۔ دیکھتے ہی دیکھتے شریعت کی حدِ آخر یعنی چار عدد بیگمات کو شرفِ قبولیت عطا فرما چکے تھے تاہم شاکر نہیں تھے۔ جہاں کوئی لالہ فریب صورت قریب سے گزری کہ حضرت کی آنکھیں گرگٹ کی طرح پھیلنے سکڑنے لگ جاتیں۔ چونکہ آٹھویں جماعت پاس تھے اور آٹھویں جماعت اور شاعری کا چولی دامن کا ساتھ ہے لہٰذا اس سے قبل کہ وہ شاعری کی چولی پر اپنا دستِ نارروا بڑھاتے خود شاعری نے بڑھ کر ان کا دامن تھام لیا تھا۔ ویسے یہ ان کی ذرّہ نوازی تھی کہ مشورۂ سخن کا اعزاز انھوں نے ہمیں ہی بخشا۔

کہتے ہیں کہ افراط ہر چیز کی بُری ہوتی ہے چنانچہ بُغدم چچا کے گھر والوں نے دیکھا کہ ان کی شاعری میں مجازی رنگ ضرورت سے زیادہ آنے لگا ہے۔ تو والدین اور بزرگوں نے ان کا قافیہ تنگ کر کے انھیں گوشت کی دوکان پر بٹھا دیا۔

بزرگوں کا قول ہے کہ عاشقانہ مزاج دمِ واپسیں کے وقت بھی مشکل سے جاتا ہے۔

چنانچہ دوکان پر بھی بُغدم چچا کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی قبول صورت دوکان پر آتی کہ حضرت نہایت احتیاط سے ترازو کے پلڑے کو مٹھنوں تک چڑھا کر حسبِ زاویۂ چشم سرگیں نشست بنا کر بیٹھ جاتے اور اس توجہ سے گوشت کاٹتے گویا ڈاکٹر برنارڈ دل کی جرّاحی کر رہا ہو۔ ساتھ ہی بڑی سخن آفریں گفتگو بھی فرماتے جاتے۔

"ہائے کیا عمدہ چانپ ہے۔ لے میری طرف سے ایک اور لے لے۔ ارے عذرا تو کیا بات کرتی ہو مجنوں کی ران کا گوشت تو لیلیٰ کو بھی پسند نہیں آیا تھا۔ چانپ کھا کر دیکھ جانِ من"

آس پاس کی کنجڑیاں بُغدم چچا کی اس رگِ نازک کی پھڑکن سے واقف ہو چکی تھیں علی الصبح کنگھی چوٹی، سُرمے سے لیس ہو کر دوکان پر آ دھمکتیں اور سراپا دل و نگاہ کے سوا تو بُغدم چچا سے ادلے کے بدلے کی لالچ میں سوچہ ادلہ مفت مار لے جاتیں مگر بُغدم چچا بھی اپنے پیشے میں ماہر تھے۔ ترازو کے چند جھٹکوں ہی میں ناکوں سے اس نقصان کی تلافی فرما لیتے۔

گھر پر یہ عالم تھا کہ بیگمات میں ہفتے کے دن کلینڈر کی طرح بانٹ رکھے تھے بڑی تین بیگموں کے لئے ایک ایک دن اور سب سے چھوٹی ممتاز بیگم چونکہ ابھی کمسن تھیں۔ لہٰذا ازراہِ کرم اُن کے ابلاغ کے لئے تین دن وقف کر رکھے تھے۔ تینوں بڑی بیگم عدل و انصاف کے ترازو کا پلڑا اپنے حق میں ہلکا ہو جانے پر ناخوش بھی تھیں مگر کر بھی کیا۔ البتہ اتوار کا دن بُغدم چچا کا بھی ہوتا جس میں [illegible] کو وہ ہم سے بیت بازی یا پتنگ بازی فرماتے اور [illegible] دوشیزۂ سخن کے گیسوؤں کی مشاطگی کرتے جسے عرفِ عام میں غزل گوئی بھی کہتے ہیں۔

ممتاز بیگم اگرچہ بُغدم چچا کی چہیتی بیگم تھیں مگر ممتاز بیگم

بھی اس بات سے بخوبی واقف تھیں کہ جہاں پناہ کی پناہ گاہ میں پناہ گزینوں کی تعداد وافر ہے۔

سنیچر کا دن ممتاز بیگم کا تھا لہٰذا وہ شام ہی سے بن سنور کر بیٹھ گئیں۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے تک بُندم چچا گھر نہیں آئے تو ممتاز بیگم بھی سمجھ گئیں کہ آج جہاں پناہ دختِ غزالاں میں خشکار کرنے جا پہنچے ہیں۔ دل ہی دل میں کافی پیچ و تاب کھاتی رہیں اور بُندم چچا کو کوستی رہیں "موذی کہیں کے۔ کہتے ہیں میں تیرے لئے تاج محل بنوا دوں گا۔ آنے تو دو آج میرے تاج محل کے بجائے میں ہی اُن کا مقبرہ بنوا دیتی ہوں" دو بجے تک ہار کر دل مسوس وہ بھی کمرے کا دروازہ چٹخنی لگائے بغیر بند کر کے مسہری پر سو گئیں۔

رات کے ڈھائی بجے بُندم چچا گھر لوٹے تو ڈرے ڈرے تھے۔ جوتے انھوں نے ہاتھ میں لئے اور صحن کی دیوار پھلانگ کر دالان میں کود گئے۔ آہستہ سے ممتاز بیگم کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ ممتاز بیگم نے بھی دروازے کے بالکل قریب یعنی پیتل کی تھال رکھی تھی۔ پیتل کی تھالی گرتے ہی ٹھن۔ ٹھن... ٹن کے شور سے بڑبڑا کر ایک طرف کودے تو اُن کا پاؤں سگِ لیلیٰ کی دُم پر پڑ گیا۔ لیلیٰ نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ چیں چیں کرتے ہوئے اپنے دانت بُندم چچا کی پنڈلی میں پیوست کر دئے۔

بُندم چچا درد کی شدت سے چیخ اُٹھے۔

"ہائے رے کتیا کی بچی نے کاٹ کھایا۔"

شور شرابے سے ممتاز بیگم کے علاوہ تینوں بڑی بیگم بھی جاگ اٹھی تھیں ممتاز بیگم نے لائٹ آن کر کے فوراً دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

"اتنی رات گئے کہاں ابھی کہوں جو وہ کھانے گئے تھے۔"

ممتاز بیگم نے آہستہ مگر غصے سے کہا۔

"وہ چپ ناہنجار۔ ہائے میری پنڈلی سے تو خون بہہ رہا ہے کہاں چھپ گئی پلنگ کے نیچے سور کی بچی۔ میں ابھی تجھے ٹھیک کرتا ہوں" بُندم چچا پھر چیخے۔

"آہستہ بولو باہر دروازہ سے کان لگائے سوتنیں سن رہی ہیں" ممتاز بیگم پھر پھسپھسائیں۔ "ٹھہرو میں دوا لگاتی ہوں" یہ کہتے ہوئے ممتاز بیگم نے طاق سے ایک ڈبے میں سے کچھ نکال کر بُندم چچا کی پنڈلی پر رگڑ دیا۔

"ارے مر گیا" چلاتے ہوئے بُندم چچا نے اُچھل کر پنڈلی کی طرف دیکھا۔

"ہائے۔ ہائے مار ڈالا۔ ارے اس بدبخت نے تو مرچ بھر دیں"

دروازے کے باہر تینوں بیگموں نے پہلے تو حیرت و استعجاب سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر مسکرائیں اور دفعتہً کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

غزل

ڈاکٹر ایس۔ پی شرما تفتہ
(کوروکشیتر)

تمام عمر تو یکساں یہ من نہیں رہتا
ہمیشہ ایک سا اِن کا چلن نہیں رہتا

وہ دل کہ جس میں بھی اسیرِ محن نہیں رہتا
کہ جس کو خطرۂ دار و رسن نہیں رہتا

بشر کو چاہئے کچھ تو زباں کا پاس کرے
زباں نہیں تو وقارِ سخن نہیں رہتا

تم اپنے کپڑے اُترنے کی بات کرتے ہو
یہاں تو لاش کے اوپر کفن نہیں رہتا

غروب ہوتا ہوا دیکھے کبھی سورج
شباب ڈھلنے پہ وہ بانکپن نہیں رہتا

وجود زن ہی سے قائم ہے آدمی کا و[illegible]
بجز رتی[1] تو مدن[2] بھی مدن نہیں رہتا

کچھ ایسے بھی ہیں جہاں میں رہا پسند انسان
وطن بھی جن کی نظر میں وطن نہیں رہتا

جنابِ راز کے حلقے میں جو بھی آتا [illegible]
فنِ سخن میں وہ ناکام فن نہیں رہتا

مقام ایسے بھی آتے ہیں عشق میں تفتہ
وجودِ روح تو رہتا ہے تن نہیں رہتا

[1] رتی۔ کام دیو کی بیوی۔ [2] مدن = کام دیو

عقل و حکمت

ڈاکٹر اودے سرن ارمان

ایک بہت ہی بوڑھا شیر جو چلنے پھرنے سے بھی معذور تھا بھوکا کچھار میں پڑا پڑا موت کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ زندگی بہت ہی عزیز شے ہے کوئی بھی اس کو آسانی سے کھونا نہیں چاہتا۔ یکایک شیر نے سوچا بوڑھا شیر اور بھوکا مرے عجیب بات ہے بڑھاپے میں جب طاقتِ جسمانی ساتھ چھوڑ دیتی ہے تو عقل و حکمت ساتھ دیتے ہیں۔ یہ دنیا عقل و حکمت ہی سے جیتی جاتی ہے میں بھی عقل سے کام کیوں نہ لوں۔ وہ جگت لگانے لگا۔ ہونٹوں پر زبان پھیری (بھوک سے) ہرنوں کے تازہ خون کی للک اس کو جیسے تیسے کچھار سے باہر کھینچ لائی۔ باہر آ کر وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بغیر ہاتھ پیر ہلائے روزی روٹی نصیب نہیں ہوتی ہے لیکن ہاتھ پیر ہلانے میں عقل و دانش بھی تو شریکِ کار ہوتی ہے طاقت ہی تو ہر جگہ کام نہیں آتی۔ ناامیدی کی اُفق پر امید کی ایک کرن پھوٹی۔ اس نے کچھار کے آس پاس ہی چوہے کا ایک بل کھوجا اس نے جوانی میں دیکھا تھا کہ بہت سے چوہے منڈوے کی بالیں کتر کے کھاتے رہتے تھے اور وہ ان کو ناچیز شے سمجھ کر کبھی دھیان نہیں دیتا تھا شیر نے منڈوے کی بال کتر کر چوہے کی بل پر رکھ دی۔ بال کی خوشبو سونگھ کر ایک چوہیا باہر نکل آئی مستعدی سے کھڑے شیر نے فوراً جھپٹ کر اس کو پنجوں میں دبوچ لیا۔ بیچاری نے مدد کے لئے پتی دیو کو بلایا چوہا اس کی پکار سن کر فوراً باہر آیا تو بل سے کچھ ہی دور ایک شیر کو آرام سے لیٹا ہوا پایا اور اس کے پنجے میں گرفتار چوہیا کو دیکھا وہ بری طرح چیخ رہی تھی اور اس کی ننھی ننھی سور کے دانوں کی طرح آنکھیں چمک رہی تھیں۔ چینی مرکھو کی طرح پونچھ لٹکائے ہوئی تھی۔ یہ دیکھتے ہی چوہے کے ہوش اڑ گئے اسے دھیرے دھیرے سے کہا دادا ٹھیک کہتے تھے ہرنوں کا سردار ہمیشہ چھوٹوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اس نے دانتوں کو کٹکٹایا اور پیچھے سمٹ کر بیٹھ گیا۔ اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتا تھا

اس کے دانت کمزور کسان کے کھیت کو کتر سکتے تھے مگر شیر کے پنجوں کو نہیں۔ وہ مجبوری میں آنسو بہانے لگا۔ مگر پھر بھی اس نے ہمت نہیں ہاری اور سوچ لیا کہ جب اس کی گھروالی اس کے سامنے مر رہی ہے تو اس کا زندہ رہ کر بھی کیا ہوگا اس کو کون سا آدمی کی طرح جہیز کا لالچ ہے جو خوش خوش اپنی بیوی کو مر جانے دے۔ اس نے مضبوطی سے کہا۔

اے بوڑھے شیر تم جنگل کے راجہ ہو اور راجہ کے فرائض سے واقف ہو۔ جانوروں میں سب سے زیادہ طاقتور ہو سبھی تمہارا لوہا مانتے ہیں پھر تم کمزور چوہیا کو اپنے فولادی پنجوں میں دبائے کیوں پڑے ہوئے ہو؟ اگر تم نے اس کی کسی بے ادبی پر ناخوش ہو کر اس کو مار بھی ڈالا تو تمہاری بہادری کو چار چاند نہیں لگیں گے۔ اور اگر کھا لیا تو تمہارا [illegible] سا پیٹ بھرے گا نہیں الٹا قتل کرنے کا پاپ اور چڑھے گا کیونکہ یہ حاملہ ہے اور آٹھ دس بچوں سے کم کبھی نہیں دیتی ہے۔ یہ سن کر شیر غرایا جیسے اس کو حیرت ہوئی ہو اس نے کہا۔

"اگر تم اپنی عزیز بیوی کی جان بچانا ہی چاہتے ہو تو میرا ایک کام کرو۔ پاس آ کر سنو میری آواز بھاری ہے دور دور تک جاتی ہے کوئی جانور سن لے گا تو میری چال فیل ہو جائے گی" یہ سن کر چوہا بجائے آگے سرکنے کے سکڑ کر اور پیچھے ہٹ گیا شیر حقیقت کو بھانپ گیا۔ اور پیار سے بولا "تم ڈرو مت میں تم کو ستاؤں گا نہیں بلکہ تم سے دوستی کروں گا۔ تمہاری دوستی میرے بڑے کام آئے گی۔ میں راجہ ہوں راجہ کبھی غریبوں کو ختم نہیں کرتا ہے بلکہ ان کو بنائے رکھتا ہے۔ کیونکہ حکومت انہیں کے سہارے چلتی ہے۔ اب چوہیا کا چیخنا بند ہو گیا تھا شاید شیر کا پنجہ کچھ ڈھیلا ہو گیا تھا اور اسی لئے وہ چوہے کی طرف بڑے سکون [illegible] مگر ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی وہ مجھ جیسا چھوٹا جیو آپ کے کیا کام آ سکتا ہے

چوہے نے متعجب ہو کر کہا۔
"وہ چھوٹے لوگ بڑے لوگوں کے بہت کام آتے ہیں یہ تو
بڑے لوگوں کی قابلیت پر منحصر ہے کہ وہ اُن سے کیسے کام لیتے
ہیں۔ چھوٹے بڑے کی بات چھوڑو ہر ایک کی اپنی جگہ ایک
خاص اہمیت ہوتی ہے" یہ سن کر چوہے کے دل میں شیر کی طرف
سے کچھ یقین جاگا۔ اور وہ کچھ آگے آ گیا اس نے دونوں ہاتھ
منہ پر پھیرے خالی منہ چلایا اگلے دونوں ہاتھ پچھلے دونوں گھٹنوں
پہ ٹیک لیے آنکھیں ٹمٹمائیں مونچھیں پھڑپھڑائیں "تو کہو" وہ بولا۔
"تم کسی ایسے ہرن کے پاس جاؤ جو غیر شادی شدہ ہو شادی
شدہ ہرن آسانی سے تمہارے کہنے میں نہیں آئے گا۔ کیونکہ اس کی
بیوی اس کو اکیلا نہیں آنے دے گی اور تم سے سیکڑوں سوال پوچھے
گی۔ عورتیں بڑی شکی اور تاڑو ہوتی ہیں تم اس کے سوالوں
میں الجھ کر کہیں نہ کہیں ضرور گڑبڑ کر دوگے اور بات بگڑ جائے گی"
"شادی شدہ کی پہچان کیسے ہوگی"
"وہ جو چنچل ہے سمجھ لو غیر شادی شدہ ہے۔ تم اس سے
کہنا ایک شیر ہارٹ فیل ہو کر میرے بل کے پاس گر گیا وہیں
میری بیوی دانا دنکا چگ رہی تھی وہ اس کے نیچے کچھ
ایسی دبی کہ خود بھی نہ نکل سکی اور مجھ سے بھی نہ نکالی گئی
میں اس کے پنجوں کو کتر کتر کر بھی ہلکا نہیں کر سکا۔ تم
پل بھر کو وہاں تک چلے جاؤ اور اپنے سینگوں سے اس کا
پنجا اٹھا دینا جس سے میری بیوی نکل آئے گی۔ میں زندگی
بھر تمہارا احسان مانوں گا اور تم کو اپنے بل میں سے
نکال کر منڈوا کھلاؤں گا۔ دھرم کما لو۔ تمہاری برادری
نے سیتا ہرن کے تمام کُل کو بدنام کر دیا ہے اگر تم نے
میری بیوی کی جان بچا دی تو میں دنیا بھر میں تمہاری تعریف
کروں گا اور سالوں سے ماتھے پر لگا آ رہا یہ کلنک کا داغ
بھی چھوٹ جائے گا۔
ہرن کہنے میں آ جائے گا اور ساتھ ہو لے گا جیسے ہی
وہ سر جھکا کر پنجے کو اٹھائے گا میں اس کی گردن دبوچ
لوں گا اور تمہاری بیوی کو چھڑا دوں گا"
پھر ہنستے ہوئے بولا "پیٹ بھرنے کی ترکیب تو اچھی سوچی ہے مگر
یہ ڈھنگ تم نے کہاں سے سیکھا ہے۔"

"وہ آدمی سے۔ دیکھا نہیں؟ وہ جنگل میں آ کر بھینس بکری
وغیرہ کسی پیڑ سے باندھ دیتا ہے اور بھوکے کھانے شیر آ کر
اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور وہ ہیں آس پاس چھپا ہوا آدمی گولیاں چلا
اس کو مار ڈالتا ہے شیر جیسے بہادر کو آدمی جیسا کمزور ناکارہ
جیو مار ڈالتا ہے۔ یہ سب عقل و دانش ہی سے ہوتا ہے طاقت سے
تھوڑے ہی ہو سکتا ہے"
"بات تو صحیح ہے مگر اس طرح کسی کو دھوکا دینا تو بری بات
ہے۔ پاپ ہے"
"تم میرے پیٹ بھرنے کی ترکیب کو پاپ بتاتے ہو اور آدمی
کو دیکھو جو کمائی کر صرف تفریح کے لئے ہمارا خون بہاتا ہے"
یہ سن کر چوہا چپ ہو گیا اور چوہیا کو دیکھتا ہوا چلا گیا۔ اس
نے جلد ایک غیر شادی شدہ ہرن کو تلاش کر کے ادھر آنے
کے لئے راضی کر لیا۔ چھوٹے لوگ بڑوں کو دھوکا نہیں دیتے ہیں
صرف اسی بات پر اس نے چوہے کی باتوں پر غور نہیں کیا اور
سوچے سمجھے عمل کرنا شروع کر دیا۔ شیر تو فلم ایکٹر کی طرح اوپر
جانے پڑا ہوا تھا ہی ہرن کے سر جھکاتے ہی اس کو دھر دبا
وہ بہتیرا چھٹپٹایا مگر شیر کے آہنی پنجوں سے چھٹکارا نہ پا سکا
دونوں کی ملی بھگت کا اس کو اب اندازہ ہوا اور وہ مرتے مرتے
"کمینے غدار۔ تیرے اسلاف مرقوں گنیش جی کی سواری رہے
تو نے آج ان کا نام بھی بدنام کر دیا مکھن کی اولاد ہوتے ہوئے
بھی تجھ میں کوئی بھلائی نہیں آئی۔ زندہ شیر کو مردہ بتا کر مجھے آج
کا شکار بنوا دیا اس کے کتنی بھی کھانے میں چوہیا نہیں ہے اور
سچ ہے تو یہ اس کو بھی کھا گیا تجھے بھی کھا جائے گا۔ دنیا کے جانوروں
کے اتہاس میں یہ پہلی مثال ہے کہ ایک جانور نے دوسرے جانور
کو اس طرح دھوکے سے مروایا ہے۔ خونی کا ساتھی ہونا بڑا پاپ ہے"
کہتے کہتے ہرن کی آواز دھیمی پڑ گئی۔ چوہا دور بیٹھا بیٹھا اس کی باتوں
پر خوب خوش ہو رہا تھا اب اس کو یقین ہو گیا کہ شیر اس کی چوہیا کو منہ لگا
گیا۔ درندوں کا وشواس ہی کیا۔ بلی سانپ کتا اپنے بچوں تک
کھا جاتے ہیں۔ اس نے من کی بھڑاس نکالتے ہوئے کہا۔
"جنگل کے راجا یہ تم نے کیا کیا۔ میری چوہیا بھی کھا گئے اس سے
تمہارا پیٹ بھی نہیں بھرا ہوگا اور دوست کی بیوی کے ساتھ
کچھ کیا۔ شرنارتھی کو مار کھانے والا بہادر راجہ نہیں ہو سکتا باقی

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹیو بینک لمیٹڈ

رجسٹرڈ آفس ۷۸ محمد علی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

دہلی آفس نمبر ۲۹۵۵ نیتاجی سبھاش مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

فون نمبر:- ۲۶۸۲۶۶ — ۲۶۴۳۷۲

- ہمارے یہاں شرح سود تمام نیشنلائزڈ اور شیڈولڈ کمرشیل بینکوں کے مقابلہ ایک فیصد زیادہ ہے
- ہندوستان کا پہلا کوآپریٹیو بینک جس کو زرمبادلہ میں کاروبار کے لئے لائسنس جاری کیا گیا۔
- ہمارے بینک میں اوقاف کے جمع شدہ رقم کی آمدنی دفعہ ۱۳(۵)(الف) (۱۱) انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔

اس کے علاوہ

ہم آپ کے آرام و آسائش کی ضروریات مہیا کرنے کے لئے آسان قسطوں پر قرضہ فراہم کرتے ہیں۔ ایک فیصدی کا فرق بہت بڑا فرق ہے۔ یہ آپ کی رقم میں ہزاروں روپیہ کا اضافہ کرتا ہے آپ بھی اس کا فائدہ اٹھائیں۔

زین جی رنگون والا — منیجنگ ڈائرکٹر

حسینی ۔ ایس ڈاکٹر — (چیئرمین)

شمیم کاظم — (اسسٹنٹ جنرل منیجر شمالی ہند)

اندرا گاندھی کے ساتھ اس کے آخری لمحہ تک

مترجم عظیم فیروزآبادی

ذیل کا مضمون ترجمہ ہے میگوئل سیرالو کے اسپینی مضمون کا۔ موصوف ۱۹۵۲ء میں ہندوستان میں اسپین کے سفیر تھے ان کی کئی کتابیں انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ یہ خاکہ اندرا جی کے مزاج، ان کی پسند ناپسند اور ان کی اس مخصوص انسانی صفت کی نمائندگی کرتا ہے جسے محبت اور خلوص سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مجھے ہندوستان لوٹنے کا اتفاق ہوگا۔ یہ میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ جب اچانک یہ موقع ہاتھ آگیا۔ اس میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہ تھا آسمان پر بجلی کے کوندے کی طرح مجھے خبر ملی اور میں نے دہلی جانے والا پہلا جہاز پکڑا۔ شہر ویران اور خاموش تھا۔ ہر وقت بھیڑ سے گھری رہنے والی گلیوں میں ایک بھی آدمی نظر نہیں آرہا تھا۔ صرف سپاہیوں سے بھری لاریاں دوڑ رہی تھیں اگر ہماری کار پر سفارتی پلیٹ نہ لگی ہوتی تو شاید ہمیں گزرنے بھی نہ دیا جاتا۔ ہوائی اڈے پر مجھے وہی پرانا برہمن سکریٹری ملا جو تیس سال پہلے میری ایک سفیر کی حیثیت سے پذیرائی کرتا تھا۔

ہماری کار نے امپیریل ہوٹل کی طرف رخ کیا جہاں میں پہلی بار مقیم ہوا تھا۔ میں اپنی ان پرانی بھولی بسری یادوں کو تازہ کرنا چاہتا تھا جن کا گویا دوسرے جنم سے تعلق تھا۔ ہوٹل کا باغیچہ سکھ ٹیکسی ڈرائیوروں سے بھرا ہوا تھا جنہوں نے ان بپھرے ہوئے ہندوؤں کے ہجوم سے بچنے کے لئے وہاں پناہ لی تھی جو اپنے ہونے والے نقصان کا ان سے بدلہ لینا چاہتے تھے۔ میں نے کار کا دروازہ کھولا اور ہندوستانی گلاب اور چمبیلی کی راحت افزا خوشبو لینے کے لئے باہر سر نکالا۔ لیکن سردی کی شروعات کی وجہ سے اس کا پتہ نہ تھا۔

آخری بار اندرا کو میں نے ویانا میں دیکھا تھا۔ وزیر اعظم کرسکی نے اعزاز میں جو ڈنر دیا تھا۔ میں بھی اس میں مدعو تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہ جاذب نظر تھی۔ خدا نے اسے ایسا حسن دیا تھا جو ستاروں میں دیکھنے کو ملتا ہے اور اگر ہمیں سے لئے تو وہ ملکہ شیبا کی حیثیت رکھتی تھی۔ ایک بار اس نے مجھ سے کہا تھا "لوگ عام طور پر مجھے اتنی ہی بوڑھی سمجھتے ہیں اور وہ بھی آج کی نہیں۔ پانچ ہزار سال پرانی۔"

اس نے ایک بار مجھے یہ بھی بتایا کہ روم میں ایک شخص نے میرا پیچھا کیا جو للچائی بھوکی نظروں سے دعوت شوق دے رہا تھا۔ میں نے پولیس والے سے اس کی شکایت کی جو وہ کیا کہہ رہا تھا۔ "پولیس افسر نے مجھ پوچھا وہ کہہ رہا تھا، میں تمہیں چاہتا ہوں۔ ایک ایسی زبان میں جسے میں ہی سمجھ سکتی ہوں۔" اندرا نے جواب دیا۔ "اور میں بھی تو تم سے محبت کرتا ہوں۔" پولیس والے کا جواب تھا۔

اپنے والد کی وفات کے بعد اندرا کے پاس قلیل سرمایہ تھا۔ نہرو خاندان نے آزادی کی جنگ میں اپنی ساری دولت گنوا دی تھی۔ اس کے والد کے کریا کرم کے موقع پر میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھ سے رابطہ قائم رکھے اور آئندہ ملاقات کے خیال سے میں نے اس سے دریافت کیا کہ آئندہ آپ کا کب سفر کرنے کا ارادہ ہے۔ ایک بار جب ہم دونوں لندن میں تھے میں نے سفارتخانے سے اسے فون کیا۔ اس نے اپنے اور راجیو کے ساتھ کار میں آؤٹنگ کرنے کی مجھے دعوت دی۔ اسے ایک چھوٹا سا مکان مل گیا تھا۔ جسے وہ خریدنا چاہتی تھی یہ ایک خوشنما تنگ گلی میں تھا اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور ایک چھوٹے بچے کی طرح وہ کمرے دکھائے جنہیں وہ سجانا چاہتی تھی واپسی میں ہم دونوں پچھلی سیٹ پر تھے جب کہ راجیو اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے منہ موڑ کر کہا "ممی تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو جس مکان کو تم خریدنا چاہتی ہو اسے خریدنے کے لئے تمہارے پاس روپیہ کہاں ہے؟"

"راجیو تم ٹھیک کہتے ہو" اس نے کہا "لیکن خواب دیکھنے میں کیا حرج ہے۔"

والد کی وفات کے بعد اندرا وزیر اطلاعات بن گئی اور اس

حیثیت سے اس نے یوگوسلاویہ کا دورہ کیا جہاں میں بھی سفیر ہوگیا تھا حالانکہ وہ سرکاری مہمان تھی لیکن علی الصبح میرے ساتھ بیلگریڈ کو دیکھنے کے لئے وقت نکال لیا۔ شہر کے مضافات میں جو جنگل تھے۔ دراصل وہ انہیں دیکھنا چاہتی تھی وہ وہاں ٹہلتی رہی اور زمین پر گری ہوئی پتیوں کو چنتی رہی۔ اس وقت میرا دھیان اس طرف گیا کہ اس طرح وہ شاید اپنے والد کی یاد سے دل بہلا رہی ہے۔

وزیر اعظم ہو جانے کے بعد بھی اس نے یوگوسلاویہ کا دورہ کیا۔ اس کی آمد سے باخبر ہوتے ہی میں کار کے ذریعہ پولا گیا جو براؤنی کے جزیرے کے اس پار واقع ہے۔ جہاں اسے ٹیٹو کے ساتھ قیام کرنا تھا۔ یہ ۱۹۶۸ء کا موسم بہار تھا اور ملک اس سیاسی بحران سے گزر رہا تھا جو ٹیٹو نے اپنے حامی روس نائب صدر سے نجات حاصل کرنے کے لئے پیدا کیا تھا۔ میرے پولا پہنچنے پر یوگوسلاویہ کے ہندوستانی سفیر بھی وہاں آگئے ہم دونوں نئی دہلی ہی میں دوست بن گئے تھے۔ انھوں نے اندرا کے استقبال کی تقریب میں شامل ہونے کے لئے مجھے بھی دعوت دی۔ مجھے بیلگریڈ لوٹنا تھا لیکن ہوٹل کے اس کمرے میں جو میں نے شب باشی کے لئے لے رکھا تھا۔ ہیں خوشی میں دوسرے دن سرکاری ڈنر میں شریک ہونے کے لئے مجھے دعوت نامہ ملا۔

جزیرے کے دورے کے لئے ایک جنگی کشتی کا اہتمام کیا گیا تھا جس کی نگرانی مسلح گارڈ سے بھرا ہوا ایک ہیلی کاپٹر کر رہا تھا۔ ان میں ہندوستانی عملے کے علاوہ میں ہی ایک غیر ملکی سفیر تھا۔ اس کے بعد جہاز کی گودی میں افسر رابطہ نے مجھے مطلع کیا کہ اندرا مجھ سے ملنا چاہتی ہے وہ اس مہمان خانے میں مقیم تھی جو ٹیٹو نے شاہ ایران کے قیام کے لئے تعمیر کیا تھا یہ سمندر کے اوپر تعمیر کیا گیا تھا اور پانی کی لہروں پر پوشیدہ روشنی کی شعاعیں دل پذیر منظر پیدا کر رہی تھیں۔

دیر تک ہم چبوترے پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ یوگوسلاویہ سے فارغ ہو کر اندرا کو روس جانا تھا اور وہ اس سلسلے میں فکر مند تھی۔ خروشچیف کا تختہ الٹ دیا گیا تھا اور بریژنیف اور اس کے اردگرد کے لیڈروں کے مزاج سے وہ واقف نہیں تھی۔ اس نے مجھ سے مشورہ کیا۔ میں نے اسے خوفزدہ نہ ہونے کی صلاح دی کیونکہ روس بھی ہندوستان کے تعاون کا اس قدر طلب گار تھا جتنا خود ہندوستان چین اور پاکستان دونوں کے مشترکہ مسائل نے انھیں ایک دوسرے سے قریب کر دیا تھا اس سلسلے میں میں نے اس سے ٹیٹو سے مشورہ کرنے کے لئے کہا کیونکہ اس وقت ٹیٹو سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ روس کے ساتھ ہمارا کیا رویہ ہونا چاہیئے۔

اندرا نے اس طرح کا سوال کر کے مجھے پہلی بار متعجب نہیں کیا۔ ایک بار اس کے والد کے مکان میں ہم دونوں نے ساتھ ساتھ وزیر اعظم نہرو سے پوچھا "آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں کہ انگریز ہمیں پسند نہیں کرتے" اس نے بڑی گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور مجھے یاد آیا کہ اس سے پیشتر بھی ہم نے ایک بار محبت آمیز باتیں کی تھیں۔ اس نے کہا۔ محبت نام ہے خود کو محبوب کی ہستی میں ضم کر دینے کا۔

نئی دہلی میں میں نے ساری رات پرانی باتیں یاد کرنے میں گزار دی۔ میں جب ہندوستان آیا تھا۔ ہم دونوں ہم عمر تھے۔ میں جوان تھا اور سیدھا سادا تھا۔ وہ وزیر اعظم کی اکلوتی بیٹی تھی اس تک رسائی کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ کمو ڈی ادار راؤ نے مجھ سے کہا: میں ہندوستان میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہوں۔ ضابطہ کو بالائے طاق رکھ کر میں سیدھے اندرا کے پاس پہنچا کیونکہ معلوم تھا کہ وہ مغربی موسیقی کی دلدادہ ہے اس کے بعد اس نے ہمیشہ میری اعانت کی اور اپنے خاندان کے ایک فرد کی طرح میری پذیرائی کی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے اپنی پہلی تقریر کے وقت وہ کس قدر خوفزدہ تھی۔ اس کے بعد میں نے اسے کانگریس پارٹی کا چارج سنبھالتے دیکھا۔ میں اس وقت کی اس کی توانائی اور حوصلہ مندی کا چشم دید گواہ ہوں۔ وہ بڑی نازک اندام تھی۔ ایک کمزور قسم کی عورت لیکن جب وزارت عظمیٰ کی باگ ڈور اس نے سنبھالی تو کسی قسم کی کمزوری ظاہر نہیں ہونے دی۔

وہ شاعری، موسیقی اور مصوری کی بھی دلدادہ تھی۔ ایک صوفی کی طرح اسے اپنے باطن سے واقف ہونے کی تمنا تھی اور ہندوستانی دانشور مردوں اور عورتوں کے ذریعہ جنہیں اس کا قرب حاصل تھا اس نے فلسفہ و حکمت اور خدا کی معرفت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وہ سادھوؤں، جوگیوں اور راہبوں کے متعلق اکثر بات چیت کرتی تھی۔

میں نے اسے ہرمن ہیس کی کتاب "سفر مشرق" پڑھنے کو دی اور اس نے میری کتابوں کے انگریزی تراجم بھی پڑھے۔ ہم گویا ایک ہی خاندان کے فرد تھے اور راجیو، سنجے اور میرے بچے ہندوستان میں ساتھ ساتھ کھیلا کرتے تھے۔

آخر کار صبح کی روشنی ہوٹل کی کھڑکی سے اندر داخل ہوئی۔ ایک چھوٹی چمگادڑ رات بھر اڑتی رہی تھی۔ اب ایک گلہری اچانک آ پہنچی اور اس نے متجسس نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں ساری رات ماضی کی دنیا میں گھومتا رہا تھا اور اندرا بھی میرے تصور میں میرے ساتھ محوِ گشت رہی تھی۔ میں نے اس کی موجودگی کو اس طرح محسوس کیا جیسے اس کے آخری سفر سے پہلے اس سے ملاقات کے لئے ہندوستان میں میری واپسی اس کی ایما سے ہوئی ہو۔ جو کچھ پیش آنے والا تھا کاش اس کا علم مجھے اس سے پیشتر ہو گیا ہوتا تو میں صندل کی لکڑی کا وہ بیہ اپنے ساتھ لے آتا جو ہم دونوں کے آخری لنچ کے بعد نہرو نے مجھے دیا تھا جب بیلگریڈ میں اپنی نئی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے میں نے ہندوستان کو الوداع کہا تو مجھے رخصت کرنے کے لئے اندرا اسٹیشن تک آئی تھی۔

اس احساس سے کہ نہرو کے گھر آنے کا میرا یہ آخری موقع ہے۔ مجھے ایک گونہ خوشی محسوس ہوا۔ گولیوں کی بوچھاڑ سے مجروح اندرا کا جسم پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ درشن کے لئے لمبی قطاریں گزرتے ہوئے معززین کے صف میں میں بھی شامل ہو گیا۔ یہاں ہم وا آنکھوں سے تقریباً نہ دیکھتے ہوئے ملکہ شیبہ کی سراپا تصویر میری نظروں میں گھوم گئی۔ ہاتھ جوڑتے ہوئے میں نے نمستے کہا۔ جس کا مطلب ہوتا ہے۔ تم میں جو دیوتا ملتا ہے میں اسے سلام کرتا ہوں۔

اپنی بی کار میں مجھے بھی تابوت کے ساتھ چلنے کی دعوت دی گئی لیکن گلیاں سپاہیوں اور سوگ منانے والوں سے اس قدر کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں کہ ارتھی مشکل سے آگے بڑھ رہی تھی۔ میں جلوس سے باہر آ گیا اور اندرا کے گھر گیا۔ اس جگہ کو دیکھا جہاں اندرا کا جسم اس کے قاتلوں نے چھلنی کر دیا تھا۔ اس کے بعد میں اس جگہ پہنچا جہاں نہرو رواج کے مطابق اندرا کا کریا کرم ہونا تھا وزارت خارجہ میں تعینات میرے دوست نٹور سنگھ نے مجھے پہچان لیا اور مجھے ان غیر ملکی مہمانوں میں شامل کر دیا جو مجھ سے پہلے یہاں پہنچے تھے ان میں جان کے گل برتھ بھی تھے جو نئی دہلی میں میرے ہم عصر رہے تھے ارتھی کوئی ساڑھے تین گھنٹے میں اپنی منزل پر پہنچی۔ میت کو چتا میں رکھا گیا اور پنڈتوں نے وید شاستروں کے اشلوک اور منتر پڑھنا شروع کیا۔ پھول ہٹا کر انھوں نے میت کے ارد گرد صندل کی لکڑی کے گٹھے چن دیئے۔ راجیو گاندھی سفید کھدر کے لباس میں گاندھی کی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ انھوں نے میت کے بالوں کو درست کیا اور ان پر گھی تیل اور صندل کا پاؤڈر ملا۔ چتا کو سلگا کر میت کے چاروں طرف سات چکر لگائے اور اس آگ کو بھڑکایا جس میں اس کی ماں کا جسم بھسم ہونے والا تھا۔

چتا کی آگ کئی گھنٹے تک جلتی رہی اور جب سب کا برین چلے گئے تو عام آدمی چتا کے قریب پہنچے۔ میں بھی چتا کے پاس گیا اور شمشان گھاٹ پر اس جگہ تعظیماً سر جھکایا۔ جہاں جسم جل کر خاک ہو گیا تھا اب آگ نے سب کچھ جلا کر ختم کر دیا تھا اس کا چہرہ، اس کے پیر اس کے نازک ہاتھ اور انگلیاں سب جل گئے تھے۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ میں راجیو کے قریب کھڑا ہوں۔ راجیو نے اپنے لڑکے کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور وہ مشکل سے اپنے آنسو ضبط کر پا رہے تھے۔ میں نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا مجھے تم میں تمہاری تمہارے باپ اور تمہارے نانا کی روح محسوس ہوتی ہے۔ اس کی نظریں جیسے میرے جسم میں سرایت کر گئی۔

دوسرے دن راشٹرپتی بھون میں صدر اور وزیر اعظم کی موجودگی میں اندرا کی تعزیتی تقریب منعقد ہوئی۔ اتفاق سے دوبارہ میں راجیو کے سامنے آ گیا میں اس جوان آدمی کی آنکھوں کو کبھی نہیں بھول سکتا۔

ان میں بڑی اداسی اور غم چھپا ہوا تھا جس کا اظہار خلوص اور شکریے کے الفاظ کرنے سے قاصر ہیں۔

اس صبح مجھے دلائی لامہ کو بھی دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی جسے میں نے تقریباً پچھلے بیس سال سے نہیں دیکھا تھا جب کہ چینیوں کے حملے کے وقت اسے اپنے وطن تبت سے فرار ہونا پڑا تھا اس نے مجھے ایک چھوٹا سا تبتی کتا دیا۔ یہ کتا کئی سال تک میرے ساتھ رہا۔

اس حادثے کے متعلق ہم میں باہمی گفتگو ہوئی اور ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ کلجگ ہے۔ آہنی تباہی کا زمانہ جس میں فیصلہ آج پھیلتا ہے دھرم بھرشٹ ہو جاتا ہے۔

ان پتیوں کی طرح جو بیلگریڈ کے جنگلوں میں گری تھیں۔ اندرا کا جسم بھی زندگی کے پیڑ سے جدا ہو گیا تھا اور اس کا ذہنی جسم کو پیشتر ہی دوسری دنیا میں منتقل ہو گیا تھا۔ [illegible]

باب تنقید

(ادارہ)

کلیاتِ سراج :

ضخامت ۲۴۲ صفحات حجم ۲۰×۲۶/۸ - کاغذ، کتابت اور چھپائی ترقی اُردو بورڈ کی روایات کے مطابق قیمت ۴۴ روپے - ناشر: ترقی اُردو بیورو - ویسٹ بلاک عـ۸ - آر - کے - پورم - نئی دہلی عـ۲۲-۱۱۰۰ -

سید شاہ سراج الدین سراجؔ اورنگ آبادی کی کلیات کا شمار قدیم شاعری کے شاہ پاروں میں ہوتا ہے - جسے پروفیسر عبدالقادر سروری نے نواب سالار جنگ بہادر کی سرپرستی میں قائم ہوئی مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کے اشاعتی پروگرام کے تحت بڑی محنت اور جانفشانی سے مرتب کیا اور ۱۹۴۰ء میں شائع کیا تھا - چونکہ اب یہ کلیات نایاب ہے اس لیے ترقی اردو بیورو نے کتابت کی چند غلطیوں کی تصحیح کے بعد اس کا عکسی ایڈیشن شائع کیا ہے جس میں خطوط اور فارسی کلام کو حذف کر دیا گیا ہے -

جناب عبدالقادر سروری نے سراج کی حیات، تصنیفات اور شاعری کے عنوان سے جو مقدمہ لکھا ہے وہ ۱۴۰ صفحات پر محیط ہے جس کے مطالعہ کے بعد یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ کتابوں کے دیباچے اور مقدمہ لکھنے والے حضرات اگر اس مقدمہ کو پڑھ لیں تو انہیں دیباچہ اور مقدمہ لکھنے کی صحیح سمتوں کا پتہ چل سکے گا -

سراجؔ اورنگ آبادی کے کلام کے بارے میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ دکنی اُردو شاعری کا اس سے بہتر نمونہ نہیں مل سکتا - شاہ سراج اورنگ آبادی کی تحریر کا عکس اور شاہ سراج اورنگ آبادی کی تصاویر بھی شامل کتاب ہیں - کلیاتِ سراج، دفتر شان ہند نئی دہلی عـ۲ سے بھی مل سکتی ہے

موجِ کوثر -

جناب کوثر ساگری مدھیہ پردیش کے مشہور استاد شاعر جناب سلام ساگری کے شاگرد رشید ہیں اور مدھیہ پردیش کے گنتی کے اچھے شعراء میں ان کا شمار ہے - اُردو اکیڈمی مدھیہ پردیش کی مالی معاونت سے ان کا مجموعہ کلام موجِ کوثر شائع ہوا ہے - جس کی ترتیب و تدوین مسٹر صہبائی اور ساغر الفقائی ساگری نے فرمائی ہے -

کوثر ساگری کا کلام جس قدر اچھا اور قابل تعریف ہے مجموعہ اتنا ہی ناقص شائع ہوا ہے مگر جس طرح ایک خوبصورت اور نیک ذات کو خوبصورت نظر آنے کے لئے پشواز کی ضرورت نہیں ہے اسی طرح کوثر ساگری کے کلام کو اس بدصورت مجموعہ میں پڑھتے ہوئے بھی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا - ۱۱۲ صفحات کے اس مجموعہ کی قیمت پندرہ روپیہ ہے جو یقیناً زیادہ ہے - مگر اچھے اشعار کا لطف لینے والوں کے لیے "موجِ کوثر" واقعی ایک بہترین مجموعہ ہے - دفتر ایم - پی - اُردو رائٹرس سنگم - برکھیڑی بھوپال سے یا دفتر شان ہند نئی دہلی عـ۲ سے اسے حاصل کیا جا سکتا ہے -

گلِ صحرا :-

حضرت اعجاز وارثی اتر پردیش میں نہیں بلکہ ملک کے ان اچھے شعراء میں شمار ہوتے ہیں جن کا کلام ہر لحاظ سے قابل تعریف اور قابل مطالعہ ہوتا ہے اور جن کی شاعری میں روایتِ غزل کے بنیادی عناصر اور اہم ترین اجزا کا احترام پورے طور پر ملحوظ رکھا جاتا ہے اور نہ ہی صنف غزل کے مسلمہ خصائص سے کہیں کوئی انحراف ملتا ہے -

غزلیات - رباعیات قطعات، تاریخی قطعات اور مختلف چوبیس نظموں پر مشتمل گلِ صحرا ۱۸×۲۲/۸ سائز کے ۲۴۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے - غزل کے کچھ مختلف اشعار سنیئے :-

شامِ وعدہ اس طرح آوازِ پا آتی رہی
جانبِ در بار بار اپنی نظر جاتی رہی

دل کے ویرانے میں آہٹ ہے کوئی اب نہ صدا
یاد بھی اُن کی دبے پاؤں گزر جاتی ہے

توبہ اور سے بسے ! ذرا ہم بھی تو چل کر دیکھیں
پڑ گئے عقل پہ جن شخص کی پتھر دیکھیں
چھینٹوں کی بزمِ یار میں ہم پہ کمی نہ تھی
بیٹھے تھے گرچہ چار طرف دیکھ بھال کے
جو تیری زلف کے سائے میں گزری اس کے بعد
خدا گواہ کہ پھر کوئی رات ، رات نہ تھی
واعظ ! خیال توبہ بجا ہے مگر ابھی
میں تو بقدرِ ظرف گنہگار بھی نہیں
کتنی نازاں ہے گلستاں میں نسیم سحری
اور اگر ایسے میں وہ مست خرام آجائے

ایسے سیکڑوں اشعار اس مجموعہ میں موجود ہیں۔ یہ نہ [illegible] کہ غزلیہ اشعار ہی اس مجموعہ کی جان ہیں۔ اگر آپ [illegible] سنبھال کی صبح اور ایک نرس پڑھیں گے تو یہ فیصلہ کرنا آپ کے لئے مشکل ہو جائے گا کہ اعجاز وارثی غزل بہتر کہتے ہیں یا اچھے نظم گو ہیں

اعجاز وارثی صاحب کا پہلا مجموعہ کلام طنز و مزاح کا تھا۔ [illegible] کا نام پلیش دستی تھا۔ " پلیش دستی " اپنی طرز کا ایک بہترین طنزیہ و مزاحیہ مجموعہ تھا اور زیر نظر مجموعہ پڑھنے کے بعد یہ کہنے میں کوئی اندیشہ نہیں کہ اعجاز وارثی صاحب کو طنز و مزاح اور سنجیدہ شاعری پر یکساں قدرت حاصل ہے۔

" گل صحرا " بلا شک و شبہ ایسا شعری مجموعہ ہے جو کسی بھی قدر [illegible] اردو شاعری کی ذاتی لائبریری میں ایک خوشگوار اضافے کا موجب بن سکتا ہے۔ یہ مجموعہ پچیس روپیہ میں مجلد مصنف کے پتہ [illegible] عزیز پور سنبھل - ضلع مراد آباد - یوپی سے یا دفتر شان ہند [illegible] منگایا جا سکتا ہے۔

ادارہ

پنجرے کے پنچھی : مصنف : مانک ٹالا -
[illegible] نگار : رام لعل نابھوی - قیمت ۲۵ روپے - ۱۹۸۶ء
[illegible] - کتابی سائز - ناشر : ماڈرن پبلشنگ ہاؤس - گولا [illegible] دریا گنج نئی دہلی - ملنے کا پتہ - دفتر ماہنامہ شان ہند نئی دہلی [illegible]

[illegible] کہانیوں ، آٹھ مزاحیہ مضامین - ایک خاکہ اور ایک [illegible] سے مزین - اس مجموعہ کے مصنف افسانہ نگار کم ہیں اور ناول [illegible]

مصنف کا کہنا ہے کہ افسانوں اور مزاحیہ مضامین کی ترتیب الگ الگ نہیں رکھی۔ کچھ کہانیاں مزاحیہ ہیں اور کچھ کہانیاں پوری کی پوری طنز و مزاح سے بھرپور ہیں۔ البتہ دو خاکے آخر میں دے دیئے ہیں۔

افسانہ لکھنے کے لئے عمیق مطالعہ۔ گہرا مشاہدہ۔ مقامی نظر درکار ہے۔ افسانہ میں واقعات کی نوعیت محدود ہو لیکن محدود نوعیت کو محسوس کیا جا سکے۔ افسانہ زندگی کے مخفی گوشوں میں پھیلتا چلا جائے۔ جزئیات نگاری۔ تسلسل ، جامعیت فنی چابکدستی ، جمالیاتی لطافت اور ارضیت ہو۔ افسانہ شروع ہوتے ہی قاری کو گرفت میں لے اور یہ سب تبھی ممکن ہے جب زبان افسانوی ہو۔ تحریر میں ندرت ہو۔ بات کہنے کا سلیقہ ہو۔ زیر و بم کی کیفیت ہو۔ افسانہ حقیقت نظر آئے۔ مصنف کا مشاہدہ وسیع ہے۔ مصنف نے غیر ملکوں کی سیاحت کی ہے۔ زندگی سے نبرد آزما رہے ہیں۔ زبان بڑی خوبصورت استعمال کرتے ہیں۔ طنز کا نشتر اور مزاح کی زیریں لہریں قاری کو لطف اندوز کرتی ہیں۔ علاقے کی لسانی چھاپ تو ہونی ہی تھی۔ اردو زبان نے وقت کے دھارے کے ساتھ ساتھ بے شمار الفاظ اپنے اندر جذب کر لئے ہیں۔

مکالموں میں موزونیت اور نفاست ہے۔

افسانے سبھی عمدہ ہیں۔ بہتر ہوتا اگر انگلستان کی میکسی دنیا کی بات کرتے ہوئے وہ وہاں کی ادبی دنیا کی کہانی بھی سناتے۔ " پانی پت کی لڑائیاں " ڈرامائی انداز میں پیش کیا جا سکتا ہے طنزیہ - مزاحیہ مضامین خاکہ اور آپ بیتی۔ الگ الگ چھپنے چاہیئے تھے۔

مصنف لفظ " بنیا " کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن " بنیا " کوئی لفظ نہیں۔ محض غلط العام ہے۔

کتابت - طباعت ٹھیک ہے - سرورق خوبصورت اور قیمت مناسب ہے۔

Dr. Zakir Husain [Library] Jamia Nagar N. Delhi

Phone: 275602 Regd·No D- (DN) 353
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 NOVEMBER 1985
Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57

خرید کر پڑھیے :

مانگ کر پڑھیے :

یا پھر

چوری کر کے پڑھیے

یہ ہے ہی اتنا خوب صورت،

اتنا دل کش،

اتنا مکمّل کہ اسے کسی طرح بھی

حاصل کریں کیوں کہ

یہ فیض کی شخصیت اور فن پر ایک

شان دار ادبی دستاویز ہے ۔ اِس میں شامل ہیں :

قیمت : پندرہ روپے

★ خلوت اور جلوت کے بھید کھولنے والے ذاتی نقوش۔
★ نادر و نایاب تصویریں۔
★ سدابہار، ہزار رنگ و منتخب کلام۔
★ فیض کی شخصیت کے وہ ڈھکے چھپے گوشے جن پر سے پہلی بار پردہ اُٹھایا گیا ہے۔
★ ہندوستان، پاکستان، رُوس اور انگلستان کے دانش وروں کی مشترکہ کاوشوں کا گلدستہ۔

ساری اُردو دنیا میں شبستان کے "فیض نمبر" کا چرچا ہے

اس سے پہلے کہ اسٹاک ختم ہو جائے آج ہی اپنے قریبی نیوز ایجنٹ سے طلب کیجیے یا براہِ راست ہم سے منگوائیے۔

شبستان اُردو ڈائجسٹ، آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شانِ ہند
نئی دہلی
ایڈیٹر
سرور تونسوی

فون نمبر ۲۷۵۴۰۲ رجسٹرار آف نیوز پیپر فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۶۲/۱۲/۵۷ رجسٹرڈ نمبر ڈی (ڈی این) ۲۵۴

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انسان پرست ہوں
فیاض گوالیاری

ماہنامہ

شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

فی پرچہ ۔ ۲/۵۰ پیسے
زر سالانہ ۔/۲۴ روپیے

جلد ۴۶ دسمبر ۱۹۸۵ء شمارہ ۱۲

ماہنامہ شانِ ہند کی تازہ ترین پیشکش

ہر بار کہا دل نے

جو ملک کے مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر اودے سرن ارمان کے افسانوں کا ایسا مجموعہ ہے
جسے سال سن ۱۹۸۵ء کا سب سے بہترین افسانوی مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔
لکھائی، چھپائی اور کاغذ نیز گٹ اپ کے لحاظ سے شاید ہی اس سال میں شائع شدہ کوئی
کتاب اس کا مقابلہ کر سکے۔
۲۲۴ صفحات ۔ قیمت ۳۵ روپے
تاجرانِ کتب کو کم از کم پانچ جلدیں خریدنے پر ۳۳ ½ فیصد رعایت۔ لائبریریوں کو ۱۵ فیصدی
رعایت۔ محصول ڈاک ہر حالت میں خریداروں کے ذمہ۔

دفتر شانِ ہند۔ فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۲

''دیا پرکاش سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ نمبر ۸
انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔ سرورق ریز کو پرنٹرز لمیٹڈ نئی دہلی میں چھپا۔

عورتوں کی نس بندی

نئے طریقے (آلۂ دوربین) کے ذریعے

- آسان، محفوظ نیز قابلِ اعتماد طریقے سے۔
- آپریشن ماہر اور جراحی میں قابل ترین ڈاکٹروں کے ذریعہ
- ہسپتال میں داخل ہونے کی ضرورت نہیں

دلی کے تمام بڑے ہسپتالوں میں یہ آسانیاں حاصل ہیں۔

یاد رکھیے

دو بچوں کا سُندر سپنا
سورگ بنا لو یہ گھر اپنا

مزید معلومات کے لئے اپنے نزدیکی فیملی ویلفیر سنٹر / ہسپتال سے رجوع کریں

ڈائریکٹوریٹ آف فیملی ویلفیر دہلی انتظامیہ دلی

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ صبا چہ کرد؟

ارجن سنگھ

ع زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا

کچھ ایسی ہستیاں ہوتی ہیں جنھیں قدرت کچھ ایسی صلاحیتیں ودیعت کر دیتی ہے جن سے وہ اپنی ایک الگ ہی پہچان رکھتے ہیں اور قدرت اُن سے ایسے کام سرانجام دلاتی ہے کہ جن کی اہمیت اور افادیت اس قدر اہم ہوتی ہے کہ دشمن کی زبان سے بھی بے ساختہ نکل جاتا ہے۔ اللّٰھمّ زِد فزِد

جناب ارجن سنگھ ایسی ہی ایک ہستی ہیں جنھیں قدرت نے عقلِ سلیم سے اس قدر نوازا ہے کہ آج اُن کی ایک ایسی پہچان بن گئی ہے جو رہتی دُنیا تک قائم رہے گی اور اُن کی یہ پہچان ہے "مسئلہ پنجاب کو بخیر و خوبی حل کرانے میں ایک ایسا اہم رول.. جسے ہندوستانی عوام ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

ہمارے محبوب وزیر اعظم جناب راجیو گاندھی نے جناب ارجن سنگھ کو مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ سے آنِ واحد میں پنجاب کا گورنر بنا کر چنڈی گڑھ بھجوایا۔ کیونکہ وزیر اعظم کی دور رس نظروں نے بھانپ لیا تھا کہ پنجاب کے پیچیدہ مسئلہ کے باعزت حل کے لئے اگر کوئی اہم رول ادا کر سکتا ہے تو وہ ہیں ارجن سنگھ صاحب۔ اور دُنیا نے دیکھ لیا کہ جناب ارجن سنگھ نے پنجاب کی گورنری ایک مثالی گورنری کی طرح کی۔ اور وزیر اعظم کے صلاح مشورہ سے انھوں نے پنجاب میں ایسے حالات پیدا کیے کہ انتہائی ڈرامائی انداز میں پنجاب کا مسئلہ حل ہو گیا اور وہاں عام انتخابات جس اچھے انداز اور بہتر ماحول میں ہوئے وہ بھی ایک مثالی تھے۔ اور جب پنجاب کی حکومت پنجابیوں کے نمائندوں کے حوالے ہو گئی تو وزیر اعظم نے اس قیمتی ہیرے ارجن سنگھ کو پھر دلی بلا لیا اور ایک نہایت اہم وزارت کی ذمہ داری اُن کے سپرد فرمائی۔ تاکہ ان کی صلاحیتوں سے ملک مستفیض ہو سکے

اہل دلّی کی خوش قسمتی ہے کہ کانگریس پارٹی ہائی کمان نے جنوبی دلی کے حلقہ انتخاب کے ضمنی انتخاب کے لئے کانگریس (آئی) کا لوک سبھا کے لئے اُمیدوار جناب ارجن سنگھ کو مقرر کیا ہے۔ چنانچہ اس حلقہ کے ہر ووٹر کا یہ فرض ہی نہیں بلکہ ملک دوستی ہے کہ اپنی نمائندگی کا حق جناب ارجن سنگھ کو دے تاکہ یہ آزمودہ کار کانگریس آئی کا سپاہی اپنے حلقہ انتخاب کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکے۔

دراصل ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جناب ارجن سنگھ بلا مقابلہ منتخب ہوتے اور ایسا ہونا اس امر کا اظہار ہوتا کہ اہلِ دلی ایک ایسے فرض سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں جو ملک کے تئیں اُن کے ذمہ ہے۔ مگر ہماری یہ بدقسمتی ہے کہ کانگریس آئی کی مخالف سیاسی پارٹیاں اس کی اہمیت نہیں سمجھتی ہیں کہ اگر کوئی فرد واحد ملک کے مفاد کے لئے مصروف ہے تو اُسے بلا تخصیص سیاسی مخالفت بلا مقابلہ منتخب کیا جائے۔ مگر ہمارا سیاسی شعور ابھی اس نہج پر نہیں پہنچا اور ہم سیاسی تعصب میں ملک کے مفاد تک کو بھول جاتے ہیں۔

جنوبی دلی کے ہر ووٹر کا یہ فرضِ اولین ہے۔

اپنے دل کو ٹٹولے اور ایمانداری کے ساتھ یہ فیصلہ کرے
کہ اس کا ووٹ ملک کے مفاد میں جانا چاہیئے یا محض ذات
برادری یا ناکام سیاسی پارٹیوں کے کسی امیدوار کے لئے
اسے یہ بھی نگاہ میں رکھنے کہ جناب ارجن سنگھ مدھیہ پردیش
کے وزیر اعلیٰ پانچ سال تک رہے اور ان کی وزارتِ اعلیٰ
نے مدھیہ پردیش کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔

چاربیت کا ناکام پروگرام

دلی اردو اکاڈمی نے پچھلے سال ٹونک، راجستھان
کی دو پارٹیوں کا مقابلۂ چاربیت ایوانِ غالب میں کرایا تھا
جو اس قدر کامیاب ہوا تھا کہ اہل دلی اس حربیہ فن موسیقی
و شاعری سے اس قدر مسحور ہوئے کہ اب تک اسے یاد
کیا جاتا ہے

اس مرتبہ دلی اردو اکاڈمی نے پھر اعلان فرمایا کہ ۴
دسمبر ۱۹۸۵ء کو ایوانِ غالب میں چاربیت کا پروگرام منعقد
ہو رہا ہے۔ اور یہ خصوصی پروگرام ریاستی اردو اکاڈمیوں
کی رابطہ کمیٹی کے تیسرے اجلاس میں مختلف اردو اکاڈمیوں
کے معزز سکریٹری صاحبان کے استقبال کے طور پر کیا گیا
تھا۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ رام پور کی دونوں
چاربیت پارٹیوں منجو خاں اینڈ پارٹی اور محمد احمد
خاں اینڈ پارٹی کا یہ پروگرام قطعاً ناکام تھا اور ستم [illegible]
مسٹر شبیر علی خاں شکیب نے جس انداز میں نظامت
کی وہ از خود اس پروگرام کو ناکام کرنے کی بہت
حد تک ذمہ دار تھی۔ چاربیتوں میں جو کلام پیش کیا گیا تھا
وہ نہ صرف کمزور ہی تھا بلکہ چاربیتوں کے لئے موزوں بھی
نہ تھا

ٹونک راجستھان کی دونوں چاربیت پارٹیوں نے
جس خوبی انداز میں پروگرام پیش کیا تھا اسے اہل دلی بھی
فراموش نہ کر سکیں گے۔ ٹونک کی دونوں پارٹیوں کے
پاس حضرت صولت ٹونکی۔ حضرت بسمل سعیدی ٹونکی،
[illegible] ٹونک کے شعرا کے کلام کا بہترین ذخیرہ تھا

کلام تھا۔ مگر ان پارٹیوں کے پاس بالکل معمولی کلام تھا
عالیجناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے مختلف ریاستی
اردو اکاڈمیوں کے سکریٹری صاحبان سے گذارش کی کہ
چاربیت دن دن ختم ہوتا جا رہا ہے اور اب یہ محض ٹونک
اور رام پور تک ہی محدود رہ گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ موسیقی
اور شاعری کی اس حربیہ صنف کو نابود نہ ہونے دیا جائے
اور اس کی زیادہ سے زیادہ سرپرستی کی جائے اور مختلف
اردو اکاڈمیز اگر چاربیت پارٹیوں کے پروگرام اپنی اپنی
ریاستوں میں منعقد کرائیں تو اس سے "چاربیت" کو زندگی
ملے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کنور صاحب نے "چاربیت"
کو زندہ رکھنے کے لئے بالکل مناسب اپیل فرمائی ہے۔
اور ہم چاہتے ہیں کہ دلی اردو اکاڈمی ایک بار پھر ٹونک
کی چاربیت پارٹیوں کو دلی میں مدعو کرے تاکہ اہل دلی کو
رام پور کی چاربیت پارٹیوں سے جو مایوسی ہوئی ہے اس
کا ازالہ ہو سکے۔ اس کے ساتھ ہی ہم کنور مہندر سنگھ
بیدی سحر صاحب سے یہ مودبانہ گزارش کریں گے کہ ۲۶
جنوری کے جشن جمہوریت میں مختلف ریاستوں کی پارٹیاں
جو پروگرام پیش کرتی ہیں ان میں چاربیت کا پروگرام بھی
رکھوایا جائے۔ تاکہ ملک بھر سے آئے ہوئے لاکھوں لوگ
اس حربیہ فن موسیقی و شاعری کا مظاہرہ دیکھ سکیں

اردو کا بھانگڑہ "چاربیت"

نہ معلوم روزنامہ "قومی آواز" دن دن عقل سلیم کو کیوں
تلانجلی دینے پر تلا ہوا ہے۔ پہلے تو اس نے رام لیلا ایسے
مقدس تاریخی قومی پروگرام کو نوٹنکی کے ہم پلہ قرار دیا۔ اور
اب "چاربیت" ایسے حربی اور قابل تعریف پروگرام کو اردو
کا بھانگڑہ لکھ کر ایک تیر میں دو نشانے لگاتے ہوئے
پنجاب کے ہر دل عزیز لوک گیت اور لوک ناچ نیز "چاربیت"
ایسے حربی پروگرام کا بھونڈا مذاق اڑایا ہے۔
قومی آواز کے مدیر محترم تو عام طور پر لکھنؤ رہتے ہیں اور
دلی کے قومی آواز کی ادارتی دیکھ ریکھ جناب یشپال کپور

اپنے کچھ ایسے منظورِ نظر لوگوں کے ہاتھوں میں دے رکھی ہے جو کسی روزنامے کی ادارتی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ بلکہ روزنامے کی ادارتی فرائض کے انجام دینے کی الف۔ ب سے بھی واقف نہیں ہیں۔ یہ لوگ اپنی کامیابی کا اندازہ محض اُن مکتوبات میں اپنی کی گئی تعریف سے لگاتے ہیں۔ جو محض خوشامدی مکتوب نگار محض اپنا نام یا مکتوب قومی آواز میں شائع کرانے کے لئے جھوٹی تعریف کرتے ہیں۔

دلی قومی آواز کا ادارتی اسٹاف (جناب عشرت علی صدیقی کے علاوہ) "جاریت" کی حرکی "سلیقی سے قطعاً نا واقف ہے اور کجا انگریزی کی اہمیت سے تو ان کے آباواجداد بھی واقف نہیں ہیں۔ کیا ستم ظریفی ہے کہ لیش پال کپور صاحب خود پنجابی ہوتے ہوئے پنجاب کے قابلِ فخر لوک ناچ کا بھونڈا مذاق برداشت کرنے پر مجبور رہیں۔

کانگریس دعوے تو کرتی ہے قومی یکجہتی کا اور سیکولرازم کا کانگریس کے کچھ سرکردہ اصحاب کے زیر اثر شائع ہونے والا قومی آواز دن دن زیادہ سے زیادہ مشرف بہ اسلام ہوتا جا رہا ہے اور اب تو اس میں پاکستانی اخبارات کے صفحات جوں کے توں لگا دیے جاتے ہیں جن میں بعض اوقات پاکستانی فوجی حکومت کا مذاق اڑایا ہوتا ہے یا ہندوستان کے بارے میں خیر کے کلمات نہیں ہوتے۔ آج کل جب کہ دونوں ممالک کی حکومتیں صلح و آشتی کے لئے کوشاں ہیں۔ قومی آواز میں پاکستان کی موجودہ حکومت پر کیے گئے چھینٹوں والے مضامین کو بڑی شد و مد سے شائع کیا جاتا ہے۔

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ سیکولرازم کا دعوے دار اور قومی یکجہتی کا بزعم خود علم بردار قومی آواز ملک کے لاکھوں ہندوؤں کی مقدس روایت رام لیلا کو نوٹنکی کا ہم پلہ قرار دینے پر اب تک اظہارِ ندامت کے طور پر کچھ نہ لکھنے پر اپنی متعصبانہ روش پر قائم ہے۔ کاش کہ قومی آواز کے ارباب اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور بلراج کومل کو ایوارڈ

ماہ دسمبر ۱۹۸۵ء اُردو کے ہندو دانشوروں کے لئے ایک مبارک مہینہ ثابت ہوا ہے۔ اس ماہ میں اعلان ہوا کہ ساہتیہ اکاڈمی نے ملک بھر کی انیس زبانوں میں سے اُردو کا ایوارڈ جناب بلراج کومل کو اُن کے شعری مجموعے "پرندوں بھرا آسمان" پر دیا ہے۔ جو دس ہزار روپیہ نقد اور توصیفی سند پر مشتمل ہوتا ہے۔

اور پھر ۲۰ دسمبر ۱۹۸۵ء کو بین الاقوامی غالب سیمینار کے افتتاح کے موقع پر غالب ایوارڈز کے سلسلے میں عزت مآب گیانی ذیل سنگھ صدر جمہوریہ ہند نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کو ان کی مجموعی ادبی خدمات کے سلسلے میں فخرِ غالب انعام عطا فرمایا جو دس ہزار روپیہ کا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا شمار اُردو کے صفِ اول کے معتبر ترین ادیبوں اور دانشوروں میں ہوتا ہے۔ تنقید، تحقیق اور لسانیات تینوں میں وہ پایۂ امتیاز رکھتے ہیں۔ آپ نے لسانیات کے میدان سے اردو تنقید کی نئی جہات کو روشن کیا ہے۔ ہندوستان سے باہر اُردو کو مقبول بنانے میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے جو جد و جہد کی ہے اس کی مثال نہیں مل سکتی۔

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ جب سے ساہتیہ اکاڈمی نے ایوارڈ کا سلسلہ شروع کیا ہے بلراج کومل پہلے غیر مسلم عوامی شاعر ہیں جنہیں یہ ایوارڈ دیا گیا ہے اور اسی طرح غالب انعامات بھی جب سے شروع ہوئے ہیں یہ پہلا موقع ہے کہ کسی غیر مسلم کو اُسے مجموعی ادبی خدمات پر ایوارڈ دیا گیا ہے۔

ہمیں مسرت ہے کہ اب ساہتیہ اکاڈمی اور غالب انعامات کے ناخداؤں کو یہ احساس ہونے لگا ہے کہ اُردو محض مسلمانوں کی ہی زبان نہیں ہے بلکہ غیر مسلم بھی اسے زندہ رکھنے میں پیش پیش ہیں۔ غالب انعامات دینے والوں نے دس فیصد غیر مسلمانوں اور نوے فیصدی انعامات مسلمانوں کو دیتے ہیں دو سالوں میں پندرہ میں سے تین غیر مسلم باقی ہر

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

تقسیمِ ملک کے بعد خواتین میں شاعرہ بننے کا شوق اس شدت سے اُبھرا کہ ہند و پاک کے اُردو مشاعروں میں شاعرات کے نام اس کثرت سے سُننے میں آنے لگے کہ حیرت ہونے لگی جیسے ہیروشیما میں پہلا ایٹم بم گرائے جانے کے بعد وہاں پر فصل اپنے عام سائز سے بڑی پیدا ہونے لگی تھی اسی طرح ہند و پاک کے بٹوارے میں ہونے والے قتل و خون کے بعد اُردو شاعرات کی تعداد میں دن دونا اضافہ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ کوٹھوں پر گانے والیوں کی اکثریت نے بھی شاعرات کا رُوپ دھارن کرلیا۔ اور اُردو مشاعروں میں شاعرات کی کھیپ نے مشاعروں ایسی شئے لطیف کو شئے کثیف بناکر رکھ دیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ شاعرات واقعی قابلِ احترام اور قابلِ فخر ہیں اور وہ انتہائی شریف اور مجسمۂ اخلاق ہیں مگر ایسی اُنگلیوں پر گنی جانے والی شاعرات کے مقابلہ میں وہ شاعرات جن کو شاعرات کہنا بھی لفظ شاعرہ کی توہین ہے۔ اور غیر ادبی مخلوق اپنی عشوہ طرازیوں اور جنسی سکینڈلوں کے باعث منتظمین مشاعرہ پر اس قدر حاوی ہوگئیں کہ کوئی بھی مشاعرہ ان کے بغیر پھیکا سمجھا جانے لگا۔ ایسی ہر غیر شاعرہ نے کسی نہ کسی مشہور شاعر کا سہارا لے رکھا ہے اور یہ سہارے ایسے ہیں جو کمیشن وصول کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں برسرِ اقتدار لوگوں تک بطور تحفہ پیش کرکے اعزازات پانے لگے۔

ایک ایسی شاعرہ بھی میدان میں آدھمکی جن کے سوکالڈ شوہر نامدار کو اپنی شراب نوشی سے کام تھا ان کی سوکالڈ شاعری بے شک اپنے اور اپنے سوکالڈ شوہر نامدار کے نام نامی کو چار چاند لگادیتی تھی پھر انھیں اس سے کوئی غرض نہ تھی۔ کہا

جاتا ہے کہ کسی بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر نے انھیں ایک وزیر یا مدبر کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کرکے متعدد مطالبوں برآریوں سے ہمکنار ہوکر فائدے اُٹھائے۔ اسی شاعرہ نے ایک بہت بڑے افسر کو اپنا سہارا بنایا اور اس سہارے سے اپنا جنسی کمیشن حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی بیل او ورز تک رسائی کرادی اور ان کی شاعری میں نکھار آتا گیا۔

کچھ ایسے اُردو کے خود ساختہ دانشور بھی ہیں جو اپنے علم و عمل کے بل بوتے پر پہنچنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے تو انھوں نے ترقی، شہرت اور طلبِ زر کے لئے حوا کی ایسی بیٹیوں کو جنھیں عرفِ عام میں کال گرلز کہتے ہیں کچھ خوش ذوق بڑے لوگوں کو یہ کہہ کر پیش کیا کہ یہ "خانہ زاد" ہیں حضور آپ کی خاطر مقصود تھی اس لئے انھیں قبول فرمائیے۔ اُردو کے یہ خود ساختہ دانشور اُلجھتے ہیں ہم ایسے نہ جانے کیوں سے۔ حالانکہ ہم نے ان حضرات کی اس راہ میں کبھی خلل انداز ہونے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ مگر وہ بچے کی قوال کے مصداق ان کے دماغ اُونچی اُڑان بھرنے کی ناکام کوشش کررہے ہیں۔ اور آبیل مجھے مار کے مصداق دوسرے لفظوں میں بہ زبانِ پنجابی "پنگا" لیتے ہوئے اُلجھ رہے ہیں۔ شانِ ہند اور اس کے مدیر عزیب حقیر تونسوی سے۔

ہم بطور دوست انھیں مشورہ دیں گے کہ آپ اپنی بے غیرتی کے بل بوتے پر بے شک اقتدار اور شہرت کی سیڑھیاں طے کرتے جائیے ہماری بلا سے۔ مگر یہ یاد رہے کہ جس روز شانِ ہند میں آپ کی کارستانیوں کا پردہ چاک کرنا مقصود ہوا تو پھر ہمیں اس ارادے سے کوئی روک نہیں

ر شان ہند میں جب بھی ایسے معاملات پر کچھ لکھا جاتا
ہے تو ایڈیٹر شانِ ہند سپریم کورٹ کی طرف مُنہ کر کے
کھتا ہے تاکہ بعد میں بغلیں نہ جھانکنی پڑیں۔

شانِ ہند کے اداریوں کے باعث ہی مسٹر رفعت سروش
یسے سرکش کو غالب انسٹی ٹیوٹ کی ڈائریکٹر شپ سے برطرف
یا گیا۔ اور ہم بہت جلد اس لڑکی کا عدالت سے تصدیق
شدہ وہ حلفیہ بیان بھی شائع کر رہے ہیں جس کو رفعت
روش کے ساتھ ہی غالب انسٹی ٹیوٹ کی ملازمت سے
طرف کیا گیا۔ حالانکہ اس بے قصور لڑکی کا یہ قصور تھا کہ
اس کے بیان کے مطابق رفعت سروش صاحب نے اس
ر مجرمانہ حملہ کرنا چاہا اور ہم محترمہ شیلا کول سابق وزیر تعلیم
کومت ہند اور کانگریس صدی تقریبات کی انچارج اور
ا صدار بابر صاحب سے دریافت کریں گے کہ انھوں نے
کانگریس صدی مشاعرہ کا کنوینر رفعت سروش کو کن اوصاف
کی بناء پر بنایا۔

یہی حال پاکستان کی کچھ آزاد خیال شاعرات کا ہے
پچھلے دنوں ایک مشاعرہ پاکستانی شاعروں کے طائفے کے
ساتھ آئی تھیں۔ راقم الحروف نے اپنی زندگی میں
ویسے تو ایسی کئی عورتوں کو دیکھا ہے جو شراب نہیں پیتی
تو بل بی جائیں اور ان کے ہوش و حواس بجا رہتے ہیں مگر
پاکستانی شاعرہ نے جس بے باکی سے شراب نوشی فرمائی
اس کی مثال کسی ہندوستانی شاعرہ میں بھی نہ مل سکے گی اور
پھر کثرت شراب نوشی کے ساتھ ساتھ اچھے اشعار سنانے
اور ہر من پسند شاعر کے ہاں شب بسری بھی اُن کا من بھاتا
انداز تھا حالانکہ اُن کی اس فراخدلی کے باعث دلی اور
نئی دلی کے کئی شاعروں اور ادیبوں کی ازدواجی زندگی میں
کئی دنوں تک ہنگامے بپا رہے۔

عزیز محترم یونس دہلوی کو غالب صحافی ایوارڈ

غالب انعامات کے سلسلے میں اس سال غالب صحافی ایوارڈ
ایوارڈ شمع گروپ کے سربراہ عزیز محترم یونس دہلوی کو دیا گیا
ہے۔ غالب انعامات کے سلسلے میں ہر سال یہ شکایت
سننے میں آتی رہتی ہے کہ یہ انعامات زیادہ تر سفارشی
لوگوں کو دیئے جاتے ہیں مگر اس سال انعامات کم از کم ۵۰
فیصدی یقیناً حق داروں کو دیئے گئے ہیں۔ یونس دہلوی
صاحب نے اپنے والد محترم حافظ محمد یوسف صاحب دہلوی کی
سرپرستی اور زیر ہدایات شمع گروپ کے رسائل کے
ذریعے اُردو صحافت کو جس رکھ رکھاؤ سے نبھایا ہے
اُس کا تقاضا تھا کہ یونس صاحب کو اس اعزاز سے نوازا
جاتا۔ ہم اس اعزاز پر عزیز محترم یونس دہلوی صاحب کو مبارکباد
پیش کرتے ہیں اور ان کے اس اقدام پر تو اور بھی دلی دعائیں
دیتے ہیں کہ انھوں نے ایوارڈ کی یہ رقم ثانوی درجے کے اُردو
طالب علموں کو وظائف دینے کے لئے عطا فرمائی اور
آئندہ ہر سال شمع گروپ کی طرف سے ۵ ہزار روپیہ کے
وظائف اُردو کے طالب علموں کے لئے دینے کا اعلان
فرمایا۔

بقیہ: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

اصحاب کو انعامات دیئے گئے ہیں۔ اس طرح دو سالا
کا تناسب دس فیصدی ہے اور حالانکہ حقیقت یہ ہے
کہ اُردو کو زندہ رکھنے میں نوّے فیصدی کوشش غیر مسلم
کی ہے اور دس فیصدی مسلمانوں کی۔ اس سے نہ
چونکئے گا کہ ہندوستان میں اُردو قلم کاروں کی تعداد با
ہزار ہے اور مسلمانوں کی آٹھ ہزار۔ تاہم ادارہ شانِ
ہند جناب بابر لج کوبل اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی خدمت
میں دلی مبارکباد پیش کرتا ہے اور دعاگو ہے کہ خدا انھیں
عمرِ طویل دے۔

دلّی میں صارفین تحریک

نئی دہلی ۔ دلی انتظامیہ نے ابھی حال میں صارفین کے معاملات کے لئے ایک ڈائرکٹوریٹ قائم کیا ہے ۔ اس کا اہم مقصد صارفین تحریک کو مضبوط بنانا اور صارفین کے مفادات کی حفاظت کرنا ہے ۔ یہ اس لئے لازمی ہے کہ موجودہ بزنس سسٹم میں صارفین کی شکایات اور دشواریوں کو دور کرنے کے لئے کوئی بندوبست نہیں ہے ۔

روزمرہ کے بڑھتے ہوئے مسائل اور صارفین طبقے کی ضروریات کے پیش نظر یہ اپنے دائرہ عمل میں آزاد اور اپنی تنظیم میں وسیع تر بنیادوں کی حامل ہوگی ۔

صارفین کی رضاکار تنظیمیں، مختلف کالونیوں کے باشندوں کی بہبودی سے انجمنیں، خواتین کی بہبودی تنظیمیں اور دیگر سماج بہبودی تنظیمیں اس تحریک کو بھرپور تعاون دے سکتی ہیں ۔

اس تحریک کی بھرپور اور مکمل کامیابی اس بات پر منحصر ہے کہ خواتین زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہوں ۔ ان کے اشتراک و تعاون سے یہ تحریک اور زیادہ مضبوط اور موثر ہوگی ۔

ہر ایک کالونی میں صارفین تحریک شروع کرنے کی تجویز ہے ۔ شہریوں کی بہبودی تنظیمیں یا صارفین کے مفادات میں دلچسپی رکھنے والے افراد اس تحریک کو مقبول عام بنانے کے لئے اپنی تجاویز بھیج سکتے ہیں ۔

جگ پرویش چندر

چیف اگزیکیٹو کونسلر دلی

اولڈ سکریٹریٹ دلی

جاری کردہ : محکمہ اطلاعات و اشاعت، دہلی انتظامیہ دہلی
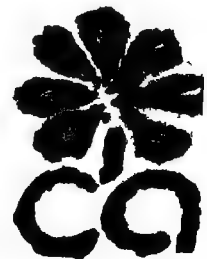
ڈی آئی پی

مشاعرہ اوسلو ۱۹۸۵ء

سید مجاہد علی
ایڈیٹر کارواں (ناروے) اوسلو

اوسلو میں سکنڈے نیویا کا پہلا عظیم الشان اُردو / پنجابی مشاعرہ تین نومبر ۸۵ء کو منعقد ہوا۔ اس مشاعرے کا اہتمام کثیر الثقافتی ایکٹیویٹی سنٹر اوسلو نے کیا۔ جس کے روحِ رواں سید مجاہد علی ماہنامہ "کاروان"۔ اوسلو کے مدیر بہر دبیر تھے۔ (ادارہ)

مشاعرے کا مقصد ایک طرف اُردو اور پنجابی جاننے والے تارکینِ وطن کے ذوقِ سماعت کی تسکین کے لئے ایک تقریب کا اہتمام تھا تو دوسری طرف نارویجین معاشرے کو یہ باور کرانا مقصود تھا کہ تارکینِ وطن بھی بعض ایسی قیمتی ثقافتی روایات لے کر آئے ہیں جن کا بیج نئی سرزمین میں بویا جاسکتا ہے۔ منتظمین کے نزدیک دانشورانہ سطح پر باہمی گفت و شنید اس سلسلہ میں اہم کردار ادا کرسکتی تھی لہٰذا اس بات کا اہتمام کیا گیا تھا کہ مہمان شعرائے کرام مقامی ادیبوں، صحافیوں اور سیاسی و سماجی زندگی سے متعلق مختلف لوگوں سے مل سکیں۔

مشاعرہ اوسلو ۱۹۸۵ء میں شرکت کے لئے ہندوپاک کے نامور ترین شعراء کو دعوت دی گئی تھی لیکن بعض شعراء مختلف وجوہ کی بنا پر شرکت نہیں کرسکے تاہم بھارت سے علی سردار جعفری اور پاکستان سے شریف کنجاہی، قتیل شفائی، حمایت علی شاعر، ضمیر جعفری جمیل الدین عالی اور شاہد لطفی، لندن سے احمد فراز اور افتخار عارف اور سویڈن سے احمد فقیہہ مشاعرے میں شرکت کے لئے تشریف لائے۔ اُردو کے ممتاز نقاد اور انگریزی زبان کے نامور صحافی محمد علی صدیقی بھی کراچی سے تشریف لائے تھے۔ مہمانوں کی آمد جمعہ یکم نومبر کو ہی شروع ہو گئی اور ۲ نومبر کی شام تک سب مہمان اوسلو پہنچ گئے۔ مقامی معاشرے سے مہمانوں کے

شناسائی کا عمل ۲ نومبر سے شروع ہو گیا۔ مشاعرے سے پہلے تمام مہمانوں کو نارویجین پارلیمنٹ کی سیر کرائی گئی۔ ملک کی سب سے بڑی پارٹی آر بائیدو پارٹی (لیبر پارٹی) کی طرف سے رکن اسمبلی آنے لیسے ڈروم (ANNE LISED RUM) اور اوسلو کے مضافاتی علاقے لورنس کوگ (LORENSKOG) کی بلدیاتی کونسل کے پاکستانی رکن اسلم احسن جو آر بائیدو پارٹی میں نمایاں شمار ہوتے ہیں اور پاکستان ورکرز ویلفیئر یونین کے سیکریٹری اطلاعات ہیں نے میزبانی کے فرائض انجام دیئے۔ آنے لیسے ڈروم نے مہمانوں کو اسمبلی کی عمارت کی سیر کرائی اور ملک کی پارلیمانی تاریخ اور سیاسی نظام کے بارے میں قابلِ قدر معلومات بہم پہنچائیں۔ اس موقع پر چائے کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔

تین بجے سہ پہر اوسلو کنسرٹ ہاؤس میں جو اوسلو کا سب سے شاندار ہال ہے۔ مشاعرے کے سلسلے میں پروگرام کا آغاز ایک غیر رسمی ملاقات سے ہوا۔ اس میں پاکستانی تنظیموں کے نمائندوں کے علاوہ نارویجین ادیب و صحافی اور سماجی کارکن بڑی تعداد میں موجود تھے مٹھائی، سموسوں اور چائے سے شرکاء کی تواضع کی گئی۔

چار بجے سہ پہر باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ تاہم پروگرام کا یہ حصہ انگریزی میں منعقد کیا گیا تھا۔ تاکہ نارویجین حاضرین کو مشاعرے اور اُردو ادب کے بارے میں تھوڑی

معلومات فراہم کی جا سکیں ۔ افسر احمد جو ناروے جین براڈ کاسٹنگ کے کارپوریشن کے اُردو پروگرام کے انچارج ہیں نے میزبانی کے فرائض انجام دیئے ۔ انھوں نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا ۔ اور شعر کو روح کی غذا قرار دیتے ہوئے امید ظاہر کی کہ اوسلو میں اس قسم کی شعری تقریبات منعقد ہونے کی روایت آگے بڑھ سکے گی ۔

اوسلو کے نائب میئر ہلس سویلاند (SVELLAND HANS) نے مشاعرے کا باقاعدہ افتتاح کرنے کی رسم نبھائی ۔ ان کے بعد پاکستان سے آئے ہوئے دانشور محمد علی صدیقی نے اُردو کی شعری روایت اور مغربی ادب سے اس کے تعلق پر مختصر گفتگو کی اور پھر مشاعرے میں شرکت کے لئے آئے ہوئے شعراء کا مختصراً تعارف بھی کرایا ۔ علی سردار جعفری ، احمد فراز اور جمیل الدین عالی نے اپنی بعض نظموں کے انگریزی تراجم پیش کئے ۔ آخر میں اوسلو یونیورسٹی کے شعبۂ ادب کے پروفیسر ایڈورڈ بائیر (EDWARD BEYER) نے ناروے کی شعری روایت پر گفتگو کی ۔ اور کلاسیکل ناروجین شعراء کے حوالے دیتے ہوئے بتایا کہ وہ سب آفاقی پیغامِ محبت پر یقین رکھتے تھے ۔

باقاعدہ مشاعرہ ۵ بجے شام شروع ہوا ۔ یاسمین مجاہد نے کثیر الثقافتی ایکٹیویٹی سنٹر کی طرف سے مختصراً استقبالیہ تقریر کی ۔ انھوں نے کہا کہ اوسلو میں مشاعرے کا اہتمام کسی اتفاقی حادثے کا نتیجہ نہیں ہے جب کہ اوسلو میں مقیم تارکینِ وطن کے مابین طویل ادبی و ثقافتی عمل کا نتیجہ ہے ۔ انھوں نے کہا کہ ہم نئے معاشرے میں گھلنا ملنا چاہتے ہیں لیکن اپنی شناخت کھونا نہیں چاہتے ہم یہاں سے بہت کچھ سیکھنا چاہتے ہیں لیکن انھیں بھی اپنے بارے میں بتانا چاہتے ہیں تاکہ باہمی احترام و محبت کا دو طرفہ عمل شروع ہو سکے ۔ انھوں نے کہا کہ فیض احمد فیض جو ہمارے عہد کی سب سے توانا شعری آواز تھے آج ہم میں موجود نہیں لیکن ہم ان کی کمی بتہہ دل سے محسوس کرتے ہوئے انھوں نے مشاعرے کی صدارت کے لئے اُردو کے جادو بیان شاعر علی سردار جعفری کو زحمت دی اور کہا کہ گو حمایت علی شاعر ہمارے مہمان ہیں لیکن وہ اوسلو میں پہلے مشاعرے کے میزبان بھی ہوں گے ۔ پاکستان ورکرز ویلفیئر یونین کے صدر قیصر مسعود صدیقی نے پاکستانیوں کی طرف سے تمام مہمان شعراء کو پھولوں کا گلدستہ پیش کیا ۔ یہ پھول علی سردار جعفری نے شعراء کی طرف سے وصول کئے ۔

حمایت علی شاعر جو مشاعروں کی میزبانی اور ٹیلی ویژن پروگراموں کی کمپیئرنگ میں یدِطولیٰ رکھتے ہیں نے مائک سنبھالا تو محفل کا رنگ ہی بدل گیا ۔ انھوں نے سب سے پہلے تمام شعراء کو یکے بعد دیگرے سٹیج پر آنے کی دعوت دی ۔ ایک ایک شاعر کی آمد پر پُرجوش تالیوں سے ان کا استقبال کیا جاتا ۔ سٹیج کو نہایت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا ۔ فرش پر خوبصورت پاکستانی قالین بچھا تھا اور تین اطراف سامعین کے بیٹھنے کے لئے کرسیاں لگائی گئی تھیں ۔ درمیان میں پھول آراستہ تھے ۔ سامنے گاؤ تکیوں کے ساتھ مختصر فرشی نشست بنائی گئی تھی تاکہ اسٹیج کے روایتی انداز کی جھلک نمایاں رہے ۔ ہال جس میں ۳۰۰ افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی کھچا کھچ بھرا ہوا تھا ۔ بے شمار لوگ جگہ نہ ملنے کے باعث کھڑے تھے یا فرش پر بیٹھے تھے حمایت علی شاعر نے خود اپنے کلام سے اس تاریخی محفل شعر و سخن کا آغاز کیا ۔

میں سو رہا تھا اور کوئی بیدار مجھ میں تھا
شاید ابھی تک میرا پندار مجھ میں تھا
وہ کج ادا ہی سہی میری پہچان بھی تھا وہ
اپنے نشے میں مست جو فنکار مجھ میں تھا

سویڈن سے آئے ہوئے احمد فقیہہ نے وطن سے آئے ہوئے شعراء کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ۔

یہ کربلا کے مسافر نہیں مگر پھر بھی
وطن سے شامِ غریباں کی یاد لائے ہیں

کراچی سے آئے ہوئے جواں سال شاعر شاہد نقوی کے بعد لندن سے آئے ہوئے افتخار عارف نے اپنا کلام سنایا اور اپنے پُرموقع شعروں سے محفل کا رنگ ہی بدل

دیا ہے

شگفتہ لفظ لکھے جا رہے ہیں
مگر لہجوں میں ویرانی بہت ہے
بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں
عجیب رسم چلی ہے دعا نہ مانگے کوئی

ان کے بعد احمد فراز آئے اور انھوں نے اپنی مشہور نظمیں "ہم اپنے خواب کیوں بیچیں" اور "محاصرہ" سنا کر بے پناہ داد پائی۔

طنز و مزاح کے جانے پہچانے شاعر جناب ضمیر جعفری تشریف لائے تو محفل کا سنجیدہ رنگ بدل گیا اور سامعین جناب جعفری کے چبھتے ہوئے معنی خیز اشعار پر لوٹ پوٹ ہو گئے

مغربیوں کا گھر ہے نرالا
کھیلے گورا دوڑے کالا
اک طرف پہاڑ کا ہے اک طرف سمندر ہے
اس کے بعد جو کچھ ہے بس اسی کے اندر ہے

جمیل الدین عالی نے اپنی مختصر نظموں اور دوہوں سے حاضرین کو محظوظ کیا

کتھر کتھر کانپے کاغذ اور سیاہی اُڑتی جائے
سچ کا بوجھ ترازو جو ہی لٹکتی دیر اُٹھائے

عالی جی اپنی آواز کی خرابی کے باعث سامعین کی فرمائش کے باوجود اپنا مشہور نغمہ جیوے جیوے پاکستان نہ سنا سکے۔

قتیل شفائی نے کئی غزلیں سنائی اور خوب داد پائی۔

شہرمند امھیں اور بھی اے میرے خدا کر
دستار جنھیں دی ہے انھیں سر بھی عطا کر
اک موج دبے پاؤں مرے پیچھے چلی آئی
میں خوش تھا بہت ریت پہ تصویر بنا کر

شریف کنجاہی پنجابی کے شاعر ہیں اور انھوں نے زیادہ تر (عزیز پنجابی کلام پیش کیا) تاہم انھوں نے اردو کی ایک غزل بھی سنائی

شریف جو بھی اٹھا ابر بن گیا آدمی
مقدروں میں اب کوئی گھٹا ہی نہیں

آخر میں صدر محفل علی سردار جعفری نے جعفری نے بعد اپنی متعدد نظمیں سنائیں۔ اور سامعین سے داد پائی۔ یوں اوسلو کی تاریخ کا یہ سا نحہ سا تھا تین دن کے مسلسل نشست کے بعد اپنے اختتام کو پہنچا۔

پیر کی دوپہر کو سٹی کونسل کے پاکستانی رکن خالد محمود نے مہمان شعراء کے اعزاز میں مقامی ریسٹورنٹ بہار میں ظہرانہ دیا۔ ناروے کی پارلیمنٹ کے سپیکر لو بینکو اور ان کی اہلیہ آنے لیز ہوگ جو خود بھی رکن اسمبلی ہیں بھی اس موقع پر موجود تھے۔ لو بینکو نے مہمان شعراء کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ ثقافتی تبادلہ دونوں معاشروں کے لیے قابل قدر ہوگا۔ پیکرنے اس موقع پر مہمانوں میں مشاعرہ اوسلو ۱۹۸۸ء کے سووینیئر بھی تقسیم کئے جو کثیر الثقافتی ایکٹیویٹی سنٹر نے خاص طور سے تیار کروائے تھے۔ یہ ہاتھ سے بنی ہوئی چینی کی پلیٹ تھی جس پر قدیم اور مقبول نارویجین نقش نگاری کی گئی ہے۔

اسی رات پاک نارویجین یونین کی طرف سے مہمانوں کے اعزاز میں ایک نارویجین گھر میں عشائیہ دیا گیا تاکہ مہمانوں کو ناروے کے بارے میں قریب سے معلومات حاصل کرنے کا موقع مل سکے۔ اس موقع پر مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ موجود تھے۔ یونین کی طرف سے ناروے کے بارے میں معلوماتی سلائیڈز بھی دکھائی گئیں۔

منگل کی صبح کو معزز مہمان اوسلو کا سٹی ہال دیکھنے گئے جہاں اوسلو کے میئر البرٹ نورڈنگن (NORDENGEN ALBERT) نے ان کا خیر مقدم کیا اور اپنے دستخطوں کے ساتھ اوسلو کی باتصویر کتاب انھیں پیش کی۔ بعد میں اوسلو سٹی ہال کی عظیم الشان عمارت دیکھی۔ اس کے بعد مہمان شعراء اوسلو یونیورسٹی کے انڈو ایرانین انسٹی ٹیوٹ تشریف لے گئے جہاں شعبہ اردو کے انچارج فین تھیسن نے ان کی ملاقات اردو کی تعلیم حاصل کرنے والے طلباء سے کرائی۔

باقی صفحہ ۶۲ پر

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

شاعرِ حُسن و حیات ـ جناب محمد عثمان عارف نقشبندی

وہ انسان کتنا خوش قسمت اور بلند مقام ہوتا ہے۔ جس کا ورثہ، ماحول اور معاشرہ اس کے رجحانِ طبع اور ذوق کے مطابق ہو۔ جناب محمد عثمان عارف نقشبندی صاحب کو یہ شرف و امتیاز حاصل ہے کہ ان کے ورثہ میں ذوقِ ادب و شعور ملا۔ شائع انسانیت و شرافت ملی۔ اور سرمایہ اخلاق و تصوف حاصل ہوا۔ انھوں نے شاعری و شرافت اور تصوف کے آغوش میں آنکھیں کھولیں اور وہ علمی و اخلاقی و روحانی ماحول میں پروان چڑھے۔ ان کے والد بزرگوار الحاج محمد عبد اللہ بیدل مرحوم (ڈسٹرکٹ جج) حضرت بیخود دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ بیخود مرحوم کو اپنے اس شاگرد کی شاعرانہ صلاحیت اور زبان دانی پر فخر تھا۔ انھوں نے اعتراف و اعلان کیا کہ:۔

”بیدل نے میری زبان پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ میرے پاس مالِ دنیا اور کچھ تو تھا نہیں۔ ایک زبان رکھتا تھا وہ حضرت بیدل کی نذر ہو گئی۔ ان کے سبب سے شعر میرے ہی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کمال، محنت اور جانفشانی سے، میری زبان، میرا بیان اور میرا تخیل حاصل کر لیا ہے۔“[۱]

یہی زبان و بیان اور تخیل، عارف صاحب کو وراثت میں ملا ہے۔ شعر و شاعری کے متعلق اپنے ایک انٹرویو میں عارف صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان سے موصوف کے نظریات شاعری، رجحانات، احساسات وغیرہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ ذرا ملاحظہ ہو:

”میں اپنی شاعری میں خاص طور پر یہ بھی دھیان رکھتا ہوں کہ ... شعر معائب سے پاک رہے۔ شعر میں کسی خوبی کا ہونا تو دوسری منزل ہے۔“[۱]

”میں نے نظم و غزل دونوں ہی میں اپنے شعری لب و لہجہ میں شدت احساس کی انتہاؤں کو چھونے کی کوشش کی ہے۔ جو ایک حساس فنکار کی خصوصیت ہوتی ہے۔“[۲]

”میرے یہاں شاعری کا ڈکشن نیا نہیں ہے لیکن میرے خیالات، جذبات و احساسات آپ کو بھرپور انداز میں ملیں گے اور میں نے کوشش کی ہے کہ صاف ستھری اور اچھی زبان میں اسے پیش کر دوں۔“[۳]

عارف صاحب کا تعلق داغ اسکول سے ہے۔ وہ شعر کو لفظی و معنوی معائب سے پاک رکھنے پر زور دیتے ہیں اور خود بھی اس پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔

عارف صاحب صرف حُسن بندشِ الفاظ کے قائل نہیں ہیں اور ہونا بھی نہیں چاہئے۔ یہ تو شعر کا ایک ظاہری وصف ہے جس میں اظہارِ خیال کا حُسن تو پایا جاتا ہے لیکن خیال کیا ہے؟ ہماری زندگی سے اس کا کتنا اور کیسا تعلق ہے؟ وہ زمانے کے تقاضوں، عصری رجحانات، ماحول و معاشرہ کے معاملات و مسائل کی ترجمانی کرتا ہے یا نہیں؟ اگر خیال صرف تخیلی یا خیالی ہے تو یہ لفظی فنکاری ہے۔ اصلیت صداقت، واقعیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ شاعری کے حُسن و جمال کو فروغ دلِ گداختہ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

عارف صاحب کو گداختہ دل پیدا کرنے کی زحمت

ہیں ہوئی وہ تصوف کو اپنی جبلت اور خمیر کا جزو پاتے ہیں اور صوفی کا دل سوز و گداز، خلوص و محبت، شرافت و انسانیت، طہارت و نفاست، صبر و قناعت، دلکشی و بے ریائی، ہمدردی، خدمتِ خلق کا گہوارہ اور سرچشمہ ہوتا ہے عارف کے دل میں جو ہوتا ہے وہی زبان پر بھی۔ سخنِ عارف کا "ترجمانِ دلِ عارف" ہے۔

حسنِ حبیب، درد، محبت، غمِ جہاں
عارف جو دل میں ہے وہی شعر و سخن میں ہے

اور حقیقت یہ ہے کہ کلامِ عارف، حسنِ حبیب، دردِ محبت اور غمِ جہاں کا [illegible] ہے۔ ایک ایک شعر ان کی دلی واردات اور ذہنی کیفیات کا ترجمان ہے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ عارف صاحب نہ صرف زبان کے رموز و نکات، اس کی سادگی و پرکاری، فصاحت و سلاست، لطافت و نزاکت سے بخوبی واقف ہیں۔ بلکہ اندازِ بیان، ایجاز و اختصار، اس کی دلکشی و تاثیر پر بھی قدرتِ کاملہ رکھتے ہیں۔ ان کو زبان و بیان کی تمام خصوصیات اور آدابِ فن سے آگاہی ہے۔ وہ زندگی اور زمانے کے مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ عصری رجحانات اور زمانے کے تقاضوں کو سمجھتے ہیں اور ان کو بہتر سے بہتر انداز میں بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں فکر و نظر کی رفعت و وسعت، جذبات و خیالات کی صداقت و طہارت [illegible] ہے۔ شعری بصیرت سے ان کا کلام ہشت پہل نگینہ کی طرح ہے جس کی آب و تاب اور چمک دمک لئے [illegible] اصنافِ سخن میں پائی جاتی ہے لیکن غزل میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ غزل میں حسنِ حبیب کا بیان بڑے والہانہ انداز میں عارف صاحب کرتے ہیں، گل افشانیٔ گفتار کا یہ انداز دوسری اصناف مثلاً رباعی، قطعہ، نظم وغیرہ میں اس لئے کم ہے کہ ان میں موضوع کے اعتبار سے خیالات کا اظہار کرنا پڑتا ہے اور اس غزل میں اشاریت و رمزیت، جوش و [illegible] اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ نظم، رباعی یا قطعہ وغیرہ میں اس حد تک نہیں ہو پاتی تاہم عارف صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ ہر صنفِ سخن کو اپنے سوزِ دروں اپنے خلوص اپنی متانت و شرافت اور ہمدردی و محبت سے شاہکار بنا دیتے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ "نذرِ وطن" نظموں پر مشتمل ہے، یہ نظمیں زبان و بیان، ہیئت و مواد کے اعتبار سے اس امر کا ثبوت ہیں کہ عارف صاحب کو اپنے فن پر پوری دسترس حاصل ہے۔ اور ان کو اپنے وطن اور وطن والوں سے کتنی والہانہ محبت ہے۔ "خارِ وطن از ملکِ سلیمان خوشتر" اور "حب الوطن من الایمان" ان کا عقیدہ اور عمل ہے۔ جناب [illegible] کے الفاظ میں:۔

"عارف کا دل جذبۂ حب الوطنی سے لبریز ہے، وہ سچے اور پکے ہندوستانی ہیں ان کا نقطۂ نظر بہت [illegible] ہے۔ ان کی نظمیں ان کے سیکولر کردار، جمہوری ذہن اور سماجی و ادبی مزاج کی آئینہ دار ہیں جن میں سے اکثر جوش اور جذبے سے بھرپور رہی ہیں"

[illegible] صاحب نے اردو شاعری اور شاعروں کی قومی و وطنی خدمات و رہنمائی کا بھی اعتراف کیا ہے۔

"اردو شاعری میں قومی و وطنی شاعری کا ایک مستقل باب ہے اردو کے شعرا اور ادیبوں نے جنگِ آزادی سے اب تک بہت جاندار اور حسین [illegible] قومی و ملکی تاریخی لٹریچر کی تخلیق کی ہے جو ہمارے ہندوستان کا بیش بہا ادبی و لسانی خزانہ ہے۔ اہلِ اردو نے ملک و قوم کا ہر مشکل میں اور ہر منزل پر نہایت خلوص اور سچائی اور دلیری سے ساتھ دیا ہے وہ خود بھی جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہیں اور اپنی تخلیقات کے ذریعہ سے عوام و خواص کو بھی سرشار و دلشاد کرتے رہتے ہیں"

سرزمینِ راجستھان ہمیشہ حریت پرور اور حریت نواز

رہی ہے، عارف صاحب اسی حریت بخش آب و ہوا میں پروان چڑھے۔ ان کے دل میں وطن کی محبت کا جذبۂ صادق نہ ہوتا تو تعجب تھا۔ وہ اپنے وطن کو ہر اعتبار سے سارے جہاں سے اچھا بنانا چاہتے ہیں۔

نذرِ وطن میں ۱۸ نظمیں ہیں اور ہر نظم ہندوستان کی عظمت اور اس کے روشن مستقبل کی ترجمان ہے۔ مادرِ وطن کو نذرِ خلوص و محبت پیش کرنے کے بعد، عارف صاحب نے حمد و نعت و منقبت کا مجموعہ "عقیدت کے پھول" (۱۹۸۱ء) شائع کیا۔ تصوف، عارف صاحب کے خمیر کا جزو ہے وہ "با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار" پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ فرقِ مراتب کا خیال رکھتے ہیں۔ نعت گوئی کی سعادت "بزورِ بازو" نصیب نہیں ہوتی۔ یہ تو اللہ کا کرم ہے جس کو حاصل ہو جائے عارف صاحب نقشبندی سلسلۂ طریقت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے روحانیات سے زیادہ قریب اور متاثر ہیں اس لئے:۔

"ان کے نعتیہ کلام میں ایک البانہ کیفیت، ایک
نیا آہنگ، ایک دلکش لے، ایک نئی تڑپ اور
ایک نئی فضا کا احساس پایا جاتا ہے اور یقیناً یہ
چیز ان کی انفرادیت کو ممیز و ممتاز کرتی ہے۔"

"قلبِ عارف، ایک عارف و سالک، صوفی و درویش کا قلب ہے۔ جو محبتِ رسول میں سرشار رہتا ہے۔ لیکن یہ سرشاری، حدِ ادب سے بڑھنے کی جرأت نہیں کرتی وہ رحمتِ عالم کے مقام و مرتبہ کا ہر لمحہ ہر پل لحاظ رکھتی ہے۔ حرمین شریفین کی زیارت اور بارگاہِ نبوی میں حاضری نے ان کے قلب کو اور زیادہ صاف اور گداز بنا دیا ہے۔ سیرتِ پاک کے مختلف پہلو اس طرح بیان کرنا کہ مبالغہ یا غلو نہ ہو اور شاعرانہ حسن بھی قائم رہے۔ حالی کی طرح عارف صاحب کی بھی خصوصیت ہے" عارف صاحب بارگاہِ نبوی میں نذرانۂ عقیدت پیش کر رہے ہیں...

انصاف و عدل وہ ہے طبیعت میں آپ کی
شاہ و گدا ہیں ایک شریعت میں آپ کی

بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھانے کو آ گئے
سینے سے بے کسوں کو لگانے کو آ گئے

• حضرت امام حسینؓ کی منقبت میں ایک مسدس "درسِ شہادت" لکھا ہے جس کا ہر بند اور بند کا ہر شعر [illegible] آموز ہے اور حق و صداقت کے لئے مرنے کو تڑپ پیدا کر [illegible] والا ہے۔ کتنی سچی بات کہی ہے کہ حسینؓ نے دنیا کو دے [illegible] ہے وہ آئین زندگی ملتی رہے گی موت میں لیکن زند [illegible] عارف صاحب امام حسینؓ کی تعلیمات حق و صداقت، قربانی و ایثار، تسلیم و رضا، عزتِ نفس و خودداری کو دہرا [illegible] اور اس کے رسول کا حکم ہے یاد دلا کر، ان کی پیروی کرنے [illegible] زور دیتے ہیں۔

وہ ظاہری اور لفظی عقیدتوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔

لفظی عقیدتیں ہیں جناب امام سے
نسبت نہیں ہے کوئی ہمیں ان کے کام سے

عہدِ حاضر میں جناب عارف صاحب نقشبندی نعت گو [illegible] حیثیت سے بھی منفرد و ممتاز مقام حاصل کر چکے ہیں [illegible] کرے حبِ رسولؐ عشقِ رسولؐ میں بدل جائے [illegible] نعت گوئی کا سلسلہ قائم رہے تاکہ اس صدی میں بھی "حسان الہند" حضرت محسن کاکوروی کے مبارک و مقد [illegible] پاکیزہ اضافہ ہوتا رہے

نذرانۂ عقیدت کے بعد عارف صاحب کی ۴۲ غزلوں [illegible] مجموعہ "تلم کی کاشت" ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ غزل کو اُر [illegible] شاعری کی آبرو کہا گیا ہے۔ غزل کی ہمہ رنگی و ہمہ جہتی [illegible] عارف صاحب کو ابتدا ہی سے متاثر و مسحور کر دیا تھا ان [illegible] اندر یہ خداداد صلاحیت موجود ہے کہ وہ ہر قسم کے جذبا [illegible] و خیالات و احساسات اور تاثرات کو غزل کی ہیئت میں بیان [illegible] کر سکیں "تلم کی کاشت" میں کشش حسن بھی ہے شیو [illegible] عشاق بھی، تہذیب رسم عاشقی بھی ہے ناز و عشوۂ محبوب بھی، حیاتِ انسانی کے مسائل و معاملات بھی ہیں، عصری [illegible] اور زمانے کے تقاضے بھی، غرض غزلیاتِ عارف، قدیم [illegible] روایات کی امین، عہدِ حاضر کے مسائل کی ترجمان او [illegible]

...ش مستقبل کی مبشر ہیں۔ عارف صاحب، عارفِ حسن ہو
...ل میں، وہ کائنات کی ہر حسین چیز سے محبت کرتے ہیں۔ وہ
...نی غزلوں میں انسانی زندگی کے ہر مسئلے اور ہر جذبے کو
...ے دلکش پیرائے میں بیان کرنے کا شعور رکھتے ہیں
...اس بات یہ ہے کہ کوئی جذبہ ہو، کوئی خیال ہو، کوئی تاثر ہو
...نگ تغزل سے خالی نہیں ہوتا۔ ان کی غزل حسن و حیات
...تاج محل ہے۔ چند اشعار دیکھئے۔

عشق کی آگ متاعِ دل و جاں ہے عارف
خاک رہ جائے جو یہ آگ بجھائی جائے

آتشِ غم سے کہو آنچ ذرا تیز کرے
تپ کے اس آگ میں کچھ اور نکھر جاؤں گا

اس دورِ خود پرست میں دیکھا جو غور سے
عارف خدا بہت ملے، انسان کم ملے

کیا شکوہ بہاروں کا عارف کس سے یہ شکایت کرتا
غنچوں کی طلب ہر شعلے نے، پھولوں کی طلب ہر خار نے کی

اپنے پہ اعتماد اگر ہے تو ڈر نہ تھکے
اک نقشِ جاوداں ہے یہ دھوکا نہ جانیے

بے لطف ہے، محروم ہے کانٹوں کی خلش سے
جو زندگی پھولوں سے ہم آغوش رہی ہے

کرو بہار کو رنگین، ہے خونِ دل حاضر
جلاؤ میرا نشیمن کہ روشنی کم ہے

دل کا رشتہ ٹوٹتے ہی چوٹ سی دل پر لگی
پھول بھی پھینکا ہے اپنوں نے تو وہ پتھر لگا

ضمانت ہے حیاتِ نو بہ نو تازہ بہ تازہ کی
نئے خورشید کا ہر صبح کرنوں میں بکھر جانا

غزل کی طرح عارف صاحب کو رباعیات و قطعات پر
...کمال حاصل ہے۔ "نوائے زندگی" مطبوعہ ۱۹۸۲ء میں ۲۹
...عیاں اور ۵۵ قطعات شامل ہیں۔ رباعی اور قطعہ
...زل سنجیدہ اور فلسفیانہ علمی و اخلاقی موضوعات کے لئے
...موزوں ہیں۔
"نوائے زندگی" پر جناب مالک رام صاحب ادیب و فلسفی

گوپی چند نارنگ جیسے باکمال محققین نے تعارف اور دیباچہ
لکھا ہے۔ مالک رام صاحب کو حیرت ہے کہ

وہ عارف صاحب نے اس جوانی کے عالم میں رباعی
اور مختصر قطعہ پر توجہ کی ہے۔ یہ امر نہ صرف ان کی
قادر الکلامی اور پختگی پر دلیل ہے بلکہ ان کی
خود اعتمادی کا بھی بین ثبوت ہے۔

واقعہ بھی یہی ہے کہ رباعی کا فن، دریا کو نہیں بلکہ
سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا فن ہے۔ اس کے موضوعات
مذہب، اخلاق، فلسفہ و تصوف، ادب، سیاست، تمدن و
معاشرت، کردار و عمل وغیرہ ہیں جو رفعتِ فکر، وسعتِ نظر، اظہار
و بیان پر قدرت کے بغیر حسن و خوبی کے ساتھ ادا نہیں کئے
جا سکتے۔ عارف صاحب میں یہ خداداد صلاحیت و صفت
موجود ہے کہ وہ ہر موضوع کو ہر صنفِ سخن میں ادا کرنے کا
شعور و سلیقہ رکھتے ہیں۔ یہ رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

سیلابِ حوادث کی فراوانی ہے ÷ انسان کو کس درجہ پریشانی ہے
اللہ رے پھر بھی یہ ثباتِ قدم ÷ جو کام ہے انسان کا طوفانی ہے

طوفان تو اٹھتا ہی چلا جاتا ہے ÷ سیلاب تو امڈا ہی چلا جاتا ہے
انسان کی کشتی کو ترا نے والو ÷ انسان تو ڈوبا ہی چلا جاتا ہے

کیوں گردشِ ایام سے گھبراتا ہے ÷ ہر دورِ زمانہ کا گذر جاتا ہے
وہ فصلِ خزاں میں بھی شگفتہ خاطر ÷ کانٹوں میں بھی جو گل بہار دکھلاتا ہے

قطعات پر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے
میں "قطعات عارفین کو، مذہبی و اخلاقی، ملکی و ملی، قومی
و وطنی، سیاسی و سماجی، ادبی و تعلیمی، خودی و خود اعتمادی
جیسے اہم موضوعات پر، عارف صاحب کی لسانی و فنی قدرت
و صلاحیت تسلیم کرتا ہوں، خشک، فلسفیانہ اور سنجیدہ
موضوعات کو بھی دلنشین انداز میں بیان کرنے کے فن پر انہیں
عبور حاصل ہے۔ "نئی زندگی" کو کتنی ولولہ انگیز زندگی ثابت
کیا ہے۔

سجا کے چاند ستاروں کی رات بھر محفل
ہر ایک صبح نئے نور میں نکھرتا ہوا،
ہر ایک غم مرے ارتقا کی منزل ہے
نئی امنگ، نئی زندگی کا مژدہ ہوں

مذکورہ بالا شعری مجموعوں کے تعارف اور مختصر ذکر سے عارف صاحب کی شاعرانہ حیثیت و صلاحیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ فطری شاعر ہیں۔ شاعری کا ملکہ خداداد دیے ہوئے شاعری قوت ہے اور یہ قوت عارف صاحب میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس قوت کی کرشمہ سازی اور برکت ہے کہ وہ ہر صنفِ سخن پر قدرتِ کاملہ رکھتے ہیں۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ سہل ہے۔ دقیق سے دقیق مسئلہ یا موضوع کو وہ دلنشین اور سلجھے ہوئے انداز میں اس طرح بیان کر جاتے ہیں کہ دل و دماغ دونوں متاثر ہو جاتے ہیں۔ "نورِ زندگی" کے ساتھ ان کا یہ فیضِ سخن "پھول کی دھڑکنیں" تک پہنچ گیا ہے۔ جس میں تقریباً ۱۳۰ غزلیات کا مجموعہ ہے کہ وہ داخل ہوئے ہیں اور اس ساز و سامان کے ساتھ کہ نئے زمانے نئے امکانات، نئے مسائل اور نئے جہان و مکان کی بھرپور ترجمانی کریں۔ ہمارے ادبی و جمالیاتی ذوق کو سنوار اور نکھاریں، زندگی کے مسائل، جدید خیالات و رجحانات سے آگاہ کریں۔

مندرجہ ذیل اشعار عارف صاحب کے اس جدید رنگِ تغزل کے آئینہ دار ہیں۔

بنتے ہیں گر ہزار دعاؤں سے آشیاں
گرتی ہیں بجلیاں بھی بڑے اہتمام سے
چار تنکے کہیں رکھ لوں گا ٹھکانے کے لیے
باغباں میں ترے گلشن کے سہارے تو نہیں
حیات روز نئے رنگ میں نمایاں ہے
جو اک چراغ بجھا سینکڑوں چراغ جلے
مسافر کام نے کچھ کام اپنے جذبۂ دل سے
نہ منزل دور ہے مجھ سے نہ میں ہی دور منزل سے
طوفان سے بچے اور رہے ساحل پہ آ کر

بے مائیگی پہ دیکھ یہ شبنم کا فیضِ عام
پھولوں پہ اور کانٹوں پہ یکساں نکھار ہے
ہوتی ہے خیالوں ہی میں تنظیم چمن کی
کردار ہی بدلے ہیں نہ گفتار ابھی تک
اُن ظلم کے ماروں کی گنتی ہے کہاں عارف
ڈرتے ہوئے ظالم کا جو نام نہیں لیتے

بقیہ: ۔ مشاعرہ اوسلو ۱۹۸۵ء

مہمانوں کو رحمان بابا کی شاعری کے انگریزی تراجم پر مشتمل کتب بھی تحفتاً پیش کی گئیں۔

بدھ کو مہمان اوسلو کے قابل دید مقامات کی سیر کرنے کے لیے گئے۔ رات کو پاکستان ورکرز ویلفیئر یونین نے ان کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔ صدر یونین قیصر سعید محمد لطیف نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ایسے معزز مہمانوں کو بلوا کر اور اوسلو میں شاندار مشاعرے کا انعقاد کر کے کثیر الثقافتی اکیڈمی نے انتہائی قابل قدر ثقافتی خدمت سرانجام دی ہے۔

جمعرات کو مہمان اوسلو کے نواح میں سیر کے لیے گئے۔ شام کو ناروجین رائٹرز یونین کے زیر اہتمام ایک شام میں شرکت کی۔ اس موقع پر محمد علی صدیقی نے اُردو شاعری کا مختصر جائزہ پیش کیا اور اس ضرورت پر زور دیا کہ اُردو ادب کے تراجم ناروجین میں ہونے چاہئیں۔ علی سردار جعفری، جمیل جالبی اور احمد فراز نے اپنی نظمیں سنائیں اور فین تحسین نے ان کے ناروجین تراجم پڑھے۔ یوں مشاعرہ اوسلو ۱۹۸۵ء کے سلسلہ میں ہونے والی تقریبات اپنے اختتام کو پہنچیں۔ یہ مشاعرہ گو ناروے بلکہ سکنڈے نیویا کی تاریخ کا پہلا مشاعرہ تھا لیکن اس کی یاد طویل عرصہ تک دلوں میں محو نہ ہو سکے گی۔

جوزف انور

دوسری قسط

"بُغدم چچا کا فوبیا"

بُغدم چچا کو سنگ لیلیٰ عرف لیلیٰ نے کیا کاٹا کہ گھر میں کہرام مچ گیا۔ خیر سے ممتاز بیگم جانتی تھیں کہ سانپ کا کاٹا تو پھر بھی پانی مانگ لیتا ہے مگر انسان اور کُتّے کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگتا وہ یہی جانتی تھیں کہ فوبیا ہو جانے پر انسان پانی سے ڈرنے لگتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگیں۔ یا اللہ میاں کو سوتنوں کی نظر بد سے بچانا۔ خدا نہ کرے اگر انھیں کچھ ہو گیا تو وہ عین جوانی میں بے آسرا ہو جائیں گی اور جب بُغدم چچا کی حرکات و سکنات میں بھی انھیں قدرے تبدیلی نظر آئی۔ تو ہزاروں وسوسے پیدا ہونے لگے سوچا دیکھیں تو سہی میاں پر پانی سے کیا ردِ عمل ہوتا ہے

بُغدم چچا مہینے میں دو مرتبہ نہاتے تھے لیلیٰ کو کاٹنے سے ایک دن پہلے ہی وہ جسمانی طہارت سے فراغت حاصل کر چکے تھے۔ پنڈلی کے زخم بھی مندمل ہو چکے تھے پھر بھی ایک دن ممتاز بیگم ڈرتے ڈرتے بولیں۔

"اللہ نے آپ کو نئی زندگی بخشی ہے غسلِ صحت فرما لیجئے۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ارے مجھے کون سا فلیریا ہو گیا تھا جو غسلِ صحت کے لئے کہہ رہی ہو" بُغدم چچا نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں میری قسم آج تو نہانا تم پر فرض بھی ہے"

"بکومت" بُغدم چچا نے پھر تڑاخ سے جواب دیا۔

اجی ہفتے میں دو دفعہ نہا بھی لئے تو کون سی آپ پر سے میل کی تین تہوں میں سے دو تہیں اتر جائیں گی

بُغدم چچا خاموش رہے۔

ممتاز بیگم کی تشویش میں اور اضافہ ہو گیا۔ شام کو انھوں نے باورچی خانہ میں پانی گرم کیا۔ بُغدم چچا اس وقت شعر گوئی کے موڈ میں بیٹھک میں بیٹھے تھے آمد کا عالم تھا اشعار سیدھی نیوں کی طرح نازل ہو رہے تھے ممتاز بیگم نے سلسلۂ آمد توڑتے ہوئے کہا۔ آپ نہا لیجئے۔ میں نے پانی گرم کر دیا ہے۔ تم بھی کمال کرتی ہو بیگم ابھی چھ دن پہلے ہی تو نہایا ہوں۔ ڈیڑھ مہینہ پہلا تو غسل صحت غسلِ میت میں بدل جائے گا جبر یا گھر تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ مجھے غزل مکمل کرنی ہے"

مگر ممتاز بیگم کی تشخیص کیسے نامکمل رہتی۔ انھوں نے پانی کی بالٹی لاکر بُغدم چچا کے سامنے رکھ دی۔

چلئے نہاتے نہیں تو بالٹی میں منہ ہاتھ دھو لیجئے

بُغدم چچا اس وقت غزل کا مطلع کہہ رہے تھے۔ مقطع میں جو سکتہ پڑا! تو آگ بگولہ ہو گئے اور بالٹی کو ایک ایسی لات ماری کہ تمام پانی فرش کے ساتھ ان کے کاغذ پر بھی پھیل گیا۔

"ستیاناس بیگم۔ تم نے میری حاصلِ مشاعرہ غزل پر پانی پھیر دیا"

"تو کون سا آپ کے ارمانوں پر پانی پھیر دیا" ممتاز بیگم بھی آپے سے باہر ہو گئیں۔ "نہانے کے لئے ہی تو بولا تھا کوئی چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کو تو نہیں بولا تھا صاف کیوں نہیں کہتے کہ پانی کاٹتا ہے پانی سے ڈر لگتا ہے۔

"ہاں ہاں مجھے پانی سے ڈر لگتا ہے پانی مجھے کاٹتا ہے۔ بُغدم چچا کا سلسلۂ آمد آورد میں تبدیل ہو چکا تھا۔

ممتاز بیگم ایک دم سنجیدہ ہو گئیں۔ دل ہی دل میں کہنے لگیں۔ ہائے اللہ انھیں تو واقعی وہ ہو گیا ابھی تو شادی کو ایک ہی سال ہوا ہے ابھی تو اُن کی جہیز کی رقم کا سود بھی وصول نہیں ہوا۔ یہ موئی کی کاٹیاں تو گل پہ گل کھلا کر گلزار بنی بیٹھی ہیں مگر اُن کے اپنے گلشنِ چمن کو تو ابھی

شادابی کے سوا اور ملا ہی کیا ہے۔

دوسرے دن ممتاز بیگم نے بڑی بیگم کے چھوٹن کو ہمارے پاس بھیجا کہ فوراً آکر بھائی جان کو بلا لاؤ۔ ہم گندم چچا کے گھر پہنچے تو ممتاز بیگم نے چک کی آڑ سے کہا بھائی میاں ان پر نہ جانے کس چڑیل کا آنچل پڑ گیا یا پاگل کتے نے کاٹ لیا۔ آثار بھی خراب نظر آ رہے ہیں آپ انھیں ہسپتال لے جا کر سوئیاں لگوا دیجئے۔ میری تو یہ ایک بھی نہیں سنتے۔

شام کو ہمارے بہت سمجھانے بجھانے بلکہ یوں کہئے کہ منت و سماجت کے بعد گندم چچا چودہ انجکشنوں کا کورس لینے پر آمادہ ہو گئے۔ مگر شرط یہ رکھی کہ روز ہم بھی اُن کے ساتھ ہسپتال جائیں گے۔

صبح جو گندم چچا کو لے کر ہم ہسپتال چلے تو ایک فرلانگ کا راستہ ایک گھنٹے میں طے کرتے کرتے ہمارے بھی چھکے چھوٹ گئے۔ بات یہ ہے کہ ہر دس قدم پر گندم چچا سے لغزش یا سرزد ہوتی اور ہمیں اُنھیں سہارا دے کر آگے بڑھانا ہوتا۔ آپ نے برڈ واچر کا نام تو سنا ہوگا مگر آج ہمارا سابقہ ایوواچر سے پڑا تھا۔ گندم چچا کی آنکھیں گھومتیں کہ راڈار اسکرین جہاں کوئی طیارہ حضرت کے راڈار اسکرین کے دائرہ گرفت میں آتا کہ حضرت کی آنکھیں گرگٹ کی طرح پھیلنے سکڑنے لگتیں اور حضرت وہیں کھڑے ہو جاتے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہمارا بھی یہ عالم ہو چکا تھا کہ جہاں حضرت کی ذرا سی بھی چال لوٹتی تو ہم گھبرا کر دائیں بائیں آگے پیچھے دیکھتے اور ہوتا بھی یہی کہ کبھی کوئی جیٹ نظر آتا تو کبھی کوئی ہنیٹ۔ ہم دل ہی دل میں گھبرائے کہ اگر اسی طرح ہم چودہ دن اہلِ میم کا للہ عشق کے ساتھ چلے تو چودہ تو کیا چار ہی دن میں اپنی [illegible] جائے گی۔

خدا خدا کر کے ہسپتال پہنچے۔ ڈاکٹر نے چودہ انجکشنوں کا کورس لکھ دیا۔ چونکہ گندم چچا انجکشن سے بہت گھبرائے تھے لہٰذا ہمیں بھی انجکشن روم ساتھ لے گئے۔ ابھی گندم چچا نے انجکشن روم میں پہلا ہی قدم رکھا تھا کہ
ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے اور آنکھیں گرگٹ کی طرح
پھیلنے اور سکڑنے لگیں۔

یا الٰہی خیر کہہ کر جو ہم نے کمرے میں جھانکا تو
ایک حسین و جمیل نرس کمرے میں مریضوں کو انجکشن
رہی تھی۔ تین چار مریضوں کے بعد نرس نے گندم
طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"چلو بڑے میاں اب تمہارا نمبر ہے"

اس اندازِ تخاطب پر پہلے تو گندم چچا چونک اُٹھے
بچھیں ہوتے ہوئے بولے "محترمہ آپ کو ہماری داڑ
مغالطہ ہو گیا ہے۔ ابھی تو ہماری عمر ہی کیا۔ صرف پچ
سال ہے ماشاء اللہ ابھی تو ہم گبرو ہیں"

"دیکھو مسٹر گبرو ہم نے تمہاری عمر نہیں پوچھی
گندم چچا پھر بھڑک اُٹھے "دیکھئے محترمہ اس عم
پر یہ بد کلامی زیب نہیں دیتی آپ کو نہیں معلوم کہ اس
آپ کو کس کا شرفِ نیاز حاصل ہے ہم شاعرِ جمال
میم۔ نون سمرقندی ہیں"

نرس سمجھ گئی کہ آج اس کا پالا کسی مردِ مومن سے
چنانچہ مسکراتے ہوئے بولیں "دیکھئے مسٹر آپ قاف
میم ہوں کہ ح۔ غین۔ دال، یہ ہسپتال ہے امام
نہیں۔ چلو پلنگ پر لیٹ جاؤ۔"

"تم ہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے" کا مصرع د
ہوئے گندم چچا پلنگ کی طرف لپکے اور لیٹتے ہوئے ا
پاجامے کے ناڑے پر ہاتھ ڈالا۔

"وہاں نہیں انجکشن پیٹ پر لگے گا" نرس نے تن
کر کہا۔

گندم چچا نے کرتا اوپر کیا۔ تو نرس نے چشم زدن
انجکشن ٹھوک کر ہانک لگائی "چلو کھڑے ہو جاؤ"
مگر گندم چچا اتنی آسانی سے کہاں شکست ماننے وا
تھے "سبحان اللہ کیا ہلکا ہاتھ ہے ماشاء اللہ آپ کے ہا
ہے کہ گلِ بنفشہ مزہ آ گیا۔ اگر اللہ نے موقع دیا تو دا

اتوں کا آپریشن بھی آپ کے ہاتھوں کراؤں گا۔
نرس مسکرا کر رہ گئی۔
چودھویں دن تو چودھویں کا چاند آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ گندم چچا کا پیٹ ہی نہیں دل، جگر، جان سب چھلنی ہو چکے تھے۔
ایک ماہ آہ و زاری میں گزر گیا۔ اسی اثناء میں گندم چچا کو تقریب ملاقات کے لئے نہایت عجیب و غریب ترکیب سوجھی راستے چلتے انہیں جو بھی کتا نظر آ جاتا اسے شو شو کرتے اور اپنی پنڈلی پر ہاتھ مارتے۔ ہوتا یہ کہ یا تو کتا دُم دبا کر بھاگ جاتا یا کسی چلتے راہگیر کو کاٹ کھاتا اور گندم چچا کلیجہ مار کر رہ جاتے۔
ایک شام گندم چچا ہمارے ساتھ سیر کو نکلے تو دیکھا ایک زبردست ڈیل ڈول کا کتا تنہا درجنوں کتوں سے مقابلہ کر رہا ہے۔ جو بھی کتا اس کی جھپٹ میں آتا ہیں..... ہیں کرتے ہوئے دُم دبا کر بھاگ جاتا
مل گیا مل گیا آج میرا شیرا مل گیا کا نعرہ لگاتے ہوئے گندم چچا کتوں کے بیچ میں کود پڑے۔ دوسرے تمام کتے تو گندم چچا کو دیکھتے ہی بھاگ گئے مگر شیرا کھڑا رہا۔
غر... ر... ر... ر گندم چچا نے شیرا کو مقابلے کے لئے للکارتے ہوئے کہا۔
غر... ر... ر... ر۔ شیرا بھی گندم چچا کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے خوفناک صورت بنا کر سامنے کھڑا ہو گیا۔
دفعتہً گندم چچا نے جست لگائی اور شیرا کی گردن پر سوار ہو کر پہلے تو اسے ایک گھونسا رسید کیا پھر اس کے جبڑے کھول کر اس کے منہ میں اپنی پنڈلی دے دی۔
شیرا کی زندگی میں ایسا جارحانہ حملہ اس پر کسی نے نہیں کیا تھا۔ بوکھلا کر اس نے سوچا کہ شیرا آج بچہ کا بھی باپ اس کے داروغہ کے پیچھے پڑ گیا۔ کاٹنے کا بھی پاؤں کا خیال آتے ہی شیرا اس بری طرح سے تڑپا کہ گندم چچا کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ گرفت ڈھیلی پڑتے ہی شیرا چیں چیں کرتے ہوئے بھاگا اور پیچھے مڑ کر دیکھنے تک کا نام نہ لیا۔

وہ بھاگ گیا نامعقول کہیں کا۔ گندم چچا نے کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا۔
سڑک پر اچھا خاصہ مجمع لگ چکا تھا لوگ حیران تھے کہ گندم چچا کو یہ کونسی نئی قسم کا فوبیا ہو گیا ہے مگر یہ فوبیا کس قسم کا تھا اس کا علم ہمیں ہی تھا۔

بقیہ: اپنا دامن اپنی آگ

اس میں جھلسا دینے والی آگ کے بھڑکتے شعلے نہیں، میٹھی میٹھی آنچ کی مسرور کن تپش ہوتی ہے —— اب ذرا سنبھل کر چلنا ورنہ زندگی بھر محبت کی خواہش کے لئے ترستی رہو گی۔"
(دیپا سی روپ میں)
کیول دھیر ہمارے معاشرے کے ان مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں جن کا تعلق انسان اور انسانیت سے بہت ہی گہرا ہوا کرتا ہے۔
"اپنا دامن اپنی آگ" کے تمام افسانوں کا اختتام انسان پرور ہے۔ محبت کی ڈور سے یہ افسانے گہرائی کے ساتھ ان دھڑکتی اور سانس لیتی ہوئی رواں دواں زندگی سے جڑے ہوئے ہیں۔
کیول دھیر کے افسانوں کے دامن میں موجِ تہ نشین کی مانند درد، کسک، تڑپ اور دھڑکتے ہوئے انسانی دلوں کی ٹیس نمایاں ہو کر ان افسانوں کی فنی قدر و قیمت میں اہم اضافہ کر دیتی ہیں۔
کیول دھیر کا انداز بیان خوشگوار، سادہ، سلیس، رواں دواں اور بڑا ہی شگفتہ ہے۔ وہ کرداروں سے حسب حال مکالمے ادا کروا کے اس میں متحرک زندگی کے رنگ بھر دیتے ہیں۔
"اپنا دامن اپنی آگ" اردو افسانہ نگاری میں خوشگوار اضافہ ہے۔ میں اس افسانوی دنیا میں استقبال کرتا ہوں اور اسے پڑھنے کا آپ کو مشورہ دیتا ہوں۔
بڑے سائز کے ۱۷۲ صفحات، بہترین کاغذ، عمدہ چھپائی، دیدہ زیب کتابت، ملٹی کلر ٹائٹل کی کشش کہ آپ تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ قیمت [illegible] روپیہ

دو غزلیں

ڈاکٹر حقیر آستانی
ڈبل ایم اے ۔ ایل ۔ ایل بی ۔ پی ایچ ڈی
(ڈی ایس اے)

طرب تم ہو، سرور تم، دل تم ہو، سسک، یہ فغاں تم ہو
ترنم آبشاروں کا، خموشی کی زباں تم ہو
اُجالا تم، اندھیرا تم، عیاں تم ہو، نہاں تم ہو
بشکلِ گردشِ دوراں، بہ رمِ وقت رواں تم ہو
زمیں تم، آسماں تم ہو، نشانِ بے نشاں تم ہو
قریب از حرکتِ دل ہو، بعید از کہکشاں تم ہو
نظر تم ہو، نظارہ تم، یہاں تم ہو، وہاں تم ہو
کہیں شعلہ، کہیں شبنم، کہیں برقِ تپاں تم ہو
مدرس تم، سبق تم، ممتحن تم، امتحاں تم ہو
نمودِ کامرانی تم ہو، سعیِ رائیگاں تم ہو
تمہی تم ہو ہواؤں میں، فضاؤں میں خلاؤں میں
حقیقت تم، فسانہ تم، حکایت، داستاں تم ہو
تماشہ گر، تماشائی، تماشہ بھی تمہی سے ہے
کہ اب ہو داورِ کون و مکاں، اب لامکاں تم ہو
معترض ہی نہ ہوں جیسے حدیثِ سیلِ تلوّن کی
ابھی تم ذرۂ خاکی، ابھی دونوں جہاں تم ہو
مسیحائی مسیحوں کی، فقیروں کی زبوں حالی
غرورِ مہوشاں تم ہو، نیازِ میکشاں تم ہو
ذرا بھی غم کی شدت میں، کمی بیشی نہیں ہوتی
اس ابدی پیاس کے مختار تم، پیرِ مغاں تم ہو
ہمارے درمیاں پردہ، نہ واجب ہے، نہ ممکن ہے
کہ سب کے راز تم، ہمراز تم ہو، رازداں تم ہو
اُسے افسوسِ ماضی، فکرِ فردا، آج کا غم کیا
کہ جس کے حال پر اے جانِ جاناں، مہرباں تم ہو
چلو مانا، حقیر بے نوا، تم ہیچ ہو، لیکن
کبھی تو رعبِ تکلم تم ہو، کبھی زورِ بیاں تم ہو

غبارِ دل کے بشکل کتاب نکلے ہیں
سوال بن گئے خود اپنا جواب نکلے ہیں
ہماری کھوج میں شاید کمی رہی ہوگی
ہمارے شوق بھی، کچھ بے حساب نکلے ہیں
نہ جانے کتنے ارادے، نہ جانے کتنے اصول
ذلیل ہو کے یہاں، خواب خواب نکلے ہیں
ضمیر جن کا مفاد کے سدِ راہ نہ تھا
وہ لوگ دیکھا، بہت کامیاب نکلے ہیں
خلوص، مہر و مروت، وفا، رواداری
ہمارے حق میں تو خانہ خراب نکلے ہیں
مدام، ایک گرہ سی لگی ہوئی باقی
کہیں حیات کے سب پیچ و تاب نکلے ہیں
کسی کی بزم نہیں ہے یہ خلوتِ دل ہے
تمام چہرے یہاں، بے نقاب نکلے ہیں
خرید کر انھیں لایا گیا تھا کن داموں
جو طاق طاق یہاں، آفتاب نکلے ہیں
ہماری پیاس تو اک بوند ہی سے مٹ جاتی
یہ کیسے بیاباں میں اتنے سراب نکلے ہیں
کٹے ہیں گردشِ دوراں نے رت جگے لاکھوں
نصیب اپنے ہی کچھ کم خواب نکلے ہیں
کیا تھا رحم کا وعدہ تو پھر کیسا ہوگا
ادھر تو قبلہ عزلتی شراب نکلے ہیں
نظر لگے نہ کسی کی خدا کرے اب تو
کسی کی آنکھ کا ہم انتخاب نکلے ہیں
ملے تھے یوں ہی سرِ راہ آج حقیر ہم سے
سنا ہے برسوں میں، گھر سے جناب نکلے ہیں

اپنا دامن اپنی آگ ۔ افسانوی ادب میں خوشگوار اضافہ

احمد جمال پاشا ۔ سیوان (بہار)

اُردو کے جدید افسانوی ادب میں ڈاکٹر کیول دھیر کی شخصیت ممتاز اور نمایاں ہے۔ اُردو افسانے کی بنیادی جہت رومانی ہے۔ جو روزِ اوّل سے افسانے اور افسانوں کی محرک رہی ہے اور رہے گی کرشن چندر اے حمید اور اشفاق احمد کے ساتھ ڈاکٹر کیول دھیر کا نام ہمیشہ بڑے اعتماد کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر کیول دھیر کی شخصیت اُردو دُنیا کے مقبول عام ادبی رسائل میں اپنے افسانوں کی وجہ سے ممتاز نظر آتی ہے۔ اور اب رومانی افسانہ نگاری میں وہ سند کا درجہ رکھتے ہیں وہ افسانوی دُنیا میں اب تک ہر اعزاز اور انعام سے نوازے جا چکے ہیں۔

"اپنا دامن اپنی آگ" میں پندرہ افسانے شامل ہیں جو چار مختلف عنوانات کے تحت ہیں۔ پنجاب کی کہانیاں دیش کی کہانیاں، سماج کی کہانیاں اور پیار کی کہانیاں پنجاب کی کہانیوں میں تین، دیش کی کہانیوں میں چار، سماج کی کہانیوں میں تین اور پیار کی کہانیوں میں پانچ افسانے شامل ہیں۔ پنجاب کی کہانیوں کی ابتدا خوف دہشت، نفرت اور فرقہ پرستی سے ہوتی ہے۔ یہ کہانیاں بڑی خوشگوار، اصلاحی اور مقصدی ہیں ان میں انسانیت کا گہرا پیغام ملتا ہے۔ وہ بہ حیثیت ایک ماہر سرجن کے معاشرے کا آپریشن کر کے اسے صحت بخشنا چاہتے ہیں۔ اور امن، سکون، بھائی چارے کے علمبردار بن کر اُبھرتے ہیں۔

"رشتوں کی پہچان" میں انسانی خون کو بنیادی رشتہ قرار دے کر وہ آفاقیت کا تصور اُبھارتے ہیں۔

"۔۔۔۔۔۔ یہ مت بھول جا کہ ہر گھر کے در و دیوار میں ندیم کی سانسوں کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ یہ خوشبو وہی ہے جو تمہارے دل و دماغ میں موجود ہے اور تمہارے خون کی لالی میں بھی نمایاں ہے۔" گوروڈیو نے ندامت سے اپنا سر جھکا لیا تھا۔ اُس رات ایک بھی گھر جلا نہیں تھا ندیم کے لہو کی خوشبو محبت بن کر ماحول میں بکھر گئی تھی۔؟

(رشتوں کی پہچان)

کیول دھیر بڑے خلاق و شاداب ذہن کے مالک ہیں اُن کے ذہن پر معاشرے میں بکھری ہوئی ہلکی سی لغزش بھی اُبھر جاتی ہے۔ جسے وہ قصے کے تانے بانے میں بُن کر جیتے جاگتے افسانے کی شکل میں پیش کر دیتے ہیں۔ اس میں ہر انسان اپنا عکس دیکھ سکتا ہے۔ کیول دھیر خواہ دیش کی کہانیاں لکھیں یا سماج کی، اُن کی نظریں واقعات کی تہہ تک پہنچ جاتی ہیں۔

کیول دھیر نے "کمپٹیشن" میں یہ دکھانے کی سعی کی ہے کہ ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کے لئے معاشرے میں کیسے کیسے حربے اختیار کئے جاتے ہیں اگر وہ عورتیں ہوں تو بازی لے جانے کے لئے جسمانی نمود و نمائش کے ساتھ جنسی نمائش تک سے گریز نہیں کرتیں۔ جسم کی خوبصورت مثال یہ افسانہ ہے۔

پیار و محبت کی کہانیاں کیول دھیر کا اصل میدان ہے ان کا پیرایۂ اظہار بے حد دلچسپ اور دلکش ہے۔ یہ محبت کی نزاکت و لطافت سے آشنا ہیں

"۔۔۔ محبت ایسی چیز نہیں، جو خواہشات کو بھڑکا کر ہیجانی کیفیت پیدا کر دے۔ محبت وہ عظیم و مقدس جذبہ ہے۔ جو جذبوں میں ہلچل تو پیدا کرتا ہے۔ لیکن اس ہلچل میں ہیجان نہیں۔ ٹھہراؤ ہوتا ہے۔"

۱۲

"خونِ جگر" اور اس کا مصنف

امر چند قیس

"خونِ جگر" حضرت جگر جالندھری کا تیسرا مجموعۂ کلام ہے۔ جو زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر ہمارے سامنے آیا ہے پہلے دو مجموعہ ہائے کلام "سوزِ جگر" اور "لختِ جگر" کی طرح پہلے بھی حکومت اور مختلف ادبی انجمنوں کی طرف سے زاز و انعامات عطا ہوئے ہیں "خونِ جگر" کو بھی قبولِ عام سند حاصل ہو رہی ہے۔

جگر جالندھری شاعری کے دبستانِ ملسیانی سے البتہ ہیں۔ جس کے بانی ابو الفصاحت قبلہ جوش ملسیانی تھے۔ جو حضرت داغ دہلوی کے آخری جانشین تھے ...ر صاحب نے جوش صاحب کے علاوہ اُن کے ایک سر کردہ شاگرد جناب ساحر سیالکوٹی سے بھی استفادہ حاصل کیا۔ اُن کی رہنمائی میں مشقِ سخن جاری رکھتے ہوئے ...ر فارغ الاصلاح ہوئے۔ اگر انھیں ساحر سیالکوٹی صاحب کا جانشین کہہ دیا جائے تو اس میں نہ مبالغہ ہو گا نہ غلط۔

جگر اعلیٰ تعلیم یافتہ، بلند مرتبہ انسان ہیں۔ اس لئے ...ہ پایہ شاعر بھی۔ مختلف زبانوں کی ادبیات کا وسیع مطالعہ رکھتے ہیں۔ عروض سے بھی واقف ہیں اُن کا کلام قواعدِ زبان اور اصولِ فن کا پابند ہے۔ نقائص سے پاک ...سن سے مالا مال۔ جس میں فصاحت و بلاغت پہلو بہ ...لو نظر آتی ہیں۔ وہ پنجاب کے نوجوان شعرا کے محبوب ...بنا ہیں اور اُن کی شہرت کی خوشبو ہندوستان بھر کے ...ختلف صوبوں کے علاوہ پاکستان میں بھی پھیلی ہوئی ہے ...ریڈیو اور دور درشن کے علاوہ دوسرے آل انڈیا مشاعروں ...ں اُن کا کلام مشاعرہ۔ پیش کش محفل پر چھا جاتی ہے۔ زبان ...استعمال خیالات کے مطابق ہوتا ہے۔ گہرائی کے ...ا دور میں وہ ثابت قدم رہے ہیں۔ قدامت اور روایت کی بنیادی اقدار کے ساتھ جدید تقاضوں کو بھی مدِ نظر رکھتے ہیں۔

جناب جگر کے کلام میں اُلجھنیں نہیں ہوتیں۔ صفائی، روانی، شگفتگی اس کا خاص وصف ہے، جوش، سادگی اور جدّت اس میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ جن کی مجموعی کیفیت کا نام تاثیر ہے۔ جس کے بغیر شعر غرابت ہو کر رہ جاتا ہے۔ قارئین "خونِ جگر" کے مطالعہ سے محسوس کریں گے کہ اس میں لطافت، ندرت، نزاکت، نفاست، رادبیت؟ حلاوت بھی کچھ موجود ہے۔ اُن کی ترکیبیں شستہ ہوتی ہیں اور اندازِ سخن بوسیدگی سے پاک اور رنگِ تغزل عامیانہ نہیں ہوتا۔ غزلوں میں تیر و نشتر اکثر مل جاتے ہیں جو بغیر یاد کئے یاد ہو جاتے ہیں۔ جہاں وہ عام فہم ہیں سو وہاں خاص پسند ہیں۔ نثر کے نزدیک ہوتے ہیں۔ سنتے ہی دل میں اُتر جاتے ہیں۔ اُن کی "ضربِ آہ" قابلِ داد ہے۔ یہ اور دوسرے سہ ماہی دور ہیں۔ ملک بھر کے نامور رسائل اور اخباروں میں ان کا کلام بلا منت نظام احترام سے شائع ہوتا ہے۔ وہ اعزازات وغیرہ سے فطرتاً بے نیاز ہیں۔ مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن غزل اُن کا اوڑھنا مشغلہ ہے۔ جسے وہ شاعری کا وقار سمجھتے ہیں۔

"خونِ جگر" صرف غزلیات پر مشتمل ہے۔ مسلسل غزل سے آغازِ "حمد" ہوتا ہے۔ پھر یہ مجموعہ اختتام پذیر ہے۔ اکتا کے ساتھ جو حمد کی طرح مسلسل غزل ہی ہے۔ غزلیات کے بعد دوسرے حصّے میں منتخب اشعار بھی درج ہیں

اب میں اپنے بیان کی تائید میں چند شعر پیش کرتا ہوں مجھے یقین ہے کہ ان کے مطالعہ سے قارئین میرے ہم خیال ہوں گے۔ سارا مجموعہ پڑھیں گے تو اُن کے ذوقِ ادب

کی تسکین ضرور ہوگی ۔ اشعار کی تشریح کی ضرورت نہیں ۔ یہ اپنی تشریح آپ ہیں ۔ بلکہ میرا یقین ہے کہ یہ جذبات کے نازک آئینے توضیح کے لمس سے ٹوٹ جائیں گے ۔ ویسے بھی یہ احساس سے تعلق رکھتے ہیں ۔ آپ ان اشعار کو ملیانی دبستان کے نمائندہ پائیں گے ۔

پہلے دو مقطع ملاحظہ فرمائیے :۔ ؎

خونِ دل سے بھی تو ہو سکتی ہیں سرخ آنکھیں جگر!
ہم نے ساغر ہی پئے ہوں یہ ضروری تو نہیں

جگر کے خون سے آنکھوں میں سرخ ڈورے ہیں
سمجھ رہا ہے زمانہ شراب خوار مجھے

پڑھیے اور سر دھنیے ۔ اب اشعار :۔ ؎

یہ دل کا آئینہ اب توڑنے کے قابل ہے
دکھائی دیتا نہیں ، اس میں کوئی یار مجھے

اک رات کی ہے بات کہ وہ بچھڑے تھے ہم سے
اس دن سے وہیں کی وہیں وہ رات کھڑی ہے

ہمارا حال سن کر وہ اگر اتنے پریشاں ہیں
ہمارا حال دیکھیں گے تو ان کا حال کیا ہوگا

غیر ممکن میرا جینا ہے محبت کے بغیر
پانچ حرف اس کے جو ہیں ۔ پانچ عناصر ہیں مرے

ڈال کر عکس وہ آئینے میں بھر دیتے ہیں رنگ
ورقِ سادہ کو تصویر بنا دیتے ہیں

مری خودداریوں نے عشق کی دنیا بدل ڈالی
بنا ہوں منتظر سے منتظر آہستہ آہستہ

یہ علم مجھ کو بعدِ ملاقات ہی ہوا
جس کی تلاش تھی وہ کوئی دوسرا نہ تھا

دل تڑپتا ہے اس کی صورت کو
جس کی صورت سے روشناس نہیں

میں تو اس امید پر آیا تھا غم پونچھوگے آنسو
تم تو خود ہمراہ میرے اشک ٹپکانے لگے

حسرتوں کا ہو گیا ہے اس قدر دل میں ہجوم
سانس رستہ ڈھونڈتی ہے آنے جانے کیلئے

کوئی جمال دیکھنے والا نہیں رہا
بیٹھا رہے ہیں وہ مری آنکھیں نکال کر

منہ پھیر کے محفل میں اُدھر بیٹھنے والے!
بیٹھے ہیں تیرے طالبِ دیدار اِدھر بھی

تو اگر پیاسا ہے ۔ دریا سے نہ پانی کی گھونٹ
اپنی خودداری کو قائم رکھ کنارے کی طرح

سب زندگی کو کہتے ہیں اک دردِ سر مگر
مرنے کے واسطے کوئی تیار بھی نہیں

جب ہزاروں ولولے تھے ۔ وہ تھے ہم سے بے نیاز
جب ہوئے وہ مہرباں ۔ دل میں کوئی ارماں نہ تھا

سُننی ہی پڑے گی تمہیں ۔ سننی ہی پڑے گی
آواز محبت ہے یہ ۔ آوازِ محبت

مجھے یقینِ واثق ہے کہ قارئین میرے ان خیالات کی تائید کرنے میں تجمل سے کام نہیں لیں گے ۔ جن کا اظہار میں نے "خونِ جگر" اور اس کے مصنف کے متعلق کیا ہے جانتا ہوں جگر انسان ہیں ۔ انسان سے غلطیاں ہو سکتی ہیں ۔ مگر یہاں اُن کا امکان کچھ کم ہی ہے ۔

"خونِ جگر" ۱۶۰ بڑے صفحوں پر مشتمل ہے ۔ کتابت عمدہ ہے ۔ طباعت دیدہ زیب ۔ کاغذ بڑھیا ۔ جلد پختہ سرورق کئی رنگوں کا ۔

قیمت صرف ۔/۲۵ روپے جو معقول ہے ۔

غرض ؎

نہ فرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامنِ دل مے کشد کہ جا اینجاست

ملنے کا پتہ :۔
دفتر ماہنامہ شانِ ہند ۔ فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ ۔ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

محمد مشتاق شارق میرٹھی

"زاویہ ہائے نگاہ"

"زاویہ ہائے نگاہ" جناب ضیاؔ فتح آبادی کے نثری مضامین کا پہلا قابلِ قدر مجموعہ ہے۔ اس میں مضامین معاصرین کی فکری کاوشوں پر بطور تبصرہ لکھے گئے ہیں۔ راقم الحروف کی رائے میں یہ مضامین دوامی قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ جب بھی اس عہد کی ادبی تاریخ مدوّن ہوگی۔ ان مضامین کے بعض حصوں سے اخذ و استفادہ کیا جائے گا۔

جناب ضیاء فتح آبادی نے اپنے مقالوں میں تنقید کے معیاروں کو اس طرح پیشِ نظر رکھا ہے کہ کہیں ذاتی تعصب نہیں جھلکنے پایا۔ ان کے تبصرے بھرپور اور بے لاگ ہیں۔ ابر احسنی پر جو مضمون ضبطِ تحریر میں لایا گیا ہے وہ خاص طور سے جملہ اوصاف کا حامل ہے۔ اہلِ قلم حضرات کو ابر احسنی اور سیماب کی ادبی معرکہ آرائی ابھی یاد ہوگی۔ مرحوم ابر احسنی نے علامہ سیماب کی گرانقدر تصنیف "دستور الاصلاح" پر جس انداز سے نکتہ چینی کی تھی۔ اس کا تقاضا تھا کہ جناب ضیاء فتح آبادی اس سے متاثر ہو کر ابر احسنی صاحب پر خامہ آرائی کرتے۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ انھوں نے جہاں ابر احسنی کی عروض دانی کو سراہا ہے وہیں بقول جگدیش بھٹناگر حیات "اس حقیقت کے انکشاف سے گریز نہیں کیا کہ عروضی واقفیت اچھے شعر کی تخلیق میں معاون نہیں ہو سکتی"۔ اس کے ساتھ مندرجہ بالا تلخ معرکہ آرائی میں ابر احسنی کی پاکیزگیِ طبیعت پر کس انداز سے روشنی ڈالی ہے پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس اختلافِ رائے کی توجیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"علامہ موصوف کی مخالفت میں ابر احسنی کے دل میں وہ جذبۂ عقیدت کارفرما تھا جو انھیں اپنے بزرگوں سے ملا تھا اور ان کو علامہ کی وہ ادا پسند نہ آئی جس کے تحت انھوں نے اپنے بزرگوں کی اصلاحوں میں غلطیاں نکالی تھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو شاید وہ اپنی مخالفت علامہ کی وفات (جنوری ۱۹۵۱ء) کے بعد بھی جاری رکھتے مگر ان کا ایسا نہ کرنا دلیل ہے اس بات کی کہ وہ دراصل علامہ موصوف کو اپنے استاد کا درجہ دیتے تھے۔ اور ان کی اتنی ہی قدر و عزت کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے علامہ کی وفات کے بعد 'الاحسن' کا ایک شمارہ (سیماب نمبر) کے طور پر شائع کیا تھا" ص ۴۷

ایسا ہی بے ریا انداز جناب ضیاء فتح آبادی نے اُس مقام پر اختیار کیا ہے۔ جہاں انھوں نے عرش ملسیانی مرحوم کی شخصیت کی ایک نفسیاتی خامی کو نمایاں کرتے ہوئے لکھا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"... ایک روز میں کنول انبالوی کے سکوٹر کے پیچھے بیٹھ کر عرش کی مزاج پرسی کے لیے ان کے مکان پر پہنچا۔ وہ بیمار تھے۔ اور بستر سے اُٹھنے سے معذور۔ جب ہم چلنے لگے۔ تو میں نے اُن سے چند سطریں، تحریر [illegible] کے نمبر کے لئے لکھنے کی درخواست کی، جسے انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "تندرست کا ہو جانا پہلے ضروری ہے۔ بعد ازاں مجھے اوم پرکاش بجاج کی زبانی معلوم ہوا کہ بیماری سے اُٹھ جانے کے بعد عرش نے [illegible] مالک رام سے ٹیلیفون پر بات کی اور جب مالک رام نے اپنے ارادے کی تصدیق کر دی تو عرش نے اُن سے پوچھا "کیا ضیا کے علاوہ آپ کو کوئی دوسرا شاعر نظر نہیں آیا" اگر میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو شاید اس فقرے کے تخریبی اور تضحیکی

باقی ص ۳۲ پر

[illegible] ضیا فتح آبادی [illegible]

قسط ۹

دھرتی کانپ اٹھی

احمد حسین شمس ایڈوکیٹ کشن گنج

کشن لال نے سلیم کو دیکھ کر حسین بخش سے کہا "سلیم بہت بیمار معلوم ہوتا ہے"

"ہاں تو یہی تو اس نے عقلمندی کی ہے مگر دلاور خاں ...رد سے کہاں بھاگ کر جانے والا تھا۔ دلاور نے اسے ...قع واردات پر پکڑ لیا۔ یہی پانچ چھ آدمی پکڑے باقی ...رار ہو گئے مگر دلاور انھیں چہرے سے پہچانتا ہے۔"

"داروغہ صاحب نے کہا۔ ان بدمعاشوں کو میں اچھی ...رح جانتا ہوں۔ میاں صاحب یہ لوگ کوئی کام بغیر وکیل مختار ...ے مشورہ کے نہیں کرتے۔ کسی وکیل نے رائے دی ہوگی ...ھی تم بیمار ہو کسی طرح تم یہ کام جا کر کر آؤ پھر تو میں ال...ائی ثابت کر ہی دوں گا اور میاں سلیم سمجھتے کہ ...نگئے اپنے وکیل کی باتوں میں مگر یہ معلوم نہیں کہ ان کا ...ب اسی تھانے میں رہتا ہے" اور پھر داروغہ صاحب نے ...و چار غلیظ غلیظ گالیاں سلیم اور اس کے ساتھیوں کو ...ے ڈالیں۔

سلیم نے کہا۔ "خدا سب کچھ دیکھتا ہے ایک دن سب اُس کے دربار میں حاضر ہونا ہے۔"

حسین بخش نے داڑھی سہلاتے ہوئے کہا "اچھا آپ کو خدا کا بھی خوف ہے" اور پھر میاں صاحب نے ...روغہ کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا داروغہ صاحب نے ...ب سپاہی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارہ کیا وہ سپاہی ...ا اور دو تین تھپیڑ سلیم کی پیٹھ پر جما دئیے۔ سلیم تلملا کر ...لیا زبان سے چیخ نکلی اور پیٹھ سے خون بہہ نکلے اور ...کی قمیص سرخ ہو گئی دوسرے قیدی سہم کر رہ گئے کشن ...نے نفرت سے آنکھیں پھیر لیں اور حسین بخش قہقہہ ...ر ہنسنے لگے۔

کشن لال نے داروغہ سے پوچھا "اب کیا ارادہ ہے داروغہ صاحب؟"

"ان سالوں کو اگر تین تین سال قید با مشقت کی سزا نہ دلوا دوں تو پھر میرا نام کے بی اگروال نہیں ۱۴۶ء کا مقدمہ کوئی معمولی مقدمہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا فیصلہ سیشن میں ہوتا ہے بڑا سنگین جرم ہے کشن لال اب میں تحقیقات شروع کروں گا جب تک ان کے اور ساتھی گرفتار نہ ہو جائیں میں چارج شیٹ نہ دوں گا" داروغہ صاحب حسین بخش کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

کشن لال نے پوچھا "گواہوں کے بیانات قلمبند ہو چکے"

"ابھی تک تو صرف اطلاع اول قائم ہوئی ہے ان ویسٹی گیشن کل سے شروع کروں گا۔ دیکھوں اس علاقہ کے بدمعاش کہاں بھاگ کر جاتے ہیں" داروغہ صاحب نے کہا

حسین بخش بول اٹھے "ان بدمعاشوں نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے اس سال میں نے حج کا ارادہ کیا تھا مگر اب دیکھتا ہوں یہ کمبخت مجھے جانے نہ دیں گے"

داروغہ صاحب نے کہا۔ "سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں نے ان کسانوں کے دماغ آسمان پر چڑھا رکھے ہیں"

حسین بخش کھلکھلا کر ہنس دیئے اور کہا "... داروغہ صاحب آپ نے یہ سوشلسٹ کیا کہتے ہیں دھن اور دھرتی بٹ کے رہے گی خدا کی مشیت میں دخل دینا چاہتے ہیں یہ سب"

داروغہ صاحب نے ایک فرمائشی قہقہہ لگا کر کہا "بھئی دیکھئے ان لوگوں کو جب تک کانگریس برسر اقتدار ہے یہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ کتوں کی طرح بھونکتے ہی رہیں گے"

کشن لال پوچھ بیٹھے "اور جب کانگریس شکست کھائی؟"

حسین بخش نے کہا "سوشلسٹ تو ہوائی باتیں کرتے ہیں بھلا دھن اور دھرتی بھی کہیں [illegible] سکتی ہے یہ تو اللہ کا دین ہے جسے چاہے دے"

"یہ سب تیس نعرے ہیں" داروغہ صاحب نے کہا۔ یہی سب بے معنی نعرے لگا لگا کر تو روسی ایجنٹ اپنی پارٹی مضبوط کرنا چاہتے ہیں علاقے کے غریب اور جاہل عوام ان کی باتوں میں آجاتے ہیں اور پھر یہ کمبخت ایسے ایسے بڑ بونگ مچاتے ہیں کہ بس۔ تو یہ ہی بھلی سچ پوچھئے تو یہ ڈاکوؤں کی ٹولیاں ہیں جو سیاسی نام دے کر لوگوں کو بدنام کر رہی ہیں ابھی حال ہی میں ایک جگہ ڈکیتی ہوئی بہت سے کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن گرفتار ہو گئے دو دو سال تین تین سال کی سزا ہو گئی ان لوگوں کو۔ حکومت کو چاہئے کہ ان پر پارٹیوں پر پابندیاں عائد کر دے"

"تبھی تو علاقے میں شانتی برقرار رہ سکتی ہے" میاں صاحب نے کہا۔

اتنے میں دلاور خاں نے آکر کہا۔ حضور ناشتہ تیار ہے تینوں اٹھ کر دوسرے کونے میں گئے اور ناشتہ کرنے لگے۔ کشن لال نے پوچھا "داروغہ صاحب کیا یہ مقدمہ چل کر رہے گا؟"

حسین بخش نے متعجب ہو کر کشن لال کی طرف دیکھا اور پوچھا "تمہارا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ منگو سے مجھے ساری باتیں معلوم ہو چکی ہیں"

بس فوراً میاں حسین بخش نے اپنا پاؤں بڑھا کر کشن لال کے پاؤں کو دبایا کشن لال نے حسین بخش کی طرف دیکھا حسین بخش نے کہا "اگر منگو نہ [illegible] کشن لال تو آج اس عالیشان عمارت کی جگہ تم راکھ کا ڈھیر دیکھتے اس خدا کے بندہ ہی نے تو میری جان بچائی ہے"

"اچھا تو تم نے داروغہ صاحب کی کچھ خاطر تواضع کی؟" داروغہ صاحب نے اپنے چہرے پر انکسار اور شرم کے مصنوعی آثار پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "کشن لال ہم لوگ تو لوگوں کی جان و مال عزت آبرو کے محافظ ہیں خیر ملی کہ دو روپے دو دن سے آکر واقعات کی تحقیق کی ملزموں کو سزا دلوائی اگر ہم لوگ [illegible] رکار [illegible] نہ رہیں تو دن دہاڑے ڈکیتیاں ہونے لگیں میری خاطر تواضع سے کیا مطلب؟ انگریز والے نے تو ہم لوگوں کو یہی سکھایا ہے کہ جب داروغہ صاحب آئیں تو ان کے بال بچوں کے لئے ان کی جیب میں ضرور کچھ نہ کچھ رکھ دینا چاہیئے"

"چھوڑئیے ان باتوں کو" ذرا انکسار کے ساتھ داروغہ صاحب نے کہا۔

حسین بخش نے کہا۔ نہیں جناب چھوڑا کیوں جائے آپ کو میں خوش کر دوں گا مگر ان [illegible] کو تین تین سال کی قید دلوا کر رہئے"

کشن لال نے کہا "حسین تم جاؤ اور گن کر پانچ لے آؤ" داروغہ صاحب بول اٹھے "پانچ تو بہت کم ہوتا ہے اتنے بڑے دربار سے پورا ایک ہزار ملا تو کیا ملا"

حسین بخش کبھی داروغہ صاحب کبھی کشن لال کو دیکھتے تھے

[illegible] لال نے کہا کہ "ابھی تو آپ صرف پانچ سو پر ہی اکتفا کیجئے۔ آپ گھبراتے کیوں ہیں آپ تو یہاں [illegible] آئے ہیں، وہ تدبیر بتلاؤں گا کہ تینوں گھروں میں آسمان سے روپے برسنے لگیں گے" اور پھر انہوں نے حسین بخش سے کہا جاؤ جلد از جلد پانچ سو روپے لے آؤ حسین بخش اٹھ کر اندر چلے گئے تو کشن لال نے کہا "داروغہ صاحب اس مقدمہ کو چلانے کی میری خواہش نہیں حسین بخش خواہ مخواہ ان لوگوں کے پیچھے پڑے ہیں"

"آپ ایسی بات کیوں کہہ رہے ہیں" چائے کی ایک چسکی لے کر داروغہ نے پوچھا۔

اس لئے کہ جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا ہے ان سے کچھ ملنے کی امید نہیں سب کے سب غریب اور قلاش ہیں اگر ایک مقدمہ میں دس دس ہزار ہم لوگوں کے پلے نہ پڑا تو پھر وہ مقدمہ ہی کیا حسین بخش تو سمجھتے ہی نہیں اگر میں رہتا تو

ہرگز انھیں ابھی گرا سے نہ دیتا آپ تحقیقات جاری رکھئے
مگر آخر میں فائنل رپورٹ دے دیجئے میں حسین بخش کو
سمجھا دیتا ہوں وہ میری بات مان جائیں گے۔

"اب آپ دونوں مل کر جو کہیں وہی کروں گا۔"

مگر ابھی یہ راز حسین بخش پر ظاہر نہ ہو آپ ایک
ہفتہ کے بعد میرے یہاں تشریف لائیے وہیں حسین بخش
کو بھی بلوالوں گا اور پھر کوئی ایسی چال چلی جائے کہ آپ کی
بھی شہرت ہو اور ہماری بھی گوٹیاں لاتا ہوں اور پھر جب
یہاں سے جائیں تو ڈی ایس پی ہو کر جائیں موقع آتا نہیں
لایا جاتا ہے اگر حکومت کی نظروں میں سرخروئی حاصل کرنی
ہو تو آپ کو اس بڈھے کی باتوں پر عمل کرنا چاہیئے۔ میری
عمر دیکھتے ہیں نا اسی دشت کی سیاحی میں گذری ہے۔

اتنے میں میاں حسین بخش پانچ سو روپئے لے آئے
اور داروغہ صاحب کے ہاتھوں میں دے دیا داروغہ صاحب
نے روپئے اپنی جیب میں رکھ لئے۔

حسین بخش نے پوچھا "تو آپ ان قیدیوں کو اسی
وقت تھانے لے جائیے گا۔"

کشن لال بول اٹھے "نہیں انھیں ضمانت پر چھوڑا
لیا جائے۔"

"کیوں؟"

"یہ لوگ اگر حراست میں چلے گئے تو فرار شدہ بدمعاشوں
کا سراغ نہیں مل سکتا۔"

"ہاں بات تو معقول ہے۔"

داروغہ صاحب نے ایک سپاہی کو آواز دی سپاہی کے
آنے پر داروغہ صاحب نے اس کے ہاتھ میں ایک سو روپئے
دے کر کہا یہ تم لوگوں کا حصہ ہے جا کر ان قیدیوں سے کہو
اگر کوئی ضمانت دار ملے تو وہ لوگ بلوا لیں میں سب کو ضمانت
پر چھوڑ دوں گا۔

سپاہی کے جانے کے بعد حسین بخش نے کہا۔ داروغہ
صاحب وہ تو کہیئے خدا مجھ پر خاص مہربان ہے کہ عین وقت
پر اس نے کشن لال کو بھیج دیا۔

اور پھر تینوں باہر آئے قیدی ضمانت پر چھوڑ دیئے
گئے پھر ملزم نے کشن لال کے جان و مال کی دعائیں دیں
اور اپنے اپنے گھر چل دیئے۔

داروغہ صاحب اپنے سپاہیوں کے ساتھ تھانے
چلے گئے اور کشن لال گاڑی پر سوار ہو گئے۔

گاڑی کے پاس حسین بخش نے آکر کہا "کشن لال!
باتوں باتوں میں وقت بھی گذر گیا اور میں تمہاری خیریت
بھی نہ پوچھ سکا۔ کہو اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔"

"کام ادھورا چھوڑ آیا ہوں مگر بھگوان نے چاہا تو
یہ رشتہ ہو کر رہے گا۔"

"کچھ میں بھی سنوں۔"

"لڑکا تو مجھے پسند ہے مگر اس کے پتا جی بڑے
لالچی ہیں۔ مظفر پور گیا تو وہاں ان سے ملاقات نہ ہوئی
معلوم ہوا وہ موتیہاری چلے گئے ہیں اور ایک ہفتے کے
اندر نہیں آسکتے مجبوراً میں موتیہاری گیا اور ان کا پتہ
لگا کر ان سے ملاقات کی پہلے تو وہ سیدھے منہ بات
بھی نہیں کرتے تھے مگر جب میں نے کہا شرما جی میں
تلک میں تین ہزار روپے لڑکے کی نذر کرنے والا ہوں
تو بولے یہ کون سی بڑی ہمت آپ نے کی ہے آٹھ ہزار
تو مجھے مظفر پور ہی میں ملتا ہے۔"

"بڑا لالچی ہے کمبخت کیا اس کے لڑکیاں نہیں ہیں۔"

(باقی)

اطلاع

سٹیٹ بنک آف انڈیا کے ایک سینئر آفیسر
شعری مجموعہ "متوازی سائے" کے مصنف
جناب ادم پرکاش آزاد بہاولپوری ۴۰ سال
کی طویل ملازمت کے بعد ۳۰ نومبر ۸۵ء کو
سبکدوش ہو گئے ہیں۔ موصوف غازی آباد میں
مقیم ہیں۔

ناشرین اور تاجران کتب

متوجہ ہوں!

دلی اردو اکادمی اردو ناشرین اور تاجران کتب کی ایک
جامع اور ضخیم ڈائرکٹری شائع کر رہی ہے۔ اس ڈائرکٹری کے لئے
اپنے ادارے کا مختصر تعارف، کب قائم ہوا، کتنی کتابیں شائع کی ہیں۔
کسی دوسری زبان کی کتابیں شائع / فروخت کرتے ہیں۔ نصابی کتابیں
شائع / فروخت کرتے ہیں یا متفرق وغیرہ اور دیگر تفصیلات زیر ترتیب
ڈائرکٹری کے لئے ذیل کے پتہ پر جلد از جلد ارسال فرمائیں۔

اردو ڈائرکٹری
دلی اردو اکادمی۔ سن لائٹ بلڈنگ
آصف علی روڈ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
فون ۲۰۶۲۱۱

غزل

ایم۔ آر قریشی سوز زیلوا

نارسا آہِ رسا ہو یہ ضروری تو نہیں
پوری ہر ایک دعا ہو یہ ضروری تو نہیں

تم مٹا دوگے مجھے کیوں یہ قسم کھاتے ہو
بس تمہارا ہی خدا ہو یہ ضروری تو نہیں

میں نے بھی برق چمکتی ہوئی دیکھی ہے مگر
آشیاں میرا جلا ہو یہ ضروری تو نہیں

آپ خود دعوتِ نظارہ مجھے دیتے ہیں
صرف میری ہی خطا ہو یہ ضروری تو نہیں

عشق میں جان کئی لوگوں نے دے دی سچ ہے
زہر سب نے ہی پیا ہو یہ ضروری تو نہیں

گدگداتی ہے جو دل اہلِ چمن کا اے سوز
تیرے دامن کی ہوا ہو یہ ضروری تو نہیں

غزل

عبدالستار عاصی دھوری (کویت)

شانِ مقتل کو پھر سے زندہ کر
اپنے شوریدہ سر کا سودا کر

راہ میں پاؤں ڈگمگائیں گے
اپنی بیساکھیاں نہ دیکھا کر

واسطہ ہے گلی رُتوں کا تجھے
اجنبی بن کے یوں نہ گذرا کر

اپنا اپنا ضمیر ہے ناداں
چڑھتے سورج کی تو نہ پوجا کر

ہم بھکاری ہیں بس ترے در کے
ہم کو نفرت سے یوں نہ دیکھا کر

عاصی ہر اک ردیف بولے گی
اپنی غزلوں میں سوز پیدا کر

غزل

ڈاکٹر حمید اکبر قمر دیوازیوا

ترا گر آشیاں بردوشِ گلشن سے ہوا گزری
بتا دل پر ترے کیا بلبلِ رنگیں نوا گزری

یہ آغازِ الفت میں پریشانی کا یہ عالم
نہ جانے انتہا کیا ہو جو ایسی ابتدا گزری

مہک اٹھا جہاں کا کونہ کونہ اس کی خوشبو سے
ترے دامن سے چھو کر بھی اگر بادِ صبا گزری

نہ کر فکرِ ملالِ زندگی ہم غم کے ماروں کا
گزر جائے گی جیسی آج تک اے بے وفا گزری

نہ دوزخ نے جگہ دی اور نہ جنت ہی ملی ہم کو
پرستاروں پہ تیرے یہ صنم روزِ جزا گزری

ڈبو دی کس لئے منجدھار میں کشتی محبت کی
ترے دل پہ بتا کیا کچھ نہیں اے ناخدا گزری

اگر مدد نہ کرتے تو تمہارا کیا بگڑ جاتا
تمہاری بے وفائی سے قمر کے دل پہ کیا گزری

غزل

یوسف ثانی سلیمان پالی

جہاں وہ گلبدن بلنا رہا ہے
ابھی تک وہ دریچہ مہکتا ہے

ہوا تھا نیم شب وہ بے تکلف
مگر اپنا بھی پتہ کس کو رہا ہے

کبھی دیکھا نہیں اُس نے مرا گھر
تو گھر گھر کیوں مرا چرچا رہا ہے

ہیں یکجا ماہ و انجم اور جگنو
الٰہی یہ سب احساس کیا ہے

ہوئی متوالی پچھلی رات ثانی
سویرے کا نگہباں پھر خدا ہے

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹیو بنک لمیٹڈ

رجسٹرڈ آفس ۷۸ محمد علی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

دہلی آفس نمبر ۳۶۵۵ نیتاجی سبھاش مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

- ہمارے یہاں شرح سود تمام نیشنلائزڈ اور شیڈولڈ کمرشل بنکوں کے مقابلہ ایک فیصد زیادہ ہے۔
- ہندوستان کا پہلا کوآپریٹیو بنک جس کو زرمبادلہ میں کاروبار کے لئے لائسنس جاری کیا گیا
- ہمارے بنک میں اوقاف کے جمع شدہ رقم کی آمدنی دفعہ ۱۳ (۵) (الف) (۱۱۱) انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہے

اس کے علاوہ

ہم آپ کے آرام و آسائش کی ضروریات مہیا کرنے کے لئے آسان قسطوں پر قرضہ فراہم کرتے ہیں۔ ایک فیصدی کا فرق بہت بڑا فرق ہے۔ یہ آپ کی رقم میں ہزاروں روپیہ کا اضافہ کرتا ہے آپ بھی اس کا فائدہ اٹھائیں

زین جی رنگون والا — جیلی ایس ڈاکٹر — شمیم کاظمی

(چیرمین) — منیجنگ ڈائرکٹر — اسسٹنٹ جنرل منیجر

فون نمبر: ۳۶۸۲۶۶ — ۲۶۴۳۷۲

باب انتقاد

(ادارہ)

سکوتِ گل :-

جناب ثاقب امروہوی ایڈوکیٹ کا مجموعہ کلام ہے ۲ × ۲۳ سائز کے ۱۲۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے لوم نہیں کہ ثاقب امروہوی وکالت میں کیسی قانونی کافیال کرتے ہوں گے مگر ان کی شاعری ہر انداز قابلِ تعریف ہے کوئی بھی صفحہ کھولئے آپ مطلع لحقیقت مطلع انوار پائیں گے۔ ہر غزل کے شعار پر قاری داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جس م صاف۔ شستہ اور فن شاعری کا بہترین نمونہ اسی قدر مجموعہ بھی بہت ہی صاف شستہ اور فن ت کی قابلِ تعریف پیش کش ہے۔ پھر وہ باذوق ۔ بلکہ بہت ہی اچھے اشعار کا دلدادہ ہے۔ اس سکوتِ گل واقعی نعمت ہے۔ کاغذ ایسا کہ شائع یں اس سے بہتر کاغذ دستیاب نہ ہو سکے۔ تہذیب ب امروہوی نے گرد و پوش کے ڈیزائن میں رت فن کا مظاہرہ فرمایا ہے اس کی داد نہ کی دلیل ہوگا۔ چھپائی اس قدر ی آنکھوں کی روشنی بڑھائے اور کتابت ندر جلی ہے مگر ہے قابلِ تعریف۔ قیمت ۔ ہے۔ مصنف سے محلہ قریشی امروہہ یو پی شانِ ہند سے طلب فرمائیے۔

راجگان :-

مدراس یونیورسٹی کی تاریخی سیریز ع ۸ چولا راجگان (۱ (م) انڈین کاونسل آف ریسرچ کی ے اشتراک سے ترقی اردو بیورو نے بڑے اہتمام شائع کیا ہے۔ چولا آرٹ کی اس بے مثال تصنیف کے مصنف کے۔ اے۔ نیل کنٹھ شاستری ایم اے امیریٹس پروفیسر تاریخ ہند و علم آثار قدیمہ یونیورسٹی آف مدراس نیز پروفیسر آف یونیورسٹی آف مدراس ہیں اور مترجم شریمتی ایدمن سیٹھی ایم اے ہیں اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۷ء میں دو جلدوں میں شائع ہوا تھا۔ اور ہر جلد کے ساتھ منتخب کتبوں کا ضمیمہ بھی شائع کیا گیا ہے مگر اس ایڈیشن میں یہ ضمیمہ شامل نہیں کیا گیا کیونکہ اب اس کی ضرورت کئی وجوہات کے باعث نہیں رہی۔

مصنف نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ چولا آرٹ کے مکمل جائزے کی راہ میں بہت سی مشکلات حائل ہیں کیونکہ جس طرح فرانسیسی اور ولندیزی ماہرین آثار قدیمہ نے کمبوڈیا انام اور جاوا میں کام کرتے ہوئے جو تاثر پیدا کیا ہے وہ ضروری وسائل کی کمی کے باعث اس ضمن میں پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں مصنف نے ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے جس میں مختصر طور پر چولا آرٹ کی تاریخ کے اہم پہلو کافی وضاحتی تصاویر کے ساتھ واضح کر دیئے گئے ہیں۔ مصنف نے تمام متن پر احتیاط کے ساتھ نظر ثانی فرمائی ہے اور جزوی طور پر اس کے بعض حصوں کو تازہ انکشافات اور تاویلوں کی روشنی میں ازسرنو بھی لکھا گیا ہے۔ اور چند جاگیرداروں کے خاندان سے متعلق کچھ ضمنی مواد جو بیان میں کچھ رکاوٹ ڈالتا دکھائی دیتا تھا۔ چھوڑ دیا گیا ہے اور حاشیے اب ہر باب کے خاتمے پر یکجا کر دیئے گئے ہیں پہلے یہ حاشیے

ہر صفحے کے نیچے بکھرے ہوئے تھے۔ اس ایڈیشن میں جناب کے۔آر۔سری نواسن کے نجی مجموعۂ تصاویر سے بھی کچھ تصاویر شائع کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ پہلے ایڈیشن کی نسبت دوسرے ایڈیشن میں بہت کچھ اضافہ اور ترمیم کی گئی ہے۔

چولا آرٹ یہ مفصل تاریخ ۱۱۱۵ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے یہ کتاب ایسی ہے کہ اسے ہر لائبریری میں رکھا جائے تاکہ آثارِ قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات چولا آرٹ کے بارے میں مکمل واقفیت حاصل کر سکے۔ ترقی اردو بیورو کا یہ کارنامہ یقیناً اس کی نیک نامی میں اضافے کا باعث ہوگا۔ اس بیش بہا تصنیف کی قیمت ساٹھ روپیہ ہے۔ ترقی اردو بیورو ویسٹ بلاک ۸ آر۔کے پورم نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶ سے یا دفتر شانِ ہند نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے یہ کتاب حاصل کی جاسکتی ہے۔

مولیئر

مولیئر کے منظوم اور نثری ڈراموں سے سترھویں صدی میں فرانس کی تہذیبی علمی و ذہنی زندگی سے متعلق جس موثر انداز میں روشناسی اور اس معاشرہ سے واقفیت زیرِ نظر کتاب میں شائع شدہ مولیئر کے دو ڈراموں "بیویوں کا مدرسہ" اور تارتوف سے حاصل ہوتی ہے اس سے یہ اندازہ بخوبی ہوسکتا ہے کہ سترھویں صدی میں کلاسیکی ڈراموں کے قواعد میں زماں، مکاں اور حال کی تثلیث کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اور فرانسیسی ڈرامہ نگاروں نے سترھویں صدی کے وضع کئے ہوئے کلاسیکی اصولوں کی سختی سے پابندی کی۔ فرانسیسی زبان کے بڑے ڈرامہ نگار کورنئی، مولیئر اور سین اسی نو کلاسیکی عہد کا عطیہ ہیں۔

ثریا حسین نے سترھویں صدی میں فرانس کا ادبی سیاسی ماحول، مولیئر کا فن اور اس کی معنویت، مولیئر۔ خاندان، حالات زندگی، عنوانات کے زیرِ تحت شروع میں قاری کے لئے مولیئر کے ڈراموں کے بارے میں مفصل واقفیت بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ فرانسیسی ڈرامہ نگاری پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ دونوں ڈرامے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ "بیویوں کا مدرسہ" ہدایت نامہ بیوی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کاش کہ یہ ہدایت نامہ ہمارے ہاں کی خواتین پڑھ لیتیں۔ گو خواتین کی اکثریت قدامت پسندی اور بورژدہ ہونے کا فتویٰ صادر فرمائیں گی مگر تین صد سال گزر جانے کے بعد بھی اس ہدایت کی حرف بہ حرف اپنی جگہ پر ایک ایسی اٹل حقیقت ہے کہ جسے شاید رہتی دنیا تک بھی جھٹلایا نہ جاسکے گا۔

یہ کتاب بھی ترقی اُردو بیورو۔ ایسٹ بلاک ۸۔ آر۔کے پورم نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶ نے شائع کی ہے اس خوبصورت کتاب کی قیمت پندرہ روپیہ ہے۔ خاتون جو اپنے شوہر کے دل کی ملکہ بننے کی خواہشمند ہو اسے مولیئر کے ڈرامے، بیویوں کا مدرسہ ضرور پڑھنا چاہئے۔ دفتر شانِ ہند نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے یہ کتاب دستیاب ہے

بقیہ: زاویہ ہائے نگاہ

پہلو کو نظر میں رکھتے ہوئے اُن سے گلہ گزار ہوتا۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ مالک رام صاحب کچھ بھی کریں مگر عرش اپنی صحیح رائے کے اظہار میں نہیں ہچکچائیں گے۔ یہ بھی تو انسان کے کردار کی بلندی کا ثبوت ہے۔

جناب ضیاء فتح آبادی بڑی شگفتہ اور سادہ نثر لکھتے ہیں اُسی کے ساتھ اسلوب میں تعطیل الفاظ کی خوبی پائی جاتی ہے وہ چاہتے تو مضامین کو کھینچ تان کر بڑھا سکتے تھے مگر انھوں نے دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی کوشش کی ہے مزید یہ کہ ہر سطر اُن کے خلوص کی آئینہ دار ہے۔

مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ جناب ضیا فتح آبادی خوش فکر شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب اسلوب نثر نگار بھی ہیں امید ہے زاویہ ہائے نگاہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا زاویہ ہائے نگاہ دفتر شانِ ہند دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے دستیاب ہے

Phones 275602

THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002

Regd. with the Registrar of Newspaper — 14/57

Regd. No D- (DN) 353

DECEMBER 1985

خرید کر پڑھئے

مانگ کر پڑھئے :

یا پھر

چوری کر کے پڑھئے

یہ ہے ہی اتنا خوب صورت،

اتنا دل کش،

اتنا مکمّل کہ اسے کسی طرح بھی

حاصل کریں کیوں کہ

یہ فیض کی شخصیت اور فن پر ایک

شان دار ادبی دستاویز ہے۔ اِس میں شامل ہیں :

قیمت : پندرہ روپے

- ★ خلوت اور جلوت کے بھید کھولنے والے ذاتی نقوش۔
- ★ نادر و نایاب تصویریں۔
- ★ سدا بہار، ہزار رنگ و منتخب کلام۔
- ★ فیض کی شخصیت کے وہ ڈھکے چھپے گوشے جن پر سے پہلی بار پردہ اُٹھایا گیا ہے۔
- ★ ہندوستان، پاکستان، رُوس اور انگلستان کے دانش وروں کی مشترکہ کاوشوں کا گلدستہ۔

ساری اُردو دنیا میں شبستان کے "فیض نمبر" کا چرچا ہے

اس سے پہلے کہ اسٹاک ختم ہو جائے آج ہی اپنے قریبی نیوز ایجنٹ سے طلب کیجئے یا براہ راست ہم سے منگوائیے۔

[illegible] ڈ/ایکسٹ، آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲